فنون

فنون

خاص سہ ماہی شمارہ

۷

ادارہ،

احمد ندیم قاسمی ✧ حبیب اشعر دہلوی

تزئین

موجد

جلد: ۴ دسمبر ۱۹۶۶ء شمارہ: ۲

سالانہ چندہ: ۱۴ روپے غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

قیمت فی پرچہ (اشاعتِ خاص عک) ۳ روپے

مقامِ اشاعت: ۴۷ - انارکلی - لاہور (پاکستان)

مندرجات

سرورق — موجلہ

تصاویر

راجہ مہدی علی خاں مرحوم — محمد ایوب اولیا
شاد امرتسری مرحوم — جین مائیکلسن
شکیب جلالی مرحوم — ساقی فاروقی
استاد عاشق علی خاں مرحوم — احمد ظفر
صادق نسیم

حرفِ اول — ادارہ — ۱۳

طویل افسانہ

دجلہ — شفیق الرحمان — ۱۵

افسانے

موت کے تار — انتظار حسین — ۶۹
ایک یا اتنی ایک — محمد احسن فاروق — ۷۳
فرسٹی — محمد خالد اختر — ۷۸
اپنے — مسعود مفتی — ۸۳
لمحے کی بات — منیر احمد شیخ — ۸۹
کرشنا چورا — غلام محمد — ۹۴
بدلتا ہے رنگ آسماں — آغا سہیل — ۹۹
سرحد — ذکاء الرحمان — ۱۰۹
چور — حسین شاہد — ۱۱۸
معافی — سعد شمیم — ۱۲۲

انشائیے

کچھ قلم کے بارے میں — ڈاکٹر وزیر آغا — ۱۲۵
ماہر لسانیات — رضیہ فصیح احمد — ۱۲۷
سلج — مشکور حسین یاد — ۱۳۰

سفرنامہ

سواتی مہم (۲) — محمد خالد اختر — ۱۳۲

اے ہمنفسانِ محفلِ ما

راجہ مہدی علی خاں کے خطوط — ۱۴۳
لوری — راجہ مہدی علی خاں — ۱۴۵
زندہ درگور (مرثیہ شاد) — احمد ظفر — ۱۴۶
تاریخ وفات شاد امرتسری — محسن بھوپالی — ۱۴۷
آخری غزل — شکیب جلالی — ۱۴۸
جدائی (مرثیہ شکیب) — انیس شیرازی — ۱۴۹
ہمسفر (مرثیہ شکیب) — انیس شیرازی — ۱۴۹

غزلیں

باقی صدیقی — ۱۵۰
باقی صدیقی — ۱۵۱
قتیل شفائی — ۱۵۲
قتیل شفائی — ۱۵۳
ادا جعفری — ۱۵۴
فارغ بخاری — ۱۵۵
احمد فراز — ۱۵۶

نام	صفحہ
ابن انشاء	۱۵۷
شاہد دہلوی	۱۵۸
جمیل ملک	۱۵۹
مظفر علی سید	۱۶۰
مظفر علی سید	۱۶۱
شہزاد احمد	۱۶۲
مشفق خواجہ	۱۶۳
ساقی فاروقی	۱۶۴
ساقی فاروقی	۱۶۵
ساقی فاروقی	۱۶۶
ساقی فاروقی	۱۶۶
احمد مشتاق	۱۶۷
محسن احسان	۱۶۸
محسن احسان	۱۶۹
سیف زلفی	۱۷۰
سیف زلفی	۱۷۱
صادق نسیم	۱۷۲
صادق نسیم	۱۷۳
صہبا اختر	۱۷۴
صہبا اختر	۱۷۵
جاوید شاہین	۱۷۶
سلیم شاہد	۱۷۷
توصیف تبسم	۱۷۸
خلیل رامپوری	۱۷۹
انور شعور	۱۸۰
محسن بھوپالی	۱۸۱
حسن بن افغان	۱۸۲
مشہود انور	۱۸۳
اختر ہوشیارپوری	۱۸۴
اقبال ساجد	۱۸۴
روحی کنجاہی	۱۸۵
روحی کنجاہی	۱۸۵
کمار پاشی	۱۸۶
کمار پاشی	۱۸۶
نظیر صدیقی	۱۸۷
ظفر ابن متین	۱۸۷
حزیں لدھیانوی	۱۸۸
تاج سعید	۱۸۸
فنا ضلک رشیدی	۱۸۹
کامل القادری	۱۸۹
سید نسیم محمود	۱۹۰
عاصی کرنالی	۱۹۰
زاہد فارانی	۱۹۱
زاہد فارانی	۱۹۱
رام ریاض	۱۹۲
رام ریاض	۱۹۲
احمد ندیم قاسمی	۱۹۳

مقالات

عنوان	مصنف	صفحہ
روحِ عصر	سید علی عباس جلالپوری	۱۹۴
اخذ و اشتقاق	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۲۱۳
اکبر اعظم کا دوسرا ملک الشعراء۔ شیخ فیضی	ڈاکٹر نجم عارف	۲۱۷
شعری تجربہ ۔ ایک فلسفیانہ تحلیل	قاضی عبدالقادر	۲۲۶
بریخت کا ایپک تھیٹر	مسیح الزمان	۲۳۱

تحقیق

مارٹی پوری کا ایک اہم تاریخی قلعہ — محمد اکرام چغتائی — ۲۳۷

نظمیں

دعوت — جوش ملیح آبادی — ۲۴۶

دو غزلیں — سید ضمیر جعفری — ۲۴۷

رجابات — مختار صدیقی — ۲۴۸

وداع کے دن — مختار صدیقی — ۲۵۰

ماں — ادا جعفری — ۲۵۱

سورج کا دیوتا — فارغ بخاری — ۲۵۳

روزنا جرمن نژاد — احمد فراز — ۲۵۴

نوری سالوں کے آثار — منیر نیازی — ۲۵۶

جاوداں — جمیل ملک — ۲۵۷

آئینہ — احمد ظفر — ۲۵۸

ایک آواز — احمد ظفر — ۲۵۹

ڈروں اکیلی — منظور عارف — ۲۶۰

سرِ شام — امید راحت چغتائی — ۲۶۱

کانٹریکٹ برج — الیاس عشقی — ۲۶۲

اپنے دوست کے لیے — فہمیدہ ریاض — ۲۶۴

دل کی بات — فہمیدہ ریاض — ۲۶۵

میرا جسم — کمار پاشی — ۲۶۶

یہ پاگل منہ زور ہوا — کمار پاشی — ۲۶۶

میری تخلیق — ادیب سہیل — ۲۶۷

ایک نغمہ — خالد شیرازی — ۲۶۷

تضاد — پروین سید فنا — ۲۶۸

مسافر کا کرب — احسان فاروقی — ۲۶۹

بے چارہ — ا-ح شیرازی — ۲۶۹

نوحہ — عرفانہ عزیز — ۲۷۰

تنہائی — عرفانہ عزیز — ۲۷۰

سنگت — فہیم جوزی — ۲۷۱

گم شدگی — فہیم جوزی — ۲۷۱

ایک شاعرہ

جین مارگسن — ساقی فاروقی — ۲۷۲

نیا جنم — جین مانکلسن، ترجمہ: ساقی فاروقی — ۲۷۳

لالچ — جین مانکلسن، ترجمہ: ساقی فاروقی — ۲۷۴

رات کا خیال — جین مانکلسن، ترجمہ: ساقی فاروقی — ۲۷۴

طنز و مزاح

کتاب (نظم) — ایوب صابر — ۲۷۵

موت کا تجربہ — منصور قیصر — ۲۷۶

فنونِ لطیفہ

اصول النغمات آصفیہ — عزیزہ بیگم — ۲۸۰

سندھی روایتی موسیقی — الیاس عشقی — ۲۸۳

استاد عاشق علی خاں — محمد ایوب اولیا — ۲۸۷

مذاکرہ

تجریدی مصوری — احمد ندیم قاسمی

حمید احمد خان

ڈاکٹر سید عبداللہ

تبصرے

جنگ آمد — محمد خالد اختر — ۲۹۷

باز آؤ اور زندہ رہو — فتح محمد ملک — ۳۰۰

واگہ کے اس پار — سید علی عباس جلالپوری — ۳۰۳

اقبال اور جمالیات — آغا سہیل — ۳۰۵

غبارِ خاطر — آغا سہیل — ۳۰۶

اخوان الصفا — آغا سہیل — ۳۰۸

۱۹۶۵ء کے منتخب افسانے — آغا سہیل — ۳۰۹

غزال — جمیل ملک — ۳۰۹

اسمِ اعظم — سیف زلفی — ۳۱۱

چکیدہ — سیف زلفی — ۳۱۴

ادارہ

حرفِ اوّل

فنون کے اس سہ ماہی نمبر کی اشاعت میں اتنی تاخیر ہوئی ہے کہ قارئین سے معذرت ضروری ہے۔ تاخیر کے اسباب تو متعدد ہیں اور اگر تفصیل عرض کی جائے تو قارئین یقیناً نہایت فراخ دلی سے درگزر بھی فرما دیں گے مگر ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ کسی گذشتہ شمارے میں ہم نے فنون کی اشاعت میں تاخیر کا ایک آدھ سبب عرض کیا تھا تو یار لوگوں کو ایک لطیفہ ہاتھ آ گیا تھا اور قارئین نے تو سرے سے اس مسئلے کے ساتھ کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار ہی نہ کیا۔ تب ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کے زمانے میں ادبی رسالے کے قاری کو پڑھنے کے لئے رسالہ چاہئے اور بروقت چاہئے۔ اس سے زیادہ اسے رسالے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی سو ہم قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ فنون کی سہ ماہی اشاعتوں میں آئندہ ہر قیمت پر باقاعدگی پیدا کی جائے گی اور اگر ہماری یہ کوشش ناکام رہی تو ہم "فنون" کو بند کر دینے کے اعلان میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے۔

معاونین سے

ہم "فنون" کے معاونین سے بھی معذرت خواہ ہیں کہ ان کے مضامین نظم و نثر کی اشاعت میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے مضامین کی بھی خاصی تعداد ہے جو رسالے کی محدود ضخامت یا ترتیب کی مشکلوں کے باعث کتابت شدہ رکھے رہ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اہلِ قلم اپنی ان تخلیقات کو "فنون" ہی کے لئے وقف رکھتے ہیں اور یہ ان کا بڑا کرم ہے۔ اکا دکا ایسے اصحاب بھی ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات کی اشاعت میں تاخیر سے خفا ہو کر "فنون" کو باقاعدہ ہدفِ طعن بھی بنایا ہے مگر ہم ان پر کوئی الزام نہیں دھرتے۔ قصور سراسر ادارۂ "فنون" ہی کا ہوتا ہے۔ ان کے طعن و تشنیع کے باوجود "فنون" ان کی معیاری تخلیقات کو اپنے صفحات میں جگہ دے کر فخر محسوس کرے گا۔ ہم تو گالی دینے والے کو بھی دعا دیتے ہیں کہ ایک ادبی رسالے کے ادارے کا یہی منصب ہے اور ظاہر ہے جب کوئی ادیب کسی کو برا بھلا کہتا ہے تو اس کے پاس اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہوگی چاہے یہ وجہ ذاتی ہی ہو۔ ہم ادیب کی "ذاتی وجہ" کا بھی احترام کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ ادیب ہے اور اس کے ہاتھ میں قلم کی سی مقدس امانت ہے جسے کما حقہ استعمال کرنے کا سلیقہ تھوڑی سی ریاضت کے بعد ہی آتا ہے۔

ہمارے شاعر

"فنون" نے مروجہ تنقید کی عام روش کے پیشِ نظر (جس میں معاصر شعر و ادب کو بہت کم بار حاصل ہوتا ہے) اپنے شاعروں کو ان کے فن کے صحیح پس منظر میں شعر کے قارئین سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس ضمن میں اب تک بائیس شعرا کا کلام مختصر تنقیدی اشاروں کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے مگر افسوس کہ خود بعض شعرا میں یہ سلسلہ خاصا غیر مقبول ہوا۔ ہم نے اس سلسلے میں جو فہرست مرتب کر رکھی تھی، اس میں ہر مکتبِ فکر کے ایسے شعرا کے اسمائے گرامی شامل تھے جنہوں نے اب تک چاہے چند ہی نظمیں یا غزلیں کہی ہوں مگر جو کچھ کہا ہو اس میں سے ہماری شاعری کا تابناک مستقبل جھانک رہا ہو۔ ستم یہ ہے کہ خود معترضین میں سے بھی بعض حضرات ہماری اس فہرست میں شامل تھے مگر "ہمارے شاعر" کے اس سلسلے پر بعض ایسے اعتراضات عاید کرنا مناسب سمجھا گیا جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ گروہ بندی کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ جب نیت بخیر ہو گی اس پر شبہ اس انتہا کو جا پہنچے، نیز جو سلسلہ گروہ بندیوں کو ختم کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہو مگر یہ بجائے خود بعض گروہوں کو گروہ بندی

پر اکسائے، اسے بند ہی کر دینا بہتر ہے۔ سو اس اشاعت سے یہ سلسلہ ختم کیجئے۔ ہم احمد ظفر، صادق نسیم، منظفر علی سید، حافظ لدھیانوی اور کمار پاشی سے معذرت خواہ ہیں کہ اب کے ہمیں اس سلسلے میں انہی کا کلام پیش کرنے کی عزت حاصل کرنا تھی مگر ہم ایسا نہ کر سکے۔ ہم معترف ہیں کہ "فنون" نے اس ضمن میں خود فن کاروں سے شکست کھائی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ فن کی دنیا میں ایسے حادثے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور جب تک فن کار اپنی "انا" کو تلوار کی دھار بنائے رکھیں گے، ایسے حادثے ہوتے ہی رہیں گے۔

اے ہمنفسانِ محفلِ ما

گذشتہ چند مہینے اردو شاعری کے لئے نہایت ظالم ثابت ہوئے کہ اس عرصے میں موت ہم سے راجہ مہدی علی خان، شاد امر تسری اور شکیب جلالی کے سے شعرا کو چھین لے گئی۔ یہ تینوں فن کار اپنے اپنے رنگ میں بے حد مقبول اور جانے پہچانے شاعر تھے۔ ساتھ ہی وہ بڑے پیارے انسان تھے۔ وہ خلوص کے پیکر تھے اور معصومیت کی حد تک محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس شمارے میں بھی ان کی یاد میں چند صفحات وقف کئے گئے ہیں مگر یہ ناکافی ہیں۔ آئندہ اشاعت میں ان کی شخصیت اور فن پر متعدد مضامین شائع کئے جائیں گے۔

راجہ مہدی علی خاں

قیام پاکستان کے بعد راجہ صاحب نے بمبئی میں مستقل قیام اختیار کر لیا تھا مگر پاکستانی ادیبوں اور ادب کے پاکستانی قارئین نے انہیں اپنے دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ انھوں نے اردو شاعری کو طنز سے روشناس کرایا اور اپنی بے پناہ ذہانت کو اسی کے لئے وقف کر دیا۔ آخر آخر میں وہ مزاح کی طرف بھی راغب ہوئے مگر ان کا اصل رنگ طنز یہ شاعری میں نکھرتا تھا۔ اس ذیل میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک مفصل تنقیدی جائزے کا مستحق ہے۔ جن اصحاب کو تنقید پر قدرت حاصل ہے ان سے گزارش ہے کہ وہ راجہ مہدی علی خان کی طنزیہ شاعری کو اب اپنا موضوع بنائیں کہ اب تو ان کا انتقال بھی ہو چکا ہے اور انھیں ناقدین کی توجہ کا استحقاق حاصل ہو گیا ہے۔ ان کی شاعری کو محض ایک لطیفہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس کی داد محض ایک قہقہہ ہے۔ اس شاعری میں تو مروجہ تہذیب و معاشرت کی بعض بوسیدہ اور بے معنی اور نمائشی قدروں پر بڑے زور کی چوٹیں ہیں اور ان کی روشنی میں تو ان زوال پذیر قدروں کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

شاد امر تسری

شاد کا المیہ یہ تھا کہ وہ زندگی بھر خود اپنی تلاش میں رہے اور خود اپنے آپ کو پا نہ سکے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے فن کی بعض خصوصیات کتنی اہم ہیں تو وہ یقیناً اپنی حفاظت کرتے اور اپنے آپ کو یوں ضائع نہ ہونے دیتے۔ انھیں کلاسیکی انداز کی غزل کہنے میں بھی عبور حاصل تھا اور جدید نظم بھی اسی روانی سے کہتے تھے۔ پھر انھیں موسیقی سے گہرا شغف تھا اور اس علم کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک سلجھے ہوئے نقاد بھی تھے مگر انھوں نے اپنے اس جوہر کو شاذ ہی تحریر کی صورت میں لانے کی کوشش کی۔ یوں ایک جوہر قابل جسے ابھی اپنی فن کارانہ قوتوں کا مکمل شعور بھی حاصل نہیں ہوا تھا عین عالم شباب میں ہم سے رخصت ہو گیا اور ان امکانات کو ختم کر گیا جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کی بھر پور توجہ کے لئے ترستے رہے۔

شکیب جلالی

شکیب جدید اردو غزل کی امید گاہ تھا۔ اسے اپنی قوتوں کا شعور بھی حاصل تھا اور اسی لئے وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنی موت سے چند روز پہلے بھی اس نے اپنے دوستوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ زندہ رہنے کے لئے اپنے آپ کو مسلسل آمادہ کر رہا ہے مگر ایک پر اسرار ذہنی کیفیت اسے موت کی طرف کھینچ لے چلی گئی۔ انسانی منطق نے شکست کھائی اور وہ جو عمر بھر نغمہ بار رہنا چاہتا تھا، ۱۲ ر نومبر کو ریل کی پٹڑی پر یوں کٹا پڑا تھا کہ اس کا دھڑ ہسپتال میں پہلے پہنچا اور ٹانگیں بعد میں لائی گئیں۔ جب شکیب پانچ چھ برس کا بچہ تھا تو اس کی والدہ پر سے بھی ریل گاڑی بالکل اسی زاویے سے گذر گئی تھی۔ ممکن ہے ارباب نفسیات اس کی کوئی توجیہہ کر سکیں لیکن یہ توجیہہ بھی ہمیں وہ شکیب واپس نہیں دلا سکتی جس کی غزل پڑھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ یہ صنف شعر قیامت تک زندہ رہے گی۔
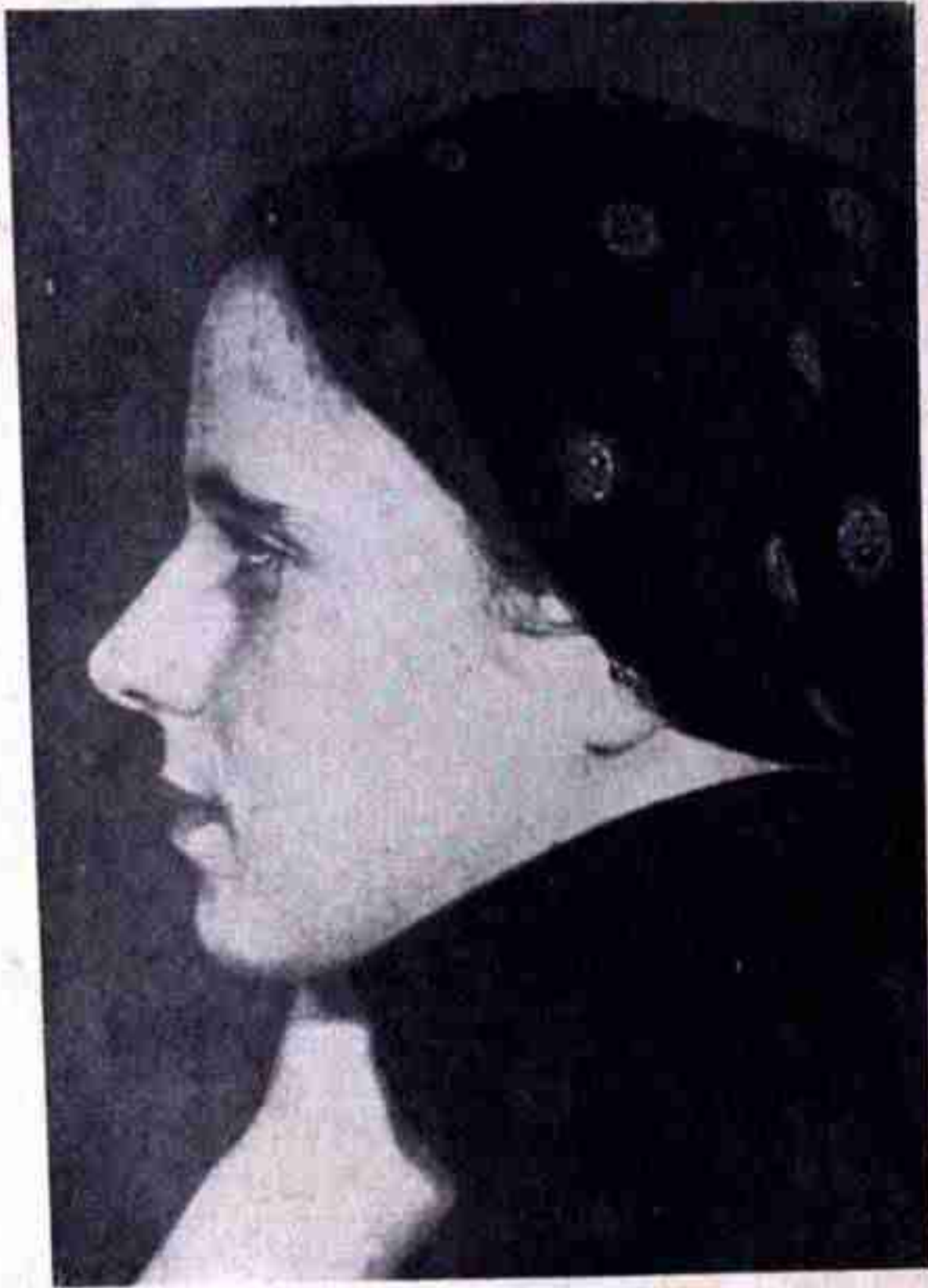
ساقی فاروقی

جین مائیکلسن

احمد ظفر

صادق حسن
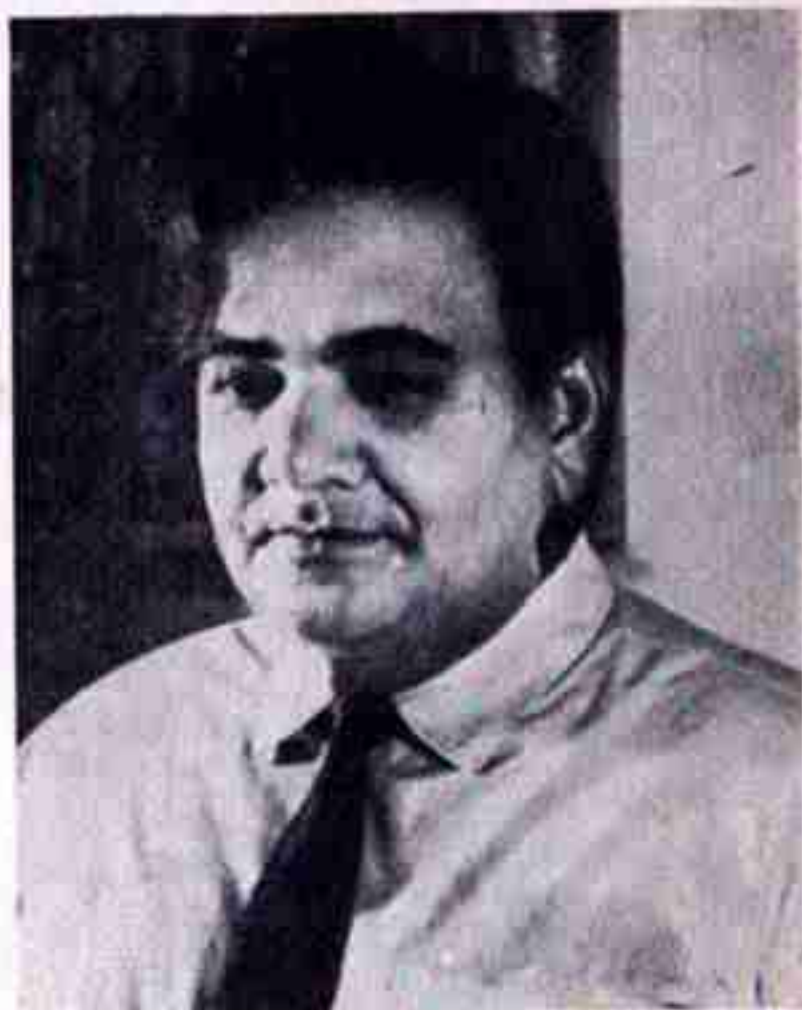
راجہ مہدی علی خاں (مرحوم)

شاد امرتسری (مرحوم)
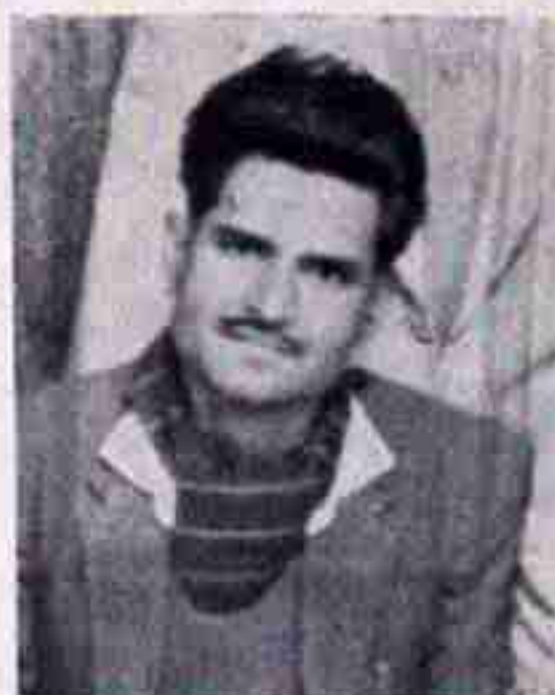
شکیب جلالی (مرحوم)

استاد عاشق علی خاں مرحوم

محمد ایوب اولیا

شفیق الرحمٰن

دجلہ

ایک ویرانے میں نامیوں نے بورڈ لگا رکھا تھا۔

بغداد کا راستہ —— سو میل تک شمالی مغربی سمت میں جا کر پھر ڈیڑھ دو سو میل مغرب کی طرف نکل جاؤ۔

اس کے آگے پچاس ساٹھ میل تک دائیں بائیں دیکھتے جاؤ۔ جہاں آبادی نظر آئے —— یہی بغداد ہو گا۔

بغداد جاتے وقت سفر بالکل اسی قسم کا تھا۔ مجھے بغداد سے زیادہ دجلے کو دیکھنے کا شوق تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے "اُس کے سمندر کی موج دجلہ و دیو نیل" والا دجلہ عام دریاؤں جیسا ہرگز نہیں ہو گا، بڑی ممتاز شخصیت کا مالک ہو گا۔ کافی انتظار کے بعد ایک بھوری سی ندی نظر آئی۔ ڈرائیور بولا۔ "آہا دجلہ آ گیا!"

موٹر ٹھہرا کر اسے قریب سے دیکھا۔ اوپر نیلا آسمان تھا، نیچے خشک کناروں کے بیچ میں گدلا سا بہہ رہا تھا۔ اور دریاؤں کے قریب پہنچو تو پہلے درختوں کے جھنڈ آتے ہیں اور کچھ نہیں تو نرسل یا سبزہ ہی دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں کناروں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ کنارے بھی پانی کی سطح سے کافی اونچے تھے۔ اگر اندھیرا ہو تو انسان چلتا چلتا سیدھا دجلے میں دھم سے گرے۔ سعدی کا مصرعہ

اگر باراں بہ کوہستاں نہ بارد بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یاد آ گیا۔

میرا اور ریونٹ کا ساتھ عراق تک تھا، پھر مجھے واپس آنا تھا۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد ریت میں آتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کیمپ کمانڈانٹ کی تقریر ہونے والی ہے۔ مجمع میں انگریز، عراقی، ہندوستانی، کرد، آرمینی، سب موجود تھے۔ اچھا خاصا بین الاقوامی ہجوم تھا۔ سرخ رنگ کا ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا۔ پچپن ساٹھ کا ہو گا۔ تیر کی طرح تنا ہوا، بے تحاشا گھنی بھویں اور بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں، جو سفید ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ مونچھیں بڑی ہیں یا بھویں۔ جسم کی ہر جنبش کے ساتھ مونچھیں ہلتیں یا بھویں —— یا دونوں۔

"میرا نام برکن ہے اور میں آج ہی آیا ہوں بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ غیر ملکیوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں اور اس نکتے پر میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ میرے لئے اجنبی ہوں تو ہوں لیکن یہ علاقہ اجنبی نہیں ہے۔ چوبیس سال ہوئے جب آپ میں سے بیشتر حضرات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں یہاں جنگ لڑنے آیا تھا اور کئی برس رہا ——"

ایک وجیہہ شخص نے ان فقروں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

"تب سے میں مشرقِ وسطیٰ میں رہا ہوں اور ان ملکوں کے چپے چپے سے واقف ہوں لہٰذا میرے لیے یہ علاقہ پُراسرار ہرگز نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بصرے میں نسیمِ سحری چلتی ہے تو کیا تاثرات پیدا ہوتے ہیں —— کرد دلق ہے۔ بغداد کی بل کھاتی ہوئی سحر انگیز گلیوں میں کیا ہوتا ہے —— شور روشن پھٹتا ہے اور دکھیاں جھنجھناتی ہیں۔ موصل کی چاندنی راتوں کے طلسم سے بھی شناسا ہوں —— گیارہ بارہ بجے تک گلیں لگتی ہیں اور اس کے بعد کتے چاند کی طرف

منہ کر کے روتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ملک کے شہروں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ جب مانچسٹر میں صبح ہوتی ہے تو دھوئیں اور کہرے کے مارے جوتے پہننے سے پہلے بجھانے کی بجائے کا انسان شروع کر دیتے ہیں۔ اور لندن میں صبح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انگلستان میں سال بھر کے انتظار کے بعد ایک بدھ کو بہار آتی ہے اور پورے دو ہفتوں کے بعد بدھ ہی کے روز موسم بہار ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا آپ مجھے دوسرے اجنبیوں جیسا نہ سمجھیں —— میں یہاں کچھ عرصے کے لئے ہوں، پھر یہاں گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں کو چھوڑ کسی دوسرے ملک کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں میں زندگی گذارنے چلا جاؤں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کر سکتے ہیں ——"

عربی میں ترجمہ ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی —— "واللہ یا ابو شوارب!"

"یہ کون تھا؟" برٹن نے پوچھا۔

مشکی رنگ کا ایک بدو کھڑا ہو گیا

"شکریہ یا ابو ملاحت!" برٹن نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔

واللہ واللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہجوم ہنسنے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جہاں بدو نے برٹن کو مونچھوں کے ابا کہا تھا وہاں اس نے بدو کو نمکینی کے ابا کہہ کر واضح کر دیا کہ وہ یہاں کے رواج سے واقف ہے (کہ انسان کی سب سے نمایاں خصوصیت کے ساتھ ابو لگا کر نام رکھ دیتے ہیں)۔

اس دن سے برٹن کا نام ابو شوارب پڑ گیا۔

جو شخص ترجمہ کر رہا تھا، وہ مقامی باشندوں سے بالکل مختلف تھا، ماتھے پر تیوری چڑھائے یوں بیٹھا تھا جیسے ماحول سے بیگانہ ہو۔ بار بار ٹھوکر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا اور عقاب کی سی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھتا یوں لگتا تھا جیسے یہ لاپرواہ مغرور شخص ابھی کسی سے لڑ پڑے گا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کردستان کا ہے نام بہت طویل تھا —— اس میں تین چار ابن کچھ ابو اور چند ال آتے تھے تب جا کر مکمل ہوتا تھا لیکن سب اسے منصور کہتے تھے

شام کو دریا کے کنارے کرسیاں بچھائی گئیں۔ آفتاب غروب ہوا تو برٹن اور ہم تینوں پہنچ گئیں۔ پہلے نو وار دوں کا تعارف کرایا گیا۔ پھر برٹن نے سب کی خیریت پوچھی، اور بولا —— "حضرات، میں (MESS) میں ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے سوائے تین کے: مذہب اور سیاست کے عورتوں کا ذکر جہاں روایتاً ممنوع ہے وہاں کیمپ میں تو بالکل بیکار ہے۔ یہاں کوئی خاتون ہے ہی نہیں، چنانچہ ویرانے میں بیٹھ کر عورتوں کے متعلق باتیں کرنا بالکل ایسا ہے جیسے ہوا میں تلوار چلانا۔ مذہب کا یہ ہے کہ سارے مذاہب اگرچہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کے پیرو ہمیشہ ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرتے رہتے ہیں اور مبلغ پبلک کو اپنے مذہب کے ذریعہ بہشت میں پہنچانا چاہتا ہے۔ رہ گئی سیاست تو سپاہی کو اس کی پیچیدگیوں کی سمجھ ہی نہیں اور پھر سیاست میں یہ خرابی ہے کہ لوگ لیڈر کی پیروی کرتے کرتے دفعتاً اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں لیڈر آگے ہوتا ہے اور پبلک پیچھے ——"

گلاس سامنے رکھے گئے۔ میرے انکار پر وجہ دریافت کی گئی۔ میں نے بتایا کہ مجھے کھیل کود کا بہت شوق ہے اور اس چیز سے توانائی کم ہو جاتی ہے۔

"بالکل نو عمروں والی بات کی ہے۔ اس عمر میں طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں ——" برٹن ہنسنے لگا" اعتدال ہو تو توانائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بڑے اچھے اچھے سپورٹسمین پیتے ہیں۔ بہر حال میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔"

کھیلوں کا ذکر شروع ہو گیا۔

برٹن کہنے لگا "مجھے کرکٹ بالکل پسند نہیں، ایک مرتبہ بلا غلط گھماؤ تو آؤٹ۔ ہاکی فٹ بال وغیرہ میں غلطیاں کرنے کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ کھیلنے تو دیتے ہیں اور یہاں ہی غلطی پر میدان سے باہر نکلنے کا حکم نہیں مل جاتا۔"

پھر پولو پر پہنچا ـــــ میں رسالے میں تھا۔ اب تک گھوڑے یاد آتے ہیں۔ گھوڑوں کی خوشبو یا بدبو، ٹینکوں کے پٹرول کی بو سے کہیں بہتر تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے کے لئے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ گھوڑے ڈانٹنے چمکارنے سے مان جاتے تھے، مشینوں کو جتنا مروڑو اتنی ہی بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ ویسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہارس پاور تب تک صحیح تھی جب تک وہ گھوڑوں میں رہی ـــــ" پولو کے بعد نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ، لومڑی کا شکار، شہسواری کے کرتب سے ہوتے ہوئے معاملہ مچھلیوں کے شکار پر ٹنگ گیا۔

جب لوگ جمائیاں لے رہے تھے تو وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ سامن اور ٹراؤٹ کی عادات و خصلات میں کیا فرق ہے اور کیوں فرق ہے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان سے کب چھٹکارا ملے گا۔ اگر پرسوں نجات مل جائے تو اگلے سنیچر کی رات کو اس وقت سینٹر میں ہوں گا، چاندنی ہوگی اور سمندر کی لہریں۔

اگلے روز برٹن نے مجھے بلا کر کہا ـــــ "تمہاری کل شام کی گفتگو مجھے پسند آئی۔ میں نے بغداد ٹیلیفون کر دیا ہے کہ تمہیں کچھ عرصے کے لئے یہاں رہنے دیا جائے۔"

اس کے بعد بتایا کہ رات کو اس کے خیمے میں چوری ہو گئی اور کوئی سارے سگار، وسکی کی بوتلیں اور کافی کے ٹین لے گیا۔

"باقی چیزیں تو بچ گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے علاوہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں ـــــ"

گورے سارجنٹ نے آ کر سلوٹ کیا اور اپنے مخصوص انداز میں رپورٹ دی ـــــ "سر آج صبح جب میں چارج لے رہا تھا مجھے سرکوپورل ڈیوس نے بتایا کہ چوری ہو گئی۔ میں نے ملٹری سرپولیس کے سارجنٹ میجر اور کوارٹر ماسٹر کو رپورٹ کی۔ ہم سب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سر چور کوئی باشندہ ہے ـــــ"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" برٹن نے اُسے بھیج دیا۔

رات کو کیمپ میں بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا پھر بھی چور نالی میں سرکتا سرکتا آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ صبح کو نالی خطوط سے بھری ہوئی تھی جنہیں چور بیکار سمجھ کر پھینک گیا تھا۔

"کوئی پڑھا لکھا چور ہوگا۔ وہ خط میرے بھتیجوں کے تھے لیکن فقط میری ہی چیزیں کیوں چرائی گئیں۔ آس پاس بھی تو خیمے تھے ـــــ"

"شاید آپ کی کل والی تقریر کو چیلنج سمجھا گیا ہو ـــــ"

"تمہارا قیاس صحیح ہے۔ پچھلی جنگ میں جب میں یہاں آیا تھا، تب بھی میں نے کیمپ کے مقامی باشندوں کے سامنے کچھ ایسی ہی تقریر کی تھی ـــــ"

"تب کیا ہوا تھا ـــــ؟"

"تب بھی چوری ہوئی تھی ـــــ اسی رات کو ـــــ"

اگلے روز کسی نے شکایت کی کہ ڈاکخانے سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ پوسٹ ماسٹر سے پوچھا تو اس نے سرپیٹ کر بتایا کہ ٹکٹوں اور نقدی والا مقفل صندوق وزنی زنجیر سمیت غائب ہے ـــــ

پھر اتنی چوریاں ہوئیں کہ ہم نے افسوس کرنا چھوڑ دیا۔

خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا کہ درجہ حرارت سائے میں ایک سو تیس تک پہنچ جاتا ہے لیکن سایہ ندارد تھا۔ علی الصبح اٹھ کر نو دس بجے تک کام کرتے یا پھر سہ پہر کے بعد، باقی وقت خیموں میں چھپے رہتے۔

برٹن بڑا محنتی اور سخت جان تھا۔ جس تن دہی سے خود کام کرتا اسی کی توقع دوسروں سے رکھتا۔ کام کے اوقات میں وہ ہم پر کڑی نظر رکھتا۔ نہ کسی کو

پہچانتا نہ کوئی فالتو بات کرتا۔ لیکن جہاں شام ہوتی ایسا بدل جاتا کہ حیرت ہوتی کہ کیا یہ وہی تلخ دجا برٹن ہے۔ بالکل دوستوں کی طرح ملتا، مشورے دیتا، قہقہے لگاتا لیکن دن بھر آدمی آئے تو چلے۔ جب دیکھو پسینے میں شرابور سینہ نکالے، کہنیاں پھیلائے چکر لگا رہا ہے۔ اسے قیلولے سے سخت چڑ تھی۔ کسی پر شبہ ہو جاتا کہ یہ دن میں سوتا ہے تو اسے تنگ کرتا، ذرا ذرا سی دیر کے بعد اردلی آتا — "برٹن صاحب نے سلام بھیجا ہے۔"

وہ غریب وردی پہن کر پہنچتا۔

"اوہ تمہیں نہیں روز کو بلایا تھا" برٹن کہتا۔ اور اگر روز ہوتا تو: "اوہ تمہیں نہیں رچرڈ کو بلایا تھا، اردلی سے غلطی ہوئی۔"

ٹیلیفون پر گفتگو کرنے سے پہلے چیرز CHEERS ضرور کہتا خواہ کیسا ہی موقع ہو۔ دفتر سے اکثر آواز آتی — "دا رابرٹ! تم سا سست اور نکما انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا اسی وقت واپس کیمپ پہنچو میں تمہاری خبر لوں گا — چیرز!"

یا، "سمتھ! ابھی ابھی موصل سے اطلاع آئی ہے کہ تمہارا سارا سامان چوری ہو گیا اور لندن سے خبر آئی ہے کہ تمہارے مکان پر بم پڑا ہے — چیرز!"

اور، "جو حکم ملا ہے اسے فوراً بجا لاؤ، بکواس مت، خاموش رہو — چیرز!"

"میں وطن سے پہلی مرتبہ نکلا تھا، ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا، ہر بات کو توجہ سے سنتا۔" برٹن کہا کرتا — "لڑکو! جہاں گردی اور قسمت آزمائی کے یہی دن ہیں۔ جگہ جگہ جاؤ دنیا دیکھو، لوگوں سے ملو، تجربہ حاصل کرو، تجربہ کا کوئی بدل نہیں ہے۔ غلطیاں کرو اور ان سے سبق سیکھو — یہ کتابیں نصیحتیں اور لیکچر سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کم ہوتی جائے گی اور ایک مرتبہ نظریے پختہ ہو گئے تو پھر سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔"

کبھی سمجھاتا کہ جس طرح مقابلوں کے لیے کھلاڑی ٹریننگ لیتے ہیں، مشقت کرتے ہیں، اسی طرح آفتوں، حادثوں اور غیر متوقع واقعات کے لئے ذہن کی ٹریننگ ہونی چاہیے۔ ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے ذہنی طور ان سے مقابلے کے لئے تیار رہو۔ مصیبتوں کا مزہ چکھے بغیر لڑکا مرد نہیں بنتا۔"

اس کے دفتر میں حکیم سقراط کا مشہور مقولہ آویزاں تھا —

"زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود، مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں۔ تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل۔"

"اس میں ضرور صداقت ہو گی ورنہ اتنی صدیوں تک یہ مقولہ زندہ نہ رہتا۔" وہ کہا کرتا۔

اس کی میز پر مغربی شعرا کا مجموعہ کلام پڑا رہتا۔ کسی نے پوچھا تو بولا "لٹریچر کو میز پر رکھنا اور نہ پڑھنا فیشن میں شامل ہے، تبھی یہ کتاب یہاں رکھی ہے۔ پتہ نہیں لوگ شعر کس طرح کہہ لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیئے ان دیکھی ان جانی عجیب عجیب باتیں سوچنی پڑتی ہوں گی بار بار فرضی باتیں سوچو تو ان پر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ موجودہ شاعری میں رونے پیٹنے اور زندگی کی بے ثباتی کا بار بار ذکر ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان فانی ہے۔ زندگی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور دنیا بڑی بری جگہ ہے — لیکن میں ان باتوں کے بارے میں بار بار ریمائنڈر پڑھنے نہیں چاہتا —"

چنانچہ دجلے کے کنارے شام کی محفلیں جمتیں تو میں ان میں بطور طالب علم شریک ہوتا۔

روز اور رنبالڈ میرے ساتھ آئے تھے کیمپ میں برٹن سے واقفیت ہوئی۔ پھر منصور اور جمیل سے۔ آخر وہ گھڑی آئی جس کا دیر سے انتظار تھا۔ ہم بغداد جا رہے تھے۔ آٹھویں صدی میں جب لندن اور پیرس چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے تب خلافت کا یہ مرکز دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس زمانے کا بغداد، پھر الف لیلہ کا بغداد پھر ہلاکو کا بغداد — پتہ نہیں اب کیسا ہو گا۔

کھجوروں کے جھنڈ آئے، نہمد پوش حضرات گدھوں پر سوار تھے، عورتیں مٹی کے برتن لیئے دجلے کی طرف آ رہی تھیں۔ دجلے کا پانی اور بھی گدلا ہو گیا — اب بغداد قریب تھا۔

لیکن جب بغداد آیا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ عمارتیں، سبزہ و درخت ——— ہر چیز پر ریت کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بغداد کا دجلہ ایسا تھا جیسے بچارا بہہ رہی ہو۔ شارع رشید دیکھ کر، رسالۂ عالم شاعر ابونواس کی سڑک پر پھرے، سندباد ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ کئی بغدادیوں کے چہرے یا بازوؤں پر بغدادی ناسور دیکھے ——— اور پھر دجلے کے کنارے آکھڑے ہوئے۔

"یہ دریا تو کچھ نہیں ہے ——" روز نے بیزاری سے کہا۔

"دن میں اس دریا کو پہچاننے کی کوشش کرو گے تو مایوسی ہوگی۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتا، یہ اس معزور گر غمگین بوڑھے کی طرح ہے جس نے کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں اور جو اب ماحول اور حالات سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہو۔ تھوڑا انتظار کرو، رات ہونے، پھر دیکھنا ———" جرجیس نے دجلے کی طرفداری کی۔

"رات کو کیا ہوتا ہے ——؟"

"رات کو بوڑھا خوشبو لگا کر رنگین عبا پہنتا ہے۔ جو روشنیوں میں جگمگ جگمگ کرتی ہے ——"

دجلے میں طرح طرح کی کشتیاں تیر رہی تھیں ——— گول ملبوتری، ڈونگہ دار، مستطیل نما، چند دخانی کشتیاں اور سٹیمر بھی نظر آئے۔

آخر اس سست رو بھورے سے دریا میں ایسی کیا خوبی ہے؟ سوائے اس کے کہ یہ تپتے ہوئے صحرا میں بہتا ہے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آگئی ——— صحرا کا دائمی پیاسا اور کھارے پانی کا عادی بدو بغداد آیا۔ دوکان پر روٹیوں کی قیمت چکا کر پہلی روٹی کے ٹکڑے کو دجلے کے پانی میں ڈبو کر چکھا۔ ایک روٹی کھائی، پھر دوسری، پھر تیسری ——— جب آٹھویں پر پہنچا تو دوکاندار نے جھنجھلا کر پوچھا ——"آخر کب تک کھاتے رہو گے؟"

"جب تک دجلہ بہتا رہے گا ——" بدو نے جواب دیا

سائے لمبے ہو گئے، سورج چھپ گیا اور بغداد چمکنے لگا۔ دجلے کے کنارے روشن ہو گئے، پانی پر نور کی بارش پڑی تو جیسے آگ سی لگ گئی۔ موسیقی کی دلکش تانیں فضا میں مرتعش ہوئیں۔

قہقہے تھے، گہما گہمی تھی اور متعدد حسین چہرے ——— راگ رنگ کا طوفان آگیا۔ دجلے کی سطح پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

جرجیس کی حالت مجذوب تھی۔ ابھی ساتھ ہے ابھی غائب ہو گیا، پھر آملا، ادھر جھانک رہا ہے، ادھر تاڑ رہا ہے۔

"وہ دیکھو ——" اس نے اشارہ کیا۔ ہم نے دریچے سے دیکھا، اندر رقص ہو رہا تھا۔ ایک طرف منصور بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک شعلۂ جوالہ، جو مچل رہی تھی شرما رہی تھی، مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔

"منصور کتنا خوش نصیب ہے ——" روز نے نہایت لمبی آہ بھری۔

"منصور یہاں رہ چکا ہے اور لوگوں کو جانتا ہے۔ اگلی مرتبہ میں بھی کسی کے ساتھ ہوں گا اور تم لوگ دور سے دیکھ دیکھ کر رشک کرو گے ——" جرجیس نے بھی اچھی خاصی طویل آہ بھری۔

ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے کیبرے دیکھ رہے تھے۔

"ہائے یہ موسیقی کیسی اداس کن ہے!" نباگر نے بھی آہ بھری جسے دیکھو آہ بھر رہا تھا۔

"وسکی میں پانی ملا ہوا ہے، دو چار جام پر کچھ نہیں ہوا ——" روز بھی غمگین ہو گیا۔

"برٹی یاد آرہا ہے۔ بڈھے کو ناحق کیمپ میں چھوڑ آئے ——" جرجیس بڑبڑایا۔

میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے کندھا پکڑ کر ہلایا ——"لعنتی (۲۷۸۸۸۷۷)، تم چپ کیوں ہو کچھ تم کہو ——"

"ناحق رنگ میں بھنگ مت ڈالو، یہاں سب مسکرا رہے ہیں اور تم منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔ نہ موسیقی میں خرابی ہے اور نہ روشنی میں، اور برٹن کو یہاں ہونا نہ ہونا بے معنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ کیا ہے ـــــ؟"

"جانتے نہیں یہ احساسِ تنہائی ہے ـــــ"

"لیکن ہم تنہا تو نہیں ہیں، اکٹھے ہیں ـــــ" روز نے نیم مردہ آواز میں کہا اور ہم پھر چپ ہو گئے۔ صبح کو دیکھا تو وہی مٹیالا سا دجلہ تھا اور وہی گرد میں اٹا ہوا بغداد۔ وہ حسن و جمال کہاں گیا؟ وہ لطافتیں خوشبوئیں کیا ہوئیں؟ موسیقی کی دریا تانیں کہاں کھو گئیں؟ رات کی ہر شئے سحر زدہ تھی۔ شاید الف لیلہ کے دقتوں کا طلسم اب تک باقی ہے۔ واپسی پر روز کہنے لگا کہ "شہر تو میں نے بھی کئی دیکھے ہیں لیکن دن رات کے سماں میں ایسا نمایاں تضاد کہیں محسوس نہیں کیا۔"

میں ورزش کرتا تو وہ پوچھتے کہ اتنے کام کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بتاتا کہ زیادہ کام سے تھکاوٹ ہوتی ہے لیکن ورزش سے چستی آتی ہے۔ جم جیس کی طبیعت اچھی نہ ہوتی اور مجھ سے دوائی مانگتا تو میں ورزش تجویز کرتا ـــــ بیزاری کا علاج ایک میل کی دوڑ، جس کے بعد بھوک لگے گی، نیند آئے گی اور بیزاری یاد تک نہ رہے گی۔ موڈ خراب ہو تو ایک سو بیٹھکیں اور ایک میل کی دوڑ۔ جی نہ لگتا ہو تو سو ڈنٹر اور سو بیٹھکیں۔ عشق ہو جائے تو لگاتار دوڑ، ڈنٹر اور بیٹھکیں، جب تک کہ افاقہ نہیں ہوتا۔

"بس بس بد مذاقی کی انتہا ہو گئی، مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے ـــــ" وہ ناراض ہو کر کہتا۔

جب کبھی باہر جانے کی ڈیوٹی آتی تو جم جیس خاص طور پر میری سفارش کرتا کہ اسے بھیج دو یہ بھاگ دوڑ میں خوش رہتا ہے

برٹن اُسے سمجھاتا ـــــ "جم جیس خد و خال اور قد تو قدرت تراشتی ہے لیکن جسم انسان خود تراشتا ہے۔ بھدّے جسم کے لیے کوئی قدرت کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا لیکن کو دیکھو دن بھر کا تھکا ہارا شام کو شربت اتار پی کر ایسا سوتا ہے کہ صبح کو بگل کی آواز بھی نہیں سنتا ـــــ"

ایک دن ملی اصبح دوڑ لگائی تو منصور کے ماتحت نے پکڑ لیا۔ مجھے پہچانا تو معافی مانگی اور تنبیہ کی ـــ "واللہ! یا ابو ریاضت یہ کیا حرکت ہے؟ اتنے سویرے اور مغرب کے وقت اندھیرے میں اس قسم کی ورزش یہاں مت کیا کریں ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہوگا کہ کوئی بدو کیمپ میں چوری کر کے بھاگا جا رہا ہے ـــــ"

چوریوں کا ذکر اکثر ہوا کرتا۔ طرح طرح کے قصے بیان کیے جاتے۔ لوگ آپ بیتیاں سناتے ـــــ "انھیں سفید چادروں کا بہت شوق ہے۔ کوئی سو رہا ہو تو چور چپکے سے آتا ہے۔ بستر کا جو حصہ خالی ہو اس سے چادر تہہ کی جاتی ہے۔ پھر پر یا کسی ملائم چیز سے سونے والے کے گدگدی کی جاتی ہے۔ جونہی وہ کروٹ بدلتا ہے بقیہ چادر اس کے نیچے سے نکال لی جاتی ہے۔ صبح اٹھ کر وہ ملازم کو ڈانٹتا ہے کہ رات چادر کیوں نہیں بچھائی۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ لیٹے ہوئے انسان کے نیچے سے چادر نکل گئی۔

"پچھلی جنگ میں جب میں یہاں تھا تو عجب تماشا ہوا۔ ہر شام کو کیمپ سے ایک خچر غائب ہو جاتی۔ پہرہ سخت کر دیا گیا۔ سنتریوں کی تعداد بڑھائی گئی لیکن پھر بھی چوتھے پانچویں روز خوش خبری ملتی کہ ایک خچر کم ہے۔ آخر مخبروں سے رجوع کیا اور انھوں نے چور پکڑوا دیا۔ معلوم ہوا کہ جب شام کو جانور پانی پی کر کیمپ میں آتے تو چور کتے کی کھال اوڑھ کر ان کے ساتھ ساتھ آ جاتا۔ اندھیرا ہونے پر ذرا دیر کے بعد خچروں کو چھیڑتا۔ وہ ہنہناتیں۔ دولتیاں جھاڑتیں۔ فوراً سنتری آتا اور خچروں کو بندھے دیکھ کر واپس چلا جاتا ـــــ کچھ دیر کے بعد پھر شور مچتا، سنتری پھر بھاگ کر پہنچتا اور خچروں کو صحیح سلامت پا کر لوٹ جاتا۔ یہ عمل اتنی مرتبہ دوہرایا جاتا کہ سنتری خچروں کے بلا وجہ شور و غل سے بالکل بیزار ہو جاتے حتیٰ کہ جب چور سچ مچ ایک خچر کو لے کر بھاگتا تو سنتری نہ کسی کے ہنہنانے کی پروا کرتے اور نہ شور و غل کی ـــــ"

"ایک مقامی باشندے کو آملیٹ بہت پسند تھا۔ اس نے مجھ سے پکانے کی ترکیب پوچھی تو میں نے بتایا کہ پہلے چار انڈے جماؤ پھر تھوڑا سا مکھن اور نمک مصالحہ چڑاؤ اور پھر چڑھائے ہوئے چولہے پر۔۔۔"

اور سب ہنسنے لگے۔

برگن پرانا سپاہی تھا۔ اس کے آٹھ تمغوں میں دو ایسے تھے جو فقط میدان جنگ میں بہادری پر دیئے جاتے ہیں کسی نے پوچھا کہ "آپ نے کیا کیا تھا؟"
"یہ تمغے ان معرکوں کی یادگار ہیں جن میں میرے رفیقوں کو جو مجھ سے کہیں دلیر اور فرض شناس تھے، کچھ نہ ملا۔ وہ مجھ سے زیادہ حقدار تھے۔"
پھر کسی نے اس کے تمغوں کا ذکر نہیں کیا۔

ہمارے دو ساتھی تبادلے پر چلے گئے لیکن ان کی جگہ کوئی نہ آیا۔ اس سے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے۔ بولا "آدمی زیادہ ہونے سے کارکردگی کبھی نہیں بڑھتی۔ وہ سوال یاد ہوگا جو کسی بچے سے پوچھا گیا تھا کہ اگر دو آدمی ایک کام کو دو دن میں کر سکتے ہیں تو چار آدمی کتنے دن میں کریں گے؟ بچے نے جواب دیا تھا چار دن میں؛ میرے خیال میں یہ جواب بالکل صحیح ہے جتنے زیادہ آدمی ہوں گے اتنا ہی زیادہ وقت ضائع کریں گے۔۔۔"

کیمپ کی بے کیف زندگی سے تنگ آجاتے تو وہ مشورہ دیتا۔۔۔ "اسی میں خوشیاں تلاش کرو۔ مسرت بھرے لمحے کسی پروگرام کے تحت نہیں ملتے۔ یہ ادھر اُدھر سے چرانے پڑتے ہیں۔ خوش خبریاں باہر سے نہیں منگوائی جاتیں یہ تو ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ بے کیفی اور جمود کے تالاب سے خود کھینچ کر نکالنی پڑتی ہیں جس طرح لڑائی میں اپنی پسند کا میدان جنگ، موزوں موسم، مطلوبہ نفری اور جنگی سامان ملنے مشکل ہیں اسی طرح موزوں وقت، صحیح موقعہ اور سازگار حالات کبھی نہیں آتے۔۔۔ یہ بالکل غلط ترکیبیں ہیں۔ کچھ کرنا چاہتے ہو تو مردوں کی طرح خواہ مخواہ مستعدی سے جٹ جاؤ۔۔۔ یہی ایک طریقہ ہے جو تمہارے کام آئے گا۔" ایک دن ہم نے پوچھا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟

"شادی کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ جوانی جہاں گردی اور فیلڈ سروس کی نذر ہو گئی، ادھیڑ عمر کا ہوا تو پھر خیال چھوڑ دیا۔ دراصل محبت فقط نو عمروں کے لئے ہے۔ اس عمر میں ہر چیز خواہ مخواہ رنگین معلوم ہوتی ہے۔ ہر جذبے میں بے ساختگی ہوتی ہے اور بلا کا خلوص۔ محبوب ایک دفعہ مسکرا دے تو کئی ہفتے خوشی خوشی گذر جاتے ہیں۔ پورا یقین ہوتا ہے کہ امتحان میں ضرور کامیابی ہوگی، مالی حالت بھی بہتر ہو جائے گی، دوست دشمن سب قدر کرنے لگیں گے اور محبوب کی بے رخی سے سب تہس نہس ہو جائے گا۔ آئرلینڈ کی وہ جھلمل جھلمل کرتی ندیاں، وہ لہلہاتے کھیت، شاداب کنج، گھنے جنگل، مجھے اب تک یاد ہیں، اگرچہ ان لڑکیوں کے نام اور چہرے یاد نہیں جو ان دنوں میرے ساتھ ہوا کرتیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب بادل آئے تھے اور کب بوندیں تھم گئیں۔۔۔ طلوع آفتاب کے بعد اتنی جلدی چاند کیسے نکل آیا۔ ذرا دیر پہلے گھپ اندھیرا تھا، دفعتاً یہ روشنی کہاں سے آ گئی۔۔۔ وہ جگمگاتی صبحیں۔۔۔ وہ رنگین شامیں۔۔۔ وہ مستی کے شب و روز۔۔۔ محبت کی اصلی عمر وہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بس دکھاوا ہے۔ اگرچہ میں شادی کے قضیے سے بالکل مبرا ہوں اور تم لڑکوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ اپنی کمر پر زین نہ کسوانا لیکن اگر خدانخواستہ کبھی پھنسنے لگو تو جذبات کے دھارے میں ہرگز نہ بہنا۔ ایسا چہرہ چننا جس کی کشش اور دلربائی دیرپا ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ گذرتے ہوئے ایام چہروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور محض دس پندرہ سال کا وقفہ چہروں میں کیسی کیسی تبدیلیاں لا سکتا ہے۔۔۔"

ہم نے روز کی اشارہ کیا کہ یہی موقع ہے پوچھ لو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بغداد کا ذکر کیا۔ بوڑھا ترنگ میں تھا کہنے لگا۔۔۔ "میں ڈیوٹی کے سلسلے میں سختی برتتا ہوں لیکن تفریح کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا کیونکہ یہ اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ڈیوٹی۔ سنیچر کی شام کو جو لڑکا بغداد جانا چاہے بخوشی جا سکتا ہے۔ لیکن محتاط رہنا ان شہروں میں آئے دن فساد ہوتے رہتے ہیں۔ میں جنگ سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا دنگے فساد سے۔ لڑائی میں دشمن کی تمیز کی جا سکتی ہے لیکن جب کوئی ہجوم مشتعل ہو جائے تو دوست

دشمن کا پتہ نہیں چلتا اور ایسی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں ـــ جنوبی افریقہ میں فساد، دو تماشائی جو جاپانی تھے ہلاک ہو گئے ـــ بخوریا میں فساد تین فرانسیسی راہگیروں کی حالت نازک ہے ـــ یہ حقیقت ہے کہ میکسیکو میں دو سیاست دان ڈویل لڑے۔ دونوں کو خراش تک نہ آئی، مگر آٹھ تماشائیوں کا مکمل طور پر انتقال ہو گیا ـــ بطور تماشائی مرنا بے حد ہولناک موت ہے ـــ"

ہم بغداد جانے لگے۔ سنیچر کی شام کر بغداد پہنچ کر خوش ہوتے اور اتوار کی شام کو واپس کیمپ آ کر بھی اتنی ہی خوشی ہوتی کیونکہ شہر میں دوکاندار اور چور ہماری جیبیں خالی کر دیتے۔

برٹن اپنے رشتہ داروں کے ذکر سے ہمیشہ احتراز کرتا۔ اُدھر جرجیس کا محبوب موضوع ہی یہی تھا۔ اپنے اور دوسروں کے تایا، چچوں، بھائی بھتیجوں کے متعلق پوچھنا اور بتانا۔ اسے سمجھایا بھی کہ انگریز ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے پھر بھی برٹن سے پوچھ بیٹھا ـــ "آپ کے کتنے بھائی ہیں ـــ؟"

"ایک ہے لیزلی ـــ بڑا شیطان ہے ـــ ہم دونوں گہرے دوست بھی ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں وہ لندن میں تھا۔ بعد میں آوارہ گرد ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا رہتا ہے۔"

"تو گویا آپ اور وہ دس سال سے نہیں ملے ـــ؟" جرجیس نے ایک اور غلطی کی۔

"دراصل ہم ۱۹۳۸ء میں ملے تھے۔ پھر گیارہ برس کے بعد میں چھٹی پر گیا۔ لندن میں کسی نے بتایا کہ لیزلی بھی وہیں ہے۔ کھوج نکال کر اس کے فلیٹ پر پہنچا آواز دی ـــ 'لیزلی! لیزلی!' 'کون ہے؟' وہ اندر سے چلایا ـــ 'میں ہوں ایرک!' ـــ 'ہلو ایرک مشرق وسطیٰ کا کیا حال ہے ـــ' 'اچھا ہے کوئی تازہ خبر سناؤ' 'یوس ٹیس کا انتقال ہو گیا ایرک' ـــ 'کیسے ہوا لیزلی؟' 'بس ایک دن چلا جا رہا تھا دھڑام سے گر کر مر گیا ـــ تمہیں تعجب ہوا ایرک؟' 'بالکل تعجب نہیں ہوا لیزلی! اس کی صحت گرتی جا رہی تھی جب وہ سکندریہ میں ملا تو میں نے صاف بتایا تھا کہ اولڈ بک تم ڈھیلے ہوتے جا رہے ہو۔ تمہارا وقت قریب ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے دوست نے یہ چار سال کیسے نکال دیئے اور لیزلی! تم باہر نکلو نا' ـــ 'ایرک مجھے کچھ دیر لگے گی میں باتھ روم میں حجامت کر رہا ہوں۔ انتظار کرو گے' 'میں انتظار نہیں کر سکتا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر مجھے پکاڈلی سرکس پہنچنا ہے ـــ' 'تو پھر ایرک تم فوراً بس پکڑ لو ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔ پھر کبھی ملیں گے ـــ گڈ بائی' ـــ 'چیرز لیزلی!' ـــ اگلے روز اسے فون کیا وہ کہیں باہر جا رہا تھا۔ پھر اس نے فون کیا، میں ہوٹل میں نہیں تھا ـــ پھر میں نے فون کیا تو بولا 'گھوڑدوڑ پر جا رہا ہوں۔ چلو گے؟' چند ماہ پہلے میں گھوڑوں کے سلسلے میں چھ سات سو پاؤنڈ ہار چکا تھا۔ لہٰذا گھوڑدوڑ سے کترا تا تھا اس لئے نہیں گیا۔ میں نے اسے پورٹ یا گھر کی سیر کے لئے مدعو کیا لیکن اسے جانور اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ وہ نہ آیا۔ اگلے ہفتے وہ سمندر کے کنارے چلا گیا۔ میں بھی مصروف رہا۔ اتنے میں چھٹی ختم ہو گئی اور میں واپس آ گیا۔ لیزلی سے ملاقات ہو جاتی تو اسے آئرلینڈ چلنے کے لئے مجبور کرتا۔ گھر ہو آتے اور یہ بھی دیکھ آتے کہ اولڈ بوائے کا موڈ کیسا ہے ـــ اولڈ بوائے بھی اب نوے برس کا ہو گا، اس سے جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں ملاقات ہوئی تھی ـــ"

"اور پوچھو انگریزوں سے ایسے سوالات ـــ" منصور نے جرجیس کو ڈانٹا۔

موہن نمبا کرم ہتا تھا۔ سانولا رنگ، پستہ قد، گٹھا ہوا جسم۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔ دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔ اس کا خیمہ قریب تھا۔ علی الصبح اس کا گانا سنائی دیتا۔ "بھولے بھولے، تم جاگو موہن پیارے" لگتا جیسے اپنے آپ کو جگا رہا ہو۔ پھر اُٹھ کر دجلے کے کنارے سے طلوعِ آفتاب دیکھتا۔ صبح کے وقت اکثر اس کے خیمے سے جوگیا، بھیرویں اور اساوری کی تانیں سنائی دیتیں، کبھی اداس لے میں گہرلے "اس دن کی تدبیر جب تیرا آوے گا پروانہ" گاتا تو کبھی لہک لہک کر ـــ

جام گدائی ہاتھ ہیں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

اور آخر میں ـــ جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

میں ورزش ختم کرتا تو دریا کے کنارے ملاقات ہوتی ـــ "خاں صاحب کیسی سہانی صبح ہے۔ دریا میں سونا بہہ رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مغربی کنارے پر ہیں ورنہ طلوع آفتاب کا یہ نظارہ نہ دیکھ سکتے۔" اُدھر برش روز وغیرہ سب غروب آفتاب پر فدا تھے۔

"سورج کا ڈوبنا اداس سا نظارہ ہے لیکن طلوع تخلیق کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اگر انسان صبح صبح مسرور ہو تو سارا دن اچھی طرح گذرتا ہے۔ میں نے آج تک کبھی شام کا انتظار نہیں کیا ـــ"

محنت مشقت کے علاوہ اسے فقط دو چیزوں کا شوق تھا موسیقی اور کبھی کبھی ذرا سی وسکی۔

"جوگیا تری عبادت ہے خاں صاحب۔ انسان پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی تہہ ناپ سکتا ہے مگر درباری کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا ـــ جس شام کو وسکی نہ ملے ایمن سے نشہ پورا ہو جاتا ہے ـــ دوسری ملہاروں اور میاں کی ملہاروں میں آپ نے فرق محسوس کیا؟ استاد نے ذرا سی ترمیم و اضافے سے سماں باندھ دیا۔ اسے سنتے وقت بارش کی پھواروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بھیگے خنک جھونکوں کا لمس محسوس ہوتا ہے ـــ اور انسان کتنا ہی اداس ہو مگر ساوری کی چند تانیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں ـــ"

"میں نے زندگی کے پہلے اٹھائیس سالوں میں نہ کبھی غم لگایا نہ شراب کو چھوا۔ پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ شمشان میں انھیں جلانے کے فرائض بطور بڑے بیٹے کے مجھ کو سر انجام دینے پڑے۔ اس دن جو کچھ مجھ پر بیتی بیان نہیں کر سکتا۔ شام کو میں نے پہلی مرتبہ پی۔ اس واقعہ کو دس سال گذر چکے ہیں لیکن اس دن اور اس کریہہ منظر کا ایک ایک منٹ مجھے یاد ہے ـــ خان صاحب میں نے عجیب عجیب محفلوں میں پی ہے ـــ اچکوں، شہدوں، لفنگوں کے ساتھ جہاں گلاسوں کی جگہ بوتلوں سے حساب ہوتا تھا، بات بات پر چاقو نکل آتے تھے (اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا سا نشان تھا) یہ زخم ان خرمستیوں کی یادگار ہے۔ پھر جب مہاراجے کی ملازمت میں تھا تو کئی مرتبہ پری جمالوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر کی طرح پی ـــ ایک ایک حسینہ ایسی تھی کہ اس کے لیے عمر گنوا دی جائے اور ذرا افسوس نہ ہو۔ کچھ شراب کا نشہ کچھ ان متوالی آنکھوں کا خمار، کیا کیا کیفیتیں طاری ہوتی تھیں ـــ! اب یوں لگتا ہے جیسے ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ پھر کبھی کبھی ایسے منحوس مطلب پرست خبیثوں کا بھی ساتھ دیا، گھنٹوں کی بادہ نوشی کے بعد بجائے سرور کے افسردگی ملی اور قے کرنے کو جی چاہا۔ شدید صدمے برداشت کرنے کے لئے پی اور ہمیشہ صدمے کو شدید تر محسوس کیا۔ شرط لگا کر پی، بلا نوشوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے فائدے تھوڑے ہیں اور نقصان زیادہ ـــ"

اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ بیوی ہمیشہ روٹھی باپ کے پاس رہتی۔ کبھی کبھار اس کے پاس آتی تو غربت کے طعنے دیتی۔ لڑنے کے بہانے تلاش کرتی۔ سسرال والے حقارت آمیز سلوک کرتے۔ یہ کہانی اور اپنی زندگی کی دوسری المناک کہانیاں دہرا کر وہ پوچھتا ـــ "دنیا میں کسی چیز کو بھی تو ثبات نہیں، دوست بناتے دیر لگتی ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات سے برسوں پرانی دوستی یوں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بتائیے کہ یہاں ہمیشہ ڈر ڈر کر کیوں رہنا پڑتا ہے، کوئی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو آج دوست بنا ہے اس کے دل میں کل بھی اتنی ہی محبت ہو گی ـــ ذرا سی جدائی معمولی سی غلط فہمی تخیل کی غلط پرواز شب و روز کی یکسانیت کسی تیسرے کی آمد ـــ بعض اوقات تو کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی اور آناً فاناً میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ـــ یہ کیا تماشا ہے ہاں ـــ میں خاموش رہتا، وہ پوچھتا ـــ" اور یہ بتائیے مجھ سا جذباتی اور حساس ہر وقت فکرمند کیوں رہتا ہے، وسوسے آتے ہیں، اپنے آپ کو بہتر سمجھاتا ہوں کہ یہ شبہات ہیں غلط ہوں گے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، پھر بھی فکر کر کرکے برا حال ہو جاتا ہے مجھے خوش فکر

پر رشک آتا ہے جو کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں ——"

میں تسلی دیتا کہ اگر انسان فکر نہ کرے تو زندگی کے کام کیوں کر چلیں، موجودہ اور آئندہ مسائل سے کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ لیکن وہ سر ہلا کر کہتا، "نہیں یہ طفل تسلیاں ہیں ——"

پھر کسی دن کہتا: "زلزلوں، وباؤں اور جنگوں سے انسان کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ چالبازوں، جھوٹوں اور مکاروں سے — اور اس قسم کے لوگ دنیا میں اس قدر کامیاب ہیں۔ ہر فریب، ہر جرم، ہر خباثت ان کے لئے جائز ہے، نہ ان کا ضمیر ہے، نہ ان پر جزا و سزا کا اطلاق ہے۔ اس کے باوجود یہ پھلتے پھولتے ہیں۔ رہ گئی اگلی دنیا —— سو کیا پتہ کہ یہی لوگ اِدھر اُدھر مل ملا کر اپنا "تو" سیدھا نہیں کریں گے ——"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ——"

"کیوں نہیں ہو سکتا جب کہ بارش نیک اور بد دونوں پر پڑتی ہے۔ سورج کی شعاعیں دونوں کے لئے ہیں۔ قدرت کی نعمتیں اور حادثے سب کے لئے یکساں ہیں۔"

میں خاموش ہو جاتا۔ وہ شکایت کرتا: "آپ جان بوجھ کر ٹال جاتے ہیں ——"

اس کا رنگ سانولا تھا لیکن جب گوروں کالوں پر بحث ہوتی تو وہ غیر جانب دار رہتا اور کہتا: "جلد کے دونوں رنگ پیانو کے سفید اور سیاہ پردوں کی طرح ہیں، جب تک دونوں ہم آہنگ نہ ہوں نغمہ پیدا نہیں ہوتا ——"

برٹن اس سے ہندوستانی موسیقی کے متعلق سوالات پوچھا کرتا: "دیوتاؤں کے سامنے موسیقی، رقص اور پھولوں کی پیش کش سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا کافی خوشگوار ہوتا ہوگا اور اگر دیوتا کہیں ہیں تو وہ یقیناً اس رنگ سے محظوظ ہوتے ہوں گے ——"

کیمپ میں ایک گھنی مونچھوں والا ہیبت ناک شخص بھی تھا جس کے بے سرے گانوں سے سب نالاں تھے لیکن موہن اسے ناپسند نہیں کرتا تھا: "یہ برا آدمی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے گانے کا شوق ہے۔"

حالانکہ وہ رات کے گیارہ بارہ بجے بھیانک آواز میں ایسے اوٹ پٹانگ گانے گاتا کہ صورِ اسرافیل کا گمان ہوتا۔ آخر تنگ آ کر منصور نے سب کے سامنے اسے بتایا کہ حکیم رازی کو اوائل عمر میں بانسری بجانے اور گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب پختگی آئی تو گانا بجانا یک لخت ترک کر دیا اور کہا کہ جو نغمہ داڑھی اور مونچھوں کے درمیان سے نکلے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔"

منصور کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی اور اس کی نغمہ سرائی کم ہوتی گئی۔

جرجیس کا اصل نام جارج تھا اور اصل وطن آرمینیا۔ موٹا تازہ آرام طلب نوجوان تھا۔ پتہ نہیں نوکری کیوں کر رہا تھا کیونکہ اسے کام سے نفرت تھی اور قواعد و ضوابط سے چڑ۔ پیدل چلنے سے ہمیشہ گریز کرتا۔ کہیں چلنا پھرنا پڑ جاتا تو —— "میں فوجی نہیں ہوں، مجھے کچھ نہ کہو۔" کہہ کر بیماری کے بہانے سے خیمے میں لیٹ جاتا۔ ویسے ہر روز تقریباً دس بجے نہا دھو کر تیار ہوتا اور نعرہ لگاتا —— "اب جرجیس ہر چیز کے لئے تیار ہے سوائے کام کے ——"

دائمی کاہلی کے باوجود جرجیس نہایت شدید قسم کا عاشق تھا اور تقریباً ڈیڑھ یا پونے دو عاشقوں کے برابر تھا۔ کسی لڑکی کو مغموم دیکھ کر اس سے رہا نہیں جاتا تھا۔ دراصل جو لڑکی مغموم نہ بھی ہو اسے دیکھ کر بھی بے قابو ہو جاتا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ دنیا کی حسین ترین لڑکی پر عاشق رہتا تھا —— یہ اور بات تھی کہ کبھی لڑکی کا نام اماتیا ہوتا، کبھی ورجینا تو کبھی الزبتھ۔ ساتھ ساتھ یہ گلہ بھی رہتا کہ اسے اتنی توجہ نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے۔

"آج دوتاروزا نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہنریٹا نے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ باتیں تو ہوئیں لیکن پھیکی پھیکی سی۔ حالانکہ اسی لڑکی نے پچھلے ہفتے میرا دل

اور کیمرہ چرا لیا تھا۔ اور تو اور وہ بے وقت گرل بھی روٹھی ہوئی ہے ــــ ہائے ہمیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا ــــ۔

اور تم نے زندگی کو کیا دیا ہے؟" روزنر جواب کہتا ــــ "تم اُن لوگوں میں سے ہو جو ہر ایک سے ہر وقت ہر قسم کی توجہ کے طالب رہتے ہیں۔ کسی خوفناک حادثے سے بچ جانے پر جنہیں خوشی کی جگہ افسوس ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں نے توجہ نہیں دی بلکہ جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے ــــ۔"

روزنر اور جرجیس میں اکثر ٹھنی رہتی۔ روزنر پوچھتا ــــ "جرجیس جانتے ہو۔ کائنات میں تقریباً دس کروڑ جھرمٹ ہیں، ہر جھرمٹ میں دس لاکھ کے قریب نظام شمسی ہیں، ہر نظام شمسی میں کئی سیارے ہیں جن میں سے کچھ آباد بھی ہوں گے۔ اُدھر تم ہو کہ ایک چھوٹے سے سیارے کے ننھے سے ملک میں بالکل فضول سی باتوں میں غلطاں رہتے ہو ــــ۔"

"جو چیزیں دوربینوں سے بھی دکھائی نہ دیتی ہوں اُن پر میرا کوئی اعتقاد نہیں ــــ دنیا کا جتنا سا حصہ نظر آتا ہے ــــ اسی پر قانع ہوں ــــ خصوصاً بغداد، یہودیوں والا پل اور اس پر یہودنوں کے جھرمٹ۔"

یہ یہودنوں والا پل بڑی پرکشش جگہ تھی۔ شام ہوتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی۔ دریا کے کناروں سے ساری رونق پل پر سمٹ آتی چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے معطر رومال گرا دیا کہ کوئی اٹھا کر دے تو تعارف ہو، گھڑی باندھ رکھی ہے، پھر بھی صحیح وقت پوچھ رہی ہیں، سرخ ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر ماچس مانگتا، اور کوئی کہہ کر کسی زخمی کیڑے مکوڑے سے ڈر جاتا تاکہ کوئی ڈرنے کی وجہ پوچھے، اسی قسم کے سینکڑوں حربے۔ سیاہ زلفیں، زیتونی رنگ، بھرے بھرے ہونٹ چست لباس اور بڑی بڑی آنکھیں۔

جرجیس بار بار کہتا ــــ "یہ یہودی تو کچھ نہیں مگر یہودنیں رحمتیں بچا کیں والله!"

اس کے باوجود یہودنیں جرجیس کے لئے سرکس کے جانوروں کی طرح تھیں۔ وہ انہیں بڑے شوق سے دیکھتا بار بار ملنا چاہتا لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

روزنر جرجیس سے پوچھتا کہ "تم شادی سے کیوں بھاگتے ہو؟"

"میرے خیال میں شادی فقط شادی شدہ لوگوں کے لئے مفید چیز ہے ــــ۔"

"تم عورت کی مستقل رفاقت سے ڈرتے ہو ــــ"

"عورت کی رفاقت میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن شادی کے بعد جو باقیماندہ اتنی ساری عورتوں سے دور رہنا پڑتا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے۔ یہ کیمپ تو اتنا بُرا نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں جہاں تھا وہاں اتنی تنہائی تھی کہ شادی کرتے کرتے بال بال بچا ــــ"

اس کا عقیدہ تھا کہ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرا دو کہ وہ حسین ہے اس کے بعد وہ تمہارے سارے جھوٹ بالکل سچ مان لے گی لیکن ہم یہ بتاتے کہ وہ اکثر لڑکیوں کو ملتے ہی خفا کر دیتا ہے لہٰذا اس کی تکنیک میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔

"یہ تو دل کے معاملے ہیں، جو سوجھتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ قوانین و ضوابط سے مجھے سدا کی چڑ ہے۔" جرجیس کی تکنیک کچھ اس طرح کی تھی ــــ

کوئی لڑکی کہتی ــــ "آج میری سالگرہ ہے ــــ"

"مبارک ہو! آج آپ کتنے سال کی نہیں ہوئیں؟"

وہ چڑ جاتی۔

جرجیس سرگوشیوں میں کہتا ــــ "جانتی ہو دنیا کی سب سے حسین لڑکی کون ہے؟"

"کون ہے ـــ؟" وہ خوش ہو کر پوچھتی

"گریٹا گاربو ہے"

لڑکی پھر خفا ہو جاتی

جرجیس پھر ہنستے لگتا ـــ "کل سوزی تمہارے مٹاپے پر فقرے کس رہی تھی میں نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ تم موٹی تو نہیں فقط تمہارا وزن تمہارے قد سے مناسبت نہیں رکھتا"

اس پر وہ آگ بگولا ہو جاتی ـــ "بڑے بدتمیز ہو! تمہارے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں کہ تم اول درجے کے جھوٹے لفنگے اور ہرجائی ہو"

"سوچ لو! تم مجھے ترغیب دلا رہی ہو ـــ"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا لیکن جرجیس کا جوش و خروش کبھی کم نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ ایک پختہ عمر کی خاتون کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے فوراً دھمکایا ـــ "جانتے ہو میں تمہارے دوست کی چچی ہوں ـــ؟"

"چچی جان! آپ کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے اور آپ کی چال خوب ہے ـــ"

"تمہیں مجھ سے ملنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

"اپنے دوستوں کے ہمراہ بابل، طاقِ کسریٰ اور دیگر آثارِ قدیمہ دیکھنے آیا تھا، سوچا آپ کے درشن بھی کروں ـــ"

"خبردار! آئندہ مجھ سے دور رہنا۔ تمہارے اور میرے خیالات بالکل مختلف ہیں ـــ"

"واقعی ہم دونوں مختلف ہیں۔ آپ کو لڑکے پسند ہیں اور مجھے لڑکیاں ـــ"

جرجیس کی جیب اکثر خالی رہتی۔ ایک شام کو شارع رشید کے مہنگے سے ریستوراں میں دیکھا کہ جرجیس اور ایک لڑکی ڈنر کھانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی کیونکہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں، تماشہ دیکھنے کے لئے قریب جا بیٹھے۔

جرجیس کہہ رہا تھا ـــ "اب جبکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھے پسند کرتی ہو میں یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ تم بے حد حسین ہو۔ مجھے اپنی زندگی کی داستان سناؤ اور ضرور سناؤ لیکن مختصراً پہلے بارہ تیرہ سال بے شک اس میں شامل نہ کرنا کیونکہ تب تم محض بچی تھیں، اس کے بعد کیا ہوا وہ بتا سکتی ہو ـــ"

اتنے میں ویٹر آ گیا، لڑکی نے ضرور مہنگے کھانے چنے ہوں گے کیونکہ جرجیس کاغذ پنسل لے حساب لگا رہا تھا اور جیبیں ٹٹول رہا تھا جب ویٹر نے اس سے پوچھا تو آہ بھر کر بولا ـــ "خاتون کا کھانا لے آؤ میں نہیں کھاؤں گا، کیونکہ میں عشق میں مبتلا ہوں اور بھوک سے بالکل مبرا ہوں ـــ"

کام کے اوقات ختم ہوتے تو جرجیس یکلخت چست ہو جاتا۔ خیمے میں داخل ہوتا تو جیسے زلزلہ آ جاتا ـــ "چپ کیوں ہو، گراموفون بجاؤ، ریڈیو لگاؤ، شور مچاؤ، اور کچھ نہیں تو تاش ہی کھیلو، یار و کچھ تو کرو، توبہ توبہ کیسے سست الوجود دوستوں سے واسطہ پڑا ہے، زندگی تباہ ہو گئی ہے"

روز پوچھتا ـــ "جرجیس ہر ملک میں عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں، آرمینیا کوئی ایسی ہستی کبھی وجود میں آئی؟"

"اغیار ہمیں شہرت نہیں پانے دیتے۔ ویسے بھی بڑھاپے سے پہلے عظمت نہیں ملتی اور میں ابھی نوعمر ہوں ـــ دیکھ لینا دوست کسی دن میرا مجسمہ ضرور بنایا جائے گا۔ حالات خود بخود سازگار ہوتے چلے جائیں گے جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہو گی۔ یکے بعد دیگرے خوشخبریاں ملیں گی، میری جیبیں پُر رہا کریں گی، روز ہر شام کو بغداد جا سکوں گا۔ دوسروں سے قرض مانگنے کی بجائے انہیں خوب ادھار دیا کروں گا۔ سب مجھ سے متاثر ہوں گے۔ میری قابلیتوں کا اعتراف کیا کریں گے ـــ"

لیکن حساب داں آوزاسے بتاتا ـــ "جرجیس تمہاری حرکتوں اور نظریوں سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ زبوں حال رہو گے، اگر تمہاری

ذہنی یا مالی حالت سدھر جائے تو میرا نام بدل دینا۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس پر لعنت بھیجوں گا ـــــ"

ایک روز برٹن نے بھی جرجیس کو ٹوکا تھا ـــــ "یہ تم ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہو، دنیا میں اور کام بھی تو ہیں ـــــ"

"جناب لڑکیوں سے منہ موڑ لینے کے بعد دنیا میں اور کیا رہ جاتا ہے، ہو محبت نہ کی جائے تو ناکامی کیسے ہو اور محبت کی ناکامی کے بغیر غم غلط کرنے کے موقعے کس طرح ملیں ـــــ" جرجیس نے جام خالی کرتے ہوئے بڑے ادب سے جواب دیا۔

اُسے دوستوں کی خوشنودی کا ہر وقت خیال رہتا تھا، اکثر کہا کرتا "میں دوستوں کو ہمیشہ خوشخبری سنانے کا منتظر رہتا ہوں، بُری خبر کبھی نہیں سناتا، اگر بُری خبر تو نصیب کیسی اور سے بھی مل جائے گی لیکن جرجیس تو اس خبر کا جزو نہیں بنے گا۔

مہینے کی آخری تاریخ کو دجلے کے کنارے جرجیس نے اترتے ہوئے کہا۔ "جناب آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میں نے لڑکیوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"

برٹن مسکرانے لگا۔ روز جلدی سے بولا ـــــ "اب جرجیس ہر وقت عورتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اس کی دائمی بے چینی اور اضطراب کی فقط تین وجوہ ہیں ـــــ لڑکیاں، عورتیں اور خواتین ـــــ"

روز بیکار یا نکمی ذاتی تو اسے بات پہ سوال نہ کرنے دیتا۔ بغداد جانے سے پہلے یہ پوچھتا کہ بل ادا کرنے کا کام کس کے سپرد کیا جائے، پھر سب سے برابر برابر چندہ جمع کر کے اس کے حوالے کرتا ـــــ "جب وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ دیکھیں گے تو ہم سب کو امیر سمجھیں گے دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اپنی جیب کی حفاظت نہیں کرنی پڑے گی ـــــ"

وہ بالکل گنجا تھا، اپنی مدافعت میں طرح طرح کی مثالیں پیش کرتا ـــــ "چارلس دوئم گنجا تھا موسم گرما میں سر کے مصنوعی بال اتار کر ٹہل رہا تھا کہ اتفاق سے ملکہ نے دیکھ لیا، اس حالت میں پہلی دفعہ دیکھ کر ملکہ نے چیخ ماری۔ بادشاہ بڑے پیار سے بولا: جانِ من گرمی بہت تھی مجبوراً بال اتارنے پڑے۔ فرانس کے لوئی چہاردہم نے عمر بھر اپنے گنجے پن کو کامیابی سے چھپائے رکھا، ملکہ الزبتھ گنجی ہوئی تو محل اور دربار کے سارے آئینے تڑوا دیئے۔ سکاٹ لینڈ کی حسین ملکہ میری اور فرانس کی مشہور میری انتونیٹ بالکل گنجی تھیں لیکن یہ راز اُن کی موت کے بعد افشا ہوا ـــــ میں تو ایک معمولی سا سپاہی ہوں۔ بادشاہ ہوں والی حرکتیں تو کر نہیں سکتا۔ گنجا ہوں تو بس گنجا ہوں۔ چھپاتا تو نہیں۔"

اس کی سالگرہ کی پارٹیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ کوئی لڑکی پارٹی سے گھر جانا چاہتی تو روز فوراً اعلان کر دیتا کہ آج تو اس کی سالگرہ ہے اس لئے جلد گھر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بار بار بلانے پر نہ آتی تو پیغام بھیجتا ـــــ "آج انگلستان میں عزیز و اقارب میری سالگرہ منا رہے ہوں گے۔ میں یہاں بے یار و مددگار ہوں، کم از کم آپ تو مایوس نہ کیجئے۔" غرضیکہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہ مبارک دن آ جاتا۔

لڑکیوں کو مدعو کرتے ہوئے بھی وہ ریاضی کے فارمولے استعمال کرتا ـــــ "پیر کو میرے ساتھ چائے پیجئے ـــــ" "نہیں میں پیر کو نہیں آ سکتی، اس دن میری دادی جان آ رہی ہیں ـــــ" اگلے روز پھر ٹیلیفون کرتا ـــــ "اچھا تو بدھ کی شام کو رقص پر چلیں ـــــ" "نہیں بدھ کو نانا جان آ رہے ہیں ـــــ" "تو پھر جمعرات کو پکنک پر انتظام کروں؟" آخر تین چار مرتبہ انکار کر کے وہ سنیچر یا اتوار کے لیے مان جاتی۔

روز بڑی سنجیدگی سے ہمیں سمجھاتا کہ "لڑکی کے چار پانچ انکار ہر مرتبہ برداشت کرنے پڑتے ہیں پھر اسے مجبوراً یا لحاظاً ہاں کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی سنیچر اتوار کے پروگرام مجھے موافق آتے ہیں اس لئے ہر ہفتے پیر کے دن سے پوچھنا شروع کر دیتا ہوں ـــــ"

وہ حساب لگا کر بتاتا کہ دجلہ جن پہاڑوں سے نکلتا ہے وہ فرات کے پہاڑوں سے نیچے ہیں لہٰذا ان کی برف پہلے پگھلتی ہے۔ تبھی پہلے دجلے میں

سیلاب آتا ہے پھر فرات میں۔ فرات کی سطح مقابلتاً اونچی ہے اس لئے فرات سے نہریں دجلے میں گرتی ہیں، راستے میں آب پاشی کرتی ہیں اور دونوں دریا سال میں پینتالیس لاکھ ٹن مٹی بہا کر لاتے ہیں۔

"اور جو پینتالیس لاکھ ایک ٹن یا چوالیس لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے ٹن لاتے ہوں پھر ـــــ؟" جرجیس پوچھتا۔

کوئی کسی ناخوشگوار واقعے سے افسردہ ہو جاتا یا غم لگ لیتا تو روز اپنے فارمولے کے حوالے سے سمجھاتا ـــ "ایسا واقعہ تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ دن تک بھلا دینا چاہیئے۔ رہ گیا یہ فکر کہ لوگ کیا کہیں گے، سو لوگوں کو ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس معاملے میں پبلک کا حافظہ بےحد کمزور ہے لہٰذا بہترین فارمولا یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے آپ سے سیدھا سا سوال پوچھنا چاہیئے کہ آیا آج سے تین مہینے کے بعد آج کا واقعہ سچ مچ یاد رہے گا؟ اور اگر یاد رہا بھی تو میری نظروں میں تب اس کی اہمیت کیا ہوگی؟"

منصور سب میں کم گو تھا۔ الگ تھلگ رہتا۔ بغداد اکیلا جاتا۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ کوئی نئی حسینہ ہوتی لیکن محفلوں میں کبھی لڑکی کا ذکر اس کے ہونٹوں پر نہیں آیا۔ اس کی باتوں سے ہم فقط اتنا اندازہ لگا سکے کہ ایک تو اسے میدان کے باشندے اچھے نہیں لگتے اور دوسرے یہ کہ اسے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بہت شوق ہے اور اپنے وطن کی پہاڑیاں بہت عزیز ہیں۔

"سب سے دلکش اور روح پرور وہ ہوا ہے جو گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان سے گذر کر آتی ہے۔" وہ کہا کرتا۔

اُسے اپنے گھوڑے سے اتنی محبت تھی کہ کیمپ کی موٹروں لاریوں کے باوجود اسے ساتھ رکھتا۔ اس کا ذکر اس طرح کرتا جیسے کسی دوست کی باتیں سنا رہا ہو ـــ "اگر قصور پر سزا دو تو بیچارہ خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے لیکن بلا وجہ مار دیا ڈانٹ دو تو روٹھ جاتا ہے اور کئی کئی دن چارہ نہیں کھاتا۔ اس کی ماں ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ اُس سے کوئی کام نہیں لیتے اور اس کی اتنی ہی عزت کی جاتی ہے جتنی کہ کنبے میں بڑی بوڑھیوں کی ہوتی ہے۔"

اور مجھے اپنے وطن کے گھوڑے یاد آ جاتے۔ اُن کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا ـــ آٹھ آٹھ موٹی تازی سواریاں بٹھا کر تانگے والے ہر دو منٹ کے بعد ما دتا چابک رسید کرتے ہیں۔

ایک دن میں نے عربی سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں کچھ نہ کچھ تو سمجھ لیتے ہو گے؟" منصور نے پوچھا

"فقط گنے گنائے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کی گردان بہت مشکل ہے۔"

"شہروں میں یقتل، قتلو، تقتل، قتلت، یقتلون ـــــ کے الفاظ تو بار بار سُنے ہوں گے ـــ؟"

"یہ تو میں نے بھی سُنے ہیں ـــ" روز بولا۔

"بس یہ قتل کی گردان ہے جو شہروں میں اکثر ہوتی رہتی ہے ـــ اسی سے گرامر سیکھنے کی کوشش کرو۔" منصور مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

موٹر سے ہرن کا شکار کھیلنے کا پروگرام بنا۔ برٹن نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہنے لگا کہ مجھے کسی زمانے میں شکار کا بہت شوق تھا لیکن ایک مرتبہ ہندوستان میں مہاراجے کی پارٹی کے ساتھ ہاتھیوں پر چڑھ کر شکار کھیلنے گیا۔ ہم اتفاق سے ایک دوسری شکاری پارٹی کی زد میں آ گئے جو ہاتھیوں کا شکار کھیلنے آئی تھی ـــــ اُس روز جو کچھ ہوا، میں نے شکار سے توبہ کر لی۔ ان دنوں جیپ نہیں ملی تھی۔ صحرا میں جو موٹریں تھیں اُن سے صحرائی ہرن زرا تیز دوڑتا ہے (روز نے حساب لگا کر بتایا کہ پانچ میل فی گھنٹے کا فرق ہے) اس قسم کا شکار مجھے اچھا نہیں لگتا۔ "اس سے تو یہ بہتر ہو گا کہ ہم ہرن کو دستی بم یا مشین گن سے ہلاک کر لیا کریں۔" منصور نے بھی موٹر سے

کوئی فائر نہیں کیا کیونکہ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ شکار کو بچ کر نکل جانے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔

پھر ہم دونوں گھوڑوں پر شکار کھیلنے نکلتے۔ وہ کردستان کے جانوروں پرندوں کی باتیں سناتا۔ شکار کے قصے سناتے وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں ——"گھوم کر نیچے آتی ہوئی مرغابی، پتھر کی طرح دھم سے گرتا ہوا پرندہ، لڑکھڑاتا ہوا زخمی ہرن —— کوئی اور نظارہ بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے؟

ہم کبھی سیر پر نکل جاتے، آبادی سے باہر نکلتے ہی وہ لمبا سانس لے کر ہوا سونگھتا —— اب ویرانے کی جان پرور ہوا آئی ہے۔ اس کی تازگی تم نے بھی محسوس کی ہوگی لوگ تنہائی اور ویرانی کا رونا روتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ انسان کے آنے سے پہلے دنیا آباد ہی تو تھی سارے ہنگامے اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے۔ مرد جس جگہ خیمہ گاڑ دے وہیں رونق ہو جاتی ہے!"

"آداب و تکلفات کو ذکر چھڑتا تو وہ بتاتا —— شاید تمہیں میری باتیں عجیب معلوم ہوتی ہوں۔ در اصل اس وقت پڑھا لکھا منصور نہیں بول رہا ایک دیہاتی کرد تم سے مخاطب ہے —— زندگی میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ترشی، بدکلامی، منگنے فسادے مجھے نفرت ہے لیکن بعض اوقات زندگی کی شاہراہ پر کوئی ایسا خبیث بھی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روک لیتا ہے جو فطرتاً بدگو، بدخواہ اور بدکردار ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر انسانیت اور شرافت کے درس دینا اور راستہ چھوڑ دینا نری بزدلی ہے۔ اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے جسے وہ سمجھتا ہو اور ایسا سبق سکھانا چاہیے کہ عمر بھر نہ بھولے ——

میں نے اُسے کبھی غمگین نہیں دیکھا —— اس کی وجاہت، گستاخ سی مسکراہٹ، اس کے حوصلے اور اولوالعزمی سے سب متاثر ہوتے —— "مرد کو ہمیشہ نیوٹرل گیئر میں رہنا چاہیے، کڑھنا، اپنے اوپر ترس کھانا، ناکامیوں پر بہانے تراشنا بالکل بے سود ہے۔ زندگی میں بارہا شکست ہوگی کئی مرتبہ ٹوکا جائے گا، بلاوجہ شبہ کیا جائے گا، بغیر قصور سزا ملے گی جیسے کیرم کھیلتے وقت اصلی نشانہ کسی اور رُخ میں ہوتا ہے لیکن زد میں کوئی اور آتا ہے اور TANGENT کسی اور طرف لگتی ہے —— اسی طرح بغیر کچھ کیے مرد دوسروں کی زد میں کئی مرتبہ آتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر سوچ لینا چاہیے کہ یوں ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوا کرے گا۔ مرد کبھی ہراساں نہیں ہوتا اور کبھی ہار نہیں مانتا ——

میں نے اُن حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا۔"

"ہاں کئی ہیں —— "وہ مسکرانے لگا۔

"کوئی منتخب کی؟"

"نہیں اور تک کنوارا رہنے میں یہی خرابی ہے —— جب شوخ و شنگ موسیقی سنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے۔ پھیکی مٹیالی سی سہ پہر کو حزن سے مجیسے کیمتھرین سے ملنے کو جی چاہتا ہے جو خنک ڈبڈبے کیف فضا پر یوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ بذلہ سنجی ہیں تا مرہ کا کوئی جواب نہیں، جب محض خرافات بکنی ہو تو روزلین جیسا رفیق ملنا محال ہے، غضب کی پھکڑ ہے اور واہی تباہی بکنے میں بے مثال ہے۔ زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر منیرہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ دل جوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ بہت سے منصوبے باندھ لئے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو حمیدہ کی تمکنت اور حسن بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے، خود پسندی اور انا کا بھوت اترتے دیر نہیں لگتی۔ اچھی چیزیں کھائے عرصہ گزر چکا ہو تو مستورہ بھلائے نہیں بھولتی جو اپنی نفاست پسندی سے خوش خوراکی پر آمادہ کرتی ہے کہ محض چند ہفتے میں وزن بڑھ جاتا ہے —— بتاؤ میں کیا کروں، یہ سب خوبیاں یا بُرائیاں جو مجھے پسند ہیں فقط ایک لڑکی میں کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں —— اور پھر مجھے شادی کا کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے ——"

"یہ بتاؤ کہ اتنے گھمسان کے اکیشن کے باوجود اب تک کیونکر بچے ہوئے ہو؟"

"تم بخوبی جانتے ہو کہ جنگی چالوں میں حملے کا پلان بناتے وقت پسپائی کا پلان بھی بنایا جاتا ہے ——"

سنیچر کی رات تھی، ہم رقص گاہ میں موسیقی سن رہے تھے۔ ایک لڑکی قریب سے گذری جرجیس نے اسے ٹھہرا لیا اور پوچھا ــ "معاف کیجئے آپ کی میز پر وہ خوبصورت سی لڑکی کون ہے ــ؟"

"میں ــ" اس نے جواب دیا۔

"مگر اس کے رخسار پر تو تل تھا ــ"

"سرمے کا تل تھا، رومال سے اتر گیا ہوگا ــ فرمائیے"

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ــ شاید ملا بھی ہوں"

"آپ نے پتہ نہیں کیا کیا دیکھا ہوگا۔ ویسے میں آج صبح پہلی مرتبہ بغداد آئی ہوں ــ"

"لیکن مجھے ابھی یاد ہے کہ ــ"

"اب آپ فرمائیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے۔ میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں، یا آپ کو مدت سے میرا انتظار تھا، وغیرہ وغیرہ ــ" وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

جرجیس بہت خفا ہوا "میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن یہ خواہ مخواہ ڈانٹ گئی ــ اب اس پر باقاعدہ عاشق ہو کر نہ دکھایا تو جرجیس نام نہیں"

وہی لڑکی سامنے سے پھر بالکل تیر کی طرح گذر گئی اور جرجیس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ کچھ دیر تلملاتا رہا پھر سیدھا لڑکیوں کے جھنڈ پر چیل کی طرح حملہ آور ہوا لیکن فوراً واپس آ گیا۔

"رقص کے لئے کہا لیکن نہیں مانی ــ"

جب موسیقی شروع ہوتی تو جرجیس تیزی سے اس طرف جاتا اور انکار کرا کے واپس آ جاتا۔

ایک دفعہ جو گیا تو بھاگا بھاگا واپس آیا ــ "وہ کہتی ہے کہ یہاں اتنے لڑکے بیٹھے ہیں جو تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ بھلا تم میں ایسی کون سی خوبی ہے جس پہ اتراتے ہو؟ للہ کوئی منہ توڑ جواب سوچئے تاکہ اسے خاموش کرا سکوں"

میں نے مشورہ دیا کہ اسی موضوع پر فارسی کا ایک شعر ہے کہ گلشن میں صبح صبح بلبل نے گلاب کے پھول سے کہا کہ چاروں طرف کتنے پھول کھلے ہوئے ہیں جو رنگ روپ میں تجھ سے کہیں بہتر ہیں پھر تجھے کس بات پر ناز ہے؟ گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے مگر یہ انداز گفتگو کیسا ہے؟ کبھی کوئی اپنے محبوب سے اس طرح کلام کیا کرتا ہے؟

وہ سرپٹ دوڑ گیا ــ پھر واپس مشورہ لینے آیا، پھر چلا گیا، اس مرتبہ جو آیا تو پیچھے پیچھے وہ آئی ــ "تو آپ اسے پڑھا پڑھا کر بھیج رہے ہیں، خود میدان میں کیوں نہیں اترتے ــ؟"

ہم سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ فوراً دوسری طرف چلے گئے۔ اتنے میں ایک نہایت پیاری سی لڑکی آئی اور گروہ میں شامل ہو گئی ــ اس کے رخسار پر تل تھا۔

"یہ آپ کا تل ــ" جرجیس کچھ پوچھنے لگا تھا لیکن ایک دوسرے سے تعارف شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے اسے خاموش ہونا پڑا۔

"یہاں آنے سے پہلے آپ نے عراق کا نام سنا تھا ــ؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"بچہ بچہ اس نام سے آشنا ہے ــ" میں نے "تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود" ــ کا ترجمہ سنایا۔

"اور بغداد ـــــ؟"

"بغدادی چور کو کون نہیں جانتا ـــــ؟"

"اور بصرہ ـــــ؟"

"اس پر تو گیت گائے جاتے ہیں ـــــ ایک حسینہ المعروف بہ 'چھبی' ہند سے فرار ہو کر بصرہ پہنچ گئی ہے۔ سارے نوجوان مل کر ایک لٹھ باز سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح چھبی کو گھیر کر واپس لے آئے۔"

"یہ تو کچھ نہیں ہے ـــــ" تل والی نے منہ بنا کر کہا۔

موہن میرے کان میں بولا ـــــ "خان صاحب میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی ـــــ ایک اخبار میں DOG RACE کا ترجمہ کتوں کی گھڑ دوڑ خود میں نے پڑھا تھا ـــــ"

"آپ کے ہاں رومانی گیت بھی تو ہوتے ہوں گے ـــــ"

"پہلے ہوا کرتے تھے لیکن اب فقط فلمی گانے رہ گئے ہیں ـــــ" میں نے جواب دیا۔

"پرانے گیتوں میں سے کوئی سنائیے ـــــ"

"سہیلیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی ہیں ـــــ ایک کہتی ہے ـــــ میرے چھیل چھبیلے بانکے سپاہی کو دیکھا، اس رنگ رنگیلے جھوٹے ہرجائی کا کیا پوچھتی ہو۔ اس جیسا زمانے میں کوئی نہیں ہے ـــــ"

"ہائے اللہ تمہارے ہاں جھوٹے محبوب کو بھی پسند کیا جاتا ہے ـــــ؟"

"من موہنا اور دلچسپ محبوب جھوٹا بھی ہو تو اس محبوب سے کہیں بہتر ہے جو سچ بولتا ہو مگر موتی اور ٹھس ہو ـــــ اور پھر محبوب سے الفت اس کی خوبیوں کی بنا پر تھوڑا ہی کی جاتی ہے، محبت تو اس کی برائیوں کے باوجود بھی ہو جاتی ہے ـــــ یہ چھوٹی موٹی چالیں، ذرا سا جھوٹ، تھوڑی سی ہیرا پھیری، ایک دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے بھرپور حملہ اور جیتنے پر ساری شرطیں منوانا ـــــ محبت اور جنگ دونوں میں جائز ہیں۔"

"ہوں گی ـــــ لیکن نہ ہمیں جنگ، پسند ہے اور نہ سپاہی۔ سپاہیوں سے ہم اس لئے کتراتے ہیں کہ وہ بغیر بتائے کسی دن دور چلے جاتے ہیں ـــــ"

"اگر وہ چلتے پھرتے نہ رہیں تو ان سے ملاقات کیوں کر ہو ـــــ؟"

"لیکن ایک مشرقی لڑکی کسی ہرجائی کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟" تل والی نے پوچھا۔

"یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے؟ مشرقی، ایشیائی، جنوبی، مغربی وغیرہ کی صفت محض دم چھلا ہے۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے، ہرجائی ہو یا کچھ اور۔"

"ہمیں کوئی اچھا سا گیت سنائیے ـــــ" اس کے نازک ہونٹ ہلے۔

بابا فرید کی کافی ـــــ 'ڈیہنہ سہاگ دے آوندے ہن' ـــــ کا بالکل آزاد ترجمہ سنایا ـــــ "ایک حسینہ سوچ رہی ہے ـــــ

یہ اچانک زیور کیوں بھانے لگے ہیں؟
کہیں سہاگ کے دن تو نہیں آ رہے؟
صحرا میں تتلیاں کہاں سے آ گئیں؟
ویرانوں میں شادابی کون لے آیا؟
ایسی سہانی رت تو کبھی نہیں آئی۔
میرے اللہ، کیا ہونے والا ہے ـــــ؟"

"ہائے۔ یہ تو بے حد لطیف ہے ——" اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ تل اور بھی نمایاں ہو گیا —— اس کا نام سعدہ تھا۔

جس سے جو ہمیں کی لنانی ہوئی تھی وہ توئی زنا تھی جس کے ہاتھ کچھ حرح ح تھے۔ شاید مہندی سی لگا رکھی تھی۔ جو ہمیں کی زبانی اس شعر کا ترجمہ اُسے سنوایا ——

تل کے مہندی کبھی دریا میں نہایا نہ کرو   آگ پانی میں مری جان لگایا نہ کرو

(آگ پانی میں —— کی جگہ —— آگ دجلے میں —— استعمال کیا گیا)

"ایسی ماڈرن لڑکیاں تو ہر جگہ مل جاتی ہیں ——" روز بولا "یہاں کی اصل لڑکیوں سے بھی ملاقات ہونی چاہیئے ——"

ہم نے اسے بتایا کہ یہاں کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ ملاقات کا وقت تک مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ دن تو آسان ہیں —— اتوار یوم الاحد ہے، اُس سے آگے انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ یہ بھی پتہ ہے۔ ایک بجے الساعۃ واحدہ ہوتی ہے۔ الساعۃ خمس پر پانچ بجتے ہیں لیکن جب کوئی الساعۃ واحدہ ونصف الا خمس دقائق کہہ کر چل دے تو فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بج کر پچیس منٹ کا وقت دیا ہے۔ یا الساعۃ اثنتان وثلث سے مراد دو بج کر بیس منٹ ہے ——"

"لیکن زبان تو سیکھنی پڑے گی ——"

میں نے منصور سے کہا کہ مقامی باشندوں سے ملنا چاہیئے اس طرح زبان سیکھنے میں آسانی رہے گی۔

"اب تم سے کئی ملیں گے ——" وہ مسکرا کر بولا۔

چنانچہ سلیم خود ملنے آیا۔ چھوٹے قد کا پلا ہوا چکنا چپڑا سا نوجوان، موٹی اُبھری ہوئی ناک۔ بازوؤں، کلائیوں، گردن اور کانوں پر بال ہی بال تھے مگر سر پر کچھ بھی نہیں تھا ——

"بزنس کے علاوہ اس سے کسی بھی موضوع پر بات کرو ——" منصور نے ہمیں مشورہ دیا۔

"مسعودی نے لکھا ہے کہ بغداد میں ——"

"مسعودی کون تھی ——؟" سلیم نے گھبرا کر پوچھا۔

"مسعودی کون تھا —— اپنے زمانے کا مشہور مورخ ——"

"مورخ تھا —— اچھا!"

"جب ابن بطوطہ بغداد آیا تو اسے یہ شہر پسند نہیں آیا۔"

"کیوں ——؟" وہ چونکا۔

"یہ اس کے سفرنامے میں پڑھئے ——"

"ابن بطوطہ کون تھا ——؟"

"سیاح تھا ——"

"سیاح تھا —— اچھا!"

بار بار —— کون تھا —— اور اچھا! دوہرائے گئے۔

اس کے جانے کے بعد منصور نے بتایا کہ یہ بغداد میں رہتا ہے —— وہیں نے کہا تھا کہ شہریوں سے ملنا بیکار رہے ——"

"مگر یہ آیا کس سلسلے میں تھا ——؟"

"سعدہ کا عاشق ہے تم سے ملنے آیا تھا"

"کہیں خفا تو نہیں ہوگیا ؟"

"نہیں —— پھر آئے گا۔"

اگلی دفعہ آیا تو اپنے ساتھ ایک موٹا تازہ چکنا گنجا دوست لایا جو سکول کا مدرس تھا۔ ذرا منصور نے چوٹ کی —— "یہ بتائیے کہ ہمارے بڑے بڑے عالم الاصفہانی، المصری، البیرونی البلخی، السندی، الخوارزمی کیوں تھے ؟ کوئی العراقی، البغدادی یا الموصلی بھی گذرا ہے ؟"

"الکردی بھی کوئی نہیں تھا ——" سلیم کا دوست بولا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دیجئے ——"

"عربی ادب کی جامع فہرست کیا البغدادی نے مرتب نہیں کی تھی ؟"

"لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بزرگ یہاں کے تھے یا یہاں کچھ عرصے کے لئے مقیم رہے تھے کیونکہ یہ کتاب قسطنطنیہ میں مرتب ہوئی تھی۔"

"مان لیا کہ بغدادیوں نے کچھ نہیں کیا۔ کردوں نے کون سے تیر مارے تھے ؟"

"کردوں نے چنگیز خاں کی فاتح فوج کو پہلی مرتبہ شکست کا مزہ چکھایا۔ اس کے بعد طولی خاں کو خوار کیا، اگر کرد اُسے نہ روکتے تو وہ سیدھے میں منگول شمالی افریقہ تک جا پہنچتے۔ کردوں نے چنگیز کے پوتے ہلاکو کو بغداد جانے والی شاہراہ سے نہیں گذرنے دیا —— مجبوراً اسے ایران سے ہو کر بغداد آنا پڑا۔ بغداد کو تباہ کر کے اس کی فوجیں ہماری پہاڑیوں کی طرف آئیں تو ہم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا ——"

"یہ تو آپ ساری قوم کا ذکر کر رہے ہیں —— کسی ایک کرد کا نام لیجئے ——"

"غازی صلاح الدین ایوبی جیسا عظیم انسان آج تک کسی اور ملک نے پیدا کیا ہے ——؟"

سلیم کا دوست خاموش ہو گیا لیکن سلیم نے گلا صاف کرتے ہوئے شکایت کی —— "جب جانتے ہو کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر ایسے سوال کیوں پوچھتے ہو —— اگر میں پوچھوں کہ چمڑے کا بھاؤ کیا ہے ؟ آج کل فولاد خریدا تو نفع ہوگا یا نقصان ؟ کپاس اور چاول کے نرخ کس طرف جا رہے ہیں تو پھر ؟"

واپسی پر منصور کہنے لگا کہ ہمارا گاؤں بھی دجلے پر ہے لیکن وہاں اور یہاں کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فرات کی طرح دجلہ بھی ترکی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ کردستانی پہاڑیوں کے بعد جب میدانی علاقہ آتا ہے تو دجلے میں دو دریا گرتے ہیں۔ جو ذرا لمبا ہے اسے الزاب الاعلیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو الزاب الاسفل۔ دمشق پچاس ساٹھ میل کے فرق پر کسی دریا کو سفل کہنا زیادتی ہے۔ شمال میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں دجلہ و فرات تقریباً آپس میں مل جاتے ہیں، میدانوں میں نہریں انھیں ملاتی ہیں پھر قرنا کے قریب دونوں واقعی مل کر شط العرب بن جاتے ہیں اور بالآخر خلیج فارس میں جا گرتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ قریب قریب رہیں۔ دونوں میں طغیانی آتی ہے۔ دونوں گدلے ہیں، دونوں ویرانے سے گذرتے ہیں، دونوں کے کناروں پر قدیم ترین تہذیبوں کے نشان ہیں —— فرق صرف اتنا ہے کہ فرات اور اس کے انگریزی نام یوفریٹیز میں کچھ مطابقت ہے لیکن دجلے کا ٹائیگرس سے قطعی کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح اسی علاقے میں آیا تھا اور یہ کہ باغ عدن قرنا کے قریب واقع تھا لیکن عدن والے مصر ہیں کہ ہمارے ہاں تھا۔ پرانے زمانے میں دونوں دریا علیحدہ علیحدہ سمندر میں گرتے تھے۔ آہستہ آہستہ مٹی سے دہانے اٹتے گئے۔ نئی زمین بنتی گئی اور سمندر دور ہوتا گیا۔

ان دریاؤں اور ان کی مٹی نے میسوپوٹیمیا یعنی دوآبے کو ہزاروں سال سے زرخیز بنائے رکھا۔ تقریباً چھ ساڑھے چھ ہزار سال پہلے دنیا کی سب سے پرانی قوموں کی ملاقات غالباً خلیج فارس کے ساحل پر ہوئی ـــــ یہیں مختلف نسلوں کے انسان آپس میں ملے۔ دراوڑ جو شاید ہندوستانی تھا مکران کی طرف سے آیا تھا، حامی، افریقہ سے اور منگول وسط ایشیا سے۔ یہاں سبزہ تھا، پانی کی افراط تھی۔ اُن دنوں نسل، رنگ اور نیشنلزم وغیرہ کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ لوگ متحمل تھے لہذا اکٹھے رہنے لگے اور انسان نے پہلا گاؤں دجلہ و فرات کے کناروں پر آباد کیا۔ لیکن بہت جلد دوآبے کی خوشحالی کی خبر اِدھر اُدھر پہنچ گئی، اور اغیار کشاں کشاں آنے لگے نسل انسانی آہستہ آہستہ مہذب ہو رہی تھی چنانچہ جنگیں شروع ہو گئیں۔ ۵۰۰۰ قبل از مسیح کے لگ بھگ پہیہ ایجاد ہوا تاکہ حملہ کرنے اور بھاگنے میں آسانی ہے تانبے کا استعمال شروع ہوا، آئینہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ میک اپ کا سامان ـــ تاکہ خواتین ہر جگہ لیٹ پہنچ سکیں۔

جنوبی علاقے میں سُمیرین لوگوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور سیلاب عظیم کی کہانی بیان کی (جو طوفانِ نوحؑ کے تذکرے سے ملتی جلتی ہے) پہلے اشیا کا مبادلہ اشیا سے ہوتا تھا، انھوں نے چاندی رائج کرکے "زر" کا ریکٹ شروع کیا۔ زر کے ساتھ لکھا پڑھی بھی لازمی تھی چنانچہ میخی رسم الخط جاری کرنا پڑا اور روپے پیسے کے سلسلے میں انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ان باتوں کے قصے جہاں جہاں پہنچے حملہ آور ساتھ لائے۔ شمال سے سامی لوگ آدھمکے، عکادیوں نے دیکھا دیکھی حملے شروع کئے جو چار سو برس تک جاری رہے (ایک دفعہ پہاڑیوں کی سمت سے حملہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا) حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ تنگ آکر سمیرین لوگوں کو باقاعدہ جنگِ آزادی لڑنی پڑی اور غیر ملکیوں کو بھگانا پڑا۔ انھوں نے دوبارہ آزاد ہو کر بابل بسایا۔

بابل کے معنی تھے 'دیوتا کا دروازہ'۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے بتایا کہ ان کی زبان میں بابل انتشار کو کہتے ہیں (یہودی ہمیشہ الٹا مطلب نکالتے ہیں) بابل کا شہر ہندوستان تک پہنچا تو ہندی حملہ کرنے کی بجائے 'بابل کے دیس' اور 'بابل مورا نیہر چھوٹو جائے' گا کر محظوظ ہوئے۔

سمیرین لوگوں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے کے لئے پہلی مرتبہ ثالث مقرر کئے (تنازعے چکانے کا یہ طریقہ پانچ ہزار سال سے استعمال کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ فیل ہوتا ہے)۔

ان لوگوں کو جنت و جہنم کے بارے میں کوئی علم نہ تھا چنانچہ ان کا مذہب فقط اسی دُنیا تک محدود تھا۔ ان کے مشہور بادشاہ حمورابی نے مٹی کی تختیوں پر اپنے ماتحتوں کو خطوط لکھوائے۔ اسے اپنی زندگی میں شبہ تک نہ ہوا کہ مکاتیب حمورابی کے ذریعے وہ دنیا کے اول ترین قوانین وضع کر رہا ہے۔ ان دو سو بیاسی قوانین کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کافی تہذیب یافتہ تھے کیونکہ ان کے ہاں انکم ٹیکس والے تھے اور رشوت اور سفارشیں قبول کرنے والے افسر بھی۔ حمورابی نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کیا ـــ آزاد لوگ، نیم آزاد اور غلام! (یہ تقسیم مدتوں تک رہی اور اب بھی ہے) ہر چیز کی قیمت مقرر کی گئی اور پبلک سے کہا گیا کہ ایک سے زاید شادی نہ کریں۔ تاقلوں کا کرایہ نامہ اور ٹائم ٹیبل بنایا گیا۔ قرض کے سلسلے میں سود رائج کیا گیا اور سزائے موت کی قسمیں واضح کی گئیں ـــ مثلاً زہر دینا، دریا میں ڈبونا وغیرہ۔ ٹھیکیداروں، طبیبوں اور آفیشل کارروائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا یعنی مکان کے قبل از گارنٹی گر جانے سے رہنے والے کا بچہ مر جائے تو مکان تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار کے بچے کو مار دیا جاتا تھا۔ بے توجہی یا لاپروائی کرنے پر طبیب کو نوٹس ملتا اور طبیب کام بگڑ کر دیتے تھے۔ طبیبوں کے پاس عمر پتیں تختیاں دستخطوں پر لگاتے تھے (اس زمانے کے نسخے نہایت مختصر ہوتے تھے مثلاً دانت کے درد کے لئے سورج مکھی کے بیج لگاؤ، پیٹ میں درد ہو تو دودھ پیو ـــ گنجے پن کے لئے سر پر شراب اور تیل کی مالش کرو) کسی کے پاس رقم یا جائداد ہو مگر اس کا دفتری ثبوت نہ ہو تو سزائے موت ملتی تھی تہمت لگا کر ثابت نہ کر سکنے پر بھی سزائے موت۔ جرمانے امیروں کے لئے زیادہ تھے اور غریبوں کے لئے کم۔

آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت ـــ والا مشہور قانون بھی حمورابی کا ہی تھا۔ ان سخت قوانین نے (جن میں غالباً سب سے نرم سزا موت کی تھی) رعایا کے حقوق اور ان کی ملکیت کی پوری پوری حفاظت کی اور عورتوں کو مردوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ وہ مردوں پر مقدمے دائر کر کے ان سے طلاق

ے سکتی تھیں، اور جائداد پر قبضہ کر سکتی تھیں۔

ان دنوں ایک خاص وضع کی عمارت بنانے کا عام رواج تھا۔ پختہ اینٹوں میں گھاس اور نرسل کی تہیں جما کر ایک عظیم الشان چبوترہ تعمیر کیا جاتا جس کی سات منزلیں ہوتیں، جو بلندی کے رخ سکڑتی چلی جاتیں ——اسے زگرت کہا جاتا۔ دن کو یہ مندر کہلاتیں اور رات کو اس کی سیڑھیوں سے ستاروں کا مطالعہ ہوتا۔ بابل کا مینار جو تباہ ہوا تھا اسی قسم کا تھا چند زگرت اب بھی موجود ہیں اور ان کی تہوں میں جمی ہوئی خشک گھاس اونٹ کھاتے ہیں۔

بیسویں صدی قبل از مسیح میں پھر ہڑبونگ مچی۔ شمال سے خانہ بدوشوں نے ہلّہ بول دیا (حطیطی آئے کیسیتی آئے) اور سمیرین حکومت تباہ ہو گئی۔ اس مرتبہ حملہ آور گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ بابل والوں نے پہلی مرتبہ اس جانور کو دیکھا تو اسے پہاڑی گدھا کہا (بابل والے شیر کو بڑا سا کتا اور موتیوں کو مچھلی کی آنکھیں کہا کرتے تھے غالباً انھیں غلط نام رکھنے کا شوق تھا) اس مرتبہ شمال میں دجلے کے کنارے بڑی مشقت پسند اور توانا قوم آباد ہو گئی، یہ اشور کو دار الخلافہ بنا کر اشوری کہلانے لگے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہر وقت لڑتے رہنا ہی بہترین دفاع ہے چنانچہ جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ وہ یہ کہ مار مار کر دشمن کا کچومر نکال دو (قیدیوں کا بھی) پھر مفتوحہ شہروں پر اچھی طرح ہل چلا کر بیان دے دو کہ ہمیں تو دشمن سے خطرہ تھا۔ اسی ڈر سے ہم اپنا دفاع کر رہے تھے۔

شروع شروع میں یہ ڈنڈے مار نظریہ خاصا کامیاب ثابت ہوا۔ بابل کو تلوار سے مطیع کرنے میں دیر لگی تو دریا کا رخ بدل دیا۔ شہر میں پانی آ گیا اور لوگ بھاگ نکلے۔ اس قدیم پایۂ تخت کو تباہ کر کے نئے دار الحکومت کی فکر پڑی۔ افسوس بھی ہوا کہ اگر زیادتی نہ کی ہوتی تو مناسب ترمیم و اضافے کے بعد بابل اچھا بھلا دار الحکومت بن سکتا تھا۔ آخر واپس شمال کی طرف گئے اور دجلے کے کنارے نینوا چنا جو معمولی سا گاؤں تھا۔ نئے شہر کی تعمیر کا فی الحال پڑی، جگہ جگہ دیواروں پر لمبی لمبی داڑھیوں والے شیر بنائے گئے جن کے کندھوں پر بڑے بڑے پر تھے (یہ شیر برٹش میوزیم میں رکھے ہیں) داڑھیوں والے بیل بھی نصب کیے گئے۔ (اشوریوں کو انسانوں سے زیادہ حیوان پسند تھے)۔

حمورابی کے قوانین منسوخ کرنے کے بعد انھوں نے دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ (اشوریوں کے طرفدار کہتے ہیں کہ بیچاروں کو اتنا کڑا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا کہ ادائیگی کے لیے مجبوراً دوسرے ملکوں میں لوٹ مار کرنی پڑتی تھی)۔ لیکن دوسرے ملکوں کو بھی اشوری فلسفۂ حیات معلوم ہو چکا تھا چنانچہ اشوریوں کی سلطنت سو برس بھی نہ چلی۔ نینوا کی تباہی پر (جو اشوریوں کے پسندیدہ طریقے سے شہر پر ہل چلوا کر کی گئی تھی) سارے ملک خوش ہوئے۔ اس واقعے کے دو سو سال بعد یونانی مورخ زینوفن نینوا سے گذرا تو وہاں نہ نینوا تھا نہ کوئی اشوری۔

ویسے اشوری اتنے برے بھی نہیں تھے، کبھی کبھی جب جنگ و جدل سے فرصت ملتی تو حطیطیوں کی لکھی ہوئی تختیاں اکٹھی کر کے فہرستیں بناتے۔ آخری اشوری بادشاہ اشور بنی پال نے دنیا کی پہلی لائبریری بنائی۔ لائبریری کے کھنڈرات سے بائیس ہزار پختہ مٹی کی تختیاں ملی ہیں (جو حسبِ معمول برٹش میوزیم میں ہیں)، فہرستِ کتب کے علاوہ اس کے مختلف سیکشن تھے —— مذہب، سائنس، تاریخ، ادب —— (لیکن مصنف اشوری نہیں تھے)۔ ہر تختی پر شاہی حکم درج تھا کہ اسے لائبریری سے باہر لے جانا منع ہے۔ ویسے بھی ایسی کتابوں کا چرانا کافی مشکل ہوتا ہوگا۔ اتنی وزنی چیز کوئی چھپا کر نہیں لے جا سکتا خصوصاً جب کتاب کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا بھی ڈر ہو۔

اب میدین لوگوں کی باری آئی —— یہ بڑی زبردست قوم تھی جب سیتھین لوگوں نے ان پر حملہ کیا تو لڑتے رہے ہار نہیں مانی حتیٰ کہ اٹھائیس برس گذر گئے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ (حملہ آور جنگ آ کر واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ عورتوں نے پہلے تو انتظار کیا پھر غلاموں سے شادیاں کر لیں۔ چنانچہ آقاؤں نے اپنے دار الحکومت کو گھیر کر تلواریں نکال لیں۔ غلاموں اور غلام زادوں نے مقابلہ کیا۔ کئی دنوں کی شدید لڑائی کے بعد کسی جہاں دیدہ بزرگ نے

مشورہ دیا کہ اپنے غلاموں سے برابر کا سلوک کرنا نری بے وقوفی ہے۔ بکل تلوار کی بجائے ڈنڈے، کوڑے اور ڈنڈے استعمال کرو۔ لہٰذا اگلے روز آقا کوڑے لیئے ہوئے آگے بڑھے اور غلاموں کو ڈنڈوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا — غلاموں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور مشہور ذہنیت کا ثبوت دیا۔

ساتویں صدی قبل از مسیح میں کلدانی آئے کیونکہ کلدانی دست غلامی سے نینوا پر ہل چلا چکے تھے اس لئے آتے ہی انھیں دارالحکومت کی فکر پڑی۔ نینوا کو از سر نو تعمیر کرنے میں جنگ ہنساتی کا ڈر تھا اس لئے مجبوراً انہوں نے بابل کو چنا۔ بابل جدید میں کلدانی بادشاہ بنوکد نظر نے چالیس برس تک حکومت کی جوانی میں کسی پہاڑی دوشیزہ سے شادی کر بیٹھا تھا جو ان تپتے ہوئے میدانوں میں پہاڑوں کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتی۔ بادشاہ نے بہتیرا سمجھایا بجھایا آخر اسے معلق باغات تعمیر کرنے پڑے جو بعد میں زمانۂ قدیم کے سات عجائبات میں شامل ہوئے۔ معلق باغات کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی ہیں کہ وہ کس وضع کے تھے جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے ملتے جلتے تھے (بعد میں حملہ آور جو ایران سے آئے تھے ان معلق باغوں کو دیکھ کر بہت ہنسے کیونکہ ایران میں لاتعداد ایسے باغ تھے جو معلق نہیں تھے۔ انھوں نے ان باغوں کو غیر فطری قرار دے کر تباہ کر دیا)

شاید ملکہ معلق باغات سے بھی مطمئن نہیں ہوئی کیونکہ ان میں پھول، پرندے، درخت وغیرہ تو تھے خنکی نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آکر بنوکد نظر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اس کے عہد میں علم ہیئت کو بڑی ترقی ہوئی اور دنیا کا پہلا کیلنڈر مرتب ہوا۔ پھر بادشاہ نے بیزار ہو کر دوروں پر جانا شروع کر دیا اور مصریوں کو شکست دی۔ پھر یروشلم کو تباہ کر کے اتنے سارے یہودی غلام ساتھ لے آیا کہ بغداد میں اب تک یہودی ہیں (یہودی ایک دفعہ کہیں آجائیں تو پھر واپس نہیں جاتے) ویسے یہ لوگ اشوریوں سے مختلف تھے اور مقابلتاً صلح پسند تھے۔ اور ان کی ایک کہاوت تھی کہ لوگ لڑ رہے ہوں تو کان دبا کر چپ چاپ ایک طرف نکل جاؤ ورنہ گواہ بننا پڑے گا اور عدالت میں جو درگت گواہ کی بنتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

بنوکد نظر نے دجلے پر بند تعمیر کیا۔ نہریں کھدوائیں۔ جہاں اس میں کئی خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا — ہر وقت وہ بابل ہی کی توسیع کرتا رہتا تھا۔ بسے بسائے شہر کو تین مرتبہ پھر بسایا۔ نئے محل بن رہے ہیں، سڑکیں چوڑی کی جا رہی ہیں، بلکہ اچھی بھلی سڑکوں کے اوپر بلا وجہ نئی سڑکیں بن رہی ہیں رعایا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا اور شہر کی سطح اونچی ہوتی گئی۔ شاید گمنامی کے ڈر سے اس نے ہر اینٹ پر اس قسم کے فقرے لکھوائے۔

"کیا میرا تعمیر کردہ بابل دنیا کا عظیم ترین شہر نہیں ہے؟"

"میں شاہ بنوپلیسر کا بیٹا شاہ بنوکد نظر والیٔ بابل ہوں"

یہ اینٹیں اب بھی موجود ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے سیاح اور مورخ کافی متاثر ہوئے زینوفن متاثر ہوا۔ پھر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس متاثر ہوا (ہیروڈوٹس بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا ... تبھی اسے بابائے جھوٹ بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً اس نے جنگ مراتھون میں شکست خوردہ ایرانیوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی ہے لیکن چند سال ہوئے وہاں فوجی مشقیں ہوئیں تو مراتھون کے میدان جنگ میں ایک بریگیڈ بھی پوری طرح نہیں سما سکا)

لیکن تشہیر سے فاتح کچھ اتنے متاثر نہیں ہوئے۔ ایرانیوں کے طاق کسریٰ میں بھی یہی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ عربوں نے بھی تعمیر کے سلسلے میں بنوکد نظر کے شہر کا ملبہ استعمال کیا۔ بہرحال اتنی ساری اینٹوں پر دستخط کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلدانیوں کے بادشاہوں کے پیچیدہ سے ناموں سے لوگ مانوس نہیں ہیں البتہ بنوکد نظر کو سب جانتے ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ اگر آج فرعون مصر میں آئیں تو اپنے اہرام، بت اور مندر دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے لیکن اس دوآبے کے قدیم بادشاہ آئیں تو انھیں سخت مایوسی ہوگی کیونکہ ان کی ایک نشانی بھی تو باقی نہیں رہی۔ مصر میں پتھر ہے اور یہاں فقط اینٹیں تھیں وہ بھی آدھی کچی آدھی پکی اور ساتھ ساتھ حملہ آوروں اور سیلابوں کی یلغار (مصری الگ تھلگ رہتے تھے اس لئے خوش تھے۔ انھیں مذہب اور اگلی زندگی کا شروع سے خیال تھا۔ (مصری بلیوں کو متبرک مانتے تھے

چنانچہ ایک مرتبہ عقلمند حملہ آور دآنحہ دس ہزار بلیاں ساتھ لے آئے اور جنگ شروع ہوتے ہی بلیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا تو مصریوں نے فوراً ہار مان لی۔

دوآبے کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اب زوال شروع ہو رہا تھا ـــــ

تین ہزار سال قبل دوآبے کے ایک شاعر کی نظم "قنوطیت" سے اس انحطاط کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

آقا اور غلام آپس میں باتیں کر رہے ہیں ـــــ

'خادم کچھ کہوں ؟'

'ارشاد! آپ جو فرمائیں گے بجا فرمائیں گے !'

'محبت کرنے کو جی چاہتا ہے ـــــ'

'ضرور کیجیے حضور! محبت دکھ درد بھلا دیتی ہے۔'

'نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے ـــــ'

'بہت اچھا کیا۔ محبت تو ایک پھندا ہے ایک بھیانک گہری غار ہے

اور عورت ایسی تیز تلوار ہے جو قریب آجائے تو موت یقینی ہے ـــــ'

'خادم کچھ کہوں ؟'

'فرمایئے ! میں حضور سے متفق ہوں ـــــ'

'مقدس پانی لاؤ وضو کر کے عبادت کروں گا۔'

'ضرور کیجیے حضور! عبادت سے دل صاف اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔'

'نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔'

'بہت اچھا کیا۔ بار بار گڑگڑانے سے دیوتا اکڑنے لگتے ہیں،

انھوں نے آپ کے لیے کیا کیا ہے جو آپ احسان مند ہوں ـــــ'

'خادم کچھ کہوں ؟'

'فرمایئے حضور! میں آپ کا ہم خیال ہوں۔'

'غریبوں کو خیرات نہ دی جائے ؟'

'ضرور دیجیے حضور! اس سے کئی گنا آپ کو ملے گا۔'

'نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے ـــــ'

'بہت اچھا کیا۔ سخی کا دیوالہ بھی نکل جائے تب بھی سائل مطمئن نہیں ہوتے،

قبرستان میں جا کر دیکھیے سخی اور کنجوس ایک ہی زمین میں دفن ہیں'

ـــــ کئی موضوع آتے ہیں لیکن یہ اکتاہٹ یہ بیزاری نہیں جاتی آخر طے ہوتا ہے کہ ہر شے بے معنی ہے۔ بیکار ہے۔ آخر تنگ آ کر آقا کہتا ہے ـــــ

'خادم کچھ کہوں ؟'

'ارشاد میں حضور سے متفق ہوں'

'اگر یہی زندگی ہے تو کیا کریں، خودکشی کر لیں؟'

'ہم مجبور بندے ہیں، کسی نے دنیا کو بھی جیتا کیا ہے، آسمان کو بھی چھوا ہے؟'

'تو پھر آج میں تمہیں مارتا ہوں، بعد میں خود مر جاؤں گا'

'بجا فرمایا جناب نے لیکن یہ خادم اپنے آقا کو دنیا کی مصیبتیں برداشت کرنے کو کیسے چھوڑ جائے؟'

کیوں نہ دونوں اکٹھے چلیں؟'

کلدانیوں نے اُر بھی بسایا تھا جو حضرت ابراہیمؑ کا گاؤں تھا اور جہاں انہیں خدا تعالیٰ کی موجودگی کا خیال آیا۔ اُر سے وہ اپنے طویل سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ (مغربی مورخوں نے شام اور دیگر ملکوں کے سفر کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے لیکن عرب کے بارے میں جان بوجھ کر خاموش ہیں)

اس مرتبہ جو حملہ آور آئے نہ انہیں کلدانیوں سے کوئی خاص دشمنی تھی اور نہ نئے دار الحکومت کی تلاش چنانچہ اخامنین (جنہیں ہخامنشی بھی کہا جاتا تھا) بابل کے پندرہ بیس ہزار آدمی مار کر، دس بارہ مندر اور پانچ چھ محل وغیرہ تباہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ دراصل اخامنین لوگوں نے اپنی اصل قوت اور سارا جوش و خروش یونانیوں کے لیے مخصوص کر رکھے تھے (جس کا بدلہ بعد میں سکندر یونانی نے لیا)۔

ملک کی حالت بری نہیں تھی، اصلاحات کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مگر حملہ آور جو ایران کے علاقے سے آئے تھے اہل بابل کی بہتری و بہبودی کے خواہاں تھے (جیسا کہ سب حملہ آور کہا کرتے ہیں)

انہیں جب کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو نہ ملی تو ناچار دنیا کی پہلی گھوڑا ایکسپریس شروع کی۔ جگہ جگہ گھوڑے بدلے جاتے۔ ایلچی ڈاک لے کر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ایک ہفتے میں طے کرتے تھے (ایلچی بھی بدلے جاتے ہوں گے)

ساتھ ساتھ آداب محفل، تکلفات، اور مسجع و مقفیٰ عبارت رائج ہوئی۔ بعد میں جب چنگیز نے ایک ایرانی کاتب سے کسی گورنر کے نام مختصر سا حکم نامہ لکھوایا تو کاتب فوراً دوسرے صفحے تک پہنچ گیا۔ چنگیز کو شبہ ہوا، بولا پڑھ کر سناؤ۔ کاتب نے بخدمت جناب عالی مآب بلند اقبال حضور گورنر صاحب سے شروع کیا تھا۔ مزاج، موسم، اور کنبے کا حال پوچھنے کے بعد درخواست کی تھی کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو حقیر چنگیز کی اس معمولی سی گذارش پر غور فرمایا جائے ——— چنگیز جو مختصر چنگیزی الکلام کا عادی تھا آگ بگولہ ہو گیا۔ کاتب کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ چنگیز نے آداب و القاب فوراً بند کرا دئے (جو اس کے جانے کے بعد فوراً واپس آ گئے) چنگیز نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہر شام لوگ شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مہینے میں تین دفعہ سے زیادہ مدہوش ہونا جرم ہے (اس کے جانے کے بعد یہ حکم بھی ختم ہو گیا)

سکندر اعظم پہلی مرتبہ بابل آیا تو دارا کا تعاقب کر رہا تھا ——— یہ وہ دارا نہیں تھا جس کی فتوحات مشہور ہیں۔ "کس لئے دارا مارا" والا بادشاہ دارا سوم تھا جس کے دربار میں بے شمار خواجہ سرا تھے۔

سکندر جلدی میں تھا۔ اگرچہ پجاریوں اور سفیروں سے ملاقات کے لیے اس نے وقت نکال لیا تھا۔ البتہ جب ہندوستان سے واپس آیا تو فرصت ہی فرصت تھی لیکن پہلے سے کافی بدل چکا تھا۔ ایرانی لباس پہنتا، بات بات پر بگڑ جاتا، وہمی ہو گیا تھا جب اس کے استاد ارسطو کے پوتے کیلستھنیز نے اسے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے مروا دیا۔ اس سے پہلے اپنے جگری دوست اور محسن کلائی ٹس کو خود اپنے ہاتھوں قتل کر چکا تھا۔

دجلہ عبور کیا ہی تھا کہ بابل سے وفد آیا اور معروض ہوا کہ دیوتاؤں کا یہ ارشاد ہے کہ آپ مغرب کی جانب نہ آئیں۔ کئی یونانیوں نے بھی پیشین گوئی کی کہ یہ سفر آخری سفر ہے۔ سکندر بابل پہنچا تو فصیل پر کوّے لڑ رہے تھے، ایک کوّا سکندر پر گر پڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا کہ بُرا شگون ہے اتنا واویلا مچا کہ سکندر شہر میں داخل نہیں ہوا۔ کبھی دریا کے کنارے کیمپ لگاتا، کبھی کشتیوں میں اِدھر اُدھر پھرتا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا، ذرا ذرا سی بات منحوس بن جاتی ہر واقعے میں بدشگونی اخذ کی جاتی۔ شروع شروع میں اس نے ایسے بدگو لوگوں کو مارا پیٹا بھی لیکن اس قماش کے لوگ کبھی باز نہیں آتے۔ ان سب نے مل کر سکندر کو یقین دلا دیا کہ آخری وقت قریب ہے۔ پھر جون ۳۲۳ ق م میں بخار چڑھا پہلے بھی کئی مرتبہ بخار چڑھا تھا لیکن تب اسے ایسی، وِٹ پتانگ پیشین گوئیوں پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا۔

نقاہت بڑھتی گئی۔ مرنے سے پہلے ساری فوج بسترِ مرگ کے قریب گذری آنکھوں سے ہر سپاہی کے سلام کا جواب دیا پھر دیکاس نے منہ نکالی اور پوچھا۔

"شاہی مہر کسے دی جائے؟"

"جو سب سے دلیر اور قوی ہو ——" یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

مغرب کے وقت سکندر انتقال کر گیا۔ چند روز بابل والے سہمے سہمے رہے کہ اب کوئی زبردست مصیبت نازل ہوگی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس جوانمرگ فاتح کو بھول گئے جس نے اُس زمانے کی دریافت شدہ ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ ان دنوں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو پھر بھی سکندر کا نام ہر شہر ہر قصبے میں بچے بچے کی زبان پر تھا جسے یاد کر کے جولیس سیزر اپنے گنجے سر پر ہاتھ مار کر کہا کرتا۔ "میں تو کچھ بھی نہ کر سکا —— اس عمر میں سکندر دنیا فتح کر چکا تھا۔"

سکندر کے جانشین سلیوکس نے سکندر کے آباد کیے ہوئے اٹھارہ اُنیس سکندریہ دیکھے تھے۔ وہ مدت سے منتظر تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی آباد کرے اس نے بابل کو خیرباد کہا اور دجلے کے کنارے اپنا سلوکیا بسایا۔ یہ شہر زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ دراصل سکندر کی عظمت سے سلیوکس کا تحت الشعور بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ یونانیوں نے دجلہ عبور کیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ رومن پیچھے رہ جاتے۔ ویسے بھی اپنی تہذیب و تمدن کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں پر حملہ کرنا رومنوں کی پرانی عادت تھی —— یہ ان کی انتہائی شرافت تھی ورنہ پسماندہ ملکوں کو کون پوچھتا ہے۔

لہٰذا مجبوراً انھیں دجلہ و فرات کی وادی میں آنا پڑا۔

ویسے اُن دنوں چین اور ہند سے دو آبے کے راستے گرم مصالحے، ریشم اور خوشبوئیں روم بھیجی جاتی تھیں۔ پلائنی (۷۹ء-۲۳ء) نے لکھا ہے —— آج کل روم میں لونگ، جائفل، دارچینی، کالی مرچوں کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ عورتیں ریشمی کپڑوں اور سامانِ آرائش کی منتظر رہتی ہیں۔" سلطنتِ روما کے اس رپورٹر نے اُس رقم کا بھی ذکر کیا ہے جو رومن اُن چیزوں کی خرید پر صرف کرتے تھے —— تقریباً دس لاکھ پاؤنڈ جتنی رومن کرنسی سالانہ —— (ان دنوں بھی اتنا ہی خرچ ہوتا ہے)

کہتے ہیں کہ رومن بادشاہ ترواجن کو سکندر ثانی کہلانے کا بڑا شوق تھا (یوسف ثانی بننے کی خواہش نے بھی بہتیروں کو خوار کیا ہے) ترواجن اسی راستے سے آیا جس سے سکندر آیا تھا، بالکل اسی سٹائل سے لڑتا ہوا دو آبے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے یاد آیا کہ سکندر ثانی بننے کے لیے ہندوستان پر بھی حملہ کرنا ہوگا۔ بیماریوں اور گرمی سے فوج کی بُری حالت تھی لیکن ترواجن کے حکم پر حملے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ آخر وہی ترواجن جس نے ڈینیوب کے کنارے چٹانوں پر یہ الفاظ کھدوائے تھے —— اس کٹھن علاقے کے سرکش اور جنگجو قبیلوں کو شہنشاہ ترواجن نے اپنی تلوار سے زیر کیا —— (یہ چٹانیں اور الفاظ اب تک موجود ہیں) —— وہ ترواجن خلیج فارس کے ساحل پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ (بادشاہ کے رونے کا ذکر مورخین نے بڑی وضاحت سے کیا ہے) واپس جاتے وقت ترواجن کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ پہلا رومن بادشاہ تھا جو اس علاقے میں تہذیب پھیلانے گیا تھا۔

ساسانی اپنے عروج کے لئے کافی عرصے سے منتظر بیٹھے تھے۔ دجلے کے کنارے خسرو اعظم اپنے محل طاق کسریٰ میں سارے غیر ملکی سفیروں کو اکٹھا کر کے اپنی موجودہ اور گزشتہ عظمت کے قصے سُناتا۔ سفیروں نے یہ کہانیاں اتنی مرتبہ سُنی تھیں کہ انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ سچی ہیں۔

طاق کسریٰ کی محراب اتنی اونچی تھی کہ آج تک اسے دنیا کی بلند ترین محراب سمجھا جاتا ہے (نہ جانے طاق کسریٰ کی عظیم محراب میں ایسی کیا کشش تھی کہ ہر ایک کا یہی جی چاہتا تھا کہ اسے ڈھا کر برابر کر دے۔ فتح کے بعد عربوں نے اسے مسمار کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن کسی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بعد میں جب منصور نے قریب ہی بغداد آباد کیا تو اینٹوں کے لئے محراب کو تڑوانا شروع کرا دیا۔ لیکن محکمہ مالیات نے بتایا کہ اس طرح توڑ پھوڑ کر بیس میل سے اینٹیں منگوانے کی بجائے بغداد میں اینٹیں بنانا سستا رہے گا۔ لہٰذا یہ محراب بچ گئی)۔

ساسانی بادشاہ سردیاں یہاں گذارتے اور گرمیاں ایران کے پہاڑوں میں۔ جب بادشاہ موسم کے الٹ پھیر میں دارالحکومت بدلنے لگیں تو ضرور کچھ ہو کے رہتا ہے ——— چنانچہ عرب آ گئے۔ خالدؓ بن ولید نے تیرہ مہینوں میں پندرہ جنگیں لڑیں اور ہر مرتبہ فتح پائی۔ کچھ ساسانیوں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور خوش فہمی انھیں لے ڈوبی۔ ہرمز خالدؓ سے لڑنے آیا تو بے شمار زنجیریں ساتھ لایا تاکہ عرب قیدیوں کو گرفتار کر کے لے جانے میں آسانی رہے۔ دجلے کے کنارے ابلہ کے مقام پر نہ صرف ہرمز کو شکست ہوئی بلکہ انہی زنجیروں سے ساسانی باندھے گئے (جنگ قادسیہ میں ساسانیوں کا کمانڈر مشہور پہلوان رستم تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اکھاڑے کی پہلوانی اور چیز ہے اور جنگ اور چیز)

دلیری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ اصلی جنگ سے پہلے "سنگل" ہوا کرتے۔ کوئی سورما نکل کر مخالف لشکر کو للکارتا ——— "ہل مبارز منکم" (کوئی ہے جو سامنے آئے) پھر دونوں فوجوں کے سامنے مقابلے ہوتے۔

(یورپ نے نقل شروع کی تو "ڈوئل" رائج ہوئی۔ لیکن بعد میں اُنھوں نے ڈوئل کا مذاق بنا لیا اور جرمنی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نکلنے لگے ——— "بہادرو! چہرے پر ڈوئل کے نشان لگوانا چاہتے ہو تو فلاں جراح کی خدمات حاضر ہیں، جو آپ کے ماتھے یا رخسار پر تلوار کے زخم نہایت چابکدستی سے بنا دے گا")

اُس زمانے میں بادشاہ لڑتا تو اگلی صف میں ہوتا تاکہ سپاہیوں کے حوصلے بلند رہیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے یا مر جانے سے جنگ پر فیصلہ کن اثر پڑتا تھا لیکن بعد میں بادشاہ اس لئے پیچھے رہنے لگے کہ کہیں اُن کی موت پر لشکر بددل ہو کر بھاگ نہ نکلے۔

عرب فاتح جلدی میں تھے۔ دوآبے کو عراق عرب اور عراق عجم میں بانٹ کر بصرے اور کوفے میں نئی چھاؤنیاں بنا کر شمال کی طرف تیزی سے نکل گئے۔ آرمینیا اور کاکیشیا میں سپاہیوں نے پہلی مرتبہ سنہرے اور سرخ بالوں والی لڑکیاں دیکھیں ——— بعد میں کاکیشیا کے پہاڑ کوہ قاف اور یہ لڑکیاں کوہ قاف کی پریاں مشہور ہوئیں۔ عربوں کی سلطنت پھیلتی گئی اور پرانی رومن سلطنت سے بڑھ گئی۔

عرب خانہ بدوش تھے۔ اونٹ کے بالوں سے بُنا ہوا خیمہ ان کے لئے بہترین عمارت تھی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ اپنے خیموں کے لئے نفیس ترین عمارتوں کے شہتیر کھینچ لیا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے بڑی مفید باتیں لکھی ہیں ——— اس نے کہا ہے کہ آرٹ کبھی تخلیق نہیں ہوتا جب تک کہ آرٹسٹ نہ ہوں اور یہ کہ قوم بننے میں تین پشتوں کا عرصہ یعنی تقریباً ایک سو برس لگتے ہیں اور یہ کہ فقط جفاکش اور جنگجو قوم حکومت کر سکتی ہے۔ فتح کے بعد جب جاہ و حشمت اور مال و دولت اس قوم کو تن آسان اور آداب و تکلفات کی طرف لے جاتے ہیں تو فوراً کوئی توانا اور جیالی قوم ان سے حکومت چھین لیتی ہے اور مفتوح قوم فاتحین کی ہر بات کی نقل کرتی ہے۔ ہارے ہوئے لوگ فاتحین کا لباس، ان کی غذا، رسمیں، آداب ——— ہر چیز غیر شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں کہ شاید انہی کی بدولت فاتحین نے انھیں شکست دی تھی۔

فتوحات کھلی ہواؤں میں رہنے والے عربوں کو شہروں اور قصبوں میں لے آئیں تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ پریشانی بجا تھی کیونکہ آبادیوں میں کاشتکاری ہوتی تھی۔ پانی کی وجہ سے مچھر تھے جن سے بخار چڑھتا تھا اور شہروں میں طرح طرح کی بیماریاں تھیں۔

خلفائے بنی امیہ دمشق میں رہے لیکن صحرا اور نخلستانوں کی محبت دل سے نہ گئی۔ شکار یا دورے کے بہانے صحرا میں نکل جاتے۔ ان کے صحرائی محلوں کے کھنڈر اب تک موجود ہیں لیکن عباسیوں نے بغداد بسا کر شہری سکونت اختیار کی۔ آہستہ آہستہ بود و باش، طرزِ تعمیر، ہر چیز پر ساسانی رنگ آ گیا۔ دیوانِ عام کی جگہ دیوانِ خاص نے لے لی۔ افسروں سے ملنے سے پہلے درخواست دینی پڑتی تھی اور ان کے سامنے درباری آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔

بغداد بین الاقوامی شہر بن گیا۔ ہارون الرشید نے شارلیمین کو ایک کلاک اور ہاتھی بھجوایا (مورخ لکھتے ہیں کہ ہاتھی نے سنہ ۸۱۰ء میں جرمنی میں انتقال کیا ـــــ شارلیمین کا انتقال بعد میں ہوا۔)

نہر سویز کا خیال سب سے پہلے ہارون الرشید کو سوجھا تھا۔ موجودہ نہر کی کھدائی سے ہزار سال پہلے اس نے متعلقہ علاقے کی پیمائش کرائی تھی۔ ویسے ان دنوں بھی بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم چند نہروں کے ذریعہ آپس میں ملے ہوئے تھے۔

ہارون نے بازنطینیوں سے جنگیں لڑیں۔ بازنطینی ہر بار صلح کر لیتے اور عرب فوج کے واپس بغداد پہنچنے سے پہلے صلح نامہ منسوخ کر کے پرانی حرکتوں پر اتر آتے (شاید اس لئے کہ یہ فاصلہ کئی مہینوں میں طے ہوتا تھا)

عرب پھر حملہ کرتے، ایک اور صلح نامہ ظہور میں آتا اور فوراً بازنطینی لڑکیوں کی شادیاں عربوں سے کی جاتیں (یہ موقع شناس لڑکیاں بڑے سلیقے سے سسرال والوں کو رواداری کی تلقین کرتیں) عربوں کی تاریخ پر مغربی بیویوں نے بھی اچھا خاصا اثر ڈالا ہے۔

ایرانی سول عہدوں پر تھے، عراقی یا تجار تھے یا طالب علم۔ اس لئے خلیفہ معتصم نے مجبوراً غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس نئی فوج کے لئے جو ملوکوں اور وسط ایشیا کے قبائلیوں پر مشتمل تھی، ساٹھ میل اوپر دجلے کے کنارے سامرہ آباد کیا گیا۔ جو دارالخلافہ بن گیا۔

ریت سے اَٹا ہوا سامرہ ہوائی جہاز سے اب بھی ایک ماڈرن شہر دکھائی دیتا ہے ـــــ اس میں RACE COURSE ہے، شاپنگ سنٹر ہیں، اور ماڈل ٹاؤن بھی (ادھر مستطیل، اُدھر مربع، یہاں دائرہ، وہاں تکون ـــــ ہر جگہ جیومیٹری کے خطوط دکھائی دیتے ہیں۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ سامرہ کے بسنے کے ساتھ ہی خلافت کا زوال شروع ہو گیا۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن آج تک جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں، وہ تین سو برس سے زیادہ نہیں رہیں۔ شاید قدرت نے یہی عمر مقرر کر رکھی ہے۔ اس کے بعد اقتدار کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہانے سینکڑوں بن جاتے ہیں ـــــ باہمی خانہ جنگی، کسی نئی قوم یا فرقے کا عروج بعض اوقات کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی۔ سلطنت روما کے زوال پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل ہوا کیا تھا۔ کئی سلطنتیں تو بڑی بڑی جنگیں جیتتے جیتتے ختم ہو جاتی ہیں۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے سولہ لاکھ کو قتل کیا۔ دریا رواں رہے، نہریں بہتی رہیں لیکن ہل چلانے والا کوئی نہ رہا۔ زرخیز زمین دوبارہ بنجر ہو گئی (بیسویں صدی کے شروع میں سر ولیم ولکاکس نے حکومت ترکیہ کو رپورٹ بھیجی کہ عراق میں نئی نہریں کھودنے کی بجائے اَٹی ہوئی قدیم نہروں کو ٹھیک کرا لیا جائے)

تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا۔ آخر خلافت بغداد سے قاہرہ منتقل کی گئی اور وہاں سے قسطنطنیہ، اور پھر خلافت بالکل ختم ہو گئی۔

خلافت بغداد کو تباہ کر کے ہلاکو کی اولاد نے پچاس سال کے اندر اندر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی آ گئے۔ پھر ترک آئے جو کئی سو برس رہے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بصرے میں دفتر کھول لیا۔ ایک جہاز SEA HORSE بصرے میں آیا، اس کا ایک جہاز راں گرمی کی شدت سے اس قدر نڈھال رہنے لگا کہ ڈاکٹروں کو مجبوراً اسے انگلستان واپس بھجوانا پڑا ـــــ یہ نیلسن NELSON تھا۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑتے کافی عرصہ ہو چکا تھا ـــــ وہ ترکوں کے خلاف لڑے۔ جب جنرل ایلنبی ALLENBY دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے "آل نبی! آل نبی!" کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں برطانوی ایجنٹ GERTRUDE BELL نے بغداد سے اپنے رشتہ داروں کو خط لکھا کہ "آپ حیران ہوں گے کہ بغداد میں میں اتنی مقبول ہوں کہ سب مجھے اُم المومنین کہتے ہیں، لہٰذا میرا یہاں قیام بے حد ضروری ہے، میں انگلینڈ نہیں آ سکتی ـــ"

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی وقفے کے حالات ذرا پیچیدہ ہیں اور انہیں فقط سیاست دان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بغداد کا شہر دجلے کے ساتھ ساتھ یوں چلا گیا ہے کہ اس عرض و طول میں ایک اور تیرہ کی نسبت ہے۔ فقط شمالی حصّے (کاظمین شریف) میں قدیم بغداد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ورنہ بالکل بغداد آ جدید بن چکا ہے۔ پرانی عظمت کی نشانیاں گنی گنائی رہ گئی ہیں، منہدم محل، چند مینارے یا وہ زمین دوز لائبریری جس میں ہلاکو نے دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا۔

مشہور جغرافیہ داں یعقوبی نے لکھا ہے ـــ خلیفہ منصور دورے پر تھا کہ ایک گاؤں کے پاس رُکا اور اپنے ہمراہیوں سے گویا ہوا ـــ "یہ گاؤں بہت بڑی تجارتی منڈی بن سکتا ہے۔ دجلے کے ذریعے آرمینیا اور آذربائیجان سے سامان آئے گا اور فرات کے ذریعے شام، مصر اور شمالی افریقہ سے۔ ہند اور چین کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوں گے۔ اصفہانی اور خراسانی تجار سڑکوں سے پہنچیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے شہر کا بنانا میرے سپرد ہوا ہے ورنہ مجھ سے پہلے کتنے یہاں سے گذرے اور کسی کو خیال تک نہ ہوا۔"

منصور نے دجلے کے مغربی کنارے پر مدینۃ السلام کی بنیاد رکھی۔ شہر آباد ہوا تو لوگ اسے منصوریہ کہنے لگے (منصور کا شہر تھا تو دجلے پر لیکن پانی فرات سے آتا تھا) پبلک نے فوراً اسلاٹ ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن بنائے۔ مشرقی کنارے پر محلہ آباد ہوا الجہر رصافہ ـــ دیکھتے دیکھتے منصور کا اصلی شہر بالکل گم ہو گیا۔

لفظ بغداد کو کچھ لوگ تو نوشیرواں کے پرانے شہر باغ داد سے ملاتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ بابل کے وقتوں میں یہاں ایک گاؤں بغدادو آباد تھا۔

جب معتصم نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لئے (جن میں بیشتر غیر ملکی تھے) سامرہ آباد کیا تو بغداد کی اہمیت کم ہو گئی (معتصم کے زمانے میں ہندوستان سے سترہ ہزار جاٹ بغیر بلائے یا اطلاع دیے آ گئے تھے۔ عربوں نے انہیں الزط کہا اور ان کی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے تنگ آ کر انہیں سلیشیا کی سرحد پر بھیج دیا۔ جہاں وہ خانہ بدوشوں میں خلط ملط ہو گئے ـــ یا خانہ بدوش اُن میں خلط ملط ہو گئے ہوں گے۔

المتوکل نے سامرہ میں پونے تین سو گز لمبی پونے دو سو گز چوڑی مسجد تعمیر کی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ مسجد سے کہیں خوشنما اس کا مینار تھا جو بابل کے مینار کی نقل تھی۔ دو سو فیٹ اونچے مینار کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے سیڑھیوں کی جگہ ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی اور سوار گھوڑے سمیت مینار پر چڑھ سکتا تھا۔ یہ مینار اب بھی ہے لیکن کٹہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھتے وقت چکر آتے ہیں۔

لیکن پھر متوکل نے شمالی سمت میں ایک نیا دارالخلافہ الجعفریہ تعمیر کر لیا تو سامرہ یکا یک سنسان ہو گیا۔ نئی جگہ دنگے فساد ہوتے تھے۔ سال بھی نہ گذرا تھا کہ متوکل کو پھر سامرہ آنا پڑا۔ وہاں سے پچاس سال اور آٹھ حکمرانوں کے بعد سب واپس بغداد آ گئے۔

بغداد نے بڑی ترقی کی۔ عرب ملاح دور دور تک نکل گئے (چند سال ہوئے روس، سویڈن اور جرمنی میں قدیم عربی سکے ملے)

یونیورسٹیاں اور دارالحکما قائم ہوئے۔ یونانی علماء کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ بغداد علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اس عہد زرّیں کے علماء اور ماہرین کے نام تاریخ کی دھند میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں (بیسویں صدی میں سارٹن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ سائنس" میں الفارابی کو دنیا کا سب سے بڑا منطقی، ابو کامل (جنھوں نے الخوارزمی کے الجبرے کی تکمیل کی) اور ابراہیم بن سنان کو سب سے بڑے ریاضی داں، المسعودی کو عظیم ترین جغرافیہ داں اور طبری کو سب سے ممتاز مورخ قرار دیا ہے۔ عربوں کا ایجاد کردہ موتیے کا آپریشن اٹھارویں صدی تک جرمنی اور انگلستان میں رائج رہا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترھویں صدی

تک بوعلی سینا اور رازی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ بوعلی سینا کی معرکۃ الآرا کتاب "القانون فی الطب" کو ڈاکٹر اوسلر نے طبی انجیل کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کسی اور طبی کتاب نے دنیا پر اس قدر اثر نہیں ڈالا جتنا کہ اس نے۔

اس زمانے کے جینئس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے بیک وقت سائنس داں، ہندسہ داں، فلسفی بھی ہوتے تھے شاعری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا (آج کل کے انٹلکچوئل حضرات کی طرح نہیں کہ پندرہ بیس کتابیں پڑھ کر عینک لگائی، بال بڑھائے اور چھوٹے بن کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی)

بغداد کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی، یہاں سے حکمنامے جاری ہوتے تھے، خطابات عطا ہوتے تھے۔ شمس الدین التمش نے ہندوستان سے اپنا نمائندہ بغداد بھیجا اور حکومت کرنے کی اجازت مانگی۔ تب خلیفے نے سیاہ عبا، انگوٹھی اور عصا بھیجے تب التمش نے اپنے نام کے ساتھ سلطان لگایا۔ مملوکوں نے خراسان فتح کیا تو خلیفے نے مبارکباد بھیجی اور یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات عطا فرمائے بعد میں طغرل بیگ کو ملک المشرق والمغرب کا اعزاز دیا لیکن پتہ نہیں پبلک کو کیوں شبہ ہے کہ اعزازات و خطابات محض انگریزوں نے شروع کئے تھے۔ مسلمانوں نے بھی "تاج" پہنے ہیں لیکن لوگ CROWN سے اب تک خفا ہیں) کئی سو برس بغداد سے گزرے۔ بارھویں صدی میں ابن جبیر آیا تو آس پاس کے گرد و نواح میں جگہ جگہ نہریں اور پل ملے لیکن بغداد میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ باشندے بھی خشک سے لگے لیکن وہ بغداد کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے "بغداد میں حسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوف خدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔"

مارکوپولو نے موصل کے تاجروں کو موصلینی لکھا ہے (جو مسلین سے کافی ملتا ہے) اور بغداد کو بوداز، بصرے کو بلسرہ اور ہلاکو کو الاؤ۔

افواہ ہے کہ مارکوپولو نے اس علاقے کے بارے میں محض سنی سنائی باتیں لکھی تھیں۔ مثلاً اس نے بغداد کے بالکل سامنے ایک بڑے پہاڑ کا ذکر کیا ہے حالانکہ وہاں اتنی سی پہاڑی بھی نہیں ہے اور جو الاؤ کے حملے اور بوداز کی تباہی کی داستان لکھی ہے وہ سنسنی خیز جاسوسی ناولوں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ مارکوپولو نے یہ وقائع نویسی تیرھویں صدی میں کی تھی لیکن اس کے باوجود مغرب میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کو شک و شبہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ چودھویں صدی کے شروع میں آیا۔ پہلے بصرہ پہنچا، پھر خلیج فارس کے ساحل پر۔ وہاں سے بغداد کا پروگرام بنا تو معلوم ہوا کہ اسی بصرے والے راستے سے دوبارہ گذرنا ہوگا۔ لہذا مجبوراً ایران کی طرف سے سینکڑوں میل کا فالتو چکر لگا کر بغداد پہنچا۔

"جس راستے سے ایک دفعہ گذر جاؤں اس پر دوبارہ قدم نہیں رکھتا" اس نے سفرنامے میں لکھا ہے۔ بغداد پہنچ کر دیکھا کہ قدیم عمارات منہدم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے غلط عربی بولنی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا کہ تاتاری اور ترک حکمران فرمان جاری کرتے ہیں تو اس طرح شروع کرتے ہیں — "سلطان فلاں اور خاتونوں (بیویوں) کے حکم سے جاری ہوا" — (جیسا کہ دور جدید میں ہوتا ہے) — ابن بطوطہ جیسا سیاح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس نے جو سیاحت چودھویں صدی میں کی تھی اس پر بیسویں صدی میں بھی رشک آتا ہے۔ ایک دن گھومنے نکلا تو لگاتار بیس سال سیر کرتا رہا، مشرق وسطیٰ، ہندوستان، لنکا، چین، وسط ایشیا اور قسطنطنیہ دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو یاد آیا کہ اسپین اور افریقہ کے اندرونی علاقے رہ گئے ہیں، چھ برس کے لئے پھر نکل گیا۔

بغداد میں ان دنوں دو سلطان دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے بغداد کے قیام کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا کہ ان سلطانوں اور ان کی چپقلش کا آخر ایک دن دو سلطان ابو سعید (جس کی بیوی کا نام بغداد خاتون تھا) کے محلے کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ محلہ ان دنوں چلتے پھرتے کیمپ کو کہا جاتا تھا۔

سیاحت کے دوران میں اس نے لیکچر دیئے، ملازمتیں کیں، بادشاہوں کا سفیر بنا، جگہ جگہ شادیاں کیں لیکن جہاں کوئی باہر جانے والا جہاز یا قافلہ نظر آ جاتا تو منصب دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ساتھ ہو لیتا۔ سیاحت اسے سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھی۔

بصرے سے سندباد نکلا اور خلیج فارس کا رخ کرتا۔ ان دنوں سندھ "البند" تھا، ہند "الہند" اور قلات "کیکان" یہاں تک کہ دریائے اٹک "نہر مہران" تھا نہ زر مبادلہ کی بندشیں تھیں اور غالباً CUSTOMS والے بھی اچھی طرح پیش آتے ہوں گے تبھی سندباد اتنی مرتبہ سفر کر سکا ہوگا۔

منصور ایک مصنف جعفری کی کتاب لایا جو الف لیلہ کی پیروڈی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ وہی جعفر ہے۔ جو ہمارے ہاں جعفر زٹلی کے نام سے مشہور ہے ہمیں علم نہ تھا کہ الف لیلہ کی بھی پیروڈی ہوئی ہے لیکن جعفر زٹلی کی تحریروں میں جی جانے پہچانے الف لیلوی واقعات اور کردار ملے۔ مثلاً ایک باغ میں کچھ لوگ پک نک منا رہے ہوتے ہیں۔ دفعتاً ایک بیل بھاگا بھاگا آتا ہے جس کے تعاقب میں ایک بوڑھا لگا ہوا ہے۔ باغیچے کو دیکھ کر تھکا ہارا بوڑھا ایک طرف بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگتا ہے اور بیل اگلے قطعے میں گھاس چرنا شروع کر دیتا ہے۔

لوگوں نے بوڑھے سے علیک سلیک کی کوشش کی لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر کھانے کی دعوت دی اس پر بھی خاموش رہا۔ آخر انھوں نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے، بوڑھے نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ اس کی کہانی اس قدر غمناک ہے کہ خاموش رہنا بہتر ہوگا۔

سب نے اصرار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں وزیر کی حسین و جمیل لڑکی پر عاشق تھے لیکن لڑکی اتنی رحمدل تھی کہ کسی ایک سے شادی کر کے بقیہ دو شہزادوں کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی چنانچہ وہ تینوں لگاتار شادی کے طلبگار رہے اور لڑکی خاموش رہی۔ اتفاق سے تینوں شہزادے حسن و جمال، تعلیم، شہسواری، تیراندازی اور دیگر فنون سپہگری میں ایک دوسرے کے ہمسر تھے۔ جب شہزادوں نے کام کاج چھوڑ کر آہ و بکا میں وقت صرف کرنا شروع کر دیا تو بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اب شادی کا فیصلہ فوراً ہو جانا چاہیے۔ لیکن لڑکی بدستور خاموش رہی۔ اُدھر شہزادوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی۔ آخر بادشاہ کو طیش آیا اور اس نے وزیر کو خبردار کیا کہ اگر کل شام تک فیصلہ نہیں ہوا تو ایک نیا وزیر اس سے چارج لے لے گا۔ وزیر شہزادوں کو باہر لے گیا۔ اُن کا تحریری اور زبانی امتحان لیا، تینوں برابر نکلے۔ پھر نیزہ بازی کرائی، چھلانگیں لگوائیں، دریا میں تیرایا، سارے جتن کئے لیکن اگلے سہ پہر تک تینوں کے نمبر یکساں تھے۔ ڈوبتے سورج کو دیکھ کر وزیر بہت گھبرایا، پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بچھڑا نظر آیا۔

وزیر نے فوراً نعرہ لگایا۔ "جو اس بچھڑے کو پکڑ لے وہ جیت گیا۔"

تینوں شہزادے سرپٹ بھاگے۔ اُدھر بچھڑے نے زقند بھری اور تعاقب شروع ہو گیا۔ آگے گیلا کھیت تھا جس میں ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ پیچھے رہ گیا۔ پھر جنگل آیا جس میں بچھڑے نے دونوں شہزادوں کو خوب چکر دیئے۔ اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک شہزادہ کسی اور رُخ میں نکل گیا۔ اب ایک شہزادہ رہ گیا جو پوری مستعدی سے تعاقب کر رہا تھا۔ اُدھر بچھڑا تھا کہ قریب نہ آنے دیتا تھا ——— وہ دن اور آج کا دن ——— مدتیں گذر چکی ہیں ——— وہ بچھڑا پورا بیل بن چکا ہے اور آپ کے سامنے گھاس چر رہا ہے ——— میں بھی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں لیکن تعاقب جاری ہے ———"

سب نے دیکھا کہ بیل گھاس چر کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اچھا تو حضرات خدا حافظ!" کہہ کر بوڑھا بیل کے پیچھے ہو لیا۔

یہ اور ایسی کئی اور کہانیاں ہم نے پڑھیں۔ اگلے روز میں اور دو مقامی حضرات باہر سے واپس کیمپ آ رہے تھے، یکایک انھوں نے گھبرا کر بتایا کہ ہم سب خطرے میں ہیں۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے لاری کی رفتار تیز کرنی چاہی تو انھوں نے چلتی لاری سے کودنے کی دھمکی دی۔ آخر روکنا پڑا۔ چاروں طرف دیکھا، کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ چکے تھے۔ میں نے ایک ٹیلے کے اوپر لاری چڑھانی چاہی تاکہ اونچی جگہ سے دیکھ سکیں۔

"مت جاؤ۔ خطرہ ہے!" وہ دونوں چلائے

ٹیلے کے اوپر سے ایک طرف وادی سی دکھائی دی جہاں کچھ درخت اور خیمے تھے۔ ایک طرف سے غبار اُٹھا۔ نعروں کی آوازیں آئیں اور گولیاں چلنے لگیں پھر ریت کے بادلوں میں سب کچھ چھپ گیا۔ چند سوار بندوقیں لئے تیزی سے ایک طرف نکل گئے اور غبار سا چھا گیا۔ پھر اونٹ اور سوار دوسری طرف جاتے دکھائی دیئے، چند گولیاں چلیں اور سوار اور بھیڑیں دکھائی دیں۔ کبھی اونٹ اور آدمی سامنے آ جاتے، کبھی بھیڑیں اور آدمی تو کبھی اونٹ

اور بھیڑیں ـــــ ساتھ ساتھ نعرے اور گولیوں کی آواز ـــــ پھر یہ سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔

جب گرد صاف ہوئی تو ایک طرف اونٹ کھڑے تھے۔ دوسری طرف بھیڑیں اور آدمی گھوڑوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ نہ کوئی زخمی نظر آیا، نہ کسی کا انتقال ہوا تھا۔

اپنے دونوں ساتھیوں کو سنبھالا جو ابھی تک تھر تھر کانپ رہے تھے۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جان بچ گئی ـــ ابھی دو فریقوں میں خونریز لڑائی ہوئی تھی۔"

کیمپ پہنچ کر یہ واقعہ منصور کو سنایا۔ وہ حقارت سے بولا ـــ "شہری ہوں گے۔ یہ لوگ ڈینگیں مارنے کی غرض سے بوگس لڑائیاں اسٹیج کرتے ہیں جو درحقیقت لڑائی کی پیروڈی ہوتی ہے۔ کبھی تمہیں پہاڑ والوں کی اصلی لڑائی دکھائیں گے، تم یقیناً خوش ہو گے ـــ"

ڈوز بولا ـــ "عجیب اتفاق ہے ـــ کل ہم نے ایک پیروڈی پڑھی تھی اور آج تم نے ایک اور پیروڈی کا نظارہ کیا ـــ"

"یہ فقط بغداد کے گردونواح ہی میں ہو سکتا ہے ـــ" منصور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

سلیچر کی شام کو منصور بھی ہمارے ساتھ بغداد گیا۔ آج خاص پروگرام تھا۔ پبلک کے پُرزور اصرار پر عفیفہ مجیدہ اپنے مقبول اور ہر دلعزیز نغمے سنانے والی تھی۔

وہ مائکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں گانا کم تھا اور مٹکنا تھرکنا زیادہ۔ مجیدہ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چُست۔ بازو تھرکتے، گردن ہلتی، کمر مٹکتی، سارا جسم بل کھاتا ـــ کبھی کبھی چھوٹا سا مصرعہ زبان پر آ جاتا ـــ

"کیا جذبات ہیں! ـــ کیا اظہار ہے ـــ! ـــ واللہ ـــ" جرجیس جھوم جھوم جاتا۔

"کون سے جذبات؟ اور کون سا اظہار؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دجلے کا رقص ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہو رہا ہے ـــ واللہ!" جرجیس نے جواب دیا۔

گانا ختم ہوا تو خاموشی طاری ہو گئی۔ مجیدہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاباش ملے گی لیکن ہجوم ایک اور فربہ و توانا خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے بھڑکتا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور جو کسی موزوں جگہ کی تلاش کے بہانے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھی اور اُدھر سے اِدھر۔

جب خاتون بیٹھ گئی تو ہجوم مجیدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ یکایک مجیدہ کی سامنے والی میز سے ایک فلک شگاف ڈکار بلند ہوئی جو اس امر کا زندہ ثبوت تھی کہ کوئی صاحبِ دل آرٹ کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہ سکتا۔

مجیدہ نے ایک اور نغمہ چھیڑا۔ ہم نے دیکھا کہ باہر دو شیخ اونٹوں سے اُترے۔ اندر آ کر گانے والی کو کچھ دیر بغور دیکھا، ہاتھ ملا کر عربی میں نعرہ لگایا اور واپس چلے گئے

"انھوں نے آپس میں کیا کہا تھا؟" ڈوز نے پوچھا۔

"انھوں نے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ الحمد للہ عفیفہ مجیدہ ابھی تک فربہ ہے" منصور نے بتایا۔

"ضرور دیہاتی ہوں گے ـــ" ایک طرف سے آواز آئی۔

پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سلیم چند چکنے چپڑے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔

سلیم کہنے لگا ـــ "اس پہاڑی کا قصہ تو سنا ہو گا جس کو عبادت کرتے کرتے اچانک کوئی مسافر نظر آ گیا۔ فوراً عبادت ملتوی کی، بندوق سنبھالی اور مسافر کو لوٹ کر پھر عبادت شروع کر دی۔ کوئی مہذب شخص دیکھ رہا تھا۔ اس نے بُرا بھلا کہا تو پہاڑی خفا ہو کر بولا ـــ "یہ دین کا کام ہے وہ دنیا کا ـــ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

سلیم کے دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

منصور نے جواب دیا ——— "جی ہاں یہ قصہ میں نے سُنا ہے اور شہروں میں بقیل' قاتلوں، مقتول والی گردان بھی سُنی ہے۔ ایک سچا واقعہ آپ بھی سن لیجیے۔ ایک شہری اور دیہاتی چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ دفعتاً شہری کچھ دیکھ کر چونکا اور دیہاتی کو بتایا کہ دوسرے کونے میں اس کا جانی دشمن چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ دیہاتی کے تجسس پر اس نے اشارے سے بتایا کہ میرا دشمن وہ ہے جس کی مونچھیں سیاہ ہیں۔ اتفاق سے اُن پانچوں کی مونچھیں سیاہ تھیں۔ وہ جو موٹا اور گنجا ہے ——— لیکن وہ پانچوں موٹے اور گنجے تھے۔ وہ جس کی توند نکلی ہوئی ہے ——— اتفاق سے پانچوں کی توندیں نکلی ہوئی تھیں۔ آخر دیہاتی کو دشمن دکھانے کے لئے شہری نے پستول نکالا۔ ٹھز ٹھز کی چار آوازیں آئیں، چشم زدن میں چار آدمی مرے پڑے تھے۔ جو رہ گیا ہے وہ میرا دشمن ہے ——— اب سمجھے نا ——— امید ہے کہ یہ قصہ آپ پہلے سُن چکے ہوں گے۔"

اب قہقہہ لگانے کی ہماری باری تھی لیکن کچھ بدمزگی سی ہو گئی

مجیدہ کا گانا ختم ہو چکا تھا۔ اندر ہال میں آرکسٹرا بج رہا تھا اور لوگ رقص کے لیے جا رہے تھے۔ منصور اور سعدہ کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چلے گئے۔

جرجیس تین معمر بنی ٹھنی خواتین کو لئے آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی تھی۔ یہ جرجیس کی نئی محبوبہ تھی جو تین مہینے کی پروبیشن پر تھی۔

روز نے فوراً حساب لگا کر جرجیس کا کندھا ہلایا ——— "جانتے ہو کہ ان تینوں کی مجموعی عمر تقریباً سوا سو برس ہوگی اور تم صرف پچیس سال کے ہو۔"

"میں ان چاروں میں سے تین سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں ———"

روز نے جلدی سے اُس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور رقص کرنے چلا گیا۔

"جس لڑکی کو دیکھو کسی یورپین پر فریفتہ ہے ———" جرجیس نے جھلا کر کہا۔

"اتنی دیر کسی اور کے ساتھ ناچ لو۔" میں نے مشورہ دیا لیکن وہ بار کی طرف چلا گیا۔ غم غلط کر کے واپس آیا تو لڑکی پر برس پڑا ——— "یہ کیا حرکت تھی؟"

"حرکت ورکت کچھ نہیں تھی ——— ناچنا ہے تو چلو ناچتے ہیں، ورنہ اپنا راستہ لو ———" وہ بولی۔

جرجیس شام کو اُسے چند قیمتی تحفے دے چکا تھا۔ اس لیے اپنا لہجہ بدلنا پڑا اور خوشامد شروع کر دی ——— "کاش تمہیں علم ہوتا کہ میں ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔"

"قاسم بھی یہی کہتا ہے ———" وہ بولی۔

"لیکن میں قاسم سے کہیں پہلے اٹھتا ہوں اور آدھی رات تک جاگتا رہتا ہوں۔ تمہیں یاد کرنے کے گھنٹوں کا میزان کیا جائے تو میرے زیادہ ہیں گے۔ اور یہ قاسم کون ہے؟"

"یہ دیکھو ——— یہ آج ہی ملی ہے ———" اس نے ہاتھ سامنے کر دیا۔ ایک انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔

"درمیانی انگلی میں انگوٹھی؟" روز حیران رہ گیا۔ "یہ انگوٹھی تو غلط انگلی میں ہے۔"

"منگنی بھی تو غلط آدمی سے ہوئی ہے ——— لیکن اگر یہی بات تھی تو تم نے مجھے غلط امیدیں کیوں دلائیں؟ اور دو ہفتے اور تین دن سے میرے ساتھ کیوں پھر رہی ہو؟"

"میں قاسم کی محبت آزما رہی تھی ———"

"اس وقت تم دو انسانوں کو بے وقوف بنا رہی ہو اور ان میں سے ایک تم خود ہو ———"

"جرجیس، تمہیں کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا ———"

وہ اسے تعریف سمجھ کر مسکرانے لگا لیکن لڑکی نے بات جاری رکھی ——— "کیونکہ تم پہلے ہی سے بے وقوف ہو۔"

ان کی تُو تُو میں میں شروع ہو گئی اور ہم باہر نکل آئے۔

منصور ابھی تک بحث میں مشغول تھا۔ سعدہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔

منصور ایک واقعہ سنا رہا تھا ـــــ شام کو شہر میں انقلاب آیا اور کافی غدر مچا۔ اسی افراتفری میں آدھی رات کے بعد تین آدمی جیل کی کوٹھری میں بند کر دئیے گئے۔ رات گذری تو صبح کے اجالے میں انھوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور گرفتاری کی وجہ دریافت کی ـــــ ایک نے بتایا کہ مجھے اس لئے پکڑا گیا ہے کہ میں عطا ابن جبار کا سب سے بڑا دشمن ہوں ـــــ دوسرے نے کہا کہ مجھے اس لئے قید کیا گیا ہے کہ میں عطا ابن جبار کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ اب دونوں نے تیسرے سے پوچھا کہ آپ کی تعریف؟ ـ "میں عطا ابن جبار ہوں" تیسرا آہستہ سے بولا۔ سو حضرات یہ ہے شہروں کی سیاست ـ اگر اسے سیاست کہا جا سکتا ہے"۔

"لیکن دیہاتی اَن پڑھ ہیں ـــــ" سلیم بھنا اٹھا "اَن پڑھوں کو نہ اچھے بُرے کی تمیز ہوتی ہے نہ سچ جھوٹ کی ـــــ"

"نہ ہمارے ہاں پولیس ہے نہ انواع و اقسام کے محکمے پھر بھی انصاف ہے اور ایمانداری ہے۔ شہری عدالت میں کوئی قسم کھا کر سر پھرا جھوٹ بول سکتا ہے لیکن اپنے گاؤں میں عزیزوں دوستوں کے سامنے کسی کی کیا مجال جو غلط بیانی کر جائے ـــــ تبھی ہمارے ہاں پنچایت منٹوں میں سچ فیصلہ کر دیتی ہے ـــــ تمہاری خفیہ پولیس کی طرح نہیں کہ دو تین سال تفتیش ہوتی رہی، کیس ایک محکمے سے دوسرے اور تیسرے کے پاس جاتا رہا، آخر میں فائل میں لکھ دیا کہ پوری تحقیقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے ـــــ"

"تمہارے امن و انصاف کے کیا کہنے؟ کسی پہاڑی نے اپنے ہمسایوں کی رحمدلی اور ایمانداری کی تعریفیں کیں جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ہر وقت بندوق کیوں لئے پھرتے ہو ـــــ تو بولا کہ اپنے ہمسایوں کو رحمدل اور ایماندار رکھنے کے لئے ـــــ یہ بتاؤ کہ پہاڑی ہر وقت بندوق کیوں لٹکائے پھرتے ہیں؟"

"اور شہری ہر وقت پستول کیوں چھپائے پھرتے ہیں ـــــ؟"

اتنے میں لوی زا آگئی۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جرجیس اُسے دیکھ کر بھاگا بھاگا آیا لیکن تب تک روز اسے رقص کے لئے لے جا چکا تھا۔

جرجیس کو اور کوئی نہ ملا تو مجھ پر خفا ہونے لگا ـــــ "دیکھا تم نے؟ یہ انگریز ہر موقعے پر من مانی کرتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ رہ گئے تم تو تم میں مشرقیت نام تک کو نہیں ـــــ"

"کیا ہوا ـــــ؟"

"انگلش منہ مروڑ کر انگریزوں کی طرح بولتے ہو۔ ایک لفظ پلے نہیں پڑتا۔ چاء انگریزوں کی طرح پیتے ہو۔ چھوٹی سی پیالی سے آدھ گھنٹے تک کھیلتے رہتے ہو۔ ناچتے بھی انہی کی طرح ہو۔ رقص نہیں پریڈ کرتے ہو اور اپنے مشرقی بھائیوں کا کوئی لحاظ نہیں ـــــ اس لئے کہ تمہارا نظریہ حیات بھی انہی سے ملتا جلتا ہے ـــــ"

"یعنی ـــــ؟"

"یعنی یہ کہ میں خوبصورت، بد شکل، نوعمر، بوڑھی یہاں تک کہ کالے چور کو بھی لاؤں، روز اسے چھین کر لے جاتا ہے اور تم کچھ نہیں کہتے ـــــ"

"جرجیس تمہارے نام سے نسوانیت ٹپکتی ہے اور ویسے بھی تم میں مردوں والی کوئی خاص بات نہیں ہے ـــ ہمارے ہاں برجیس، جرجیس جیسے نام لڑکیوں کے ہوتے ہیں"

لوی زا پاؤڈر روم کی طرف جا رہی تھی، جرجیس سرپٹ بھاگا۔

اُدھر منصور اور سلیم ابن سکینہ کی بحث جاری تھی۔

منصور کہہ رہا تھا "ہر ملک میں دو قسم کے باشندے رہتے ہیں ـــ شہری اور دیہاتی۔ کسی بھی ملک میں ایک قوم نہیں در اصل دو قومیں رہتی ہیں ـــــ"

مجھے دیکھ کر سلیم بولا ـــــ "آپ بھی تو کچھ کہئے۔ ہند کا کیا حال ہے؟"

"ہند میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کم از کم چار پانچ دریا ہیں جو آپ کے دونوں دریاؤں سے کہیں چوڑے اور تیز رو ہیں ـــــ" میں نے بتایا۔

"لیکن آپ کے ہاں نہ دجلہ ہے نہ فرات"

"انھیں یہ بھی بتاؤ" منصور نے لقمہ دیا ۔۔۔ "کہ ہند میں جب لوگوں کو جوش آتا ہے تو جلوس نکالتے ہیں کھلے میدان میں تقریریں ہوتی ہیں۔ نعرے لگا کر درپیدل چل کر لوگ اتنے تھک جاتے ہیں کہ گھروں میں جاکر سو رہتے ہیں۔ یہاں کے شہروں کی طرح نہیں کہ جب کچھ ہونا ہو تو پہلے سناٹا چھا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں پھر مکمل خاموشی میں دفعتاً ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ مدتوں پچھتاتے ہیں ۔۔۔ صدیوں سے یہاں یہی ہوتا رہا ہے ۔۔۔"

اچانک سب کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ جرجیس کو چڑھ رہی تھی۔ وہ سلیم سے دو تین مرتبہ اس طرح مل چکا تھا جیسے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اب وہ سلیم سے چوتھی دفعہ بڑے تپاک سے مل رہا تھا ۔۔۔ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ میرا نام جرجیس ہے۔ آپ کی تعریف؟"

پھر جرجیس نے ہم سب سے پہلی مرتبہ ملنا شروع کیا اور اپنا تعارف کرا کے رسمی گفتگو شروع کر دی۔ جرجیس آؤٹ ہو چکا تھا۔ محفل برخاست ہوئی اور لاری تیزی سے کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔

موہن اور میں باتیں کر رہے تھے ۔۔۔ "خان صاحب ایک مشورہ دوں، یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ ہم پردیسیوں کو محبت یا نفرت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ یہ سعدہ وغیرہ من موہنی لڑکیاں ہیں لیکن آپ مسافر ہیں، میں کافی اونچ نیچ دیکھ چکا ہوں۔ جہاں ایک ہستی سے محبت ہوتی ہے وہاں دس بارہ آدمیوں سے خواہ مخواہ نفرت کرنی پڑتی ہے اور نفرت بالکل منحوس جذبہ ہے ۔۔۔ اس سے سیدھی سادی زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں دوسری بات یہ ہے کہ کسی انوکھے مشاہدے یا حیرت انگیز واقعے پر کم از کم پردیس میں متعجب نہ ہوا کریں، غیر ملک ہیں جو اوٹ پٹانگ چیز نظر آئے یوں منہ پھیر لیا کریں جیسے نظر ہی نہیں آئی مجھے دیکھیں میں اہنسا، شانتی، عدم تشدد، بھوک ہڑتال، آواگون، پرمودھرما ۔۔۔ یا شاید دھرمو پرما کا قائل ۔۔۔ انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر عراق میں لڑنے مرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں ۔۔۔ آپ سمجھے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں سب استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں تاڑی، گانجا، افیم، ٹھرا، بھنگ وغیرہ کھلم کھلا بکتی ہیں۔ نسوار بھی اتنی ہی مقبول ہے تمباکو جیسی مضر چیز کو عوام پان کے بہانے کھاتے ہیں۔ یہ سب نشے معاف ہیں لیکن جہاں شراب کا نام آ جائے لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں، حالانکہ دیگر منشیات غیر سائنٹفک ہیں اس لئے کہیں زیادہ نقصان دہ ہیں ۔۔۔ لیکن پبلک کا نزلہ شراب پر ہی گرتا ہے ۔۔۔ تان ہمیشہ یہیں ٹوٹتی ہے ۔۔۔ بتایئے ایسا کیوں ہے ۔۔۔؟"

موہن بھی تقریباً آؤٹ ہو چکا تھا۔

اگلے دن ہم خیمے میں تاش کھیل رہے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں خیمے کا پردہ ہلا اور جرجیس جھانکنے لگا، اس کے ہاتھوں میں تصویروں کا پلندہ تھا ۔۔۔ چال میں لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں خمار ۔۔۔

"اس تصویر میں ہم چاروں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا رہے ہیں ۔۔۔ لیکن یہ تصویر کیمپ میں لی گئی تھی۔ اگر بغداد میں اُتاری جاتی تو ایک دوسرے کی کمر میں خنجر بھونکتے ہوئے نظر آتے ۔۔۔"

"کیا ہوا ۔۔۔؟" ہم سب حیران رہ گئے۔

"میں ابھی ابھی بغداد سے آ رہا ہوں، جو جو باتیں سنی ہیں تم سب سے نفرت ہو گئی ہے ۔۔۔"

"کس سے سنی ہیں ۔۔۔؟"

"لڑکیوں سے ۔۔۔"

اسے بہتیرا چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ بکے گیا۔

آخر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے وہ رقص گاہوں، ہوٹلوں میں لی ہوئی تصویریں باہر پھینک دیں۔

اس نے ہر ایک کو باری باری گھورا اور باہر نکل گیا۔

پردے سے جھانک کر دیکھا تو وہ تصویریں اکٹھی کر رہا تھا۔ ایک ایک تصویر کو جھک کر اٹھاتا، رومال سے پونچھتا اور جیب میں رکھ لیتا۔

اس واقعے کے بعد جو جیس سے بول چال ختم ہوگئی۔ ہم اُسے دیکھ کر رستہ کترا جاتے۔

ایک ہفتہ گزرا، دوسرا، پھر تیسرا۔۔۔

پھر وہ خود آیا، ہمیں سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بڑے عجز سے کہنے لگا۔۔۔ "آئندہ میں کبھی دوستوں کو نہیں آزماؤں گا۔ اتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ شاید دوستوں کو میری کمی محسوس ہوگی اور وہ مجھے منالیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں معافی مانگنے آیا ہوں۔۔۔"

شاید اس واقعے کی اطلاع برٹن کو پہنچ گئی تھی۔ سنیچر کی شام کو جب ہم بغداد کے دجلے کی بجائے کیمپ کے دجلے کو دیکھ رہے تھے تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔۔۔ "تم دو تین ہفتوں سے منہ پھلائے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر اوروں کی بہبودی کے لئے کچھ نہیں کرسکتے تو نالائقو کم از کم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا ہی لیا کرو۔۔۔"

پھر اس نے مشورہ دیا کہ۔۔۔ "ایک لڑکی کے لیے چند مرد آپس میں لڑیں تو جائز ہے۔ لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے مل کر تین چار مردوں میں ناچاقی کرادیں تو قصور مردوں کا ہے۔ بعد میں یہی لڑکیاں آپس میں ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہوجائیں گی اور مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے۔ لہٰذا آئندہ لڑکیوں سے فالتو باتیں مت کیا کرو۔۔۔"

اگلے دن سے موسم بہتر ہوجانے کے بہانے برٹن نے سب کو ڈرل اور پریڈوں میں جوت دیا۔ شام کو تھکے ہاروں کے سامنے ورزش کی تعریفیں کرتا۔۔۔ "اضطراب دور کرنے والی، سکون و طمانیت پیدا کرنے والی اور کوئی شے نہیں ہے۔ ورزش دنیا میں بہترین "ٹرانکولائزر" ہے۔ پرانی مثل ہے کہ جو کھاؤ پیو اُسے جلاؤ بھی۔۔۔"

ایک روز برٹن نے پوچھا۔۔۔ "ریگستان کی ڈیوٹی نکلی ہے۔ کون جائے گا؟"

جو جیس میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہاں کہہ دی اور اگلے روز نئی جگہ پہنچ گیا۔۔۔ چلنے سے پہلے منصور بولا۔۔۔ "تمہارے جانے پر افسوس تو ہے لیکن یہ اطمینان ہے نئے نئے تجربے ہوں گے۔ فوجی زندگی کا یہ پہلو مجھے بہت پسند ہے۔ سپاہی کا بستر ہمیشہ گول رہنا چاہیئے بلکہ سپاہی اور بستر دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کچھ عرصہ رہنے کے بعد معمولی سے معمولی جگہ سے بھی مانوس ہوجاتا ہے اور جب کسی بہتر جگہ جانے کا موقع ملے تو انسان ٹال مٹول کرتا ہے۔ جامد رہنے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بیشتر لوگوں کو جمود پسند ہے۔ یہاں تک کہ میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنھیں ترقی کے زینے پر گھسیٹ گھسیٹ کر زبردستی چڑھانا پڑتا ہے۔"

یہ اصلی صحرا تھا جہاں دور دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اوپر نیلا آسمان، نیچے ریت، اکا دکا جھلسے ہوئے درخت اور جھاڑیاں۔۔۔ اور حبس کا عالم!

میرے ساتھ جو چند آدمی تھے وہ کئی کئی دن کام پر باہر رہتے۔ جب لاری راشن اور دیگر چیزیں لاتی تو کچھ رونق ہوجاتی ورنہ چاروں طرف ہو کا سناٹا تھا۔ دردناک خاموشی۔۔۔ جو میرے لئے بالکل نئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں تنہائی اور صحرا سے مانوس ہوتا گیا۔ دور دور بستیاں تھیں وہاں جانے لگا۔ صحرا کے اصلی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب

معلوم ہوا کہ جسے میں اُجاڑ ویرانہ سمجھتا رہا تھا وہاں روئیدگی اور زندگی کی کمی نہ تھی۔ جہاں ریت تھا وہاں چند فٹ نیچے اچھی بھلی زمین تھی کہیں سُرخ چٹانیں تھیں تو کہیں بھوری اور سیاہ۔ کہیں لاوے کے تودے تھے تو کہیں سوکھے ہوئے نالوں کی گذرگاہ۔

سراب دیکھ دیکھ کر نظارے سے اعتقاد اُٹھ جاتا ــــ کبھی بہتے ہوئے دریا سامنے آجاتے جھیلوں کی سطح پر درختوں کا عکس نظر آتا لیکن یہ سب دُور دُور رہتے، قریب جاؤ تو آگے چلے جاتے، میلوں تک یہ دوڑ جاری رہتی۔

صحرا کی لڑائیوں کو سراب اس قدر پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ کبھی کبھی پانچ چھ جھاڑیاں دشمن کی پلاٹون معلوم ہوتی ہیں، کبھی چرتی ہوئی بھیڑوں پر دشمن کے سوار "بڑول" کا گمان ہوتا ہے، جہاں محض تیس چالیس آدمی کسی سوکھے جھنڈ تلے بیٹھے ہیں وہاں بعض اوقات دشمن کی پوری بٹالین ہزار گز سے بھی نظر نہیں آتی۔ کبھی اُفق سے سیاہ بادل اُٹھتا۔ اس سے پہلے کہ آندھی کا شبہ ہو نصف سے زیادہ آسمان تاریک ہو جاتا، سیاہ بادل اٹھلاتے کھیلتے یوں آتے جیسے لاتعداد غبارے ہوا میں چھوڑ دیئے گئے ہوں ان کے نیچے ٹیلوں سے بگولے اُٹھتے اور چاروں طرف ستون ہی ستون اُگ آتے۔ سیٹیاں بجاتے ہوئے تیز جھکڑ چلتے ان ستونوں کو منہدم کرتے۔ پھر ان ٹیلوں کو بھی اُڑا لے جاتے۔ یہاں سے وہاں تک تیرہ و تاریک پردہ پھیل جاتا۔ بھورے بھورے فوارے اُبلتے اور ریت کی بوچھاڑیں پڑتیں۔ پردہ ہٹتا تو جیسے متلاطم سمندر میں سورج کی ٹکیا تیرتی ہوئی نظر آتی۔ طرح طرح کی شبیہیں اور ہیولے نظر آتے ــــ ایک سمت میں بھاگتا ہوا ہجوم ــ کانپتی ہوئی عمارتیں ــــ تھرتھراتا جنگل ــــ کبھی یوں لگتا جیسے زلزلے سے کائنات کانپ رہی ہے ــــ کبھی ذرا سی دھند رہ جاتی۔ ابھی کچھ نظر آیا، ابھی غائب ہو گیا۔

یہ شدید طوفان جس تیزی سے آتا اسی طرح اُتر جاتا۔ ٹیلے، اُفق آسمان سب نظر آنے لگتے اور ذرا سی دیر کے بعد سب کچھ ساکن ہو جاتا۔ یقین نہ آتا کہ ابھی ابھی آندھی آئی تھی۔

ریگستان میں درجۂ حرارت ایک سو بیس تک ہو جاتا ہے لیکن راتیں بیحد خوشگوار ہوتی ہیں۔ دن بھر جانور غاروں اور بلوں میں چھپے رہتے ہیں سہ پہر کے بعد جب دھوپ پھیکی پڑتی ہے تو چہل پہل مچ جاتی ہے۔ گلہریاں جھانکتی ہیں پرندے نکل آتے ہیں۔ پھر سب کچھ سنہرا ہو جاتا ہے ــــ ریت کے ٹیلے، آسمان اور سورج کی کرنیں ــــ ہر طرف سونا برسنے لگتا ہے۔ غروب آفتاب اپنی تمام سادگی کے باوجود بیحد حسین ہوتا ہے۔ پہلے بڑی ساری چمکیلی گیند کسی جھاڑی میں اُلجھ جاتی ہے۔ پھر یکلخت کوئی اُسے نیچے کھینچ لیتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا بادل مغرب سے گذر رہا ہو تو شفق پھولتی ہے۔

تارے نکلتے ہیں ــ لرزتے، ٹمٹماتے، سہمے سہمے سے۔ پھر ایسا وقفہ آتا ہے جس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شام کا دھندلکا ہے یا صبح کا اجالا ہے۔

کچھ دیر کے بعد زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلے بڑے بڑے تارے مشعلوں کی مانند بالا بناتے ہیں، پھر لاتعداد ننھے منے تارے خودرو پھولوں کی طرح ہر طرف سے نکل آتے ہیں۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے یہ جگمگ جگمگ کرتا ہوا آسمان زمین سے قریب تر ہوتا جاتا ہے جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور تاروں کو چھو لو۔

سب تارے روپہلے نہیں ہوتے کئی نیلے ہوتے ہیں، کئی سبز، کوئی کوئی سرخ رنگ جھلکتا ہے۔ سارا صحرا آباد ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی ہوتی ہے۔ آسمان کا نور چکنے پتھروں اور ریت کے ذرّوں سے منعکس ہوتا ہے تو چاروں طرف روشنیاں نظر آتی ہیں ــــ رسانی ... تلیاں، ٹمٹماتی جھلملاتی روشنیاں، کچھ ایسی قندیلیں جو بجھ بجھ کر روشن ہوتی ہیں۔

اگر چاند ہو تو چاندنی طرح کے روپ دھارتی ہے۔ آج کی مخروطی پھیکی چاندنی نے تاروں کو بھی اُداس کر دیا۔ کل چمکیلا نور چاندنی تاریں سمیٹ نور سے ہر اس طرح چھانے گی کہ اُفق کی تمیز رہے گی نہ زمین و آسمان کی ــــ سب ایک ہو جائیں گے کسی دن چنچل بے مست چاندنی ننھوں کو مخمور ہونے کی سہا دے جس پھیرے رقصاں ہو جائیں گی۔ اُفق پر تنہا کھجور کا درخت، بادل کا ٹکڑا، ڈوبتا یا اُبھرتا چاند، طلائی اُبھری اندھیری رات اور اس کے بے شمار تارے ــــ کئی تصویریں ذہن میں یوں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مدتوں نہیں بھولتیں۔

پھر پیچھے پر ایک دُھند سی چھا جاتی ہے، آنکھیں پھر سراب دیکھتی ہیں ——— اسی دھند کے پیچھے کبھی برسنے والی گھٹا جھومتی ہے، کبھی پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے تو کبھی آبادیاں۔ صبح کاذب کی آمد پر مشرق میں مدھم سی روشنی یوں پھیلتی ہے کہ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ اجالا ہے یا اندھیرا کچھ دیر کے لیئے گم ہو گیا ہے فوراً یہ جھلک غائب ہو جاتی ہے اور تاریکی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ستارہ صبح طلوع ہونے پر جو نور کل مغرب میں جا سمایا تھا مشرق سے ہویدا ہوتا ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ کبھی ریت پر جمی ہوئی شبنم کی خوشبو لاتے ہیں کبھی گیلے کانٹوں کی خوشبو۔ نسیم سحری آہستہ آہستہ سارے ستاروں کو بجھا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر صحرا میں ہلچل مچتی ہے۔ پرندے فضاؤں میں زقندیں بھرتے ہیں، ہرن اوس چاٹتے ہیں، جاندار دن بھر کی قید کی تیاریاں کرتے ہیں۔

ایک ٹیلے کے پیچھے سے سورج جھلک دکھاتا ہے، پھر دلکش اور سہانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا تھا وہ دیکھ رہا ہے۔

جب جنگلوں، پہاڑوں اور آبادیوں میں دن چڑھتا ہے اور مخلوق جاگتی ہے تو صحراؤں میں خاموشی طاری ہونے لگتی ہے۔ تپش بڑھتی جاتی ہے اور سہ پہر تک جمود طاری رہتا ہے۔

لیکن دن بھر کی کلفتوں کا انعام صحرا کی رات ہے ——— ایسی رات اور کہیں نہیں آتی۔

ویرانے کو البادیہ کہتے ہیں اور جو وہاں گھومتا ہوا نظر آئے وہ لازمی طور پر البادو یا البدوی ہوگا لیکن بدوؤں کو یہ نام پسند نہیں۔ وہ اپنے آپ کو عرب کہتے ہیں۔ بدو کی زندگی کافی کٹھن ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ اس کی غذا نہایت قوت بخش ہے (اگر ماہرین کو عمر بھر اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر گذارا کرنا پڑے تو یقیناً اپنی رائے بدل دیں گے)

گرمیوں میں جب صحرا تنور کی طرح دہکتا ہے تو بدو کو اتنی پروا نہیں ہوتی لیکن سردیوں میں جب منجمد کر دینے والی ہوا چلتی ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے کیونکہ اس کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے تبھی وہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے کوئی بدو کمزور یا وہمی ہو تو صحرا میں نہ دماغ کی گولیاں ملتی ہیں نہ مقوی معجون ——— چنانچہ جو بدو بچپن میں بیماریوں کے حملوں کا مقابلہ کر لیں وہ واقعی توانا ہوتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بدو محض تفریحاً خانہ بدوشی پر تلے رہتے ہیں حالانکہ گرمیوں میں سارے قبیلیں کو کنوؤں، چشموں اور نخلستانوں کے گرد مجتمع رہنا پڑتا ہے اور سردیوں میں بھیڑوں اور اونٹوں کی خاطر چراگاہوں کا طواف کرنا پڑتا ہے۔

لڑائی جھگڑا عموماً گرمیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ہر قبیلہ جانتا ہے کہ دوسرے قبیلے کہاں سے پانی لیتے ہیں لہٰذا اس موسم میں سردیوں کے تنازعے نپٹانے کا موقع ملتا ہے۔

موسم بیشک تبدیل ہو جائے لیکن بدوؤں کے لیئے گرمیاں تب ختم ہوتی ہیں جب علی الصبح آسمان پر سہیل نظر آنے لگتا ہے۔ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ایک اور گرمی بخیر و عافیت گذر گئی۔ نومبر سے اپریل تک چراگاہوں کے چکر لگتے ہیں، عموماً دس دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہتے

بدوؤں کی شاعری اور موسیقی عموماً جنگ کے متعلق ہوتی ہے:

مثلاً ——— "آدھی رات کی ہوائیں، چمکتے ہوئے ستارے مجھے جانتے ہیں

صبح کاذب کا اجالا، تپتا ہوا سورج اور بادِ سموم مجھ سے آشنا ہیں۔

جلتی چٹانیں، اڑتی ریت اور نخلستان کا سبزہ میرے گھوڑے کے سموں کو پہچانتے ہیں۔"

اس گیت سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ اشعار کسی جنگجو نے کہے ہیں یا بے قرار صحرا نورد عاشق نے (اگرچہ عشق کے سلسلے میں بھی کافی خون خرابا ہوتا ہے)

صحرا میں تحریری ریکارڈ یا رجسٹر نہیں رکھے جاتے، اس لئے اپنے نام کے ساتھ بزرگوں کا اور اولاد کا ذکر ابن، ابو وغیرہ لگا کر کیا جاتا ہے تبھی نام لمبے ہو جاتے ہیں بدو کافی پی کر بہت خوش ہوتے ہیں، یہ بہت گاڑھا، تلخ اور رقیق مادہ ہے جو ہر چیز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دو تین گھونٹ سے چودہ طبق روشن ہو جاتے

ہیں اور پھر بھوک نہیں لگتی (اور یہی دونوں کیفیتیں بدوؤں کو پسند ہیں ــــــ چنانچہ جب موقع مل جائے کافی کا دور شروع ہو جاتا ہے)

ان کے ہاں کہاوتوں کا استعمال بہت ہوتا ہے ان کہاوتوں میں بے ساختگی ہے ــــ "کتے کو بیٹھو تو شیر دم ہلانے لگتا ہے" ــــ "میرے دشمن کا دشمن میرا عزیز دوست ہے" ــــ "دشمن کنوئیں کے قریب کھڑا ہو تو اسے اندر دھکیل دو" ــــ "بابل کا مینار اس لئے تباہ ہوا تھا کہ اس کے گرد شہر آباد تھا" ــــ "دشمن کو ہمیشہ خوار کرو، اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو حالات ساز گار رہتے ہی ذلیل کرو ــــ"

کسی بات پر زور ڈالنا ہو تو پہلے ایک آدھ قصہ مزہ بیان کریں گے ــــ مثلاً کسی نے اونٹ کو بددعا دی کہ خدا کرے تجھے چور لے جائیں۔ اونٹ بولا بیشک لے جائیں کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے ہر جگہ محنت کرنی ہے اور چارہ کھانا ہے ــــ یہی حالت میری بھی ہے ــــ

دوران گفتگو انکساری دکھاتے ہیں اور اپنے آپ کو الفقیر کہتے ہیں، ایسے موقعوں پر انہیں جناب کم کہنا پڑتا ہے۔

کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو لوگ ملنے آتے ہیں اور فقط ایک فقرہ کہتے ہیں ــــ "اللہ تعالیٰ اگلی مرتبہ آپ پر کرم فرمائے"

دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مجھ سے خوش ہو کر اکثر دعا دیتے ــــ "خدا کرے تمہارا قبیلہ فتحیاب ہو، دشمن قبیلے غارت ہوں، تمہاری چراگاہیں ہری بھری رہیں اور تمہاری بھیڑوں کی تعداد میں اضافہ ہو ــــ"

بدو اور اونٹ کی محبت بہت پرانی ہے لیکن اونٹ پاگل ہو جائے (سردیوں میں اونٹ تھوڑے بہت پاگل ضرور ہو جاتے ہیں) تو ساربان ارواح خبیثہ کا اثر سمجھ کر اسے زدوکوب کرتے ہیں (جو بالکل غلط علاج ہے)

طویل سفر سے پہلے جیسے موٹر کا تیل پٹرول وغیرہ چیک کیا جاتا ہے اسی طرح اونٹ کی بھی چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں ٹٹولے جاتے ہیں، منہ کا معائنہ ہوتا ہے، جلد پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اونٹ میں بیس پچیس گیلن پانی سما سکتا ہے لیکن وہ اتنا سارا پانی کبھی خوشی سے نہیں پیتا، لہٰذا خشک صحرا کو عبور کرنے سے پہلے اونٹ کو دھاکر بالٹیوں سے منہ میں پانی ڈالا جاتا ہے (اور اس کے بعد اس سے شتر غمزوں کی توقع بھی کی جاتی ہے) رات کا سفر تاروں کی مدد سے ہوتا ہے حدی خوانی بھی کی جاتی ہے (کہا جاتا ہے کہ رات کو جب ساربان اونٹ کے کانوں کے قریب بلند آواز میں گاتا ہے تو اونٹ خوش ہوتا ہے اور غالباً جاگتا بھی رہتا ہے)

اونٹ چلتے چلتے دفعتاً چست ہو کر بھاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ نخلستان قریب ہے کیونکہ نخلستان تلاش کرنے میں اونٹ سے اچھا گائیڈ نہیں مل سکتا، کبھی وہ خود صحرا عبور کر لیتا ہے۔

ایک دفعہ رات کے سفر میں میں نے ساربان سے پوچھا کہ کون سا ستارہ چمکتا ہے؟

اس نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ــــ "ستارہ کیا اونٹ جانتے اور منزل ہمیں کچھ پتہ نہیں ــــ"

آسمان صاف ہو تو رات کو قطبی ستارے سے سمت معلوم ہو سکتی ہے لیکن گرد وغبار میں کچھ پتہ نہیں چلتا (اگر اونٹ ساتھ نہ ہو)

صحرا میں انسان دن کو بھی راستہ بھول جاتا ہے یہاں تک کہ ناک کی سیدھ میں چلتے تب بھی۔ بدوؤں کی تھیوری ہے کہ جیسے دونوں بازوؤں کی لمبائی بالکل یکساں نہیں ہوتی، اسی طرح دونوں ٹانگوں میں بھی ذرا سا فرق ہوتا ہے ــــ خواہ تہائی یا چوتھائی انچ ہی کا کیوں نہ ہو چلتے وقت انسان مقابلتاً چھوٹی ٹانگ کے رخ میں گھوم جاتا ہے۔ اگر پانچ چھ میل میں نصف فرلانگ کا فرق بھی پڑے تب بھی منزل پر پہنچنا مشکل ہے۔

صحرا میں جگہ جگہ کھنڈر ملتے ہیں تاریخ شاہد ہے کہ کبھی دریا نے رخ بدل لیا، کبھی قدرتی ہوئی ذریعہ کچھ عرصہ ختم ہو گیا، کبھی چشمے سوکھ گئے اور صحرا کا ایک اور حصہ اجڑ گیا۔ پھر آندھیاں اور ریت کھنڈرات کو یوں دفن کر دیتے ہیں کہ پاس سے گزرنے والے کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی آبادی تھی۔ البتہ صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہو جائیں تو ہوائی جہاز سے اجڑے شہروں قصبوں کے نقشے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب تو بستے ہوئے گاؤں اور کھنڈرات ہی قطر

غلط ملط ہو چکے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے (گزشتہ صدی میں ایک کشتی اشوریوں کے زمانے کی برآمد شدہ چیزیں لئے جا رہی تھی کہ دجلے میں ڈوب گئی۔ قریب کے گاؤں والوں نے دریا سے سب کچھ نکال کر ہزاروں سال پرانے پل، سہاگے، کلہاڑیاں، بیلچے مدتوں استعمال کئے اور انھیں آجکل کے بنے ہوئے سامان سے کہیں مضبوط پایا)

بارشوں کا مختصر سا موسم آتا ہے کبھی کبھی وفعہ نیلے نیلے بادل ترسا کر چلے جاتے ہیں، آخر بوندیں پڑتی ہیں اور ایسی بارش ہوتی ہے کہ خشک جلی جلی وادیوں میں ندیاں بہنے لگتی ہیں، مدتوں کے پیاسے درخت گرد و غبار اتار کر تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ سوکھی زمین سے قسم قسم کی خوشبوئیں آتی ہیں۔

پانی طرح طرح کے تماشے کرتا ہے، کہیں مچلتے ہوئے بھنور بناتے کہیں تالاب بن کر ساکن ہو گیا۔ چٹانوں پر پھواریں بکھیریں، خاردار جھاڑیوں سے موتی ٹپکائے ——— یہاں آبشار گرایا وہاں دلدل بنائی ——— اور غائب ہو گیا لیکن نگاہیں سراب کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں، پانی کے وجود پر یقین نہیں آتا۔

بہار آتی ہے تو میلوں تک رنگ و بو کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ رنگ رنگ کے خودرو پھول کھلتے ہیں۔ کہیں سے بے شمار تتلیاں آ جاتی ہیں نیلے پھولوں پر گلابی تتلیاں، زرد کلیوں پر قرمزی تتلیاں ——— رنگوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ رونق صرف چند ہفتوں تک رہتی ہے، پھر بھی اس مختصر سے وقفے میں جو کچھ نظر آ جاتا ہے وہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔

لیکن بدوؤں کو ساری نباتات میں فقط کھجور سے اُلفت ہے ——— اس کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں ——— کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ بہشت سے زمین پر تین پودے آئے تھے ——— چنار، گیہوں اور کھجور۔ اور کھجور سارے پودوں اور پھلوں سے افضل ہے، کھجور کا درخت تب خوش رہتا ہے اگر اس کی چوٹی جہنم میں ہو اور جڑیں بہشت میں (ماہرین کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں جتنے درخت تھے سب برباد ہو گئے۔ کھجور اس لئے رہ سکی کہ یہ بکریوں اور اونٹوں کے لئے ذرا اونچی تھی) چھ ہزار برس سے کھجور سے شکر، آٹا، سرکہ اور نبیذ بنائے جاتے ہیں ——— نبیذ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں لیکن علمائے حضرات کا اصرار ہے کہ یہ قطعاً بے ضرر ہے اگر اسی دن پیو تو کچھ نہیں کہتی لیکن چوبیس گھنٹے پڑی رہے تو پینے سے کچھ ہوتا ہے)

ایک دن لاری سے خط آیا جس میں میرے تبادلے کا ذکر تھا۔

واپس کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک یونٹ کے ساتھ محاذ پر جاؤں گا۔ روانگی کے متعلق اطلاع بغداد سے آئے گی۔ موہن نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے دسویں جماعت پاس کر لی ہے اور بڑا اچھا خط لکھا ہے۔ اس نے لڑکے کی تصویر دکھائی ——— "والد صاحب مجھے بہت چاہتے تھے مگر جب یہ پیدا ہوا تو انھوں نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ ہر وقت پوتے کو اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ——— کہتے ہیں کہ سود اصل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے ——— کاش کہ یہ لڑکا مجھ سے بہتر ثابت ہو ———"

منصور اور میں لمبی سیروں پر جاتے۔ وہ کہتا ——— "مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ محاذ پر جا رہے ہو۔ میں اپنی پُرامن زندگی سے مطمئن نہیں ہوں خطروں اور حریفوں سے نبرد آزمائی کئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسے دو یا تین تجربے کافی نہیں ہوتے۔ جب موقع ملے آگے جانا چاہئے، ورنہ نہ اپنی ندیسو کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نہ خوبیوں کا۔ جہاں تم جا رہے ہو وہاں انتظار اور تشویش سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے لیکن جب پہلی گولی چلے گی تو سب کچھ بھول جاؤ گے شناختی یاد ہے گا نہ مستقبل، بس ایک دھن سوار ہو گی کہ اگر اس وقت ذرا سی جھک ہوئی تو کہیں خود اپنی نظروں میں نہ گر جاؤ، اگلی آزمائش مقابلتاً آسان ہو گی اور آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے کہ خطرہ خطرہ نہیں رہے گا ———"

اسی نے ایک واقعہ سنایا ——— کردستان کی پہاڑیوں میں سات گڈریے طوفان میں گھر گئے۔ وہ سب ایک وادی میں تھے اور باہر نکلنے کا فقط ایک راستہ تھا جو درے سے باہر جاتا تھا۔ دوپہر سے لے کر شام تک درے پر بجلی کڑکتی رہی لیکن طوفان کی تیزی میں کمی نہ ہوئی۔ ایک بوڑھے گڈریے نے کہا کہ یہ آج ہم

میں سے کسی کی جان لے کر ٹلے گی۔ یہاں انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ باری باری وادی سے نکلیں جو درہ عبور کر گیا بچ جائے گا۔ قرعہ اندازی ہوئی ـــــ پہلا گذریا ڈرتا ڈرتا نکلا اور وادی عبور کر کے درے سے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسرا گڈریا بھی کانپتا ہوا گذر گیا لیکن بجلی نہیں گری۔ تیسرا چوتھا، پانچواں سب نکل گئے۔ پھر چھٹا لرزتا ہوا نکلنے لگا، روانگی سے پہلے اس نے ساتویں کو خدا حافظ کہا وہ بھی درے سے گذر گیا ـــــ بجلی پھر بھی نہیں گری جب درے کو عبور کر کے دو چھوٹے چھ قہقہے لگا رہے تھے تو ساتواں موت کا انتظار کر رہا تھا۔ یکلخت بجلی کڑکی، زور کا دھماکا ہوا ـــــ درے کے اُس طرف چھ گڈریے مرے پڑے تھے، ساتواں بچ گیا تھا ـــــ جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ نہ تو ایک دن پہلے ہوتا ہے نہ ایک دن بعد میں ـــــ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا ـــــ

بغداد سے اطلاع آ گئی اور میں یونٹ کے ساتھ ایک طویل سفر کے بعد محاذ پر پہنچا۔

محاذ کا پہلا تجربہ نہایت عجیب تھا۔

جب بٹالین کو آگے کا حکم ملا تو میں اور دوسرے ناتجربہ کار رات بھر جاگتے رہے اور خندقیں رات بھر پرانے سپاہیوں کے خراٹوں سے گونجتی رہیں۔ صبح کے پانچ بجے بتایا گیا کہ حملہ دو گھنٹے کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں رابرٹسن کے چلانے کی آواز آئی، دیکھا تو وہ خندق میں بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا، اُسے شکایت تھی کہ چائے میں شکر کم ہے۔

دوپہر تک لڑائی ہوتی۔ پھر سہ پہر کو دشمن کی توپوں نے ایسی شدید گولہ باری کی کہ زمین ہلنے لگی۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے اور بیچ میں کمانڈنگ افسر ایک ٹیکری پر کھڑا اطمینان سے پائپ پی رہا تھا۔ کبھی کبھی دوربین لگا کر ادھر اُدھر دیکھتا پھر بڑے مزے سے کش لگاتا۔ گولہ باری ہلکی ہوئی تو زخمیوں کو دیکھنے آیا۔ بار بار گلہ کرتا کہ آج کل اچھی دیا سلائیاں نہیں ملتیں، پائپ سلگاتے سلگاتے آدھی ڈبیہ ختم ہو جاتی ہے۔ شروع شروع میں بڑی حیرت ہوتی۔ دشمن کی توپوں یا ہوائی جہازوں سے گولہ باری ہو رہی ہے اور خندق میں جیف بڑے انہماک سے اڈنبرا والی جائیداد کے انکم ٹیکس کا حساب لگا رہا ہے۔ ٹام ایک لڑکی کو رومان انگیز خط لکھ رہا ہے کہ تین ماہ کے بعد چھٹی ملے گی تب ملاقات شیلانگ میں ہونی چاہیئے یا دارجیلنگ میں ـــــ شیلانگ بہتر ہے کیونکہ وہاں ہجوم کم ہوتا ہے۔

لڑائی کی شدت اور شور و غل میں بھی جونسٹن ایک ایک RETURN کو غور سے پڑھتا، ہجوں اور گرامر کی غلطیاں درست کر کے انہیں دوبارہ ٹائپ کراتا۔ میرے تجسس پر وہ مسکراتے اور کہتے کہ بہت جلد تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔

چنانچہ چند ہی دنوں میں میں لڑائی کے میدان اور لڑائی کی آوازوں سے مانوس ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک یونٹ کے ساتھ بغداد جانے کا موقع ملا۔

بغداد پہنچ کر یوں لگا جیسے چھوٹی سی بستی میں آ گیا ہوں اور کیمپ تو بالکل ہی سنسان جگہ معلوم ہوئی۔ پرانے رفیق اب تک وہیں تھے محفلیں بھی اسی طرح جمتی تھیں لیکن اس کی نوعیت میں فرق آ گیا تھا۔ ان میں شریک ہوتا مگر طالب علم کی حیثیت سے نہیں منصور کہتا ـــــ اب تمہیں بھی لڑائی کا تجربہ ہو چکا ہے، تم بھی کچھ بتایا کرو ـــــ

لیکن میں دوسروں کی باتیں سنتا رہتا۔

کیمپ میں ایک نیا چہرہ نظر آیا ـــــ سارجنٹ (جس کا ہندوستانی اردلی اُسے سرجنٹ صاحب کہا کرتا)۔ یہ بیزار شخص ہر وقت منہ لٹکائے چپ چاپ اپنے خیمہ میں بیٹھا رہتا۔ کوئی تقریب ہو یا شام کی محفل اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ کبھی بولتا تو اپنے ماتحتوں کی شکایت کرنے کے لئے۔

ایک دن اپنے لفٹیننٹ کے خلاف رپورٹ لکھ کر برٹن کے پاس لایا کہ یہ لڑکا اکثر گستاخی کرتا ہے، قدرے کام چور بھی ہے اور ہر شام کو بہانہ بنا کر بغداد بھاگ جاتا ہے، بڑا فضول خرچ ہے، تبھی ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔

برٹن نے بحث کرنا چاہا لیکن وہ پیچھے پڑ گیا کہ لڑکے کو ضرور سزا ملنی چاہئے۔

برٹن بولا —— "میں اسے زبانی سمجھا دوں گا، سزا کیا دوں جبکہ اس کی عمر میں میں خود ایسی حرکتیں کیا کرتا تھا۔ بڑا ہوگا تو زمانہ خود سیدھا کر دے گا۔"

برٹن نے سارجنٹ سے اس کی گہری اداسی اور خاموشی کی وجہ پوچھی۔ اس پر اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کچھ مسکراہٹ سے ملتی تھی۔

اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ چند سال پہلے وہ بالکل مختلف تھا —— پینے پلانے کا شوقین، جوئے کا دلدادہ، ناچ گانے کا رسیا اور گھوڑ دوڑ کا عاشق۔ ان مشغلوں میں ساری تنخواہ ضائع ہو جاتی۔ "آخر ایک دن میں نے ہمت کر کے توبہ کر لی اور سب کچھ ترک کر دیا۔" "اب آپ ایک بالکل نئے سارجنٹ کو دیکھ رہے ہیں جس میں ایک بھی برائی نہیں ہے ——"

"سوائے ایک کے —— کہ اب تم مکمل طور پر بیزار ہو چکے ہو۔ تقریباً ختم ہو چکے ہو۔ ایسی توبہ جس کا مرکز برائی کے بعد انسان میں زندگی کی اتنی سی رمق بھی باقی نہ رہے۔ میرے خیال میں توبہ سے پہلے تم یقیناً بہتر انسان ہوں گے۔ اور یہ تمہیں کس نے بتایا کہ فوج میں امیر ہونے کے لئے بھرتی ہوتے ہیں؟"

سنیچر کی شام کو بغداد جاتے تو ڈوڈ سے ملاقات ہوتی ورنہ ہفتے بھر [illegible] کسی شام ذکر نہ پوچھتا کہ ڈوڈ نہیں آیا تو برٹن کہتا —— "وہ اپنے آپ کو سکاٹش بتاتے ہیں، سنیچر کی شام کی خاطر بقیہ چھ دن کنجوسی کرتا ہے ——"

ڈوڈ کے الگ تھلگ رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کیمپ میں بیشتر افسروں کا کیپٹن جانتی تھا۔ وہ ڈاکٹر ریگولر تھا لہٰذا ترقی کا مستقل خواہشمند۔ اکثر کہا کرتا کہ جب میں برگیڈ کمانڈر بنوں گا تو یوں ہوگا جب ڈویژن کمانڈر بنوں گا تو یہ ہوگا۔ اس کی گفتگو کا آغاز سکاٹ لینڈ سے ہوتا۔ بڑے فخر سے کہتا کہ سکاٹش لوگ اتنے زندہ دل ہیں کہ اپنے شہرہ آفاق کنجوسی کے قصے خود ہی گھڑتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ شروع ہوتی —— "نپولین کا قول ہے کہ بار بار دشمن سے مت لڑو ورنہ وہ تمہاری ساری چالیں سمجھ جائے گا۔" یا دشمن کے بارے میں نارڈ شا نے کہا ہے کہ —— اس کی ہمیشہ قدر کرو کیونکہ وہ تمہیں چست رکھتا ہے، پھلا نہیں بیٹھنے دیتا۔"

اتنی دیر میں نشہ چڑھنے لگتا مخمور ہو کر اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا اور بڑی طنزآمیز باتیں کرتا —— "مشرق مشرق ہی ہے —— یہاں کے باشندے فقط محبت، شاعری، مذہبیات اور قدیم عظمت کے سہارے زندہ ہیں۔ جب پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو سونے چاندی میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور ہاتھی دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ یہ لوگ اپنا سارا سونا چاندی تو اس طرح کھا جاتے ہیں، غربت کیوں نہ ہو۔ انگریز جب ہندوستان پہنچے تو بادشاہوں کو خوب تحفے دیئے کہ بہت خوش ہوئے کہ کیسا ملک فتح کیا ہے جہاں کا بچہ بچہ —— میں جتلانے بعد میں پتہ چلا کہ وہ پان کی پیک تھوکتے تھے ——"

اس کی گستاخ باتیں دہریہ پن کی غمازی کرتی تھیں —— "بیشتر لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس زندگی میں نیک کام کر کے اگلی دنیا میں صلہ چاہتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم سب جاندار یعنی درخت، پودے، کیڑے مکوڑے، جانور، پرندے، انسان —— بالکل ایک جیسے ہیں۔ ہمیں اپنے وجود سے پہلے کوئی علم نہ تھا، پیدائش بھی اتفاقاً ہوئی، ہم سب کی زندگی کی میعاد مقرر کی جا چکی ہے۔ فنا ہوتے ہی ہم سب فانی ہو کر مفقود ہو جاتے ہیں لیکن اگلی دنیا میں فقط انسان ہی کو کیوں جلایا جائے گا؟ وہ سارے درندے، پرندے، کیڑے، نباتات —— یہ کیوں نہیں جلائے جاتے؟ مخصوص [illegible] تو حاوی [illegible] ملی، وباؤں، [illegible] نے صرف سے پیدا کر دیا تھا۔ انسان اپنے لئے نیا نشان بنا کر کہنے لگا کہ یہ تو [illegible] کی اگلی دنیا کا حقدار ہے۔ [illegible]

بھی زندہ ہونے چاہئیں جو دنیا میں ایک مرتبہ بیانس لے چکے ہیں۔۔۔۔"

"بہت اچھا۔۔۔" برتن ہنس کر کہتا۔ "وہاں وڈے کے پیچھے لگنے کے لئے ایک دو خیر چند مہینے اور تین چار سانپ ضرور بچے زندہ ہوں گے۔"

برتن کو اس کی باتیں ذرا نہ بھاتیں۔ اس سے کہتا۔۔۔ "وڈ تمہارے چہرے پر ہر وقت بیزنگ نظر آنے والا اظہار رہتا ہے۔ تم اس نکمے باورچی کی طرح ہو جو ہر کھانا خراب کر دیتا ہو۔ یہاں تک کہ آملیٹ اور دودھ کو بھی بگاڑ کر رکھ دے۔ بیرینتے تم نے دور گزارے ہوئے یہ چھ دن اتنے خوشگوار ہوتے ہیں جیسے بحیرۂ روم کی کسی بندرگاہ پر گزارے ہوئے کئی مہینے۔۔۔ خدا تمہارے گناہ معاف کر دے تو کر دے لیکن تمہارا انز دس سسٹم کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔"

لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور طنزیہ گفتگو جاری رکھتا۔۔۔ "موصل کے شمال مشرق میں یزیدی رہتے ہیں۔ بارھویں صدی میں اُن کے شیخ نے تلقین کی کہ کسی سے نفرت نہ کرو یہاں تک کہ شیطان کو بھی برا بھلا نہ کہو۔ یہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فی الحال شیطان زیرِ عتاب ہے۔ کبھی نہ کبھی دن اسے معافی مل جائے گی تب وہ گن گن کر بدلے لے گا۔۔۔"

لیکن اپنے دوست، وڈ کو کچھ نہیں کہے گا۔۔۔" برتن نے بات کاٹی۔

مگر وہ بولتا چلا گیا۔۔۔ "پچھلے ہفتے بغداد میں، وڈ نے ایک قالین کی قیمت پوچھی۔ پھیری والے نے پچاس پاؤنڈ مانگے۔ ایک گھنٹے کی بحث کے بعد پانچ پاؤنڈ پر فیصلہ ہوا۔ جوڑی کے دوسرے قالین کے لئے میں نے بھی پانچ پاؤنڈ لگائے تو پھیری والے نے قالین کھینچ کر کہا کہ یہ سودا تو ان صاحب سے ہوا ہے، آپ سے از سرِ نو بحث کروں گا۔۔۔"

"بھیں بغیر متوجہ پاکر وہ اور خفا ہوتا۔۔۔ "کچھ تو بولا کرو۔۔۔"

"تم درست کہتے ہو۔۔۔" ہم اسے ٹالتے۔

"میں تمہیں ہم خیال نہیں بنانا چاہتا۔ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ باقاعدہ جرح کرو۔"

"وڈ تم ہر چیز کے خلاف ہو اور آئرلینڈ کے اس باشندے کی طرح ہو جو کسی ڈوبتے جہاز سے تختے کے سہارے تیر کر تیسرے روز ایک نامعلوم جزیرے کے کنارے پہنچا۔ مقامی باشندوں نے اس کی دیکھ بھال کی تو ہوش میں آتے ہی پوچھا۔ یہ کونسا جزیرہ ہے؟ اور اگر اس جزیرے میں کوئی حکومت ہے تو میں اس کے خلاف ہوں۔۔۔"

موہن بہت جھنجھلاتا۔۔۔ "خان صاحب، جن لوگوں کو موافق نہیں آتی وہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔۔۔ لعنت ہے ایسے کشتے پر۔۔۔"

وڈ بغداد جاتا تو کباڑیوں کی دکانوں کے چکر ضرور لگاتا۔ دن بھر کی چھان بین کے بعد کوئی سستی سی کتاب خرید لاتا۔ لائبریریوں میں جا کر ایسی کتابیں تلاش کرتا جن سے سٹیرنگ کی بنام کے لئے مواد مل سکے۔ منصور اسے بتاتا کہ مغرب نے مشرق سے بہت کچھ لیا ہے، مغرب کے غیر جانبدار مصنفین کو بھی پڑھا کرو۔ مثلاً انگلش میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ ایڈمرل جو پرسوں بغداد میں دیکھا تھا۔ الکحل جسے پی کر واہی تباہی بکتے ہو۔ الکیمیا جو کیمسٹری کے نام سے بچپن میں پڑھی تھی یہ سب مشرقی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ پاجامہ جو رات کو پہنو گے مشرقی چیز ہے۔

"نہیں پاجامہ تمہارا ہرگز نہیں ہو سکتا، باقی باتیں مان لوں گا لیکن پاجامہ ہمارا ہے۔" اس نے جھلا کر جواب دیا۔

لڑکیوں کے معاملے میں بھی وڈ بالکل نکما تھا۔ سڑک پر جاتی ہوئی ہیوڈن نے اسے متوجہ کرنے کے لئے پہلے اشارے کئے، پھر مجبوراً اپنا رومال گرا دیا۔ وڈ نے (جسے زکام تھا) رومال اٹھایا، اس میں چھینک ماری اور ناک پر پھیر کر ہیوڈن کے ہاتھ میں واپس دے دیا۔

جو ہمیں پل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا۔۔۔ "یہ حسین ہے مگر فربہ ہے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ عینک بہت ہے نے زم کی

لکا رکھی ہے اور مجھے ضرور احساسِ کمتری ہوگا جو اس قدر اونچی ایڑی کے جوتے پہننے پڑے اور اتنا میک اپ تھوپنا پڑا۔ مگر وہ جو ٹھمک ٹھمک کر چل رہی ہے واللہ خوب ہے ـــ"

"جوجیں یوں دور دور سے دل خوش کرنا بیکار ہے ـــ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ چلے ـــ" منصور بولا۔

اور میرا تھا ٹھٹکا ـــ فوراً سعدہ کا خیال آیا۔

"ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہوا تھا ـــ؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہوئی ـــ" وہ مسکرانے لگا۔

"پھر یہ فقرہ کیسے زبان پر آگیا ـــ ویسے ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ ہمیشہ بھرے میلے سے رخصت ہونا چاہیے۔"

شام کو رقص گاہ میں سب خاموش سے تھے سوائے جوجیں کے منصور چپ تھا۔ سعدہ نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ سلیم اپنے چلے ہوئے دوستوں سمیت دو تین مرتبہ آیا لیکن ہم نے بھگا دیا۔

منصور رقص کرنے گیا تو سعدہ نے مجھ سے پوچھا ـــ "ان چند مہینوں میں تمہیں کون فلسفی بنا گیا؟ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بلکہ تم اپنی سناؤ ـــ منصور سے تو ایک معنی خیز فقرہ سن چکا ہوں۔"

اس کی نظریں اور نیچی ہوگئیں۔

سعدہ کی سہیلیاں آگئیں۔ وی زا نے ہتھیلی سامنے کر دی ـــ "جنگل گردی اور صحرا نوردی کر کے آئے ہوئے ہو ـــ کوئی پیش گوئی کرو ـــ"

جوجیں سرپٹ بھاگ آیا ـــ "اب پتہ چلا کہ تمہاری تکنیک کیا ہے۔ نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھ چکے۔ سخت اور کھردری ہتھیلیاں بھی تھامو ـــ"

"جوجیں لکیریں کہتی ہیں کہ خدانخواستہ تمہاری شادی ہوگی ـــ"

"کس سے ہوگی؟ اس کا نام کیا ہے؟" ـــ اس نے وی زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی سے ہوگی جس کا نام مسز جوجیں ہوگا۔ اور تمہاری شادی شدہ زندگی کے پہلے دو تین سال زیادہ خوشگوار نہیں ہوں گے ـــ"

"پھر ـــ؟"

"پھر تمہیں رنج و غم کی عادت پڑ جائے گی ـــ"

جوجیں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پروگرام بنا کہ دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ بڑی سہانی رات تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا۔

ولیتا ایک نئی لڑکی کو لائی اور مجھ سے کہا ـــ "ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گی۔"

منصور نے بتایا کہ یہ لطیفہ ہے سعدہ کی چھوٹی بہن۔ ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔

"یہ التفات اس لیے ہے کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں۔ آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل بے رخی پر ریجھ جائیں گی۔" وہ میرے کان میں بولا۔

جوجیں کو سواریاں نہیں مل رہی تھیں۔ وی زا کی منتیں کر رہا تھا ـــ "انکار مت کرو۔ خدا کے لیے کچھ چاند نہ رولو۔ خیال کرو، آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ایسی حسین رات سے کچھ فائدہ نہ اٹھاؤ گی۔ کیا تمہیں قدرتی نظاروں کا اتنا سا بھی پاس نہیں؟"

میں نے چپو سنبھالے تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ لطیفہ نے کہا — "کنارے پر چلئے، میں کچھ بھول آئی ہوں —"
واپس گئے۔ دونوں میں کھسر پھسر ہوئی اور ولیتا اتر گئی۔

میں نے پھر چپو سنبھالے — لیکن کشتی کے رخ کے متعلق ہدایتیں ملنے لگیں — "اس طرف موڑیئے — اب اس طرف چلیئے"
دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس کا منہ چاند کی طرف رہے لیکن اس طرح کشتی غلط رخ میں چلی جاتی۔

"جگمگاتے چہروں کو چاندنی کی کیا ضرورت ہے؟" مجھے مجبوراً کہنا پڑا

"کیا یہ صحیح ہے کہ لڑکیاں زیادہ تخیل پرست ہوتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"صحیح ہے تو مگر درست نہیں —"

"کیوں —؟"

"سنا ہے کہ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جھاڑیوں میں پرندے تلاش کرنے کی بجائے کھیل شروع ہوتے ہی پتے میز پر رکھوا لیتی ہیں —"

"یہ بتائیے کہ محبت کے لئے حسن و دلکشی کے علاوہ اور کیا کیا خوبیاں ضروری ہوتی ہیں؟"

"موقعے پر موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر فرصت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا —"

اس نے سعدہ کا ذکر چھیڑا — "حالانکہ وہ میری سگی بہن ہے لیکن ہم بچپن سے ہی دور دور رہی ہیں تبھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ میری بہن ہے بھلا یہ کیسے بتاؤں کہ اسے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کے منع کرنے پر بھی وہ سلیم سے ملتی ہے — اور یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہیں —؟"

"کنارے کی طرف —"

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں —" وہ چڑ گئی۔

"سب عورتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

کنارے پر منصور بولا — "جب دو بہنوں یا دو عزیز سہیلیوں سے واسطہ پڑ جائے تو ٹل جانا چاہئے ورنہ بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعدہ کی نظریں تمہاری کشتی پر تھیں۔"

"میں اس مقولے کو جانتا ہوں اور ابھی ابھی اسی پر عمل کیا تھا — لیکن جہاں تک سعدہ کی نگاہوں کا تعلق ہے وہ تمہارے لیے مخصوص ہو چکی ہیں۔"

"مرد عورت کی محبت کو چاند سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن دوستوں اور بھائیوں کی محبت تاروں کی طرح ہے، اگرچہ جگمگاہٹ کم ہے لیکن قابلِ یقین اور صادق ہے —" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

ایک شام کو کیمپ میں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹوڈی آ گیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس نے پہلے تو حسبِ معمول سکاٹ لینڈ کی باتیں کیں، جب نشہ چڑھا تو فوراً عربوں کا ذکر شروع کر دیا — "خلافت کے آخری دنوں میں ایک حکمران نے قسم کھائی کہ جب تک منگولیا کی خاک پاؤں تلے نہ روند لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ فوجی کامیابی تو کیا خاک ہوتی تھی۔ درباریوں کی ہر روز شامت آتی۔ آخر تنگ آ کر امراء و وزراء نے منگولیا سے مٹی کی بیس پچیس بوریاں منگائیں۔ مٹی دربار میں بچھائی گئی جسے روند کر حکمران مطمئن ہو گیا — ایسی باتوں سے چڑ کر ہلاکو نے حملہ کیا تھا —"

"اس مرتبہ بغداد سے کون سی کتاب لائے ہوئے ہو —؟" برٹی نے ہنس کر پوچھا۔

تاریخ کی ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں لکھا ہے کہ بغداد کے بستے ہی دو ہستیاں نظر آئیں، وزیر ـــــ جو خلیفہ اور رعایا کے درمیان جھگڑا ہوا اور جلاد ـــــ جو دربار میں تلوار لیے منتظر رہتا۔

"اور تیسرا وہ تھا جو کباڑیوں کا مہتمم مقرر ہوا ـــــ" روز نے لقمہ دیا۔

"جلاد کس مغربی بادشاہ کے پاس نہیں تھا؟" برٹن نے پوچھا" اور پھر مجرموں کو سیدھا بھی تو کرنا پڑتا تھا"

لیکن روز کی تقریر جاری تھی ـــــ" حالانکہ عربوں کی سلطنت بحر اوقیانوس تک پھیل چکی تھی تاہم یورپ کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے ـــــ یورپ میں اُن دنوں کچھ تھا ہی نہیں ـــــ لہٰذا جاننے نہ جاننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا" منصور بولا

"دسویں صدی میں جغرافیہ دان مسعودی نے لکھا ـــــ کہ شمال کے لوگ ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سورج نصف النہار پر کبھی نہیں آتا۔ شدید سردی، نمی اور برفباری نے انھیں گرمجوشی اور تپاک سے محروم کر دیا ہے۔ قوی الجثہ شمالی باشندے نہ لطیف جذبات سے آشنا ہیں نہ آداب گفتگو سے ـــــ"

"یوں لگتا ہے جیسے مسعودی نے روز کی تصویر کھینچی ہے ـــــ" برٹن نے قہقہہ لگایا۔

"پھر گیارھویں صدی میں طلیطلہ کے قاضی نے کہا کہ یورپ کے باشندوں کے رنگ پھیکے ہیں اور جسم بے ڈھنگے وہ حجامت نہیں کرتے نہ نہاتے ہیں، ان میں ذہانت، مستعدی، معاملہ فہمی اور وسیع النظری کی کمی ہے اور وہ جہالت، تعصب اور بدتمیزی کی جانب مائل ہیں ـــــ طلیطلہ کے قاضی کو یہ خیال نہ آیا کہ طلیطلہ سپین میں ہے لہٰذا یورپ میں ہے"

"قاضی نے یہ بیان روز جیسے آدمیوں کو مدِنظر رکھ کر دیا ہوگا" ایک طرف سے آواز آئی۔

لیکن روز لگاتار بول رہا تھا۔

برٹن نے پہلے کسی موڈ کو نہیں ڈانٹا تھا لیکن اس رات غصہ ضبط نہ کر سکا۔ بڑے تلخ لہجے میں بولا ـــــ روز ڈارلنگ تم سکاٹش نہیں ہو کیونکہ تمہاری ساری عمر جنوبی افریقہ میں گزری ہے اور پھر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ لوگ کسی ملک کا اندازہ فقط اُن چند باشندوں سے لگاتے ہیں جن سے اتفاقاً ملاقات ہو جائے تمہیں دیکھ کر لوگ انگریزوں کے متعلق کیا سوچتے ہوں گے۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ انسان متضاد عناصر سے بنا ہے ـــــ بے وقوفی، دانائی، بزدلی، دلیری، رذالت اور شرافت کا مرکب ہے۔ اصل چیز ہے امتزاج ـــــ کہ ان عناصر کا توازن کیا ہے؟ اور اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔ وہ چاہے تو خوبیوں میں اضافہ کر سکتا ہے برائیوں کو دبا سکتا ہے۔ خدا کے لیے تم بھی کبھی کوشش کیا کرو۔ روز گیا تمہارا رجمنٹ افسر ہونا اور ترقی کے لیے بے چینی کہ جلد از جلد بریگیڈیئر اور پھر جنرل بن جاؤ ـــــ اس سلسلے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی قسم کے جنرل بنے تو ـــــ یا جنرل سرجنٹ ہو گے یا ڈپٹی اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل۔ جنرل ناچ اور جنرل موٹرز کے لیے بھی کوشش کر سکتے ہو۔

اگلی صبح برٹن نے ٹیلیفون کیا اور روز کا تبادلہ ہو گیا۔

کچھ عرصہ پھر ریگستان میں گزارنا پڑا۔ واپس کیمپ پہنچا تو روز نے بتایا کہ برجیس لاپتہ ہے۔ اس کے محکمے والوں نے اسے موصل کی طرف بھیجا تھا تب سے کوئی خبر آئی نہ خط مجھے یونہی وہم سا رہنے لگا۔ نہ جانے بے چارہ کس حال میں ہوگا۔ سب کہتے کہ خواہ مخواہ فکر کرتے ہو خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے کہیں مزے کر رہا ہوگا لیکن میری تشویش نہ گئی۔

آخر ایک دن روز کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے گاؤں کو تلاش کیا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں پہنچے۔ گھر تلاش کر کے آواز دی سفید بالوں والی معصوم سی ضعیفہ باہر نکلی۔ بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔

"آپ برجیس کے دوست ہیں؟" اس نے پوچھا۔ ہمارے ہاں کہنے پر اس نے بتایا ـــــ کتنے دنوں سے وہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ سرآہٹ پر چونک کر

پوچھتا ہے امی میرے دوست آئے ہیں. جب کہتی ہوں کہ نہیں آئے تو خفا ہونے لگتا ہے ـــــــ امی وہ ضرور آئیں گے، میرے دوست ایسے نہیں کہ میں یاد کروں اور وہ نہ آئیں ـــــ ضعیفہ رونے لگی اُس کی پُرشفقت غمگین آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے۔

اندر جو جیس لیٹا ہوا تھا، اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا

"دیکھا امی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ آہٹ میرے دوستوں کی ہے"

میں نے بازوؤں کا سہارا دے کر اُسے اُٹھایا ـــــ کیا ہوا جو جیس، میرے عزیز دوست! یہ کیا حالت بن گئی ہے؟ یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہڈیوں کا پنجر وہی کھلنڈرا زندہ دل لڑکا ہے جسے ہمیشہ بہتر دنوں کی توقع رہتی تھی. اب اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا تھا.

اُس اُجاڑ سے گاؤں میں کوئی طبیب نہیں تھا. بوڑھی بیچاری کو جو کوئی الٹا سیدھا مشورہ دیتا اس پر عمل کرتی، جڑی بوٹیاں، ٹونے ٹوٹکے سب آزما چکی تھی لیکن بیمار بخار جیسی اُترتا تھا.

ضعیفہ رات بھر باتیں کرتی رہی ـــــ عمر بھر کی پونجی چار بچے تھے ان میں سے تین بچپن ہی میں سدھار گئے، اور خدا گواہ ہے کہ میری غفلت یا لاپروائی سے نہیں مرے جب رخصت ہوئے تو ہنستے تازے تھے. پھر ان کے والد کا بلاوا آیا، مرتے وقت اُنھوں نے میری خدمت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں. جو جیس کو جن مصیبتوں سے پالا میں ہی جانتی ہوں. اس کی تنخواہ سے کچھ بھی نہیں لیا. بلکہ اپنی محنت مشقت کی کمائی سے کچھ نہ کچھ اسے بھیج دیا کرتی کہ کہیں پردیس میں تکلیف نہ ہو. جب سے یہ باہر گیا مجھے لمحہ لمحہ اس کا انتظار رہتا اسے دیکھنے کے لئے بے قرار رہتی لیکن یہ مدتوں نہ آتا. اس کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتی ـــــ جو جیس فخر سے کہیں ان کی ماں محنت مشقت کرتی ہے کہیں لوگ اس کا مذاق نہ اُڑائیں. یہ بڑا اچھا بچہ تھا لیکن جب سے بیمار ہوا ہے بالکل بدل گیا ہے، جو کچھ اسے سکھایا تھا بھلا بیٹھا ہے. پہلے سچا اور نیک تھا اب جھوٹ بولنے لگا ہے. بے ادبی، چغلیاں، خدا نہ ڈرنا، جو ہر نہ اپنا ـــــ نئی نئی باتیں سیکھ گیا ہے ـــــ اس کے پژمردہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں اور ان پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں.

حسرتیں، مصیبتیں، بھی بھی اُمیدیں، مادرانہ خوش فہمیاں، صبر و تحمل ـــــ ایک ماں کی ساری زندگی سامنے آ گئی۔

"تم تو اس کے دوست ہو بتاؤ یہ کیوں اتنا بدل گیا ہے؟"

"بیماری بڑی ظالم چیز ہے، جہاں جسم کو کھوکھلی بنا دیتی ہے وہاں ذہنی تبدیلیاں بھی لاتی ہے، خیالات اور عادتوں کو بدل ڈالتی ہے ـــــ ہم اسے اپنے ساتھ لئے جاتے ہیں، اور بہت جلد تمہارا پیارا جو جیس واپس گھر آ جائے گا ـــــ"

اُسے ہسپتال لائے۔ زمانے طویل علاج کے بعد وہ تندرست ہوا تو پوچھنے لگا ـــــ تمہارا شکریہ ادا کرنا تو مشکل ہے، دوستو کوئی حکم دو، میں بجا لاؤں گا ـــــ

"اب سے اپنی ماں کی خدمت کیا کرنا" ہم نے کہا۔

جب میں اور وہ جو جیس کو لے کر گاؤں پہنچے تو ضعیفہ نے ہمیں دعائیں دیں ـــــ "تم نے میرا بجھتا ہوا چراغ روشن کیا ہے اگلے جشن چراغاں پر تمہارے لئے دو دیئے جلاؤں گی اور جو جیس کی اولاد میں دو لڑکوں کے نام تمہارے ناموں پر رکھوں گی"۔

دسمبر کے آخری تہوار منایا جا رہا تھا کیمپ میں بڑی رونق تھی، روشنیاں جلائی گئیں، باجے بجے، بڑی شاندار محفل منعقد ہوئی لیکن وہ موجود تھا، وہ بغداد سے تہوار منانے آیا تھا سب شور مچا رہے تھے اور وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟ ٹھیک تو ہو؟" کسی نے پوچھا

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو اپنے بھیرے کو بھی مطلع کر دو۔"

گانے شروع ہوئے تو سب نے اصرار کیا کہ برٹن بھی کچھ سنائے۔ بوڑھا ترنگ میں تھا، اس نے یہ نغمہ سنایا۔

خواب میں دیکھا کہ ایک خوشنما جزیرے میں ہوں
جہاں پھول ہیں، سکاچ ہے اور موسیقی
جہاں فقط لڑکیاں ہی لڑکیاں آباد ہیں
تین چار سو حسین چنچل خوش گلو لڑکیاں!
اس کے باوجود مجھے بار بار رونا آتا
کیونکہ خواب میں میں بھی ایک لڑکی تھا

اس پر پٹاخے چلائے گئے، غبارے پھوڑے گئے۔ جام بھرے گئے اور اگلا راؤنڈ شروع ہوا۔

پھر شکار کے قصے ہوئے، موضوع بدلا، آبا و اجداد کے تذکرے ہونے لگے نشے میں ہر ایک اپنا شجرہ کسی مشہور نام سے ملا رہا تھا۔

آخر روز بولا — "حضرات آپ نے بجیرو مرداد کا نام تو سنا ہوگا"

"سنا ہے — دیکھا ہے — جانتے ہیں —" آوازیں آئیں۔

"اسے میرے مورث اعلیٰ نے ہلاک کیا تھا —" روز نے بڑے فخر سے کہا۔

"ذوجنا لموش ہے، اس سے بھی کچھ سنیں —" کسی نے فرمائش کی۔

"پروفیسر روڈ کی جگہ آج پروفیسر روز لیکچر دیں گے۔ طلبا ٹائم ٹیبل میں ترمیم کر لیں —" روز نے نعرہ لگایا وہ گلاس تھامے اٹھا اور ایک میز پر چڑھ گیا۔

"میں نے بھی کباڑیوں سے کچھ بوسیدہ کتابیں خریدی ہیں لہذا مجھے بھی حق حاصل ہے کہ تاریخ پر گوہر افشانی کروں۔ میرا نام روز اس لئے ہے کہ میرے والد کا نام روز تھا۔ میرا مذہب بھی وہی ہے جو میرے باپ دادے کا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں مغرب میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ کس مذہب میں اور کس براعظم میں جانا پسند کرو گے؟ پھر بچپن سے سننے میں آیا کہ مشرق کے باشندے کمزور اور سست ہوتے ہیں۔ وہمی اور ماضی پرست بھی ہیں۔ یہ بھی پڑھا کہ مشرق میں قالین اُڑتے ہیں، رستے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں، بوتلوں میں سے جن نکلتے ہیں۔ ہر دوسرا شخص سادھو ہے، ہر تیسرا فقیر، ہر چوتھا علی بابا اور ہر پانچواں نواب ہے یا مہاراجہ۔ چپے چپے پر سانپ سپیرے لئے اور شیر چیتے منتظر رہتے ہیں۔ ہر چولہے کے قریب خزانہ دفن ہے۔ دعا نری خوش فہمی ہے اور بد دعا فوراً لگ جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تاثرات اُن لوگوں کے تھے جنہیں ایسی باتیں لکھنے کا خاص شوق تھا جو پہلے تو مشرقی لوگوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے، پھر انگلستان یا یورپ پہنچ کر ایسی کتابیں لکھ مارتے تھے۔ ان دنوں بھی میں نے مغربی حضرات کو فقط خاص خاص نظاروں کی تصویریں اتارتے دیکھا ہے — فوٹوگرافی میں بھی تکنیک کا پہلو ہوتا ہے۔ سر پھر کو اونگھتے ہوئے، دانت نکالے ہوئے مرد جادوگر ٹوٹے کرکٹ کے ڈھیر، فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا ہجوم، ٹوٹے لنگڑے اپاہج — غرضیکہ ہم وہی تصویر کھینچتے ہیں جو کھینچنا چاہتے ہیں۔ ان کی روئی کو نرم بلیٹ اور شلوار کو چھوٹا خیمہ کہہ کر ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے — کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ہمارے سرسبز و شاداب ملکوں میں دن بھر تپش ہو، لو کے تھپیڑے ہوں، پیاس میں بار بار پانی پینا پڑے، تیز شعاعوں اور ریت کے ذروں سے آنکھوں کی چمک جاتی رہے، مکھیاں، مچھر، جراثیم جان کے لاگو ہو جائیں — ہماری خنک اور تر پر رو آب و ہوا بدل جائے تو کیا ہم کمزور اور سست نہیں ہو جائیں گے

یہاں کی چوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اپنے اخبار فروشوں کا حوالہ دیتے ہیں جو اخباروں کا بنڈل اور سکوں کے لئے ہیٹ سڑک پر چھوڑ کر اطمینان سے شراب خانے میں جا بیٹھتے ہیں، لیکن اگر سب کی جیبیں بھری ہوئی ہوں تو تانبے کے چند سکوں کے لئے کوئی کیوں بے ایمانی کرے گا؟ کیا وہاں ڈاکے نہیں پڑتے؟ بینک نہیں لوٹے جاتے؟؟ یہاں کے ظلم و تشدد پسندی کے قصے سناتے وقت مؤرخ جیسا مؤرخ بھی بھول جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں سو اور دو سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی ــــ شلجم چرانا، خانہ بدوشوں سے میل جول، درخت کاٹنا، بلا اجازت شکار کھیلنا ــــ ان شدید جرائم کی فہرست میں شامل تھے۔

اٹھارھویں صدی کے شروع میں انگلستان میں نہ پولیس تھی نہ جیل خانے تھے ۔ ۱۸۳۰ء میں سر رابرٹ پیل نے اعتراف کیا تھا کہ جتنی کڑی سزائیں انگلستان میں دی جاتی ہیں دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں دی جاتیں۔ صلیبی جنگوں کو مدتیں گزر چکی ہیں لیکن ہمیں وہ شکست اب تک یاد ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب یروشلم فتح ہوا تو ہمارے وزیراعظم نے فرمایا کہ جو کام ہمارے سورما صلیبی جنگوں میں نہ کر سکے وہ ہم نے کر دکھایا ہے ــــ اور یہ بیان بیسویں صدی میں دیا گیا تھا جس رفتار سے عربوں نے ملک پر ملک فتح کئے، دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ حساب لگائیے کسی اور قوم نے اتنے قلیل عرصے میں اتنا وسیع رقبہ آج تک فتح کیا ہے؟ لیکن مغربی مؤرخ ان کارناموں کو سراہنے کی بجائے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے ہیں کہ سلطنت روما پہلے ہی سے زوال پذیر تھی۔ ہسپانیہ کے اندرونی حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ رچرڈ شیردل کو واپس جانے کی جلدی تھی۔ بازنطینیوں کا دھیان کسی اور طرف تھا ــــ اور اس پر طرہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو سیکولر سمجھتے ہیں۔ ہم انہیں قبر پرست اور ماضی پرست کہتے ہیں جنہیں تیرہ سو سال پہلے تلقین کی گئی تھی کہ بہترین قبر وہ ہے جو ہاتھ کی ہتھیلی سے مٹائی جا سکے۔ مذہب کے نام پر جنگ اور مذہبی تعصب کا الزام ان پر لگاتے ہیں جنہیں تعلیم دی گئی تھی کہ سب سے اچھا جہاد وہ ہے جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرے۔ ہم انہیں عورتوں کی تعظیم نہ کرنے کا طعنہ دیتے ہیں جنہیں بتایا گیا ہے کہ عورت کو کبھی ایذا نہ پہنچاؤ یہاں تک کہ اسے پھول تک نہ مارو۔ یہ بتائیے کہ زکوٰۃ اور سوشلزم کے انکم ٹیکس میں کیا فرق ہے؟ کیا ہمارا بین الاقوامی میل جول کی تیرہ سو سال پرانی کوشش نہیں؟؟ آخر میں میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مشرقی ممالک نے کب درخواست کی تھی کہ مغربی تہذیب پھیلانے کے سلسلے میں ان پر حملہ کیا جائے؟ اور انہیں زیر کر لیا جائے؟؟

اب میں اپنے مؤرخ دوست سے درخواست کروں گا کہ آئیں اور پرانے واقعات پر روشنی ڈالیں ــــ"

لیکن وہ خاموش رہا۔

مومن نے میرے کان میں کہا ــــ "خان صاحب! تم نہ کہا کرتے تھے کہ دیکھی جہاں الٹی سیدھی باتیں کراتی ہے وہاں کبھی کبھی سچ بھی بلوا دیتی ہے ــــ"

برٹن ریگستان سے واپس آیا تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے پاؤں میں کانٹا چبھا، پھر پاؤں سوج گیا۔ ہسپتال میں لیٹنے سے اسے سخت نفرت تھی۔ بڑی منتوں سے منایا۔ بار بار یہی کہتا ــــ "خدا کے لئے زیادتی مت کرو، میں پرانا سپاہی ہوں، آج تک ہسپتال میں نہیں لیٹا ــــ"

چند دنوں میں میرے تبادلے کے احکام آ گئے۔ برٹن سے ملنے گیا، اس کا بخار پہلے سے زیادہ تھا لیکن مونچھیں اور بھویں اسی طرح تنی ہوئی تھیں۔

مجھے دیکھ کر تکیے کے نیچے چھپایا ہوا سگار نکالا ــــ "اسے سلگا کر پیو۔ مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے، کم از کم اس کی خوشبو ہی سونگھ لوں ــــ"

اتنی تکلیف اور نقاہت کے باوجود اس کی آواز میں وہی کرارا پن تھا ــــ "مجھے قدیم چینیوں کا طریقہ بہت پسند ہے کہ جب تک تندرست رہے ڈاکٹر کو باقاعدہ فیس دیتے رہے، جونہی بیمار ہوئے فیس بند ــــ"

میں نے اپنے تبادلے کا ذکر کیا۔

"بہت اچھا ہوا، یہ علاقہ دیکھ چکے ہو، جاؤ دوسرے علاقے دیکھو۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو تبادلے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن بعد میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایک جگہ دیر تک رہنے سے قدم زنگ لگ جاتی ہے۔ جب پرانے علاقوں میں جاتا تو دیکھتا کہ جن ساتھیوں کو گاؤں میں چھوڑ آیا تھا وہ کوشش اور ترقی کر کے شہروں میں

پہنچ چکے تھے۔ ادھر شہر میں امیر لوگوں کی یہی خواہش تھی کہ دیہات میں کوئی باغ ہو یا فارم ــــ لیکن ذہن میں انسان یہ سب جگہیں دیکھتا ہے ــــ "درد سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرے پر کرب کے آثار اور نمایاں ہو گئے لیکن لبوں پر مسکراہٹ بدستور رہی۔

"ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں لیکن میں موت یا آئندہ زندگی کے متعلق زیادہ نہیں سوچتا۔ مجھ سے پہلے ایسے ایسے اعلیٰ اور دلیر انسان اسی راستے سے چپ چاپ گذر گئے۔ جو کچھ ان پر بیتی ہوگی بیشک مجھ پر بھی بیت لے ــــ"

اتنے میں ایک سرخ بالوں والی چھریری حسینہ آئی۔ برٹن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، نبض گنی، ٹمپریچر لیا، دو چار مذاق کئے اور چلی گئی۔

"یہاں لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں خصوصاً یہ گریس۔ یہ تو دس دس منٹ کے بعد آ جاتی ہے۔ کبھی میں ہسپتال میں لیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں ہسپتال سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا نرسوں سے ــــ تم ہی بتاؤ کہ اس عمر میں چہلیں کرتا ہوا کچھ اچھا لگوں گا؟ جس دور سے یہ گریس گذر رہی ہے میں تیس پینتیس سال پہلے گذر چکا ہوں ــــ تمہاری روانگی کب ہے؟"

"آج جانا ہے ــــ لیکن آپ بیمار ہیں ــــ"

"نہیں! آج ہی روانہ ہو جاؤ اور جلدی سے اسی جگہ پہنچ کر ان کی دیکھ بھال کرو جو ابھی نو عمر ہیں اور جن سے امیدیں وابستہ ہیں۔ بوڑھوں یا قریب المرگ لوگوں کے مقابلے میں ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے ــــ"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو بولا ــــ "ہمیشہ پھرتیلے رہنا، ایک ترکیب بتاؤں ــــ جو وردی آج کل پہنتے ہو ایک جوڑا محفوظ کر لو ہر سال پہلی جنوری کو پہن کر دیکھنا جب تک یہ فٹ آتی رہی تم بھی فٹ رہو گے!"

منصور سٹیشن پر چھوڑنے آیا لیکن کچھ افسردہ سا تھا۔ پچھلے تبادلے پر اس نے کچھ دلچسپ باتیں کی تھیں میں نے وعدہ کیا کہ کبھی اس علاقے سے گذرا تو ضرور آ کر ملوں گا:

"اب تم دور چلے جاؤ گے، بس بے جان خطوط رہ جائیں گے۔ تم نظر نہیں آؤ گے۔ نئی نئی جگہوں میں نئے نئے دوست بنیں گے اور دجلے کے کنارے گذارے ہوئے دن تمہیں یاد بھی نہ رہیں گے۔ پھر خط وکتابت بھی سست ہوتی جائے گی خطوط بے جان ہو جائیں گے ــــ"

سعدہ آتی ہوئی دکھائی دی۔

منصور نے جلدی سے کہا ــــ "تم ناتجربہ کار ہو۔ ایسے لمحات بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے اپنا دل پتھر کا بنا لو جنگ کا زمانہ ہے۔ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا اور کون کہاں جائے گا ــــ ہمت سے کام لو ــــ"

اور میں نے منصور کو بڑی حیرت سے دیکھا جو سعدہ کے لئے ایسے فقرے کہہ رہا تھا

سعدہ نے سلام کیا۔ ایک ڈبہ دیا جس میں کھجوریں تھیں

"پھر کب آؤ گے؟" اس کے ہونٹ ہلے، تل اور بھی نمایاں ہو گیا

"پتہ نہیں ــــ شاید اب موقع نہ ملے ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"اس لئے کہ وطن دور ہے ــــ"

"تم وطن تو نہیں جا رہے۔ واپسی پر آؤ گے نا؟"

میں نے منصور کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا اور کون کہاں جائے گا ——" میں نے منصور کا فقرہ دہرایا

"لیکن تم تو کہا کرتے تھے کہ جدائی کا اثر مختلف طبیعتوں پر جدا جدا ہوتا ہے، وہی ہوا کے جھونکے جو ذرا ذرا سے چراغوں کو بجھاتے ہیں تیز آگ کے شعلوں کو اور بھی بھڑکاتے ہیں ——"

"ہاں —— یہ کسی مفکر کا فقرہ ہے ——"

"جھوٹا وعدہ بھی نہیں کروگے؛ یاد ہے وہ گیت؟؟"

گاڑی چلدی۔

کئی برس کے بعد اتفاق پھر مجھے دجلے کے کنارے لے آیا لیکن اس بار میں سیاح کی حیثیت سے آیا تھا اور فقط گنے گنائے دنوں کا قیام تھا۔ سیدھا کیمپ پہنچا، صرف چند آدمی ملے، باقی کے سب جا چکے تھے۔ سڑک پر گرد اڑاتی ہوئی فوجی لاریوں کی جگہ خوبصورت بھڑکیلی کاریں نظر آئیں۔ بغداد کے دجلے میں روشنیاں اسی طرح جھلملائیں، کناروں سے موسیقی کی تانیں بلند ہوئیں لیکن وہ چہل پہل رخصت ہو چکی تھی، شور و غل تھا لیکن قہقہے فقط کہیں کہیں سنائی دیتے تھے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد تھا، کیمپ سے شمال کا رخ لیا اور منصور کے گاؤں پہنچا

"دوست مجھے افسوس ہے کہ زیادہ چھٹی نہیں مل سکی۔ کل واپس جانا ہوگا ——" میں نے معذرت کی۔

"ملاقات ایک لمحے کی بھی اچھی ہوتی ہے ——" وہ بہت خوش تھا بار بار شکریہ ادا کرتا۔

اس کے چہرے پر تفکرات نے لکیریں کھینچ دی تھیں کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے پہلے تو مہمان نوازی میں ادھر ادھر بھاگتا رہا، پھر اس کے ساتھ ایک بچہ اور بچی آئے۔

"میرے بچے ہیں ——"

"اور سعدہ کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں کہاں ہے۔ شاید بغداد میں ہو، کیوں ——؟" اسے بڑا تعجب ہوا

منصور اور سعدہ کے متعلق میرا قیاس بالکل غلط نکلا

پرانے دنوں کی طرح سہ پہر کو ہم لمبی سیر پر نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد اور بیوی کا انتقال ہو چکا ہے "جس روز والد صاحب سدھارے اسی دن منصورہ کا لڑکپن بھی ساتھ ہی رخصت ہو گیا —— شاید اس لئے کہ میرے سر سے سایہ اٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اپنی باری ہے۔ وہ میرے نہایت عزیز اور گہرے دوست بھی تھے۔ تنہائی سے ڈر کر رفاقت چاہی اور شادی کی۔ پھر دو بچے چھوڑ کر وہ بھی چلی گئی ——"

میرے اظہار افسوس پر مسکرا کر بولا —— "اور تو اور وہ سب جوانیاں بھی چلی گئیں"

کئی بار جی چاہا کہ مرحومہ کے متعلق پوچھوں کون تھی؛ کیا ہوا تھا؟ لیکن الفاظ ہونٹوں پر آ کر رک جاتے

"کبھی کبھی مجھے اپنی زیادتیاں یاد آتی ہیں جو ان لوگوں سے کیں جو مجھ سے محبت اور شفقت کی توقع رکھتے تھے —— لیکن تب محسوس تک نہ ہوتا تھا کہ یہ زیادتیاں ہیں ——"

یاد ہے بوڑھا برش نوعمروں کی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا کرتا تھا ـــــ میں نے یاد دلایا۔

"میرے خیال میں یہ تجربے کی کمی نہیں احساسات کی کمی تھی ـــ حال ہی میں میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے گرم کپڑا دیا تو بجرے بولی نہیں مجھے کوئی سستا سا چیتھڑا یا ٹاٹ دیدو۔ میرے اصرار پر کہنے لگی گرم کپڑے تو خوش نصیب پہنتے ہیں میرے لئے ٹاٹ ہی بہت ہے۔ میں تھرا اٹھا پہلے بھی ضرورتمندوں کو دیکھا تھا بلکہ انھیں دیکھے بغیر قریب سے گذر جاتا تھا لیکن اب کسی ضعیف محتاج کو دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں میں میں اور مجھ میں کوئی فرق بھی تو نہیں اور اچھے دن بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ شکار کا شوق بھی نہیں رہا۔ کبوتروں کا شکار زیادہ آتا ہے۔ میں گولی چلاتا تا۔ جو چھرّوں سے بچ جاتے وہ اپنے زخمی اور مردہ ساتھیوں کے اوپر منڈلانے لگتے اور اگلی گولی کی زد میں آجاتے۔ کبھی کبھی بے شمار آنکھیں سامنے آجاتی ہیں۔ ہرنوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جن سے آنسو نکل رہے تھے پرندوں کی متحیر آنکھیں، جانوروں کی دہشت زدہ آنکھیں کچھ ایسی جیسے معصوم بچوں کی آنکھیں ہوں اور پوچھ رہی ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا ـــ قطار در قطار یہ آنکھیں سامنے سے گذر جاتی ہیں ـــ"

ہم پتھر پر بیٹھ کر غروب آفتاب دیکھنے لگے۔

شاید اس نے میرا تجسس بھانپ لیا تھا ـــ "تم بالکل نہیں بدلے۔ آج تک تم نے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی جس کے بتانے میں مجھے ملا رہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لوں لیکن میں اس مخلص اور وفادار رفیق کو کیسے بھلا دوں جس نے ہمیشہ میرے جھوٹ کو بھی سچ مانا، میری ضد لا پرواہی اور تلخ رویے کو دلبرانہ سمجھا جس کی نگاہوں میں مجھ سا کوئی اور زمانے بھر میں نہیں تھا۔ اس کی علالت طویل ہوتی گئی۔ میں کچھ دیر پاس بیٹھتا تو کہتی جاؤ کسی سے مل آؤ کہیں سیر کر آؤ۔ مرنے سے دو روز پہلے اس نے میرے سارے کپڑے قرینے سے رکھوائے۔ ملازم کو تاکید کی کہ بغیر ناشتے کے مجھے کبھی باہر نہ جانے دے۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دوں ـــ مجھے یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں بچوں میں زندہ ہے ـــ"

میں نے بیماری کے متعلق پوچھا۔

"ان دیہات میں طبیب بہت کم ہیں، عطائی مریض کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خوش فہمی کی یہ حد ہے کہ غلط علاج سے موت آجائے تب بھی عزیز و اقارب عطائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے تو پوری کوشش کی تھی۔ تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ تم ہی ان دنوں اپنے بچوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں کہ جہاں انھیں تعلیم دینی ہے وہاں انھیں تندرست بھی رکھنا ہے۔ کہیں اپنی مرضی کے خلاف میدانوں میں نہ جانا پڑ جائے ـــ"

پھر اس نے مجھ سے محاذ کے دوسرے تجربے کے بارے میں پوچھا۔

"پہلے تجربے سے ملتا جلتا تھا ـــ"

"اب تم ملک ملک پھر آئے ہو ـــ بحثوں میں حصہ لیتے ہوگے ؟"

"نہیں ـــ"

"موہن کو بھی یہی شکایت تھی کہ تم اپنی رائے چھپا جاتے ہو ـــ"

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے دنیا ضرور دیکھی تھی لیکن زندگی کی بھٹی اُسے کندن بنا رہی تھی۔ میرا ہم سفر مجھ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

"کبھی ضرور بتاؤں گا ـــ وعدہ رہا" میں نے کہا۔

آفتاب غروب ہو گیا آسمان شفق سے جگمگانے لگا

"زندگی کے رنج والم کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اگر دن کے اختتام پر اس پہلے بھورے مٹیالے بادل نہ ہوں تو غروب آفتاب رنگین کیونکر ہوگا ـــ"

صبح مجھے رخصت کرتے وقت اس نے دور میدانوں کی طرف اشارہ کیا ـــ "شاید میں اُن پُر شور آبادیوں میں جا بسوں اور کچھ عرصے کے بعد اُن

لوگوں جیسا ہو جاؤں ـــــ تب ملے تو شاید تم منصور کو پہچان نہ سکو گے ـــــ

میں روانہ ہوا تو آسمان میلا سا تھا جیسے آئینے پر کبھی روز کی گرد جمع ہو۔ دھندلاہٹ بڑھتی گئی، پہاڑیاں ختم ہوئیں تو زرد دھند چھا گئی اور سہ پہر شام میں تبدیل ہو گئی۔
"آندھی آنے والی ہے ـــــ" ڈرائیور بولا۔
دیکھتے دیکھتے سب کچھ تاریک ہو گیا۔ موٹر کی روشنی فقط پانچ فٹ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ہم سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ پھر دم گھٹنے لگا۔
"تباہ سموم معلوم ہوتی ہے" ـــــ ڈرائیور نے بتایا۔ موٹر روک کر ہم نے منہ سر لپیٹ لیا۔ تیز جھکڑوں کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں، گھاس پھونس، کنکریاں نہ جانے کیا کیا اُڑا جا رہا تھا۔ اتنی تیز ہوا کے باوجود سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔
جب آندھی کی شدت ختم ہوئی تو ہم روانہ ہوئے لیکن تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ سڑک پہلے ہی اَٹ چکی تھی۔ ہم صحرا میں اندھا دھند چکر لگا رہے تھے۔ گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے، اس وقت ہمیں کیمپ میں ہونا چاہئے تھا۔ پھر ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاید ہمارا رُخ پہاڑیوں کی طرف بدل چکا تھا۔ سوچا کہ اب کہیں ٹھہرنا چاہیئے۔
دور ایک روشنی نظر آئی۔ قریب پہنچے تو دو لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں جن کے شیشے ہماری موٹر کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں۔ کواڑ کھلے اور ایک گول مٹول چہرہ نظر آیا، جلتی ہوئی موم بتی ہوا سے بجھ گئی۔ اسے دوبارہ روشن کیا گیا تو چند اور چہرے دکھائی دیئے ـــــ جس نے دروازہ کھولا تھا وہ اور اس کے دو ساتھی قالین پر بوتلیں تھامے بیٹھے تھے۔
وہ تینوں تقریباً ایک سے تھے، پھولے ہوئے جسم، موٹے موٹے نقش، چہروں سے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔
ڈرائیور نے مجھے تھرماس اور تھیلا دے دیا اور خود موٹر میں جا بیٹھا۔
باہر آندھی پھر شروع ہو چکی تھی۔ جھونکے تیز ہوتے تو ان کی باتیں ہوا کی سیٹیوں اور چیخوں میں گم ہو جاتیں ـــــ اس عجیب ماحول میں وہ غول بیابانی معلوم ہو رہے تھے۔
انہوں نے بہت سا کھانا نکالا، میری طرف بھی دیکھا لیکن میں نے سر ہلایا اور تھرماس کھول لی۔
تقریباً دو گھنٹے تک وہ بے تحاشا کھاتے رہے۔ پھر نئی بوتلیں کھول کر باتیں شروع کر دیں۔ وہ بڑی جلدی جلدی بولتے اور بار بار قہقہے لگاتے۔ کچھ آندھی کا شور کچھ اُن کا ـــــ اُن کی گفتگو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔ لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔
ان میں سے ایک جو اپنے بھتیجے کا واحد نگران تھا بتا رہا تھا کہ لڑکے کا لاکھوں کا بیمہ کرا چکا ہے۔ اسے دانستہ طور پر خطرناک کام دیئے جاتے ہیں، پُر خطر جگہوں پر بھیجا جاتا ہے لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد مجبوراً لڑکے سے وہی سلوک کرنا پڑے گا جو اس کے دو بھائیوں سے پہلے کیا جا چکا ہے ـــــ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔
دوسرے نے یتیم خانوں اور ایسے دیگر منافع بخش اداروں کا ذکر چھیڑا۔ دولت اور شہرت کے سلسلے میں امیر عورتوں اور بیواؤں کو ورغلانے کے قصے سنائے۔ جعلی دستخطوں، جعلی دستاویزوں، جعلی شادیوں اور دیگر چالوں کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کی۔
میں تھکا ہوا تھا دیوار کے سہارے اونگھنے لگا۔
پھر جیسے خراٹوں نے چونکا دیا۔ آندھی کا شور ختم ہو چکا تھا ـــــ دروازہ کھولا تو چاندنی اندر آ گئی۔ باہر سب کچھ ساکن تھا۔ آسمان میں چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی میں وہ تینوں دکھائی دیئے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ سانس لیتے تو توندیں پھول جاتیں۔ سانس باہر نکلتا تو بڑی بھیانک آواز آتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تین مردہ جسم شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔
باہر نکل کر دیکھا تو دور دور تک قبریں ہی قبریں تھیں۔ آندھی سے بچ کر جہاں پناہ لی تھی وہ اس قبرستان کی کوٹھڑی تھی۔ دفعتاً آنکھوں کے سامنے گذشتہ

ایک نظارہ کو ندگیا تھا۔ ذرا ایک قبرستان بمباری کی زد میں آ گیا۔ دھماکوں کے ساتھ قبریں کھل گئیں۔ مُردے دور دور جا پڑے۔ کچھ دیر کے بعد جگہ جگہ لاشیں نظر آنے لگیں۔ کچھ اُن پیاریوں کی تھیں جو ابھی ابھی مرے تھے کچھ برسوں پرانی تھیں۔ نئی پرانی لاشیں، زخمی اور بے ہوش سب آپس میں اُلجھے ہوئے پڑے تھے۔

موت کیسے کیسے روپ بدل کر آتی ہے۔ کبھی پہلے بیماری بھیج کر جسم کو بھی طرح بھسم کر لیتی ہے۔ کبھی بے خبری میں آن دبوچتی ہے کبھی ایذائیں دے کر ترسا ترسا کر جان لیتی ہے۔

لیکن سب سے ذلیل موت وہ ہے جو زندہ جسم میں یوں حلول کر جاتی ہے کہ سانس آتا رہتا ہے۔ جو اس درست رہتے ہیں لیکن دل و دماغ مر جاتے ہیں ضمیر مر جاتا ہے ——— انسانیت مر جاتی ہے۔

قبرستان کی یہ زندہ لاشیں بھی طبعی موت سے پہلے مر چکی تھیں۔

دور اُفق پر روپہلی لکیر کھنچی ہوئی تھی ——— یہ دجلہ تھا۔

میں اس سمت میں چلتا گیا حتیٰ کہ کنارہ آ گیا۔ دریا کی شفاف سطح پر تاروں کا عکس جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پانی یوں ساکن تھا جیسے لہروں اور گرداب سے نا آشنا ہو۔ ہلکی ہلکی دھند اُٹھ رہی تھی۔ دوسرا کنارہ اوجھل ہو گیا۔ چاند بے نور ہو کر چھپنے لگا۔ نظارہ سمٹتے سمٹتے محدود ہو گیا اور میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہ گیا۔

مشرق سے روشنی پھیل رہی تھی۔ خنک ہوا کے جھونکے آئے، طیور چہچہانے لگے ——— تخلیق تو روشنی، زندگی رنگ و بو اور لطافتیں لے کر آئی تھی۔ انسان سے ہمدردی، پاکیزگی اور حسن و نفاست کی توقعات تھیں۔ دریا خشک ویرانوں کو سیراب کرنے کے لئے بہائے گئے تھے ——— پھر کیا ہوا کہ صدیوں سے ان کا پانی کبھی انسان کے خون سے سرخ ہوا ہے، کبھی کتابوں کی سیاہی سے گدلا بہا ہے ——— اور ان کے کناروں نے ہریالی کی جگہ مایوس کن نظارے دیکھے ہیں۔

میں واپس پہنچا تو لمبی لمبی کاریں جا چکی تھیں۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ ایک طرف چبائی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں دوسری طرف خالی بوتلیں ——— ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔

بغداد میں سعدہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ سعدہ نے معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے۔ ننگے پاؤں، میک اپ کے بغیر، اس حُلیے میں وہ چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"سکول سے آئی ہو؟ تمہارا بستہ کہاں ہے؟؟"

وہ ہنسنے لگی ——— "میں تو اسی طرح رہتی ہوں۔ آرائش سے مجھے نفرت ہے۔ اُن دنوں پارٹیوں دعوتوں کے لیے مجبوراً بننا سنورنا پڑتا تھا ———"

میں نے منصور کا ذکر کیا۔

"وہ بھی چلا گیا ——— دوسرے بھی چلے گئے ———"

"لیکن میں تو سمجھتا تھا کہ منصور اور تم ———"

"منصور سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا ———"

پرانے ساتھیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ برٹن نے گریس سے شادی کر لی تھی جو اسے زبردستی اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی۔ جب برٹن تندرست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو اسے خود بھی علم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے مگر مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔ اس کا جوان بھتیجا قاہرہ سے تقریب میں شرکت کرنے آیا تو کئیوں نے مغالطے میں اسی کو دولہا سمجھا۔ جو ہین اپنے گھر پر خسر کے انتقال پر چھٹی لے کر ہندوستان گیا۔ واپس آیا تو اور بھی زیادہ غمگین تھا۔ خسر اتنا مقروض تھا کہ ساری دولت ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ جو ہین کو دراصل یہ دکھ تھا کہ بیوی کے سر سے امارت کا بھوت اُتر چکا ہوگا لیکن مفلس ہو جانے پر بھی بیوی کا رویہ وہی تھا جو جیتیں بڑے مزے میں ہے کہیں جا دیا تھا کہ موٹر الٹ گئی۔ اتفاق سے جس نے ترس کھا کر تیمارداری کی وہ بڑے مالدار شخص کی اکلوتی بیٹی نکلی۔ ترس دوستی میں تبدیل ہوا اور دوستی محبت میں۔ آخر لڑکی

کے باپ نے جرجیس کو بیٹا بنا کر دولت اور بیٹی اس کے حوالے کر دی۔ اب وہ دوستوں اور پہچاننے والوں کو خوب قرض دیتا ہے۔ چند مہینے ہوئے ملا تھا، بار بار پوچھتا کہ قرض لو گی؟ ان دنوں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے یورپ گیا ہوا ہے۔ رَوزنے ولایت پہنچ کر بزنس شروع کی تھی۔ بڑے فارمولے لگائے۔ ساری ریاضی صرف کر دی لیکن کچھ نہ ہوا اور اکثر جواب غلط نکلے۔ آخر بزنس چھوڑنی پڑی، اب کسی سکول میں حساب پڑھاتا ہے۔ جرجیس نے بتایا کہ رُوزاس قدر مذہبی ہو گیا ہے کہ سارے محلے والوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے، اس نے جرجیس سے تمہارا اور رُوز کا خاص طور سے ذکر کیا تھا کہ وہ ملیں تو کہنا کہ اب میں بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ خالق نے جس صناعی سے انسانی جسم بنایا ہے اس کی تعریف ڈاکٹر زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور یہ کہ جس ہنر مندی سے کائنات اور نظامِ شمسی کو ترتیب دیا گیا ہے یہ کسی عظیم ریاضی دان کا کام ہی ہو سکتا ہے ——"

"اور سلیم ——؟"

"سلیم لکھ رہی ہے اور پہلے سے کہیں فربہ ——"

"اور تم ——؟"

"سلیم اور دوسرے اکثر مجھ سے جذباتی قسم کی باتیں کیا کرتے لیکن میں جانتی تھی کہ ان جذبات کی تہہ میں تنہائی کا دُکھ ہے یا شراب کا نشہ۔ تم جتاؤ تمہارے ہونٹوں سے کبھی ایک لفظ بھی نہ نکلا ——"

"نہ تنہا تھا، نہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ——"

"کون ہے جس نے تمہاری قوتِ گویائی سلب کر رکھی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں —— سچ سچ ——!"

"اب بھی کچھ سوچ رہے ہو —— کچھ تو کہو ——"

"سوچ رہا ہوں کہ کبھی مشاہدے میں غلطی ہو جاتی ہے، کبھی فکر و عمل میں مطابقت نہیں رہتی، تو کبھی نظریے بھٹکنے لگتے ہیں ——"

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر سلیم کا ذکر آ گیا —— وہ افسردہ آواز میں بولی —— "جس سے واقفیت رہ چکی ہو اسے کیا برا بھلا کہنا۔ میں نے تو اور دوں کے خلاف بھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس اندھیرے میں کبھی کبھی جگنو سے چمکتے تھے۔ چنگاریاں بھڑکتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں ——"

اگلے روز مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئی ——

"یاد ہے یہی پلیٹ فارم تھا۔ یہی وقت تھا۔ تب تم نے جھوٹا وعدہ تک نہ کیا —— اب تو تم وطن جا رہے ہو ——"

ٹرین چلنے لگی۔

"میں تمہیں بصرے سے خط لکھوں گا ——"

"سب یہی کہتے تھے۔ کسی نے دجلے کے کناروں سے خط نہ لکھا —— بصرے سے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے ——"

بصرے میں دُکان سے کئی کارڈ لیے جن پر دجلے کی رنگین تصویر تھی۔ ان پر پُرانے ساتھیوں کے پتے لکھے، ٹکٹ لگائے —— سوچنے لگا اور کیا لکھوں۔ کئی فقرے ذہن میں آئے لیکن قلم ساکن رہا۔ سٹیمر کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ آخر حکیم بقراط کا وہ مقولہ یاد آ گیا ——

"زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گذرے جا رہے ہیں، تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ——"

انتظار حسین

سُوت کے تار

اس نے اقرار کیا کہ وہ زندہ نہیں ہے اور اسے واپس اپنے کھونٹ میں جانا چاہئے۔ مگر اس وقت وہ یوں چل رہا تھا جیسے اس کی سب سوئیاں نکل چکی ہیں اور وہ زندہ ہو گیا ہے۔ اتنی سوئیاں تھیں میرے اندر! اس نے اپنے ارد گرد حیرت سے دیکھا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا تو میں زندہ ہو گیا! اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر مزید اطمینان کے لئے کہ وہ سچ مچ زندہ ہے، وہ پہلے کھونٹ گیا۔ پھر پہلے کھونٹ سے دوسرے کھونٹ میں گیا۔ اس نے گیارہ کے گیارہ کھونٹ طے کر ڈالے۔ پھر اس نے بارھویں کھونٹ میں قدم رکھا۔ میں کس طرف جا رہا ہوں اور یہ لوگ کس طرف جا رہے ہیں!

اس نے اُمنڈتی ہوئی خلقت کو حیرت سے دیکھا۔ سواری اور سواری کے پیچھے سواری۔ پیلی مٹی کا لیپ۔ ہیڈ لائٹوں پر سیاہی ملی ہوئی۔ اوپر سامان لدا ہوا۔ اندر سواریاں ٹھنسی ہوئی۔ وہ بھاگتی دوڑتی لمبی کاروں اور فرسودہ ٹیکسیوں کو حیران دیکھتا رہا۔ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں اور کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اور وہ ہزاروں ہی تھے۔ مگر میں کن لوگوں میں سے ہوں۔ سڑک خالی تھی اور سائرن بول رہا تھا۔ سڑک کے دونوں سمت موٹروں، ٹیکسیوں، رکشاؤں، سکوٹروں، سائیکلوں اور تانگوں کی ٹھٹکی ہوئی قطاریں۔ سواریوں سے نکل نکل کر بھاگتے ہوئے چھپتے چھپاتے لوگ۔ سڑک سے اُتر کر کچے رستے پر درخت اور جھاڑیاں اور وہ نالہ جو اب خشک پڑا تھا۔ وہ آہستہ سے اس خندق میں اتر گیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے سروں کو نہوڑائے ہوئے لوگ دم بخود تھے۔ ایک لڑکی کی سفید ساٹن والی شلوار اور لون کی چست قمیص دونوں مٹی سے خراب ہو گئی تھیں اور درخت کے سائے میں کھڑی ہوئی شیورلیٹ جس پر پیلی مٹی لپی ہوئی تھی۔

وہ گڑھے سے یوں باہر آیا جیسے سات سو برس تک سونے کے بعد غار سے برآمد ہو رہا ہے۔ کیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ دنیا اسے بدلی ہوئی نظر آئی۔ کاروں، ٹیکسیوں اور سکوٹروں کی کھڑی ہوئی قطار اب وہاں نہیں تھی۔ ٹریفک معمول کی رفتار پر رواں دواں تھا۔ سامان سے لدی پھندی سفطریا نہ دوڑتی ہوئی ایک ٹیکسی چلتے چلتے اس پنواڑی کی دوکان پر رکی جہاں ریڈیو بول رہا تھا۔ ایک سوٹ بوٹ والا آدمی اترا "کیا خبر ہے؟" پریشان اور مضطرب تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دوکان پر گیا۔ پھر مطمئن واپس آ کر ٹیکسی میں بیٹھا۔ ٹیکسی والے نے بیک کر کے ٹیکسی کو موڑا اور جس طرف سے آ رہا تھا اسی طرف چلا گیا۔

لوگ آس پاس سے بھاگ بھاگ کر دوکان پر آ رہے تھے اور ریڈیو کے گرد اکٹھا ہو رہے تھے۔ شاید خبریں ہو رہی ہیں۔ اس نے جلدی جلدی قدم اٹھائے اور دوکان پر پہنچ گیا۔ ملاں پنواڑی نے سوئچ مروڑا اور ریڈیو کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک سکوٹر تیزی سے دوڑتا ہوا دوکان کے قریب آ کر اچانک رکا۔ "ملاں کیا خبر ہے؟" اس نے سکوٹر پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

ملاں نے سکوٹر والے کو دیکھا۔ جواب دینے کی بجائے آئس بکس کھول کر کوکا کولا کی ایک بوتل نکالی اور پاس کھڑے ہوئے تنومند آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ "لو پہلوان"

پہلوان نے بوتل منہ سے لگاتے لگاتے سکوٹر والے کو دیکھا اور کہا "آبا یو سیز فائر ہو گیا۔"

"سیز فائر؟" سکوٹر والے نے حیران ہو کر یقین نہ کرنے کے انداز میں دوکان پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، دیکھتا رہا۔ پھر اس نے خاموشی سے سکوٹر سٹارٹ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

سامنے سڑک پر تانگہ تیز گزر رہا تھا "جنگ کھیڈ نہیں ہندی جنا نیاں دی۔"

"اوئے چپ کر۔" پہلوان نے بے مزہ ہو کر بوتل سے منہ ہٹاتے ہوئے آواز لگائی۔

تانگے کی رفتار آہستہ ہوئی۔ پھر وہ دوکان کے سامنے آ کر رک گیا "پہلوان جی، بہت روکھے ہو رہے ہو۔"

پہلوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر کوکا کولا کی بوتل کو ابھی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی الگ رکھ، پیسے کرتے کی جیب سے نکال ملاں کے سامنے رکھے اور وہاں سے سیدھا تانگے کی طرف گیا پیچھے کی نشست پر پیر پھیلا کر بیٹھا۔ بولا "چل یار۔"

"پہلوان جی، لڑائی کی کیا خبر ہے؟"

"اوئے بکواس بند کر۔"

سیز فائر تو گویا سیز فائر ہو گیا۔ اسے رفتہ رفتہ یقین آ رہا تھا۔ اور ریڈیو نے اعلان نشر کر کے پھر قومی نغمے شروع کر دیئے تھے۔ دوکانوں میں رکھے ہوئے ریڈیو سیٹوں کے گرد اکٹھا ہو جانے والا مجمع بکھر رہا تھا، جیسے کوئی شو ٹوٹا ہو یا کوئی بڑا جلسہ ختم ہوا ہو ——— اور تم اس عورت کی مانند مت ہو جانا جو اپنے کاتے ہوئے سوت کو مضبوط ہو جانے کے بعد تار تار کر دیا کرتی تھی ——— ریڈیو سیٹ سے ٹوٹی ہوئی وہ ٹولی اس کے برابر سے گزری۔ "ٹھیک ہے مگر ——— ٹولی کا ایک فرد چلتے چلتے بولا "مگر کشمیر میں کیا ہوا؟" کشمیر میں کیا ہوا؟ اس کا جی چاہا کہ وہ تیزی سے چلے اور اس ٹولی میں شامل ہو جائے۔ مگر ٹولی تیزی میں تھی۔ اور وہ اب یوں چل رہا تھا جیسے زندہ نہیں ہے۔ کشمیر میں کیا ہوا! اس نے حیران ہو کر سوچا۔ اور جیسے اس کے اندر کوئی سوئی ہو کہ کھٹک رہی ہو کیا میری سب سوئیاں نہیں نکلی تھیں۔ جب میں قصر سوسن میں تھا تو ایسا ہوا کہ حنانی جو میرے بھائیوں میں سے ایک ہے اور بعضے ہی یہودا آئے اور میں نے ان سے ان کا حال جو اسیروں میں سے باقی رہے اور بچ نکلے تھے اور یروشلم کا حال پوچھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لوگ جو بچ گئے ہیں وہاں کے صوبے میں ذلت اٹھاتے ہیں اور یروشلم کی دیوار ڈھائی ہوئی ہے اور اس کے پھاٹک آگ سے جلے ہیں۔ اور بادشاہ نے مجھ سے کہا کہ تیرا چہرہ کیوں اداس ہے حالانکہ تو بیمار نہیں ہے۔ مقرر تیرے دل کو کوئی روگ لگا ہے۔ تب میں بہت ڈرا میں نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ ہمیشہ جیتا رہے۔ میں کیوں اداس نہ ہوں جبکہ وہ شہر جہاں میرے باپ دادوں کی قبر گاہ ہے۔ اجاڑ پڑا ہے اور اس کے پھاٹک آگ سے بھسم کئے گئے ہیں۔ "یار" وہ نوجوان چائے پینے لگا تھا۔ مگر پیالی منہ کے قریب لے جا کر اس نے پھر میز پر رکھ دی "ان میں ایک آدمی تھا جس کی سرے سے آنکھیں ہی نہیں تھیں۔"

"آنکھیں ہی نہیں تھیں! کیا مطلب؟"

"یار خالی سوتے تھے، آنکھ کے ڈلے نہیں تھے۔"

"اچھا؟ ——— حد ہو گئی ——— تم نے خود دیکھا تھا؟"

"میں نے وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں خود کیمپ گیا۔ وہ بڑھا آدمی تھا۔ بوڑھے تو خیر وہ سب ہی تھے ......" وہ نوجوان چپ ہوا اور حیرت اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہنے لگا۔ "کمال ہے یار آنے والوں میں کوئی جوان نہیں تھا۔ نہ مرد نہ عورت۔"

"مگر کیوں؟"

"کیوں کیا، جوان مرد کو تو وہ دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔"

"اور جوان عورت کو؟"

"جوان عورت کو" نوجوان چپ ہوا۔ پھر آہستہ سے بولا "اسے نہیں مارتے۔"

وہ لوگ جو تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیا کرتے تھے اور اگر تم سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو۔ اس کے اندر پھر کچھ چبھ رہا تھا جیسے کوئی سوئی ہے کہ کھٹک رہی ہے۔ تو کیا سوئی میرے اندر اتر گئی تھی۔ مگر میری تو سب سوئیاں نکل گئی تھیں۔ "تم نے کچھ نہیں بتایا؟"

"میں نے؟" وہ ایسے چونک کر بولا جیسے سوتے سے اٹھ بیٹھا ہو۔ دھیان کی اذیت بھری رو بکھر گئی

"ہاں، تم تو اس علاقہ میں تھے جو زد میں آگیا تھا۔ تم وہاں سے نکلے کیسے؟"

"میں کیسے نکلا؟" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا، چپ ہوا۔ پھر چائے کی پیالی اٹھا کر پینے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی پیالی رکھ دی "ٹھنڈی ہو گئی۔"

نوجوان نے اپنی پیالی چھو کر دیکھی "ہاں ٹھنڈی ہو گئی۔ اور منگا ئیں؟"

"نہیں یار" اس نے جماہی لی "میں اب چلتا ہوں۔"

"کیوں؟" نوجوان نے اسے تعجب سے دیکھا

"مجھے دیر ہو رہی ہے" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ ایسے چل رہا تھا جیسے زندہ نہیں ہے۔ میں کیسے نکلا؟ مگر کیا میں نکل آیا ہوں؟ اس نے سوچا اور وہ حیران ہوا۔ مگر جو نہیں نکل سکے؟ وہ ٹھٹھکا۔ اس کے اندر کسی نامعلوم گوشے میں کچھ چبھ رہا تھا کیا سوئی میرے اندر چبھی رہ گئی ہے؟ .... اور وہ جو نہیں نکل سکے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ لوگ جو باقی بچ رہے وہاں کے صوبے میں ذلت اٹھاتے ہیں اور یروشلم کی دیوار ڈھائی گئی اور اس کے پھاٹک جلائے گئے .... اور وہ لوگ جو تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیا کرتے تھے اور اگر تم سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو ... مرنے کی آرزو؟ .... مگر کیا میں زندہ ہوں؟ وہ دیر تک اس جیس بیس میں رہا کہ وہ زندہ ہے یا زندہ نہیں ہے۔ پھر اس نے طے کیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ اس اندھی کوٹھری میں وہ سوئیوں میں بندھا پڑا تھا، بے حس، بے حرکت۔ بندھی ہوئی سوئیاں کون نکالے۔ قلعہ بجائیں بجائیں کر رہا تھا۔ میرا خاوند کہاں ہے؟ ... کیا، میرا خاوند کہاں ہے ـــــ تخیل کی دکھ بھری رو کو حقیقت کی زیادہ دکھ بھری رو نے کاٹا۔ وہ عورت سیہ پوش تھی ـ اس کا خاوند کہاں ہوگا، اس نے حیران ہو کر سوچا۔ وہ لوگ جو کھجور کے تنوں کی مانند میدانوں میں سوتے ہیں .... ہم نے ان سے کہا مر جاؤ۔ پھر ہم نے انھیں زندہ کر دیا .... اور تم اس عورت کی مانند مت ہو جانا جو اپنے کاتے ہوئے کو مضبوط ہو جانے کے بعد تار تار کر دیا کرتی تھی .... تو ڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا ـــــ لوگ سڑک کے اس کنارے سے اس کنارے تک تتر بتر تھے۔ جیسے کاتا ہوا تار تار ہو گیا ہو۔ ہوا میں اڑتے ہوئے ٹوٹے ہوئے دھاگے۔ راہ میں بکھرے ہوئے آئینے کے ریزے۔ وہ ریزوں سے بہت بچ کر نکلا، مگر اس کے اندر کوئی چیز چبھ رہی تھی۔ سوئی میرے اندر ہے۔ میں زندہ نہیں ہوں۔

چوراہا عبور کرتے کرتے وہ ٹھٹھکا۔ لوگ کہاں گئے۔ ہو حق کرتی سڑک جہاں تہاں پڑی اینٹیں۔ ٹیڑھی میڑھی اندھی دھندلی لال سبز بتی۔ ایک ڈبل ڈیکر جہاں تہاں پڑی اینٹوں سے بچتی بچاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے شیشے چکنا چور تھے۔ اوپر کی منزل خالی تھی۔ نیچے کی منزل میں ڈرائیور تھا اور کنڈکٹر تھا اور ایک بوڑھی سواری۔ تار تار ہو جانے والے سوت کا ایک ٹوٹا دھاگا۔ اور میں ــــ تار تار سوت کا ایک تار۔ مگر میں کیسے نکلا؟ تو کیا میں نکل آیا ہوں۔ اور جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا تھا تم بھی ان کو وہاں سے نکال دو .... وہ بولے کہ جب ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے الگ کئے گئے تو اب ہیں کیا ہے

کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں گے۔ پھر جب لڑنا ان پر واجب کیا گیا تو ان میں سے سوائے چند کے سب ہی پھر گئے۔ آنسو؟ تو کیا میں رو رہا ہوں؟ اس نے اپنی دکھتی ہوئی بھیگی آنکھوں کو رومال سے پونچھا۔ مگر اس کی آنکھیں بدستور دکھ رہی تھیں۔ خالی سڑک جہاں تہاں پڑی اینٹیں، شکستہ و خمیدہ نابینا سبز سرخ بتی اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا۔ تم نے یہ اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو۔ میں گواہ ہوں؟ ہٹا ہٹا زبوت کا ایک تارہ۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگی تھیں اور دکھ رہی تھیں۔ کیا میری دونوں آنکھیں پانی بن کر بہہ جائیں گی؟ ڈیلے بہہ جائیں گے اور سوتے رہ جائیں گے؟ اس نے تصور کیا جیسے اس کی آنکھ کے ڈیلے نہیں ہیں۔ پھوٹے ہیں اور خالی سوتے ہیں۔ کیا میں نکل آیا ہوں؟ تیز گذرتی ہوئی موٹر۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سی سوئیاں پیوست ہوئیں۔ تیز گذرتی ہوئی موٹر کے چار بلب تھے اور چاروں اپنی تیز گرم روشنی سے چکاچوند پیدا کر رہے تھے اور اس پر اب بجلی مٹی کا لیمپ نہیں تھا۔ تو اب رات ہے؟ وقت کا تو دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ دن گذر چکا تھا۔ اب شام گذر رہی تھی اور رات کا ڈیرا تھا۔ سڑک خالی تھی اور درخت خاموش تھے۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں جا چکے تھے۔ یعنی وہ پرندے جن کے آشیانے سلامت تھے۔ وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے الگ کئے گئے۔ مگر میں کیسے نکلا اور وہ لوگ جو نہیں نکل سکے؟" اور جوان عورت کو؟" جوان عورت کو؟..... اسے وہ نہیں مارتے۔" اگر تم سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو۔ مرنے کی آرزو؟ تو کیا میں زندہ ہوں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ پھر اس نے اقرار کیا اور اس نے گواہی دی کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ مگر میں مر کر زندہ ہوا تھا یا زندہ ہو کر مرا ہوں؟ اس کے دماغ میں سوال ایسے پیدا ہو رہے تھے جیسے گیلی گندی زمین میں کنسلائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دماغ میں رینگتی ہوئی کنسلائیاں اور سوالات۔ مگر اس کی آنکھوں میں پھر سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں اور آنسو تھوڑی تھوڑی جلن کے ساتھ بہہ رہے تھے اس نے پھر جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں کو پونچھا۔ سامنے سے ایک ڈولی آ رہی تھی۔ آنکھوں کو پونچھتے ہوئے جیسے آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے۔ تو سب کی آنکھوں میں سوئیاں ہیں۔ شہزادی صبح سے شام تک اس کی سوئیاں چنتی رہتی۔ پھر ایسا ہوا کہ سب سوئیاں نکل آئیں بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں اور شہزادی نے دل میں کہا کہ جب آنکھوں کی سوئیاں نکل آئیں گی تو یہ جوان زندہ ہو جائے گا اور اس اندھیری کوٹھری سے نکل آئے گا اور پھر.....

اس کے بعد کے تصور سے وہ بہت خوش ہوئی مگر وہ بہت تھک گئی اور اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دل میں کہا بس ذرا پانی پی آؤں۔ اس نے ہاتھ روکا، باہر گئی۔ پانی پیا اور الٹے پیروں واپس آئی۔ مگر اس نے دیکھا کہ کوٹھری کا دروازہ پھر بند ہو گیا ہے۔ بہت زور سے ہارن دیتی ہوئی ایک کار اس کے برابر سے گذرتی چلی گئی۔ سڑک پر چلتے چلتے وہ فٹ پاتھ پر آ گیا۔ فٹ پاتھ پر اس کے دائیں بائیں سے کئی آدمی گذرے اور آگے نکل گئے جیسے ان سب کی آنکھوں میں کچھ تکلیف ہو اور ایک کنسلائی پھر رینگنے لگی: کیا سب آنکھیں پانی بن کر بہہ جائیں گی؟ اور اس نے تصور کیا جیسے سب کی آنکھیں بہہ گئی ہیں، سب آنکھیں خالی سوتے ہیں اور پھوٹے ہیں۔ بریک کے تیز شور کے ساتھ ایک کار بیچ چوراہے میں آ کر رک گئی۔ چوراہے کو عبور کرتا ہوا تیز رفتار سکوٹر سڑک پر پڑی ہوئی اینٹوں کے درمیان لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا مگر دقت یہ تھی کہ جو سواری گذر رہی تھی تیز گذر رہی تھی اور چوراہے پر نصب سبز سرخ بتی بینائی سے محروم تھی۔ اس نے شکستہ و خمیدہ بتی کو دیکھا اور دل میں کہا کہ یہ بتی بصارت کھو چکی ہے اور سمت دکھانے سے معذور ہے۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھ کر احتیاط سے چوراہا عبور کیا اور جلدی جلدی چلنے لگا۔ مجھے واپس چلنا چاہئیے۔

وہ گھونٹ گھونٹ ہوتا واپس ہوا۔ اور وہ حیران ہوا یہاں جو مکان تھے وہ کہاں گئے۔ ٹخنوں ٹخنوں مٹی میں چلتا تباہ و برباد عمارتوں کے درمیان سے گذرتا وہ اندھیرے میں واپس پہنچا۔ رات کا ڈیرا تھا اور قلعہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا کہ میں نہیں نکلا تھا۔ پھر وہ دراز ہوا، اور اپنی جلتی آنکھوں اور دکھتے جسم کے ساتھ سوچا اور کہا کہ سب سوئیاں میرے اندر ہیں میں زندہ نہیں ہوں۔ میں نے اقرار کیا اور میں نے گواہی دی۔

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ مر گیا۔

محمد احسن فاروقی

ایک یا اتنی ایک؟

ہاں ابھی پچاس برس کے سن تک میں نے اُس ایک کا تو، دیکھ کر کسی اور کا منہ بھی نہ دیکھا اور اب یاد بھی نہیں آتا کہ کتنی آئیں اور چلی گئیں۔ اتنی ایک کر ڈالیں اس دس برس میں اور آگے کب تک کتنی اور آتی جاتی رہیں گی خدا جانے۔

تم کہتے ہو کہ ایک کر لوں آخر سولہ برس سے پچاس برس کے سن تک ایک ہی رہی۔ اب کیا ہو گیا کہ نت نئی بلاتا ہوں۔ اس سے دل بھر جاتا ہے۔ پھر اس کی طرف رخ نہیں کرتا۔ دوسری لائی جاتی ہے اور یوں ہی تانتا بندھا ہوا ہے کہ ٹوٹنے کو نہیں آتا۔ یہ کیا ہوا۔ سب آپ سے آپ ہو گیا۔

سولہ برس کے سن سے عورت کے ہر وقت ساتھ رہنے کی عادت۔ عورتوں کے سب ہی مرد رہتے ہیں مگر میرا حال دوسروں سے مختلف تھا۔ بچپن سے عورتوں ہی میں رہا۔ والد مر چکے تھے والدہ گھر کی مالک تھیں۔ ان کے ساتھ دو خالائیں بھی رہتی تھیں۔ دو بہنیں بھی تھیں، بھائی کوئی نہ تھا۔ گھر میں بس میں ہی فرد نرینہ تھا۔ باہر سے آنے جانے والیاں بھی عورتیں۔ مجھے کھلانے والی بھی ایک عورت ہی تھی جو باہر نکلتی تھی مجھے بازار لے جاتی تھی چیزیں خرید واتی تھی والدہ کی داروغہ کہیئے۔ مردوں سے مجھے سخت نفرت تھی میں لڑکیوں کے ساتھ ہی کھیلا بھی۔ گڑیاں، چیل چھلیاں، ہنڈکلیہ اور تمام سب لڑکیوں کے کھیل۔ ہمارے یہاں کی بڑی انگنائی میں محلہ بھر کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں۔ یہی کوئی دس پندرہ ان میں آنے جانے والیاں بھی تھیں مستقل آنے والیاں بھی تھیں چودہ برس کے سن تک انہیں کے ساتھ گزری مجھے سب ہی اچھی لگتی تھیں مگر چند خاص طور پر نکھ سکھ کی درست تھیں۔ ان میں سے اگر کوئی کسی دن نہ آتی تو میں پوچھتا۔ چیل چھلیا میں ان ہی کو پکڑتا اور ان ہی میں سے کسی کو اپنے تئیں پکڑا دیتا اچھا لگتا تھا مگر کسی قسم کی جسارت نہ مجھے ہوئی نہ انہیں۔ مگر وہ میرے سر پر ہر وقت سوار رہتیں۔ امی جان مجھے اپنے پلنگ پر اپنے پاس سلایا کرتیں اور جب مجھے نیند آنے لگتی تو ان لڑکیوں کے چہرے سامنے آتے اور خواب میں بھی کبھی سب کو ایک ساتھ کبھی کسی ایک کو اپنے ساتھ دیکھتے ہوئے اور باتیں بناتے ہوئے دیکھتا۔

پندرہ کا ہو کے سولہویں میں لگا ہوں گا کہ ہمارے ہاں ایک ماما رکھی گئی۔ اس کے ایک لڑکی تھی، مجھ سے دو چار سال بڑی ہو گی۔ جب وہ آئی تھی تو امی جان نے دیکھتے ہی کہا تھا "اسے جوان لڑکی لئے پھرتی ہے شادی نہیں کرتی" تو اس کی ماں نے جواب دیا تھا "بیوی کیا کروں، غریب آدمی کی لڑکی کو کون پوچھتا ہے" پھر وہ لڑکی تھی بھی بدشکل، دبلی لمبی، تاڑ سی۔ کھمبا معلوم ہوتی تھی اور ستم یہ کہ منہ پر موٹے گہرے گہرے چیچک کے داغ۔ ناک آنکھ کچھ اچھی سی ہو گی مگر داغوں نے سارا چہرہ بھیانک کر دیا تھا۔ یہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ چیل چھلیا کھیلنے لگی۔ ایک دن وہ چور تھی اس نے مجھے پکڑا اور میں دوسری لڑکیوں سے الگ درخت کے پیچھے چھپا تھا۔ اس نے مجھے پکڑا ہی نہیں بلکہ بھینچ کر چپٹا لیا۔ پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ سب لڑکیاں کیا تھیں۔ پسند ناپسند تو پہلے ہی سے تھی۔ مگر یہ تو کچھ ایسی بات ہوئی تھی کہ حالانکہ مجھے یہ لڑکی بالکل پسند نہ تھی مگر پھر بھی اس سے بار بار چمٹ جانے کو جی چاہتا تھا۔ میں چور ہوا اب میں کسی اور لڑکی کو پکڑتا ہی نہیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسی کو پکڑ رہا ہوں اور وہ بھی جان جان کر اپنے تئیں پکڑوا رہی ہے۔ اس دن

خوب دیر تک چہل پہل ہوتی رہی اور پھر رات ہو گئی اور سب کی سب اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ ہم اور وہ رہ گئے آمنے سامنے۔ اس کی بُری شکل مجھے کیسی اچھی معلوم ہو رہی تھی کیا کہوں اور اس کا دیکھنے کا انداز میرے لئے ایک نیا دلکش تجربہ تھا مگر اب ہماری ہمت نہ ہوتی کہ چمٹ جائیں۔ حالانکہ جی یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی اور کام کرنے لگی۔ میں امی جان کے پاس آ گیا۔

جب کھانے دانے سے فراغت ہو گئی میں دالان میں امی جان کے پاس لیٹ تو دیکھا کہ وہ سامنے پکھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس پر نگاہ جمائی۔ لالٹین کی روشنی میں چہرے کے داغ نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ میں پلنگ سے اٹھ کر کھمبے سے لگ کر کھڑا ہوا اور اپنی والدہ کی طرف رخ کر کے کہنے لگا "دیکھئے آپ لوگ اسے لمبا کہتی ہیں میں اس سے زیادہ لمبا ہوں۔ میری ماں نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا جس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسی نگاہ سے وہ ہم دونوں کو دیکھتی رہیں۔ میں ان کے پاس لیٹ گیا اور اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم سے بولا "میں اب اکیلا لیٹا کروں گا" وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن میرے الگ لیٹنے کا انتظام کر دیا گیا۔ والدہ کی پٹی سے ملا کر ایک پلنگ بچھا دیا گیا جس پر میرے لئے بستر اور تکیہ وغیرہ لگا دیئے گئے۔ میں بے قراری سے رات کا انتظار کرتا رہا۔ وہ لڑکی اور اس کی ماں اسی دالان میں کنارے لگے ہوئے تخت پر سویا کرتی تھیں۔ رات میں اپنے پلنگ سے اسے تخت پر لیٹا ہوا دیکھتا رہا مگر والدہ کو عجیب قسم کا کھٹکا ہو گیا تھا اور وہ رات بھر اپنے پلنگ پر بیٹھی جاگتی رہیں اور اپنی ایک بیوہ بھاوج سے جوان کی بہن تھیں اور اب ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں باتیں کرتی رہیں۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ ان بڑھیوں کو آج آخر ہو کیا گیا ہے کہ ان کی آنکھوں میں نیند ہی نہیں آتی۔ صبح ہو گئی اور دن نکلتے ہی انہوں نے اس لڑکی کی ماں سے کھسر پھسر باتیں کیں اور اس کا حساب کر دیا۔

اسی دن انہوں نے مہریوں کو بلا کر میری شادی کے رقعے بھجوانا شروع کر دیئے۔ اسی دن چہل پہل کھیلنے والی لڑکیوں کی بھی میرے یہاں آنے کی منادی ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ باہر نکل کر پتہ چلاؤں کہ وہ لڑکی اور اس کی ماں کہاں گئیں مگر اتنے بڑے شہر میں پتہ چلانا کوئی آسان بات تو تھی ہی نہیں۔ بہر حال مجھے عورت کی طرف ایک نئی قسم کی توجہ ہو گئی تھی۔ میں زیادہ تر جو ترے جو ترے میں پلا تھا اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے ماں ایک لمحہ کے لئے نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ کسی ہم سن لڑکے سے کبھی دوستی نہ ہوئی۔ بازار جاتا کہیں ٹہلنے نکل جاتا، کبھی کوئی میلے ٹھیلے میں جاتا تو اکیلا یا گھر کی پرانی بڑھیا نوکرانی ساتھ ہوتی۔ میری عادت ہو گئی تھی کہ گھر کے اندر ہی مجھے قرار ملتا، بالکل گھر گھسنا ہو گیا تھا۔ اب اس عالم میں کوئی ایسا نظر نہ آیا جس سے دل کا حال کہتا اور مشورہ لیتا۔ وحشت میں شہر کا چکر لگانے جاتا۔ راستے میں جو بھی لڑکی یا جوان عورت دکھائی دیتی اسے گھورتا۔ خیال ہوا کہ ادھر چوک میں بھی جاؤں مگر کئی دن تو ہمت ہی نہ پڑی، آخر کو ایک دن دندانہ گھستا چلا گیا۔ کوٹھوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف نگاہ کرتا اور پھر جھکا لیتا۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ہمت بڑھی کہ ان کو غور سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ ایک دن اسی طرح جا رہا تھا کہ ایک آدمی میرے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا "میاں ان گندی گھناؤنی چیزوں کو کیا دیکھتے ہو۔ ادھر میرے ساتھ چلو تو دکھاؤں پاک صاف تر و تازہ مال گھروں کے اندر والے" میں اس شخص سے آنکھ نہ ملا سکا اور گھبراہٹ میں میری یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں اک دم سے بولا "آج نہیں بھئی کل" وہ اور بھی ڈھٹائی سے بولا۔ "اگر آج پیسے نہیں ہیں تو کل ہی سہی مگر دیکھو اس وقت دو چار پیسے کے رکتے کی بات ہے کل جمع ہیں" میں نے تھرتھراتے ہوئے کہا "نہیں نہیں کل ہی" اور پھر وہ کھلاہٹ میں ایسا ہوا گھر آیا۔ رات بھر سوچتا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں اور پھر جاؤں تو روپے کہاں سے لاؤں، امی جان نے کبھی میرے ہاتھ میں روپے نہیں دیئے۔ جب جس چیز کو میں نے کہا نوکرانی سے منگوا دی یا مجھے نوکرانی کے ساتھ کر دیا اس نے مجھے لے دی۔ روپے مانگنا اور روپیہ ملنا بھی بڑی مصیبت تھی۔ خیر وہ دن ٹل گیا۔ اب میری ادھر جانے تک کی بھی ہمت نہ پڑی کہ کہیں وہ آدمی مل گیا تو کیا

ہوگا۔ شہر میں اور طرف جانے میں بھی یہی ڈر لگتا کہ وہ آدمی مل گیا تو کیا کہوں گا۔ سکوت کے عالم میں گھر ہی میں بیٹھا رہا کلیجے پر پتھر رکھے ہوئے۔

شادی ٹھہرنے اور ہونے میں قریب قریب دو مہینے لگ گئے۔ عورت کی وہ خواہش جو اس لڑکی کے چمٹ جانے سے ابھری تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور پھر ایک بھولی ہوئی چیز ہوگئی۔ شادی کی رسموں میں بیوی کو دیکھ کر کوئی خاص جذبہ نہ پیدا ہوا۔ عورتوں میں رہنے کی وجہ سے مجھ میں وہ جسارت نہیں پیدا ہوئی جو عام طور پر جوانوں میں ہوتی ہے۔ بچپن سے ہر چیز سے ڈرایا گیا۔ ہر کام کو کرتے ہوئے ڈر جانے جھجک جانے کی عادت ہوگئی۔ بیوی سے بھی بہت جھجکا مگر جوں توں راہ پر آ گیا۔ میری بیوی خوبصورتوں میں تھی۔ آخر چھانٹ کر کی گئی تھی اور مجھے وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ حسین معلوم ہوئی۔ اس سے ایک لمحہ جدا نہ ہوتا تھا۔ میکے جاتی تو ساتھ جاتا۔ ایک دن روک لیا گیا تو شام تک بے قرار ہو کر پیدل بھاگا اور وہیں جا کر دم لیا۔ دوسرے دن ہی اسے گھر واپس لے آیا۔ یہی عالم زندگی بھر رہا۔ اس کے بچے بھی ہوتے رہے، اس کا حسن بھی ڈھلتا رہا۔ مگر ہر بچے کے بعد مجھے اس میں نیا حسن دکھائی دیتا رہا۔ میری اس سے محبت مشہور ہوگئی۔ نئی دلہنوں کو اس کا منہ دکھایا جاتا تاکہ ان کے میاں بھی انھیں اسی طرح چاہیں جیسے میں اسے چاہتا تھا۔

گھر کی سب بڑھیاں مر مرا گئیں ہم دونوں اور بچے سارے گھر کے مالک ہوگئے۔ پہلے چھ سال کے اندر سارے بچے ہوگئے۔ پھر کوئی نہ ہوا۔ یہ سب بچے بڑھے ان کو پڑھوایا لکھوایا گیا۔ ان کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ لڑکے سرکاری ملازمتوں پر لگے اور اب دوسرے شہروں میں اپنے کام پر ہیں۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی ہوگئیں۔ ہم میاں بیوی کوے سے کولا لائے بیٹھے رہے اور آرام سے کٹتی رہی مگر ایک دن اس کو ہیضہ ہوگیا اور دوسرے دن پھٹ سے ختم۔ سب بال بچے آئے۔ چالیسویں تک گھر میں چہل پہل رہی۔ پھر سب چلے گئے اور اب مجھ پر وحشت طاری ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی خالی ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آدھا دھڑ کٹ کے الگ ہوگیا۔ اس کی تیر پر جاتا مگر نہیں وہ سب کو ہم تھا۔ جی یہی ڈھونڈتا تھا کہ کوئی پاس کے پلنگ پر ہو، جب جی چاہے پاس لیٹ جاؤں اور نرم و نازک لہجے کی باتیں سنا کروں۔ گھر کے دھندوں میں بھی فرق آگیا۔ نوکرانیاں اور ایک بڑھی کھانا پکانے والی ان سب کا بھی نظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اب مجھے کام لینا پڑا تو بہت کھلا۔ کسی قسم کی معمولی سے معمولی ذمہ داری کو اٹھانے کا میں اہل ہی نہ تھا۔ خیر لشتم پشتم کام چلتا رہا۔ کبھی کہتا میں بھی مر جاؤں مگر اصل میں مرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ جب بہت زیادہ وحشت ہوتی تو ریل سے کسی لڑکے یا لڑکی کے یہاں پہونچ جاتا مگر وہاں اپنی زندگی کا ڈھرا نہ بیٹھتا اور پھر غیر مقام کی ہوا میں بھی دم گھٹتا۔ سب بچوں نے ایک رائے ہو کر کہا "آپ ایک اور شادی کر لیں ابھی گیا کیا ہے۔" کچھ یار دوست اتنی زندگی میں ہو ہی گئے تھے انھوں نے بھی یہی رائے دی۔ بازار کے دوکاندار بھی یہی رائے دیتے۔

میں بھی ہفتوں سوچتا رہا کہ دوسری شادی کر لوں مگر دیکھا کہ میرے ہمسن لوگوں میں جنھوں نے دوسری شادیاں کیں وہ مضحکہ ہوگئے۔ میں نے کان پکڑا کہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا۔ ایک میرے ہمسن باقاعدہ دولہا بن کر سسرال گئے۔ پہلی بیوی کے جوان جوان بچے ساتھ اور نئی نویلی دولہن بیاہ لائے۔ یہ چہتا کو دیکھو تو وہ جوانی سے بھری ہوئی۔ صاحبزادے سے پھنس گئی۔ وہ بدنامی ہوئی کہ کیا کہوں۔ کئی اسی قسم کی جن کو گھر میں کوئی جوان نہ ملا تو باہر کے جوانوں سے آنکھ لڑا لڑا کر بھاگ گئیں۔ میں کسی طرح ایسے حشر کے لئے تیار نہ تھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ سوتیلی ماں آتے ہی پہلی بیوی کے بچوں کی محبت ختم۔ بچے بھی ڈانٹ اور خود بھی۔ نئی بیوی کے بچے ہو رہے ہیں۔ مرنے کے بعد بڑے بھائیوں سے ان کی کفالت کی امید عبث۔ اتنے دنوں جیتے رہنے کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ لوگ ہنپنے اپنے کار سے لگ جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوان بیوی اور اس کے بچوں کو لا کر ایک کنوئیں کی جگت پر بٹھا دیا اور اب میاں صاحب کو جو موت کا دھکا لگے گا تو ان لوگوں کے لئے بھی ڈوب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ بھی سوچا کہ کوئی بیوہ اپنی ہمسن کر لوں مگر یہ بھی دیکھا کہ ویسیاں بڑی ہی تنگ دل ہوتی ہیں۔ اگر پہلے میاں کے بچے ساتھ لائیں تو وہی مصیبت یا اس سے زیادہ مصیبت جیسے کہ اپنے بھی ان سے بچے ہوں اور نہ بھی لائیں تب بھی بادشاہت کرنے آتی ہیں۔ میاں ہر وقت جوتی کی نوک پر۔ تو صاحب مجھے تو ایسی چاہئے نہ تھی

دو سال اسی مطالعہ میں گزار دیئے، رائے پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی کہ دوسری شادی کسی طرح کی بھی مصیبت ہی دے گی اور دنیا کی نگاہوں میں اُلّو کا پٹھا بنائے گی۔

کوشش کی کہ صبر کروں مگر صبر کے خیال سے تڑپ اور بڑھی اور تو اور یہ محسوس کرنے لگا کہ پھر سے جوان ہو رہا ہوں۔ ہمراہی کی خواہش ہی نہیں بلکہ جنسی خواہش بھی زور پکڑنے لگی مجھے کبھی کوئی بیماری ویماری نہیں ہوئی، تندرستی اچھی ہی رہی۔ پچاس برس کے سن پر سب قوا برقرار رہنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی مگر اب محسوس ہونے لگا کہ وہ برقرار ہی نہیں بلکہ اسی طرح ترقی پر ہیں جیسے اس وقت تھے جب وہ لڑکی چہلی چہلیا کھیلتے میں مجھ سے چمٹ گئی تھی کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا کہیں وہ ہی آجائے تو اسے ہی ڈال دوں مگر پھر خیال ہوتا وہ کریہہ منظر اب تو بڑھی ہو کر اور بھیانک ہو گئی ہوگی اور شوق رخ نکمو بھی عود کر آیا اور نوٹ قندیں بھرنے لگا اب خیال آیا کہ یہ بازار حسن ہم ایسوں ہی کے لئے ہے۔ جوانی میں ایک دفعہ ادھر سے گزرا مگر بے زر عشق ٹیں ٹیں۔ امی جان سے پیسے ملنا مشکل تھے۔ اب میرے پاس اتنا تھا کہ کھائے کھایا نہیں جاتا تھا۔ آمدنی ہی آمدنی تھی خرچہ کچھ نہ تھا۔ ایک دن رَو میں آکر دندناتا ہوا پہونچ ہی گیا اور ایک کمرہ پر جا کر دم لیا۔ یہ جسارت جوانی میں نہ تھی۔ باون برس کے سن میں عجیب انگیز طریقہ پر بحال ہوئی مگر دو چار دفعہ ہی میں یہ محسوس ہوگیا کہ میری ضرورت یہ نہیں ہے۔ عورت گھر میں آنا چاہیئے، اسی طرح رہنا چاہئے جیسے وہ مرحومہ رہتی تھی مگر جی کا جنجال نہ ہونا چاہیئے۔

اب ان والوں سے بات کرنے میں بھی اس جھجک کا سوال نہ تھا جو پہلے محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے مجھے تانگے پر بٹھایا اور ایسے ایسے مقامات دکھانا شروع کئے کہ کیا کہوں۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک عورت ہے میری بیوی مگر اب محسوس ہوا کہ اتنی ایک ہیں، کوئی حد ہی نہیں۔ اتنی ایک عورتیں، اتنے الگ الگ کینڈے، اتنے الگ الگ انداز بھونچکا رہ گیا کہ کسے چھانٹوں کسے نہ چھانٹوں اور پھر میری بیوی سے ملتی جلتی اتنی ایک نظر آئیں۔ اتنی ایک دیسی جب وہ بیاہ کر آئی تھی، اتنی ایک ایسی جیسی وہ کچھ آگے سب بچے ہو جانے کے بعد ہو گئی تھی۔ میں نے کہا واہ میں گلی کو ترستا تھا۔ ارے جب چاہتا چاہوں گلستاں بکنار ہو جاؤں۔ پہلے ایک ہی عورت میں محو تھا دوسری بھاتی ہی نہ تھی۔ اب اتنی ایک عورتیں اور تعلق میں دیکھیں تو ہر ایک میں کچھ نہ کچھ دل کو موہنے کی بات نظر آئی۔ سوچنے لگا کہ کاش مجھے اودھ کی بادشاہت مل جاتی تو اس قیصر باغ کو پھر اسی طرح سجاتا جیسا کہ واجد علی شاہ نے سجایا تھا اور شام کے وقت ان سب سے چہلی چہلیا کھیلا کرتا۔

مگر یہ سب حماقت تھی۔ ایک انتظام ہو گیا، میں گھر بیٹھا رہتا ہوں، دلال وے میرے پاس عورتیں لانے لگے۔ پہلے پہلے تو کچھ اپنی بیوی کی سی آتی رہیں پھر ان سے مختلف قسم کی آزمانے کو جی چاہا۔ وہ بھی حاضر۔ یہاں رہتی ہیں۔ جسے دل چاہوں رہتی رہیں۔ نرخ کے حساب سے ان کو دے دیا جاتا۔ ذرا طبیعت اکتائی ابھی بس چلتا کر دیا۔ دوسری آگئی۔ اکثر ایسی بھی آئیں جن کو کئی کئی ہفتے رہنے دیا۔ ایسی بھی آئیں دوسرے ہی دن روانہ کر دیا۔ کسی دن گھر عورت سے خالی نہیں رہتا اور اتنے عرصے میں ایک کے بجائے اتنی ایک کی عادت بھی پڑ گئی۔ جب بچوں میں سے کسی کے یہاں آنے کی خبر آتی تو سلسلہ بند کر دیا جاتا۔ معلوم ان کو بھی ہے کہ میں یوں زندگی گزار رہا ہوں مگر مجھے یہ برا لگتا ہے کہ ان میں سے کوئی یہاں ہو اور اس قسم کی عورت بھی موجود ہو۔ بڑے صاحبزادے ایک دفعہ بیوی بچے لے کر تین مہینے کے لئے آئے اس دوران میں سلسلہ بالکل توڑ دیا۔ اب بھی جب چاہے توڑ دوں، جب چاہے چلا دوں مگر خواہ مخواہ توڑنے سے کیا فائدہ۔ عادت سی ہو گئی ہے۔ اس کا توڑنا مشکل ہی ہے بعض وقت خیال آتا ہے کہ یہ میں گناہ ہی کر رہا ہوں مگر ویسے بھی کون سے بڑا نیک بخت اور معصوم رہا ہوں اور گناہوں کے بوجھ پر ایک یہ بھی سہی جہاں ان گناہوں کی سزا ہوگی وہاں اس کی بھی ہو جائے گی مگر کسی ایک کے ساتھ اب نکاح کر کے میں جیتے جی جہنم نہیں مول لے سکتا۔ جب تک

جی چاہتا ہے اسے چلائے جا رہا ہوں۔ جب نہ جی چاہے گا توڑ دوں گا کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی بے راہ روی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک نظام ہے۔ آسانی یہ ہے کہ جب چاہو اسے توڑ ڈالو قانون سر پر عائد نہیں ہوتا۔ کسی کو اس سے نقصان بھی نہیں ہوتا۔ نہ کسی کی دل آزاری ہے نہ کسی سے جھگڑا ہے اور نہ کسی کے لئے مضحکہ ہی ہوں۔ نہ میں کہتا ہوں کہ سب لوگ ایسا ہی کرنے لگیں۔ سب لوگ شرع قانون ہدایت پر چلیں خدا مجھے بھی اس کی توفیق دے مگر اب تک تو مجھے یوں ہی بن پڑ رہی ہے۔

اور ویسے میں کسی سے ملتا جلتا نہیں مگر میرے اس عمل کو نہ معلوم کہاں سے اتنی شہرت ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن ایک صاحب آئے بہت بڑے بڑے بال لٹکتے ہوئے۔ آتے ہی تقریر جھاڑنے لگے میری خاک جو پلے پڑی ہو۔ ایک لفظ معاشرہ معاشرہ بہت آ رہا تھا ان کی تقریر میں، یہ مجھے یاد ہو گیا اور ان کی تمام بک بک کا مفہوم یہ تھا "آپ معاشرے میں بڑی اہم تبدیلی لا رہے ہیں۔ یہ شادی بیاہ سب فرسودہ چیزیں ہو گئی ہیں۔ معاشرہ اب یہی چاہتا ہے۔ آپ بڑے رہنما ہیں" وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی انجمن کے ایک اجلاس میں جا کر بتاؤں کہ میں کیا عمل کر رہا ہوں۔ میں بھی انجمن وجمن میں جانے سے گھبراتا ہوں اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بالکل چھپا کے مجبوری کے عالم میں۔ اس کا اعلان کر کے اپنے کو نکو بنواؤں۔ نا صاحب نا میں ہرگز نہ گیا۔ پھر سنا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ پیچھا چھوٹا۔

محمد خالد اختر

طارق اقبال کالج کے بڑے ہال میں ایک عجیب بے فکری اور مسرت سے گھوم رہا تھا۔ کوئی گیارہ کا وقت تھا۔ اس کی کلاسز ختم ہو چکی تھیں اور وہ ہال میں اکیلا تھا۔ وہ یوں ہی دیواروں پر چوکھٹوں میں لگے گروپ فوٹو دیکھنے لگا — اپنے ان ہیروؤں کی تصویریں جنہوں نے ہاکی ٹیم یا ڈرامہ کلب یا تیراکی کے مقابلے میں نام پیدا کئے تھے اور کپ جیتے تھے۔ اس نے اپنے ان "ستونوں" اخروٹ کی منقش چھت کے ایوان میں چلنے اور اس ممتاز مجمع کا ایک فرد ہونے پر بڑا فخر محسوس کیا۔ یہ ناقابلِ یقین تھا! وندرفل!! وہ گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم بن جانے پر اپنی خوش قسمتی پر اترا سکتا تھا۔ یہ کالج صوبے کا بہترین امتیازی تعلیمی ادارہ تھا — تعلیم اور سپورٹس کی شاندار روایات کے ساتھ، اور اس کے فارغ التحصیل طلبا حکومت میں سب سے اچھے عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ کسی اور کالج میں اتنا نامی اور قابل سٹاف نہ تھا — ایچ ایل او گیرٹ ایسکوائر، احمد بخاری پطرس بی۔ اے کینٹب، اے۔ ڈیمی ہیٹ ایسکوائر۔ اور تو اور اس کی عمارت کتنی انوکھی اور پُرتصویریت تھی۔ اسے دیکھتے ہی آدمی کا دل ربڑ کی گیند کی طرح اچھلنے لگتا تھا۔ اس کے کلیسائی مینار، ڈھلانی سلیٹ کی چھتیں، برجیاں، اونچے دروازے، مورش محرابیں، اقلیدسی قوسوں کے دریچے۔

طارق اقبال کو ایک مہینہ پہلے اس کالج کی فرسٹ ایر میں داخلہ ملا تھا۔ عام سیکنڈ ڈویژنر ہونے کے باوجود مناسب سفارش نے اس کا کام کیا۔ وہ سولہ سال کا ایک ذہین، شرمیلا، خوش شکل لڑکا تھا — گھنگھریالے گھنے بال، معصومیت اور استعجاب سے بھری سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت متناسب خدوخال۔ اس کے مضامین انٹر آرٹس کے تھے۔ انگلش، حساب، فزکس اور فرنچ۔ وہ واحد لڑکا تھا جس نے اس سال فرنچ لی تھی اور اس سے کچھ الجھنیں پیدا ہو گئیں جو اسے کبھی کبھی فکرمند کر دیتیں۔ قدرتاً وہ بے پروا تھا اور اپنی پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا لیکن اسے انگریزی ادب میں لڑکوں کے لئے لکھی ہوئی مہماتی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور وہ اکثر اوپر کی منزل پر لائبریری روم کے گرد منڈلاتا ہوا دیکھا جاتا۔

چوکھٹوں میں پرانے گورنمنٹ کالج کے نامی طلبا کی تصویریں دیکھتے ہوئے جو اس سے برسوں پہلے اس عالیشان ایوان میں چلے تھے، انہی کلاس روموں میں بیٹھے تھے، وہ ایک [illegible] کی کالج ہاکی ٹیم کے گروپ کے آگے رکا۔ اس کا گول مٹول ہنسوڑ ماموں جمال خاں، جو اس کے ساتھ اسے کالج میں داخلہ دلوانے آیا تھا، سب سے پہلے اسے یہی فوٹو دکھانے کے لئے لایا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ جمال خاں اس گروپ میں ایک ہاکی سامنے رکھے دوسرے کھلاڑیوں سے آگے گھٹنے ٹیکے اور ہتھیلی پر سر رکھے لیٹا تھا۔ اگر جمال خاں اسے نہ بتاتا تو طارق اقبال اسے کبھی نہ پہچان سکتا۔ فوٹو میں اس کا ماموں اپنی نیکر اور جرسی میں ایک پھرتیلا کسرتی بدن کا جوان لڑکا تھا۔ طارق اقبال نے تعجب کیا کہ یہ چکنا چپڑا چہرے والا چست لڑکا کیوں کر وہ عظیم شحیم تھل تھل کرتے ہوئے جسم کا آدمی بن گیا۔ جو اس کا ماموں اب تھا۔ وہ واحد کسرتی کرتب، جو اس کا ماموں اب سرانجام دینے کا اہل تھا، اپنے کھنگھار

کو اتنی قوت سے ٹھوکتا تھا کہ وہ کمرے کی چھت سے چپٹ جاتا۔ جمال خاں اس کرتب پر خوب داد طلب ہوتا اور اسے دن میں بار بار دوہراتا۔ مگر طارق اقبال اپنے ماموں کا بڑا احسان مند تھا، اسی کی وجہ سے تو اسے داخلہ ملا۔ ایک تو وہ اوگھڑ بولنے تھا۔ پھر وہ کالج ہاکی الیون میں ان دنوں رہا جب احمد شاہ بخاری بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ اور بخاری ایک ہی عمر کے تھے۔ جمال خاں اسے انٹرویو سے پہلے بخاری کے پاس سٹاف روم میں لے گیا۔ بخاری اسے دیکھ کر بڑا ہنسا "ملک جمال خاں، بڑا موٹا ہو گیا ہے یار" بخاری نے طارق اقبال کا نام نوٹ کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ پوری مدد کرے گا اس پر بھی جمال خاں مطمئن نہ ہوا۔ اس نے فارسی کے پروفیسر سے جس سے اس کی چچازاد بہن بیاہی ہوئی تھی، انٹرویو بورڈ کے بیشتر پروفیسروں کے نام ذاتی خط لکھوائے۔ یہ خط لفافوں میں ڈالے گئے اور ان پر پتے لکھ دیئے گئے جب طارق اقبال کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو ملک جمال خاں بھی اپنے شملے کو اونچا کئے اس کے ہمراہ اندر گیا۔ اس نے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ وہ خط متعلقہ پروفیسروں کو تقسیم کر دیئے جن کے نام وہ تھے۔ وہ اُن کو پڑھنے لگے اور انھوں نے فارسی پروفیسر کے احترام میں اس سے کوئی سوال نہ پوچھا۔ ملک جمال خاں نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ اپنے ہمراہ ایک بستے میں طارق اقبال کے باپ کی خان صاحبی کی سند اور وہ سرٹیفکیٹ بھی جو اسے سرکار برطانیہ سے عنایت ہوئے تھے لے کر آیا تھا مگر اس بستے کو کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔

اور انٹرویو! طارق اقبال نے اس کے بارے میں سوچا تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ ایک نیم دائرے میں لٹکے ہوئے دس بارہ معاندانہ اور اجنبی چہروں کے روبرو کھڑا تھا۔ انتہائی نروس اور ڈھیلی ہوئی قمیص پر اپنے چھوٹے بالائی رنگ کے کوٹ کے دامنوں کو مروڑتا ہوا بورڈ کا پریذیڈنٹ انگریز پرنسپل ڈی کلف اپنے سیاہ گاؤن اور کملائے چہرے کے ساتھ درمیان میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے سولی کا حکم دینے والا جج لگا۔ اس کے ساتھ دائیں طرف ایک اچھے سلے ہوئے بھوری رنگت کے سوٹ میں خندہ رو اور خوبصورت پروفیسر احمد شاہ بخاری بیٹھا تھا۔

"کیا تم ہاکی کے اچھے کھلاڑی ہو؟" پرنسپل ڈی کلف نے اس کی درخواست کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جس میں اس نے کھیلوں کے خانے میں یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ہاکی کھیلتا ہے۔

"بہت اچھا تو نہیں مگر میں اسکول میں ہاکی کھیلتا رہا ہوں" یہ ایک لحاظ سے سچ تھا۔ مگر طارق اقبال ان لڑکوں میں سے تھا جو ہر قسم کے کھیلوں میں بالکل پھسڈی رہتے ہیں۔

پرنسپل نے اس سے دو تین سوالات پوچھے اور پھر اس کے ایک سوال کا اس نے ایک بڑا احمقانہ جواب دیا۔

"تم نے اپنے مضمون میں فرینچ کیوں چنی ہے پرشین کیوں نہیں" پرنسپل نے پوچھا۔

"کیونکہ میں پرشین کا ایک لفظ نہیں جانتا" طارق اقبال نے جواب دیا۔

کوئی زور سے ہنسا۔ غالباً یہ پروفیسر احمد شاہ بخاری تھا۔ مگر پرنسپل نے اس کافی بے وقوفی کے جواب پر پوچھا "اور فرنچ کا تمہیں ایک لفظ آتا ہے؟"

اس کا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس کے فوراً بعد اس کا انٹرویو ختم ہو گیا اور ملک جمال خاں اپنا بستہ اٹھائے دوسرے دروازے سے باہر آ گئے۔ وہ برآمدے میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ خدا جانے اس کا داخلہ ہوا یا نہیں تب احمد شاہ بخاری باہر آیا اور لکڑی کے جنگلے پر جھک کر ایک شوخ لڑکے کی طرح سیٹی بجانے لگا۔ پھر اس نے جمال خاں کو دیکھا اور اسے بتایا کہ اس کے بھانجے کو لے لیا گیا ہے۔

میں اس بھدے بے وقوف لڑکے سے اب کافی بدل گیا ہوں۔ طارق اقبال نے سوچا۔ اب وہ شلوار قمیص کی بجائے ایک دھاری دار

سرخی مائل سوتی سوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس نے شاہ عالمی کے ایک ہندو درزی سے سلوایا تھا۔ اس کی قمیص کے کالر کھلے تھے اور اس نے ابھی ٹائی باندھنی نہیں سیکھی تھی پھر بھی اس نے اپنے کو سمارٹ محسوس کیا۔ وہ اپنے نئے سوٹ پر بڑا مغرور تھا۔

وہ پرانے کالجیئن کے گروپ دیکھتے دیکھتے اپنے خوابوں میں کھو گیا۔ طارق اقبال جاگتے میں اکثر وقت خواب دیکھتے گذارتا تھا۔ اس نے اب خود کو ایک آل راؤنڈر کے روپ میں دیکھا۔ نہ ہی صرف کھیلوں میں چوٹی پر بلکہ اپنی کلاس میں بھی سب سے اول نمبر پر۔ ہر کوئی اس کی صلاحیت اور قابلیت پر رشک کرتا تھا۔ کبھی ایسا قابل اور ہونہار لڑکا اس کالج کے ایوان میں سے نہیں گذرا تھا اور پرنسپل ڈی کھنہ ایسے لائق لڑکے کے اپنے کالج کا طالب علم ہونے پر بجا طور پر نازاں تھا۔ ایک ہاکی گراؤنڈ طارق اقبال کے سامنے ابھرا۔ وہ سنٹر فارورڈ تھا اور اتنا تیز اور پھرتیلا کہ ہاف ٹائم سے پہلے اس نے ایف سی کالج کی ٹیم پر پانچ گول کر لیے۔ اس کے کالج فیلو خوشی سے اچھلے اور چلائے "ویل ڈن طارق!" "گڈ ویل طارق!" ہاف ٹائم پر خود پرنسپل اٹھ کر عزت سے اس سے ہاتھ ملانے اور اسے تھپکی دینے آیا اور اس کے کالج فیلوز نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ ہاف ٹائم کے بعد اس نے چھ اور گول کئے۔

اور اس کے کالج فیلوز خوشی سے پاگل ہو گئے۔ "کیا وہ 'ونڈر' نہیں!" ہر کوئی کہنے لگا۔ پھر اس نے تیراکی کے انٹر کالج مقابلے میں خود کو دو length سے اول آتے اور ایک بڑی ٹرافی جیتتے دیکھا۔ کرکٹ کے گراؤنڈ میں اس نے دو گھنٹے میں تین سنچریز کیں اور بعد میں اس سلئے آؤٹ ہوا تاکہ دوسروں کو بھی کھیلنے کا موقع ملے جمنیزیم میں وہ بہترین اتھلیٹ تھا۔ سب سے خوبصورت اور مکمل جسم کے ساتھ۔ وہ کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں چمکا۔ کالج کے ڈرامیٹک کلب میں اس کی ایکٹنگ سب سے زیادہ سراہی گئی اور کالج میگزین میں اس کے انگریزی مضمون کے اتنے اچھے اسلوب پر تو خود پروفیسر اے۔ ایس بخاری عش عش کر اٹھا اور اسے بلا کر مبارک باد دینے پر مجبور ہوا۔

وہ آپ ہی آپ خوشی سے مسکرایا۔ اس نے اپنی دائیں بانہہ کو دوہرا اور سخت کرکے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے بازو کی مچھلیوں کو ٹٹولا۔ جمنیزیم اور تیراکی کے تالاب میں ورزش نے اس کی مچھلیوں کو سخت کر دیا تھا اور اس کا ناپ ساڑھے تیرہ انچ تھا۔ اس نے چند روز پہلے اس قابل فخر واقعے کی خبر اپنے باپ کو لکھی تھی۔ اس کا والد ضرور مسکرایا ہوگا۔ مگر اس نے جواب میں لکھا کہ اس کے ایک خاص آدمی نے اسے پانچ بار سینما پر دیکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی پڑھائی کی طرف مناسب توجہ نہیں دے رہا۔ خط میں ایک چھپی ہوئی دھمکی تھی کہ اگر وہ اسی ڈگر پر چلتا رہا تو اسے گورنمنٹ کالج سے اٹھا لیا جائے گا۔

ہال میں اکیلے گھومتے ہوئے ایک چیز نے طارق اقبال کی مسرت میں کھنڈت ڈال دی۔ اس نے زبانوں میں فرنچ لی تھی۔ مگر مسٹر ہیٹ ایم۔ اے فسٹ ایر کلاس کی فرنچ کلاس سے کر اپنے کام کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مسٹر ہیٹ کے پاس گیا تھا اور مسٹر ہیٹ نے اسے۔ برآمدے میں چلتے ہوئے اکسانے کی کوشش کی تھی کہ وہ فرنچ چھوڑ دے۔ اور کوئی اور زبان فارسی یا عربی لے لے۔ مسٹر ہیٹ کے اس رویئے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنچ کی کلاس ہی نہ ہوئی۔ طارق اقبال کو چاہئے تھا کہ وہ فارسی یا عربی لے لیتا مگر اس نے فکر نہ کی۔ اسے ایک کلاس کم بھگتنا پڑتی تھی۔ اب پہلا سہ ماہی امتحان سر پر تھا اور طارق اقبال کبھی کبھی فکر مند ہو جاتا۔ وہ کیسے چار مضامین کی بجائے صرف تین میں امتحان دے کر پاس ہوگا۔ یہ سارا مسٹر ہیٹ کا قصور تھا جو فرنچ کلاس لینے سے گریزاں تھا۔ طارق اقبال بھلا کیا کرتا۔ یہ بادل اس کی روح پر تھوڑی دیر ہی رہا۔ پھر اس نے اپنے biceps کو ٹٹولا۔ اپنے نئے سلے ہوئے دھاریدار سوٹ کو تعریفی انداز میں دیکھا اور اپنی عظمت کے سپنوں میں کھویا گھومنے لگا۔

ہال کے خاتمے پر ایک برآمدے کے شروع میں سٹاف روم تھا۔ لمبا جالی دار دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر جھانکا۔ پروفیسر بخاری اور عربی کا بارلیش پروفیسر جس کا نام وہ نہیں جانتا تھا ایک لمبی میز کے پرلی طرف بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ طارق اقبال نے قیاس کیا کہ پروفیسر بخاری عربی کے پروفیسر سے کسی مذہبی معاملے پر وضاحت چاہ رہا تھا۔ اور ان دونوں کے چہرے مسکراہٹ سے روشن تھے۔ طارق اقبال نے سوچا کہ پروفیسر بخاری کے ساتھ

باتیں کرنا کتنا ونڈرفل ہوگا! بخاری جو بی۔ اے کینٹب تھا۔ اتنا خوبصورت اور خندہ رو اور پھر جس نے "پطرس کے مضامین" لکھے تھے کیا وہ اسے اس لڑکے کی حیثیت میں پہچان لے گا جسے ملک جمال خاں اس کے پاس داخل کرانے کے لئے لایا تھا۔ چار پانچ منٹ طارق اقبال کمرے کے باہر منڈلاتا رہا یہ سوچتے ہوئے کہ اندر چلا جائے یا نہ جائے۔ پھر بخاری کے چہرے پر خوش خلقی اور دوستی کی چمک پا کر اس کا حوصلہ بندھا اور وہ اندر چلا گیا۔

بخاری اور عربی کے پروفیسر نے اس مخل ہونے والے لڑکے کو تعجب اور دلچسپی سے دیکھا۔

"گڈ مارننگ سر" طارق اقبال نے اپنا ہیٹ اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اسے انگریزی میں بات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ کالج کے پراسپکٹس میں لکھا تھا کہ طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کلاس میں اور ہوسٹل میں باہمی بات چیت صرف انگریزی ہی میں کریں گے لیکن جونہی اس نے گڈ مارننگ کہا اس نے سوچا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں کہا۔ کہیں اسے "گڈ آفٹرنون" تو نہیں کہنا چاہیئے تھا۔

"گڈ مارننگ" پروفیسر بخاری نے خندہ روئی سے کہا اور اس جواب نے طارق اقبال کو گڈ مارننگ کے صحیح ہونے کے متعلق مطمئن کر دیا۔ پروفیسر بخاری کی پر شفقت مسکراہٹ نے اس کی ہمت بندھائی۔

"سر" طارق اقبال نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "میرا نام طارق اقبال ہے اور میں فرسٹ ایر کا طالب ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا سر کہ ملک جمال خاں مجھے آپ کے پاس داخلے کے سلسلے میں لے کر آیا تھا۔"

اسے اپنی انگریزی پر فخر تھا اور اس نے اپنے تلفظ میں صحیح انگریزی بولنے کی کوشش کی تاکہ پروفیسر بخاری بی اے کینٹب جو کیمبرج کے لہجے میں بولتا تھا اس سے متاثر ہو جائے

"او ہاں!" بخاری نے کہا "ملک جمال خاں اور میں سیکنڈ ایر میں اکٹھے تھے۔ وہ ہاکی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

"میں اس کا بھانجا ہوں۔"

"کیا تم بھی ہاکی کھیلتے ہو؟"

"نہیں سر" طارق اقبال کی آنکھیں خوبصورت اور جامہ زیب پروفیسر پر اس طرح اٹکیں جیسے ایک چاہنے والے کی آنکھیں اپنی محبوبہ پر۔ "میں سکول میں ہاکی کھیلتا رہا ہوں مگر سر میں کھیلوں میں اتنا اچھا نہیں"

"یہ کوئی بات نہیں" بخاری نے کہا "جو تمہیں فکر مند کرے۔ میں خود کھیلوں میں پھسڈی تھا اور تم کس کس چیز میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"سر مجھے ادب سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں انگریزی ناولوں کا بڑا شائق ہوں۔ میں نے "واش کرو سو" اور "دا مڈ بیگنڈ کی شی" پڑھی ہے۔"

"اوہ" پروفیسر بخاری نے کہا۔

"اور سر میں نے آپ کی کتاب "پطرس کے مضامین" بھی کوئی آدھ درجن دفعہ پڑھی ہے۔ میں اسے پڑھ کر بہت ہنسا۔ یہ اردو میں بہترین مزاحیہ کتاب ہے۔ میں بھی بڑا ہو کر ایسی ہی کتاب لکھنا چاہوں گا۔"

پروفیسر بخاری کو اپنے اس نوجوان پرستار کی تعریف بڑی اچھی لگی۔ لڑکے کے انداز میں اتنی چمک بھولپن اور سہانی بے ساختگی نے پروفیسر کا دل جیت لیا اور شاید اسے وہ وقت یاد آگیا جب وہ طارق اقبال کی طرح اس کالج کے ایوان میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔

"تمہیں کالج کی زندگی کیسی لگ رہی ہے؟" پروفیسر بخاری نے پوچھا۔

"او سر! یہ ونڈرفل ہے۔ میں کھیل تو نہیں کھیلتا مگر میں سوئمنگ پول میں روز تیرنے جاتا ہوں اور کالج جمنیزیم میں جا کر ورزش کرتا ہوں۔ میرا

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میرے بائی سٹیپ کا ماپ ساڑھے تیرہ انچ ہے۔"

"اوہ واقعی! پروفیسر بخاری نے کنکھیوں سے عربی کے پروفیسر کو دیکھا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا تم پہلوان یا مکہ باز بننے کے لئے خود کو ٹرین کر رہے ہو؟"

"نہیں سر، مگر میں ایک اچھا تندرست لڑکا بننا چاہتا ہوں اور اپنے بدن کو کسرت اور ورزش سے گٹھیلا اور مضبوط بنانے کا مجھے بڑا شوق ہے ۔۔۔ سر میں ڈرامیٹک کلب اور ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں؟"

"ڈرامہ کلب ابھی شروع نہیں ہوا۔ جب ان کا کوئی پلے کرنے کا ارادہ ہوا تو مجھے آکر ملنا۔ تمہیں ایکٹنگ کا شوق ہے؟"

"جی ہاں سر، اپنے سکول میں ہم نے ایک بار شیکسپیئر کے جولیس سیزر کا کچھ حصہ کیا تھا۔ میں بروٹس بنا تھا۔ رومنز۔ کنٹری مین اینڈ لورز ... لینڈ می یور ایئرز"

"جب کوئی ڈرامہ سٹیج کرنے کا فیصلہ ہوا تو میں دیکھوں گا کہ تمہیں بھی کوئی پارٹ ضرور ملے۔ ڈیبیٹنگ سیکھنے کے لئے پہلے اپنے گروپ کی میٹنگز میں تقریریں کیا کرو۔"

"سر، کیا میں آپ کے گروپ میں شامل نہیں ہو سکتا؟"

"اچھا میں دیکھوں گا۔ اب تم کس پروفیسر کے گروپ میں ہو؟"

"پروفیسر واسطی کے۔"

"میں واسطی سے بات کروں گا اور ایسا انتظام کروں گا کہ تم میرے گروپ میں آجاؤ۔ اور تمہیں کوئی مشکلات ہوں تو میرے پاس بے دھڑک آجایا کرو۔"

اس نے پروفیسر بخاری کو بتایا کہ کیسے اس نے فرنچ زبان لے رکھی ہے اور مسٹر ہیٹ فرنچ کلاس نہیں لیتا۔

"اسے لینی چاہئے۔ تم نے مسٹر ہیٹ سے پوچھا ہے؟"

"جی ہاں سر! اس نے دو گھنٹے مجھے اس بات پر لگانے میں صرف کئے کہ تم فرنچ چھوڑ دو اور کوئی اور زبان لے لو۔ در اصل وہ ایک کلاس سے بچنا چاہتا ہے۔"

بخاری نے سوچ کر کہا "ان حالات میں تم فارسی کیوں نہیں لے لیتے؟"

پھر طارق اقبال کے منہ پر وہی انٹرویو والا جواب آنے لگا کہ جناب اس لئے کہ مجھے فارسی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ اس نے اس جواب کو گویا نگلا اور کہا "اچھا سر۔ اگر آپ مشورہ دیتے ہیں تو ۔۔۔"

وہ کچھ دیر اس طرح کھڑا اور ہاتھ ملاتا بخاری سے باتیں کرتا رہا اور دل ہی دل میں پھولا نہیں سما رہا تھا کہ وہ اتنے نامی پروفیسر کے سامنے اتنی اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ حقیقتاً وہ اتنی اچھی انگریزی نہ تھی اور اس کے بعض فقروں کی بناوٹ بخاری کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ لے آئی۔

"گڈ بائی سر، تھینک یو۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا ہے۔" اس نے شکریہ ادا کیا اور سولا ہیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکلا۔ نامی پروفیسر سے اتنی دیر باتیں کرنے پر وہ بڑا شاداں اور مغرور تھا۔ یوں گویا ہوا پر چلتا ہوا وہ برآمدے میں سے باہر روش میں آیا جہاں سرخ بوگن ویلا بیلوں میں دہک رہا تھا۔ اس نے نیچے دھوپ کے سونے میں نہائے ہوئے کالج لانز اور کالج ٹاور کو اور بینکل کی طرف ایک رشک کی داستان کے ساتھ نظر دوڑائی اور اسے یہ احساس ہوا کہ دنیا اس کے قدموں تلے ہے۔

اور زندگی آسمان کی دھنک کی طرح حسین، اپنے سارے تحفوں، کامرانیوں، اعزازوں اور انعاموں کو اپنے دامن میں بھرے اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔

اس نے اس لمحہ وقت کی سڑک پر پچیس سال آگے اس ننھے گنجے، چشمہ لگے، منحنی، گھبرائے ہوئے، ادھیڑ عمر کے آدمی کو نہ دیکھا جو آفس سپرنٹنڈنٹ تھا اور جس کے پانچ بچے تھے اور ایک جو ہر وقت تند مزاج سخت گیر بیوی، اور جو دفتر میں اپنے افسر سے ڈرتا تھا اور گھر میں اپنی بیوی سے، اور جو صرف اس لئے زندہ تھا کہ اس میں خود اپنی جان سے کھیلنے کی جرأت نہ تھی۔

مسعود مفتی

اپنے

"پھاتاں ..... اری او پھاتاں ....." نوردین آوازیں دیتا ہوا ہڑپارہ گاؤں کے اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں داخل ہوا۔
"اری نیک بخت کہاں بیٹھ گئی ..... اے پھاتیے ....."

اس نے صحن میں گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ سامنے والے کمرے کی چھت میں بڑا سا شگاف تھا جس سے سارا کمرہ روشن ہو رہا تھا۔ دیوار میں بھی ایک شگاف تھا جس میں سر ڈال کر اس نے کمرے میں جھانکا ——— اور پھر باورچی خانے کی طرف چلا۔

مگر وہ کہیں نہ تھی

"میں تو کہوں، پھر پھر اسی منحوس برساتی میں بیٹھ کر رو رہی ہوگی۔" وہ چھت پر جانے والی کچی سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔

پھاتاں واقعی وہیں تھی ——— وہ فرش پر لیٹی ہوئی تھی اور دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر سسک رہی تھی۔ قریب ہی آدھی چھت اور آدھی دیوار کا ملبہ پڑا تھا جس میں سے ٹوٹی ہوئی کڑیاں اور گھاس پھونس باہر جھانک رہے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ایک گولہ ان کی برساتی کی چھت پر پھٹا تھا۔ اور اس کی چھت کا ایک کونہ اور آدھی دیوار کے اندر آن گرا تھا۔ اس حصے میں ویرانی تھی اور ہر چیز پر گرد کی تہہ ایسے جمی تھی جیسے ضعیف چہرے پر مردنی چھائی ہوتی ہے۔

"اری نیک بخت، میں نے تجھے ہزار بار کہا ہے کہ اس برساتی میں مت آیا کر۔ جب بھی یہاں آتی ہے رو رو کر اپنی جان فضول میں ہلکان کرتی ہے۔"

اس نے بازو پکڑ کر پھاتاں کو اٹھایا تو وہ اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ دوسری طرف پھیر کر دوپٹے سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"دیکھو کیا حال بنا رکھا ہے۔" نوردین اس کی قمیض پر سے مٹی جھاڑتا ہوا بولا اور ترس بھری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ گیلی پلکیں آپس میں چپک رہی تھیں۔ نوردین اپنے ہاتھ سے انہیں صاف کرنے لگا۔

"پگلی ہے بالکل۔ بھلا رونے سے کیا فائدہ۔ یہ کیا کم ہے کہ زندہ سلامت پھر گھر میں واپس آگئے ہیں۔"

"اپنا گھر ہے!" پھاتاں ناہموار آواز میں بولی۔ "نہ کوئی دیوار سلامت، نہ چھت قائم۔"

"او چھوڑ! کیا ہوا۔ جان تو سلامت ہے ——— جان ہے تو جہان ہے۔ اپنے ملک میں بیٹھی ہو۔ اپنے لوگوں میں موجود ہو۔ اور کیا چاہئے ——— جب تک اپنے پاس ہیں، کوئی پروا نہیں۔ مکان دکان سب بن جائے گا ..... چل اتر نیچے۔"

پھاتاں آگے آگے اور نوردین پیچھے پیچھے اترنے لگے۔

"تجھے ہزار بار کہا ہے کہ اس برساتی میں نہ آیا کر۔ گھر کی یہی تو جگہ بچی ہے اور وہ گرد کی بھی۔ خواہ مخواہ رو رو کر جان گنواتی ہے۔"

صحن میں پہنچ کر نوردین نے اوپر برساتی کی طرف دیکھا۔ "میں تو کہتا ہوں اسے گرا ہی دوں۔ سب برائی کی جڑ یہی ہے۔ اس میں ہے ——— خواہ مخواہ دل

چھڑا دیتی ہے ۔۔۔ برساتی کا ہے کو ہے۔ یہ تو یادوں کا گھر ہے ـــــ نہ یہ ہوگی نہ تو بھاگ بھاگ کر وہاں چھپے گی اور روئے گی۔"

بھاگاں لوٹتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلی اور نوردین گری ہوئی دیوار کے ملبے اٹھانے لگا۔

تین دن ہوئے۔ وہ ہڈیارہ گاؤں میں واپس آئے تھے۔ سرکاری لاریں نہر کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھیں اور وہ سوکھی نہر کو پیدل عبور کر کے آگے چلتے گئے۔ جنگ سے پہلے بسیں ہڈیارہ سے گزرتی ہوئی گھونڈی تک جاتی تھیں۔ مگر اب پل ٹوٹا ہوا تھا اس لئے وہیں رکنا پڑتا ـــــ بھاگاں کے سر پر چھوٹی گٹھڑی تھی جس میں حکومت کی طرف سے دیئے ہوئے کپڑے اور راشن تھا اور نوردین اپنی پانچ سالہ بچی آمنہ کو کندھے پر اٹھائے تھا۔

نہر عبور کرتے ہی انہیں ٹیلے لگائے گئے۔ وہیں سے انہوں نے برکی گاؤں دیکھا جو سامنے نظر آرہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چھتوں کے شہتیر خدا سے فریاد کرنے کے انداز میں ایک دم اوپر کو اٹھے ہوئے ـــــ دیواریں تو پے ہوئے کپڑوں کی طرح کسی بیٹھی اور روٹی ہوئی ـــــ جو کھڑی تھیں وہ گولیوں کے نشانوں سے چھلنی ـــــ دروازوں کھڑکیوں کے کواڑ غائب جیسے کسی بوڑھے کے سامنے والے دانت ٹوٹ جائیں ـــــ بجلی کے کھمبے مکانوں کی منڈیروں پر ٹیڑھے بیکے جھکے ہوئے۔ اور تار سوریوں کے بچھوں کی طرح لٹکتے ہوئے ـــــ یہ نقشہ دیکھ کر ان کے دل میں وسوسے تیرنے لگے۔

"ہائے اللہ۔ ہمارے گاؤں کا بھی یہی حال ہوگا؟" بھاگاں بولی۔

"تو اور کیا وہاں ریوڑیاں بٹ رہی ہوں گی!" نوردین نے مذاق اڑایا۔

بھاگاں نے بڑی ملامت سے خاوند کی طرف دیکھا: "گاؤں پر تباہی پھر گئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے!"

"تباہی پھری تو کیا۔ شکر کرو۔ گاؤں تو واپس مل گیا ـــــ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور جب وہ چلے تو گرتے پڑتے خاندان، برباد لوگ ان کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ کوئی ان سے آگے نکل جاتا کسی سے وہ آگے نکل جاتے۔ شناسا چہرے دیکھ کر دو ایک باتیں کرنے کو رک جاتے۔ عورتیں ملتے ہی رو دیتیں۔ بچے ماحول سے بے خبر دوسرے بچوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے، اور مرد سرکاری امداد کی باتیں کرنے لگتے۔ پھٹے کپڑے ننگے پاؤں۔ تھکی چال۔ کوئی چست، کوئی سست، کوئی دوبارہ گھر لینے کی خوشی میں آبدیدہ۔ کوئی چار طرف بکھری ہوئی تباہی سے متوحش ـــــ پرانے راستوں پر نئی تباہی کا غلاف تھا۔ آہوں اور سسکیوں کے اس کارواں میں فقط نوردین ہی کی آواز مایوسی سے خالی تھی۔

"بادشاہو! شکر کرو سب اپنے ہی مل کر وطنوں کو جا رہے ہیں۔ میں نے چار دن اس علاقے میں گزارے ہیں جب یہ دشمن کے قبضے میں تھا ـــــ اللہ قسم دل ڈوب جاتا ہے سوچ کر ـــــ چاروں طرف غیر ہی غیر تھے۔ جدھر دیکھو ٹھائیں سے گولی آتی تھی ـــــ رب دی سوں، ایسے لگتا تھا جیسے وہ تالاب بھی غیر ہو گیا تھا جس میں ساری عمر نہاتے رہے تھے۔ زمین غیر تھی۔ آسمان غیر تھا۔ کتے بلیاں تک بیگانے لگتے تھے ـــــ توبہ ربا۔ کیا قیامت تھی۔ آنکھیں ترستی تھیں کہ کوئی اپنا نظر آئے۔۔۔۔۔۔"

وہ ترنگ میں بول رہا تھا۔ کسی نے بات کاٹی: "تمہیں ان گولوں سے ڈر نہیں لگتا تھا جو پاکستان کی طرف سے پھینکے جاتے تھے۔"

"ہائے کیا نادانی کی بات کی تم نے ـــــ اللہ قسم میں کسی نالے میں دبکا ہوتا یا جھاڑیوں میں چھپا ہوتا اور ہندوستانیوں کو گولے پھینکتے دیکھتا تو غصے سے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے۔ مگر جب کوئی پاکستانی گولہ میرے قریب آکر پھٹتا تو میرا کلیجہ دگنا ہو جاتا۔ میں دل ہی دل میں کہتا۔ جیو میرے اپنو! اور سوچتا کہ کوئی تو میری خاطر گولہ پھینکنے والا ہے ـــــ اور ایک دفعہ تو میں نے خدا سے دعا بھی کی تھی کہ اللہ اگر مجھے مارنا ہی ہے تو اپنوں کے گولے سے مار غیروں کی گولی سے بچا!"

"پتر نور دین" ایک بوڑھا بولا "پہلے تو تم خوب بُرا بھلا کہا کرتے تھے پاکستان کو۔"

"سچ کہتے ہو چاچا۔ پر چار دن میں نے غیروں میں رہ کے دیکھ لیا۔ وہاں تو سانس بھی پرایا لینا پڑتا ہے۔ مجھے اپنوں کی قدر نہیں دلوں آئی چاچا۔ لنگڑے سے پوچھو قدر پاؤں کی ——— اسی لئے میں کہتا ہوں چاروں طرف تباہی ہے، مکان گر گئے ہیں، فصلیں تباہ ہو گئی ہیں تو کیا ہوا ——— کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی سب بھائی مل کر کام کریں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا ......
اور یہ نہیں دیکھتے چاچا ......"

اس نے لپک کر پھاتاں کے سر پر سے گٹھڑی اٹھا کر پرچم کی طرح ہوا میں لہرائی "یہ ہے اپنوں کا سلوک۔ جب یہاں سے بھاگے تھے تو کوئی مائی کا لال ایک کپڑا بھی فالتو نہ لے جا سکا تھا۔ سب تنگ ننگ فقیر ہو کر گئے تھے۔ مگر اپنوں نے چھ سات مہینے کھلایا۔ اور اب یہ ساتھ دے کر بھیجا ہے ——— جس خدا نے یہ گٹھڑی ہمیں دلائی ہے وہ خدا اور بھی چیزیں واپس دلوا دے گا اور کشمیر بھی دلوا دے گا۔"

اتنے میں شور سن کر سب لوگ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگے۔ گرد کے بادل کے آگے ایک بڑا سا ٹریکٹر آہستہ آہستہ بڑھا آ رہا تھا۔ سب دم بخود ہو کر دیکھنے لگے۔ جب وہ قریب سے گزرا تو نور دین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ضبط کئے بغیر وہ چلایا "دیکھو لوگو! غیروں نے نکالا تو پیچھے پیچھے توپیں تھیں اور اپنوں کی باری آئی تو آگے آگے ٹریکٹر ہیں ——— زندہ باد پاکستان۔"

سامنے قافلے میں نور دین حوصلے اور امید کی تصویر تھا۔ یاس اس کے قریب سے نہ گزری تھی۔ اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اپنے ملک کی حد پر اعتماد تھا، لوگوں کی ہمت پر اعتماد تھا اور وہ اپنی باتوں سے دوسروں کے دل میں بھی اعتماد کی لہر دوڑا رہا تھا۔ مایوس لوگوں کے سینوں میں دل کی دھڑکنیں ابھرنے لگیں اور وہ مسکرا مسکرا کر نور دین کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔

اس کی باتیں ختم ہوئیں تو اس نے کندھے پر بیٹھی ہوئی آمنہ کو بازو پر بٹھا کر ہوا میں اونچا کیا۔ اور تان لگائی

ربا ے چل وطناں نوں	(یا خدا، ہمیں اپنے وطن کو واپس لے چل)
جتھے دی رات وی ٹھنڈی	(جہاں رات ٹھنڈی ہے)
جتھے دی چھاں بہشتی	(جہاں کی چھاؤں جنت جیسی ہے)
جتھے دے ککھے پکے ککے تے ڈنگر بچے	(جہاں مضبوط کھونٹوں پر اصیل مویشی بندھے ہیں)
ڈنگراں دے دودھ دیاں دھاراں کڈھن ہسدی مٹیاراں	(ہنستی ہوئی کنواریاں مویشیوں کے دودھ کی دھاریں نکالتی ہیں)
اوناں دے ویرنے آوناں دھرتی دا کڈھ کے سونا	(کیونکہ ان کے بھائی زمین کا سونا نکال کے واپس آ رہے ہیں)
ربا ے چل وطناں نوں	(یا اللہ، اپنے وطن کو پھر سے واپس لے چل)

او ربا ———
ہائے ربا ———

لے چل وطناں نوں

اور دوپٹے کو سر سے ذرا اونچا اٹھا کر سڑک پر ناچنے لگا۔ سب لوگ ہنسنے لگے ـــــ پھر زین نے اگلے بند کی تان اٹھائی تو کئی اور بھی آواز ملانے لگے اور چند منٹ میں اس مایوس قافلے کی بجائے چھلکتا ہوا سیلاب رواں تھا۔

دور سے جب پیارا گاؤں نظر آیا تو سب چپ ہو گئے۔ کئی بچے ماؤں کی انگلیاں چھڑا کر بھاگے۔ عورتوں نے قدم تیز کر لئے اور ان کے سانس پھولنے لگے۔ مرد نظریں جمائے ذمہ داری سے جائزہ لینے لگے۔

گاؤں میں آہ و بکا کا شور تھا۔ کچھ لوگ پہلے پہنچ چکے تھے۔ کچھ اب پہنچے۔ مکانوں کی جانی پہچانی نشانیاں ملبے کے ڈھیروں میں گم تھیں۔ گلیاں اپنے سابقہ نقشے کا صرف ہلکا سا اندازہ دے سکتی تھیں کئی مکانوں کے گرنے سے ان کے عقب میں سے ایسی عمارتیں ظاہر ہو گئی تھیں، جن کا بالکل نیا نظارہ گاؤں والوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے حسرت سے اپنے گرے ہوئے مکانوں کا جائزہ لیا۔ اندھیکار ادھر سے چیخیں سنتے ادھر بھاگ گئے۔

چاچا نبی بخش اور اس کی بیوی ضعیف تھے۔ گاؤں میں اکیلے رہ رہے تھے۔ حملے کے وقت بھاگ نہ سکتے تھے ان کو چارپائی سے باندھ کر دشمنوں نے زندہ جلا دیا تھا۔ چارپائی کی چند ادھ جلی رسیاں، اور بوڑھی ہڈیاں سیاہ و سفید ہو کر راکھ کے ڈھیر میں پڑی تھیں اور غضبناک گاؤں والے آس پاس کھڑے تھے۔

گاؤں کے تالاب میں مردہ مویشی پھولے پڑے تھے۔

ایک درخت کی شاخوں میں ایک ہاتھ مع بازو کے اٹکا ہوا تھا جو اب گل سڑ کر بو دے رہا تھا۔

کنوؤں پر بورڈ لگے تھے کہ ان کا پانی زہریلا ہے۔ استعمال نہ کریں۔ صرف ایک کنواں قابل استعمال بنایا گیا تھا۔

مسجد کے اکھڑے ہوئے فرش پر خون کے دھبے اور انسانی ہڈیاں بکھری تھیں

مکانوں کی ادھ گری دیواروں پر چھتیں جھول رہی تھیں۔ فصلیں تباہ ہو چکی تھیں۔ پگڈنڈیاں بیلوں کی رگڑ سے غائب ہو چکی تھیں کھیتوں کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔

گاؤں کا جائزہ لینے کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کے سامنے خاموشی سے کھڑے تھے کئی سوچ رہے تھے کہ اب یہاں رہنا بیکار ہے، کہیں سرحد سے دور چل کر رہنا چاہیئے۔ بعض عورتیں اپنی عمر بھر کی کمائی کو مٹی میں ملا دیکھ کر رو رہی تھیں۔

بھاتاں جب اپنے گھر کے سامنے پہنچی تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ عمارت کا ماتھا ہی بدل گیا تھا۔ سامنے والی دیوار غائب تھی اور پرانا دروازہ اکیلا کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ملبہ بھرا صحن تھا۔ سامنے والے کمرے کی چھت غائب تھی کچھ حصہ چھت کا بیچ اندر گرا ہوا تھا۔ ساتھ والا کمرہ ٹھیک تھا مگر اس کے اوپر کی آدھی برساتی اڑ گئی تھی صحن میں نلکا بالکل دوہرا ہوا پڑا تھا۔

"بے بے۔ میرے سب کھلونے ٹوٹے پڑے ہیں" اندر سے آمنہ روتی ہوئی باہر نکلی۔

"او ہو! تو کیا ہوا۔" نور دین نے اسے اٹھا لیا "ہم اور بنا دیں گے کھلونے ہی تو ہیں"

بھاتاں اندر گئی۔ کمرے کے کونے میں گندم کا بھڑولا خالی پڑا تھا دوسرے کونے میں خالی صندوق الٹا ہوا تھا اور وہ سب کپڑے غائب تھے جو وہ ابھی سے آمنہ کے جہیز کے لئے اکٹھے کر رہی تھی۔ طاق کے اوپر والا آلہ خالی تھا اور اس میں سے زیورات کا ڈبہ غائب تھا۔ بڑی بھی پرانے لحاف نظر آتے تھے اور پرانے لحافوں کے چیتھڑے ہر طرف بکھرے تھے۔

بھاتاں وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

حوصلہ کر بھاناں،" نوردین بولا " تو بچھ گھر میں چوری ہو گئی — اتنے نقصان تو ویسے ہی ہو جاتے ہیں ورنہ جنگ میں اس سے بھی بُرا ہو سکتا ہے — یہ تو شکر ہے مال کا ہی نقصان ہوا جان تو محفوظ رہی — اللہ نے چاہا تو مال پھر بن جائے گا۔"

مگر بھاناں گھر کی ایک ایک چیز یاد کر کے روتی رہی۔ "میں نے کتنی مشکلوں سے آمنہ کے جہیز کے لئے سستی شلوار خریدی تھی — بلکہ اپنا آدھا جہیز اسی کے لئے بچا کر رکھا تھا — میری گندم میں سو روپے بھی دبے ہوئے تھے۔ وہ بھی گئے — میں نے کتنی مشکلوں سے کالی ٹاہلی کا رنگین پایوں والا پلنگ بنوایا تھا۔ سارا ٹوٹا پڑا ہے —"

"پگلی ہے بھاناں تو بھی" نوردین بولا "اری وہ تو دشمن تھے ہمارے۔ ان سے اس کے سوا توقع ہی کیا تھی۔ غیر تو یہی کچھ کیا کرتے ہیں — کوئی ہمارے اپنے تو تھے نہیں کہ ان چیزوں کی حفاظت کرتے۔"

پھر نوردین باہر نکل گیا۔ وہ گاؤں میں ادھر اُدھر گھوم کر لوگوں کو تسلی دیتا۔ انھیں حکومت کے قرضوں کا یاد دلاتا۔ زمین ہموار کرنے والے ٹریکٹروں کی طرف اشارہ کرتا۔ سستے نرخ کی اناج والی دکانوں کا حال بتاتا۔

"اس سے کیا ہوگا نورو" چوہدری امام دین بولا جس کی بہت بڑی حویلی تباہ ہو گئی تھی "یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے۔"

"بلے بلے چوہدری جی کیسی باتیں کرتے ہیں آپ" نوردین چلایا "بادشاہو اپنوں کی ایک آنے کی ہمدردی آدمی کے جسم میں سو روپے کا خون پیدا کرتی ہے۔ دل زمین سے بچھ جائے تو اوپر اٹھ جاتا ہے۔ چار میلی شاباش کہنے والے ہوں تو مرد پہاڑ بھی کھڑا کر دیتا ہے۔ حویلی کیا چیز ہے —"

نوردین کے بار بار سمجھانے کے باوجود بھاناں اس زخم کو حوصلے سے نہ سہہ سکی۔ وہ اکثر اپنے پچھلے حالات یاد کرتی۔ بھرے پُرے گھر کی ماحول کے لئے تڑپتی۔ جاتے وقت کھڑی فصلوں کا سوچتی۔ جب طبیعت بہت بیزار ہوتی اور وہ سب کی نظروں سے بچ کر دل ہلکا کرنا چاہتی تو چھت پر نیم شکستہ برساتی میں جا بیٹھتی اور جی کھول کر روتی۔

نوردین اُسے بار بار سمجھاتا کہ یہ سب فضول ہے بلکہ آج تو اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ برساتی کو گرا دینا چاہئے کیونکہ یہ مایوسی کی علامت ہے نہ برساتی ہوگی نہ کوئی رونے کے لئے وہاں جائے گا۔

گاؤں میں ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ گاؤں والے اپنے مکانوں کی کچی دیواریں کھڑی کر رہے تھے اور کھیتوں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہے تھے جنھیں سرکاری ٹریکٹر ہموار کر رہا تھا۔ نوردین کی زمین میں بہت گہرے گہرے گڑھے تھے۔ شاید دشمن نے وہاں توپیں نصب کی تھیں یا ٹینک چھپائے تھے وہ چاہتا تھا یہ گڑھے جلدی بھرے جائیں تاکہ بیجائی کے موسم سے پہلے وہ زمین میں ہل چلا لے۔ بیجائی میں بمشکل ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔

اگلے دن وہ ٹریکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈرائیور ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ دو چار لوگ کنارے کھڑے تھے جن میں ایک پٹواری تھا۔ اُس کے ہاتھ میں زمینوں کا کپڑے کا نقشہ تھا۔

"نوردین بڑی اپنائیت سے مسکراتا ہوا اُن کے پاس گیا: "سلام علیکم"

"آؤ چوہدری کیا حال ہے؟"

"مہربانی پٹواری جی ...... " وہ ذرا رکا: "میں نے کہا جی۔ یہ ہماری زمین کی باری کب آئے گی؟"

پٹواری نے اُس پر اجنبی سی نگاہ ڈالی اور قدرے رکھائی سے بولا "بھائی آپ ہی لوگوں کا کام کر رہے ہیں۔"

"نہ جی — وہ تو مہربانی ہے آپ کی۔ مگر میری زمین میں بہت گہرے گڑھے ہیں۔ وہ کب ٹھیک ہوں گے۔"

"دیکھیں جی۔ جب اللہ کو منظور ہوا۔" پٹواری نے جواب دیا اور ساتھ والے آدمی سے باتیں کرنے لگا۔

اس غیر تسلی بخش جواب سے نور دین کو ذرا بے چینی سی ہوئی مگر وہ چپ رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پٹواری سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ بولا، "بزرگو۔ ذرا ہمیں اپنا کام تو کر لینے دو۔ آجائے گی آپ کی باری بھی   جاؤ مزے سے گھر میں بیٹھو۔"

نور دین شرمندہ سا ہو کر چپ ہو گیا اور کھسیانا ہو کر ٹریکٹر کو دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے جی۔" پیچھے سے پٹواری کے بستہ بردار نے کہا "مہینے بھر سے پہلے تو مشکل ہے آپ کا کام ہونا۔"

یہ سن کر نور دین چونکا۔ اگر مہینے تک زمین ہی ہموار ہو گی تو پھر بجائی کیسے ہو گی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ فصل خالی گئی۔ سرکاری امداد کے روپے کب تک چلیں گے۔ فاقوں کے تصور سے نور دین گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اتنے میں اس نے اپنی کہنی پر ایک ہاتھ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو پٹواری کا بستہ بردار تھا اس نے آنکھ کے اشارے سے نور دین کو ایک طرف بلایا اور سرگوشی میں بات کرنے لگا.......

.......نور دین ایسے ٹھٹکا جیسے کسی سانپ نے اسے ڈس لیا ہے۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ منجمد ہو کر وہ اپنے مخاطب کو دیکھنے لگا جو رواداری سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

پھر جیسے خواب کی سی حالت میں وہ اپنا ہاتھ جیب تک لے گیا اور بیس روپے نکال کر بستہ بردار کو دیئے۔ ریلیف کیمپ سے روانگی کے وقت اسے جو دو سو روپے حکومت کی طرف سے امداد ملی تھی اس میں سے یہی بیس روپے بچائے تھے۔

بستہ بردار پٹواری کے پاس گیا اسے کچھ کہا تو پٹواری نے ٹریکٹر کے ڈرائیور کو آواز دی۔ اس نے ہینڈل کھینچ کر ٹریکٹر روکا۔ پٹواری نے نور دین کی طرف اشارہ کیا۔ "بھئی یہ چوہدری صاحب کھڑے ہیں۔ ان کی زمین کی حالت بہت خراب ہے۔ خواہ مخواہ بارش آگئی اور پانی ٹھہر گیا تو ہم ٹریکٹر نہیں چلا سکیں گے۔ تم جا کر ابھی ان کی زمین ٹھیک کر دو۔"

ڈرائیور نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پٹواری کی طرف دیکھا تو وہ بھی اسی طرح جواب میں مسکرا دیا۔

"آؤ چوہدری جی۔" ڈرائیور بولا، "میرے ساتھ ہی بیٹھ جاؤ۔ سیدھے اپنی زمین پر ہی چلو۔"

اور ٹریکٹر شور کرتا نور دین کی زمین کی طرف بڑھنے لگا۔

سہ پہر کو جیاتاں باہر سے کپڑے دھو کر لائی تو نور دین گھر میں نہ تھا مگر جب وہ کپڑے لٹکانے کے لئے کچی سیڑھیاں چڑھی تو چھت پر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔

برساتی کے فرش پر نور دین دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا — اس کی آنکھیں بند تھیں — اور ان میں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

منیر احمد شیخ

لمحے کی بات

فلسفے کا ایم اے کرنے کے بعد وہ مجھ سے ملی تو اُس نے پہلی ہی گفتگو میں مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ فلسفے کی کوئی عام طالب علم نہیں ہے۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُس نے بعض فلسفوں کو اس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے کہ وہ اُنھیں زندگی کا بہت بڑا آئیڈیل سمجھتی ہے اور اُس آئیڈیل کو عملی شکل دینے میں پوری طرح کوشاں ہے۔ مثلاً سارتر کی تحریریں اُس نے ساری پڑھ رکھی تھیں اور فلسفۂ وجودیت پر اُس کا شدید ایمان تھا۔ اُس نے مختلف مجلسوں میں اپنے اس دعوے کو ہزار مرتبہ دہرایا کہ چائے کی پیالی سے لے کر اپنے شوہر کے انتخاب تک وہ وجودیت پسند ہے۔ وجودیت کا جو مطلب اُس نے سمجھ رکھا تھا اُس کی خبر سارتر صاحب کو بھی نہ تھی۔ وہ روایت سے شدید باغی تھی، کم سے کم خیالات کی حد تک۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ مرد اور عورت کا ملاپ جس انداز سے ہمارے ملک میں ہوتا ہے سراسر دقیانوسی ہے اور اس مفروضے پر قائم ہے کہ لڑکی کا پلّو جس اتو کے پٹھے کے ساتھ باندھ دیا گیا، وہ اُس کے ساتھ ہی اتو کی پٹھی بن جائے۔ کپڑے کھونٹے جیسے مرد کی حاکمیت کا سکہ بٹھائے، دن کو چولہا جھونکے اور رات کو شوہر کی ہوس کاریوں کا سامان بنے۔ شوہر اور بیوی کے رشتے کو وہ مرد کی ہوس کاری کا نام دیتی تھی۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ ہوس صرف مرد ذات کا خاصہ ہے اور اس کی شکار صرف عورت ہوتی ہے جو صدیوں سے مرد کی غلام چلی آ رہی ہے۔ وہ مردوں سے باغی تھی، مروجہ شادی بیاہ کی رسومات سے باغی تھی، عشق کرنے کے "آؤٹ آف ڈیٹ" انداز سے باغی تھی۔ عشق کرنے کا جدید انداز اُس کے نزدیک یہ تھا کہ جو مرد بھی لڑکی کو پسند آ جائے اُسے اس سے براہِ راست تعلق قائم کرنا چاہیے اور اس تعلق کے درمیان اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ درمیان کا جب مطلب اُس سے پوچھا گیا تو اُس نے ٹھٹھا لگاتے ہوئے فقط اتنا کہا: "ظالم سماج"۔ میں نے اُس سے کہا اس ملک میں ہماری زندگی ہرگز وہ نہیں ہے جو ہماری فلموں میں دکھائی جاتی ہے اور ظالم سماج تو فلموں میں اکثر مرد اور عورت کے درمیان آ کے دیوار کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُس نے پھر قہقہہ لگایا اور کہا کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ ہمارے باپ دادا کی زندگی بھی محض فلمی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُسے کبھی فلمایا نہیں گیا۔ ہاں البتہ اب جو زندگی میرے اور میری طرح کی لڑکیوں کے حصے میں آتی ہے وہ ہرگز فلمی نہیں ہوگی۔ یہ زندگی نہ فلم کا موضوع ہوگی نہ سٹیج کا۔ یہ وقت کے سلوڈ پر چلے گی اور سورج کی روشنی میں کھلی آنکھ سے دیکھی جائے گی۔ سڑکوں کے کنارے، پارکوں میں، کلبوں کے اندر، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کوریڈورز میں، ریل گاڑیوں اور جہازوں میں۔۔۔ اس زندگی کا تعلق نہ ماضی سے ہوگا نہ اُسے مستقبل کی فکر ہوگی۔ ماضی کا بوجھ لے کے آپ چلیں گے تو وہ لمحہ جو آپ کے سامنے ہے اور جسے آپ مٹھی میں لینا چاہتے ہیں، ماضی کے بوجھ تلے دبے کا دبا رہ جائے گا اور اگر مستقبل کی فکر کریں گے تو بھی وہ لمحہ احتیاط کی نذر ہو جائے گا اور وہ کام جسے زندگی کرنا کہتے ہیں، وہ نہ ماضی ہے، نہ مستقبل، وہ تو حال ہے۔۔۔ جیتا جاگتا لمحہ جو آپ کے سامنے ہے، جسے آپ گرفت میں لیجیے، سینے سے لگائیے اور اسی میں جینے کی کوشش کیجیے۔

میں غور سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس کی گفتگو کا تار ذرا سا ٹوٹا تو میں نے پوچھا وہ کس قسم کے مرد کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہے؟ آئیڈیل

کے لفظ پر وہ پھر ہنسی، اُس نے کہا، "یہ آئیڈیل وائیڈیل بھی ایک عجیب بکواس ہے۔ آئیڈیل مرد کوئی نہیں ہوتا۔ مرد صرف مرد ہوتا ہے۔ اگر وہ مرد ہے تو آئیڈیل اور حقیقت دونوں اُس میں موجود ہوتے ہیں۔ جب تک وہ جسم سے دور ہے آئیڈیل ہے اور جسم کے ساتھ مس کرنے لگے تو آئیڈیل حقیقت میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اور کہتے ہیں کہ حقیقت بڑی گھناؤنی شے ہے۔"

اُس نے میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ کو اٹھا کے زور سے میز پر بجایا اور کہا "کون گدھا یہ کہتا ہے؟"

"وہ تمام گدھے جن کے سروں پر حقیقت اسی شدت سے گرتی ہے جس شدت سے آپ نے پیپر ویٹ میز پر مارا ہے۔"

اُس نے گرل سے پیپر ویٹ کو اپنے داہنے ہاتھ میں یوں آہستہ سے دبا لیا جیسے آٹے کا پیڑا اٹھایا ہو۔ ایک لمحے کے لئے چپ سی ہو گئی جیسے کچھ سوچنے لگی ہو لیکن فوراً ہی اُس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے بجلی کے کوندے کی طرح لپکتے ہوئے کہا: "حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ گھناؤنی اور آئیڈیل نہیں ہوتی۔ حقیقت وہی لمحہ ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ آپ چاہیں تو اُسے سینے سے لگا لیں اور دات ابدی کر دیں، چاہیں تو چھوڑ دیں اور فنا کا حصہ بن جائیں۔ آپ موسیقی سنتے ہیں ناں؟ میں بھی موسیقی سنتی ہوں۔ آپ کہیں یہ نہ پوچھ لیں کہ شوق سے سنتی ہوں یا نہیں؟ شوق پتہ نہیں کیا شے ہوتی ہے، میں فقط موسیقی سنتی ہوں۔ سُر میرے اوپر وارد ہوتا ہے، میرے جسم کے روئیں روئیں سے چمٹ جاتا ہے اور پھر جسم سے میری روح کے پوروں سے ہلکے ہلکے چھوتا ہے۔ وقت رُک جاتا ہے اور جب وقت رک جاتا ہے تو وہ لمحہ ابدی ہوتا ہے۔ وہ لوگ جن پر سُر وارد نہیں ہوتا یا اُن کے جسم و روح کے لئے واردات نہیں بنتا، وہ لوگ وقت سے کٹ جاتے ہیں اور فنا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لمحہ زندہ حقیقت ہے اور لمحے کا حصہ بننا وقت کی رفتار کی سنگت کرنا ہے۔ سنگت کا دوسرا نام زندگی ہے۔ ذرا بے تالے ہوئے تو پیچھے رہ گئے، ماضی کا حصہ بن گئے، دفن ہو گئے۔"

فلسفیانہ موشگافیاں کئی دنوں تک ہوتی رہیں۔ وہ روز میچ ہلکا سا میک اپ کر کے، ہینڈ بیگ اور کتابیں تھامے میرے کمرے میں آجاتی، آتے ہی چائے منگوانے کے لئے کہتی اور اُس کے بعد وجود اور روح کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وجود اور روح کے تذکرے میں وہ اپنی ذہنی برتری ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رہی اور اُس کی ساری وجودیت پسندی اُس کی جذباتی بے چینی سے پیدا ہوئی ہے اور اگر وہ وجود اور روح کا تذکرہ کرنے کی بجائے وجود سے روح تک کا سفر اختیار کرے تو اُس کے سارے مسئلے چٹکی بجاتے میں طے ہو سکتے ہیں۔ وہ سانولے سے رنگ کی لڑکی تھی۔ چہرے پر کوئی جاذبیت نہیں تھی، آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرے پر کوئی ایسی کشش نہیں تھی کہ ذرا سا بھی چومنے کو جی چاہے۔ البتہ اُس کے جسم میں جنسی کشش کی ایک لکیر سی تھی جو اُس کی قمیص کی کاٹ کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ یہ نقطۂ عروج راہ چلتوں کو بھی آواز دیتا تھا۔ اس کی ساری جنسی کشش اُس کے اسی حصے میں تھی اور اُسے اس بات کا بڑا احساس تھا کہ اُس کا نقطۂ کشش کون سا ہے چنانچہ اس نقطہ پر وہ خاصی محنت کرتی تھی۔ لمحے کو زندہ بنانے کا فلسفہ اُس نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا، لیکن اُس کی زندگی کے لمحے گرتے ہوئے سوکھے پتوں کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ چپکے چپکے کالج کے ایک لکچرار پر مرتی تھی جسے کسی پر مرنے کا سلیقہ نہ آتا تھا۔ وہ یوں تو کالج میں پڑھاتا تھا لیکن اپنی کاٹھ، چال، ڈھال اور گفتگو سے ایر فرانس کا سٹیورڈ لگتا تھا۔ کالج میں پڑھانے کے شغل کو وہ گھٹیا کام سمجھتا تھا لیکن کبھی استعفے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ لکچرار بھی نہ رہا تو ایئر فرانس کا سٹیورڈ بھی نہیں بن سکے گا لیکن ایر فرانس کے سٹیورڈ کی سی چھب تھی چالاکی اُس نے درس و تدریس کے پیشے میں اس لئے

قائم رکھی ہوئی تھی کہ پڑھانے والوں کو لڑکیاں قریب قریب بے مزہ سمجھتی ہیں اور تنی ہوئی ریڑھ کی ہڈی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بڑی کارگر شے ہے۔ اسے وجودی لڑکی سے کوئی عشق نہیں تھا لیکن پھر بھی اُس نے اس کی سہیلیوں کی معرفت اُسے یہ یقین دلوا دیا ہوا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ایئر فورس کا ایک اعلیٰ افسر نہیں تو ایئر فرانس کا سٹیوارڈ ضرور بن جائے گا اور پھر اُس سے ضرور شادی کرے گا اور وہ جو روایت سے باغی تھی۔ اندر ہی اندر اس غم میں گھلی جا رہی تھی کہ وہ دن جلد کیوں نہیں آتا۔ کیوں نہیں یہ کالج سے نکل کر افسری اختیار کرتا۔ اس مقام پر آ کر اس کا وہ فلسفہ کہ لمحہ ہی زندہ حقیقت ہے اکتاب کا صفحہ بن جاتا اور وہ شادی کے بارے میں سوچتی ہوئی ہمیشہ مستقبل کو دیکھتی۔ مستقبل جو اس کے فلسفے میں احتیاط پسندی کا دوسرا نام تھا۔ ایئر فرانس کا سٹیوارڈ کچھڑا ابھی تک کچھڑا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی بدستور تنی ہوئی تھی۔ مگر ابھی تک اُس کا مستقبل اتنا تابندہ نہیں ہوا تھا کہ ایک پڑھی لکھی انٹیلیجنٹ لڑکی فوراً اپنی تقدیر اُس سے منسلک کر دیتی۔

ہونے والے شوہر کے بارے میں اُس نے چند معیار بنا رکھے تھے۔ ایک روز جب میں نے بحث کے دوران اُس سے پوچھا کہ نئی نسل کی لڑکی کا شوہر کون ہو سکتا ہے؟ تو اُس نے شوہر بننے کی چند خصوصیات گنوائیں جو کچھ اس طرح تھیں۔

(ا) سینہ چوڑا چکلا ہو۔ (ب) قد آور ہو

(ج) قمیص کے کالر پر ہمیشہ کلف لگی ہو۔ (د) ریڑھ کی ہڈی سیدھی تنی ہوئی ہو

(ہ) عینک ہرگز نہ لگاتا ہو دور کی یا نزدیک کی (و) پردے کا قائل نہ ہو۔

اپنے بارے میں اُسے صرف ایک چیز کا خیال رہتا تھا کہ کوئی سکینڈل اُس کے بارے میں نہ چل نکلے۔ سکینڈل کا خوف اُس کے فلسفوں پر بھی حاوی تھا۔ کچھڑے سے وہ چپکے چپکے عشق کرتی تھی مگر اس عشق کی طرف کوئی اشارہ بھی کرتا تو وہ اس کی نفی کر دیتی۔ ایک آدھ بار یوں ہوا کہ اس کی ایک سہیلی نے اسے میرے سامنے چھیڑتے ہوئے ایئر فرانس کے اسٹیوارڈ کی طرف اشارے مارے تو اُس نے اپنی سہیلی کو وہیں جھٹلا دیا اور اُسے سخت سست کہا۔ اس کی سہیلی اس کی اس حرکت کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ اُس نے اُسے قائل کر دیا کہ آدمی جس سے عشق کرے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے اور پبلک میں باتیں کرنے کو معیوب نہیں سمجھنا چاہیئے، چنانچہ ایک روز وہ کالج کے بڑے لان کے ایک کونے میں اپنے سٹیوارڈ سے باتیں کرتی ہوئی دیکھی گئی۔ دوسرے روز جب میں نے اس کی ہمت کی داد دی تو وہ فوراً تڑپ اُٹھی "نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ وہ فلسفے کا ایم۔اے کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے ذرا کورس پوچھ رہے تھے"۔

میں اُس لڑکی کے فلسفوں اور اُس کے خدشوں سے سخت بور ہو چکا تھا۔ میں نے اُس سے کترانے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے سخت نفرت رہی ہے کہ جو کچھ کہتی ہیں، ہوتی نہیں ہیں اور جو کچھ ہوتی ہیں وہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔ مجھے اس کا فلسفہ اور اُس کی زندگی دونوں پوز دکھائی دیتے تھے۔

ایک دن میرے کمرے کے دروازے پر زور زور سے ٹک ٹک کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ بال خشک اور پریشان۔ لپ سٹک جیسے وہ لگانا کبھی نہ بھولتی تھی، ہونٹوں پر سے غائب تھی اور وہ کھنچے ہوئے تھے اور نہایت پھیکے پھیکے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو گئے تھے جیسے وہ ساری رات روتی رہی ہو۔ میں نے اُسے اندر آنے کو کہا۔ آج اُس نے چائے کے لئے بالکل نہیں کہا۔ میں نے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس نے بیٹھتے ہی اپنا پرس ایک طرف کو رکھا اور خالی ہاتھ کرسی کے بازو پر جما دیئے، پھر وہاں سے اُٹھا کے جھولی میں رکھے لیکن وہاں اُسے محسوس ہوا کہ ہاتھوں کا یہ بھی کیا استعمال ہوا کہ انہیں جھولی میں پھینک دیا جائے۔ پھر اُس نے دانتوں سے ناخن کاٹنے کی کوشش کی لیکن پھر میری طرف دیکھ کر ہاتھ وہاں سے بھی کھینچ لیا۔ میں نے اس کی بے چینی کا سبب پوچھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے

سیمون اپ کا ایک ٹھنڈا گلاس اُسے دیا اور پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟

"وہ بخت آلو کا پٹھا نکلا ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"بس مردوں کو عورتوں کی پہچان نہیں رہی۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟"

"ہوا یہ ہے کہ اُس نے محلے کی ایک بیاہتا ہمسائی سے یارانہ گانٹھ لیا ہے۔ وہ ایک بچّی کی ماں ہے۔ ایک جماعت بھی نہیں پڑھی ہوئی ہے خاوند اس کا صابن کی دوکان کرتا ہے۔ دھوتی اور بنیان پہنتا ہے۔ نہایت ڈنگر عورت ہے۔"

"ڈنگر کے لفظ پر میں نے اسے ٹوکا اور کہا کہ محلے کی عورتوں کو گالی دینا پڑھی لکھی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا۔"

اُس نے کہا "ڈنگر نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ اُس کے گھر کے سامنے رہتی ہے۔ وہ کالج سے جب واپس گھر جاتا تو وہ اپنے دروازے میں آن کھڑی ہوتی۔ چق اُٹھا کے اُسے اشارے کرتی۔ کبھی شلوار کے پائنچے اٹھا کے شلوار نیفے میں اڑس لیتی اور اپنی گوری گوری پنڈلیاں اُسے دکھاتی۔ کبھی اپنی بچی کو اپنی گود میں لے کے اُچھالتی اور زور زور سے اُس کا منہ چوم کے دکھاتی۔ بعض دفعہ تو اس کے چومنے کی آواز گلی پار کرکے اُس اُلو کے پٹھے کے کانوں سے ٹکرا جاتی اور اُس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو جاتیں۔ کبھی نیچے گلے کی کالی قمیض پہن کے اپنا نیم جلوہ دکھاتی اور ادھر اس کا یہ حال تھا کہ جیسے بھاگ کے اُس کے گھر گھس جانے کے لئے بے چین ہے لیکن محلے کا معاملہ تھا۔ پھر یہ خیال کہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز اُس عورت نے اشارے سے سمجھایا کہ وہ محلے کے باہر بس سٹاپ پر اُسے ملے۔ وہ دس بجے کے قریب گھر سے نکلا، کانپتا اور لرزتا ہوا۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ یہ اُسے دیکھ کے اور تیز ہو گیا۔ گلی کے موڑ پر اس نے آواز دی" اے باؤ جی! اتنی تیزی کیا ہے۔ ٹھہرو بات تو سنو۔" باؤ کی رفتار اور تیز ہو گئی اس نے ایک اور آواز دی:۔

"میں عورت ہو کر تمہیں ٹھہرنے کو کہہ رہی ہوں اور تم مرد ہو کر بھاگے جا رہے ہو۔ کس اُستاد سے پڑھے ہوئے ہو؟" باؤ جی رُک گئے۔ وہ قریب آئی۔ ایک ٹانگے کو آواز دے کے روکا۔ ٹانگہ رُکا تو اُس نے باؤ کو جیسے حکم دیا۔ "چلو اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔" وہ پہلے تو گھبرایا پھر جلدی سے اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ جیسے سام ٹانگے کی نہیں، سواریوں والے ٹانگے کی سواری بیٹھتی ہے۔ وہ پچھلی سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی اور ٹانگے والے سے کہا

"چلو۔"

"تو کہاں گئے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"جانا کہاں تھا۔ وہ اُس باؤ کو لے گئی کسی سہیلی کے گھر، اسے بتایا کہ وہ کئی دنوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند سے تنگ آ چکی ہے کہ رات کو اُس کے جسم سے دیسی صابن کی بو آتی ہے اور اس کی تنگ اور چست پتلون اور تنا ہوا سینہ دیکھ دیکھ کر اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس باؤ کے ساتھ دوستی کر لینی چاہیئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے باؤ سے دوستی کی اور چلتے ہوئے پوچھا کہ باؤ کس صابن سے نہاتے ہو؟ باؤ نے کہا لکس سے۔ اُس نے کہا اگلی دفعہ آؤ تو اسی صابن سے نہا کے آنا۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد وہ رونے لگی پھر اس نے کہا کہ ایئر فرانس کے سٹیورڈ نے یہ سارا قصہ اُسے خود سنایا ہے۔ میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ وہ پریشان سی میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"میں نے کہا۔ "بس میرا جی چاہ رہا ہے ہنسنے کو۔"

اُس نے کہا "مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے یہ بہت بُری بات ہے۔"

میں نے اُسے بتایا "کچھ نہیں، میں تو اس بات سے خوش ہوں کہ صابن والی نے سارتر کو نہیں پڑھا۔

"اگر پڑھ لیتی؟" اُس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھا۔

"تو وہ لمحے کو زندہ حقیقت نہ بنا سکتی" ـــ میں نے جواب دیتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور وہ اپنا پرس اٹھا کے خشک بالوں کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

غلام محمد

کرشنا چورا

یہ شہر میرے لئے کس قدر اجنبی ہے۔ اس کی گلیاں جانی پہچانی ہونے کے باوجود اجنبی اجنبی سی لگتی ہیں۔ یہاں کرشنا چورا کے ہرے بھرے درخت تھا، جو بہار کے دنوں سرخ سرخ پھولوں سے لد جاتے تھے تو میری روح کھنچ کر ان پھولوں میں سما جاتی تھی، ساری اجنبیت کے باوجود وہ تعلق آج بھی ہے۔ مجھے یہاں کچھ ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے جیسے سولی پر نیند آجائے۔

وہ سیاہ چمکتی ہوئی سڑک بہت دور لہراتی بل کھاتی چلی گئی ہے۔ اُس پر پہلے گرد اُڑتی تھی۔ میں نے اس پر کیسی کیسی گھڑیاں نہیں گذاری ہیں۔ لگتا ہے جیسے گردِ راہ دکھائی دے رہی ہے۔ کارواں گذر گئے۔ ۱۵ برس پہلے گلشن کے درختوں کے عقب میں ایک تالاب تھا۔ لوگوں نے اسے پاٹ دیا اور اس پر سے ایک پتلی سی سڑک نکالی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس تالاب میں مانک جوڑا ترتے تھے۔ اور مانک جوڑا ایسے کہ اپنے ساتھی کے لئے جان دے دیتے ہیں۔
اسی تالاب کے نزدیک ایک میدان ہوا کرتا تھا جہاں ہم لوگ گیند کھیلتے تھے۔ آج وہاں ۱۲ منزلہ عمارت کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ بڑے بڑے کرین سر اٹھائے ہوئے ایستادہ ہیں۔ لوہے کی سلاخوں کا انبار ہے، اینٹیں بچھی ہوئی ہیں کہیں بالو کے ٹیلے ہیں تو کہیں سیمنٹ کے تھیلوں کے تودے۔ ہم لوگ برسات کے دنوں میں کیچڑ کادے میں گیند اچھالتے تھے اور شڑاپ شڑاپ گرتے تھے اور ایک دوسرے سے لپٹ جاتے تھے اور شور مچاتے تھے۔ اسی میدان پر اتنی اونچی عمارت کی بنیاد پڑے گی، یقین نہ آتا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے میرے دل پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا ہے۔ کرشنا چورا کا قتل سب سے بڑا سانحہ ہے سب سے بڑا المیہ۔

اس میدان کے پورب میں ایک بڑا سا گندہ نالا بہتا تھا جو سیاہ ہو چکا تھا۔ اور کنارے کنارے سبز گھاس کے نیچے دلدل ایسی کہ بھولے سے وہاں پاؤں پڑ جائے تو آدمی کمر تک اس میں دھنستا چلا جائے۔ دن رات اس پر کام ہوا۔ اور لوگوں نے اسے زمین دوز نالا بنا کر اوپر ایک چکنی سڑک بنا دی جو نواب پور کو کاٹتی ہوئی نرائن گنج چلی جاتی ہے۔ دونوں کنارے مکانات کے پچھواڑے ہیں اور آج بھی وہاں کھلے ہوئے سنڈاس نظر آتے ہیں جن سے بدبو نکل کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ ڈھاکا ہے، ایشیا کا ایک شہر۔

دفعتاً ایک شخص چوپایوں ایسا رینگتا ہوا نزدیک سے گذر گیا۔ اُس کے دونوں پاؤں کٹے ہوئے تھے، اور وہ ایک بھوکے جانور ایسا انتہائی حسرت سے سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی پیشانی پر ایک خمیدہ نشان نظر آیا جو بائیں آنکھ پر ایک کمان سا بناتا تھا۔ اس کی شکل شانتو ایسی تھی۔ اس پر شانتو کا گمان گذرتے ہی میرا دل دھڑکا اور یقین کرنے کو جی نہ چاہا کہ یہ بے چارہ اپاہج شانتو ہو سکتا ہے۔ آداگون بچا

ہے تو اس غریب نے پچھلے جنم میں کونسا ایسا گناہ کیا تھا جو اس جنم میں اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ میں نے ہلکے سے اُسے شانتو کہہ کر پکارا تاکہ وہ شانتو ہو تو پلٹ کر دیکھے۔ اُس پر فوراً یہ ردِ عمل ہوا کہ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا اور تیز تیز رینگتا ہوا نزدیک آیا۔ وہ بے اختیار سا ہو چلا تھا اپنے ہاتھ اُٹھا کر مجھ سے ملنے کے لئے کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ دھپ سے زمین پر آ رہا۔ اور اس کی ٹھوڑی زخمی ہو گئی۔ میں دو زانو ہو گیا۔ پوچھا۔ شانتو یہ سب کیسے ہوا؟"

وہ رو پڑا۔ "اسے جانے دو۔ تم اتنے دن کہاں رہے؟"

"میں ڈھاکے سے باہر تھا۔"

"کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں مگر یہ بتاؤ کہ تمہارے پاؤں کیا ہوئے؟"

"میں معماروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ایک روز میں سیمنٹ اُٹھائے ہوئے بانس کے ڈھنوں پر چڑھ رہا تھا کہ نیچے گر پڑا اور میرے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے اور سیپٹک ہو گیا تھا اسی لئے کاٹ دیئے گئے ——"

"شانتو —— تم رہتے کہاں ہو؟ وہیں؟"

"وہ زمین تو حکومت نے کب کی لے لی۔ اب وہاں جا کر دیکھو ایک بازار پاؤ گے۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"کبھی جناح ایونیو کے فٹ پاتھ پر کبھی یہاں، کبھی وہاں۔"

وہ رو رہا تھا۔ اس غریب کے پاؤں ہی ٹوٹ گئے تو وہ بھیک کیسے نہ مانگے۔ اس کے باپ کی ایک دکان تھی جس میں پان، سپاری، گولی مٹھائی، دھاگے وغیرہ بکتے تھے۔ شانتو نے کہا کہ وہ دکان ماں کی علالت میں پان، سپاری، گولی مٹھائی اور دھاگوں سمیت بک گئی۔ اس کے ہاں فاقے پڑنے لگے۔ اس کا باپ ہیضے کی وبا میں مر گیا۔ انہی دنوں اس کے پاؤں ٹوٹ گئے اور زمین کے جو پیسے ملے تھے۔ انہی سے کچھ علاج معالجہ ہوا۔ اس کے پچکے ہوئے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ شانتو میرا بہت ہی عزیز دوست تھا۔ مجھے وہ گلی یاد آئی جس پر پندرہ برس پہلے ایک فٹ بال میچ کھیلنے گئے۔ شانتو اور میں کوچوان کے پاس بیٹھے تھے۔ گیند اس کی گود میں تھی۔ اس گلی میں جمال احمد بھی بیٹھا ہوا تھا اور لڑکے اس کے گال دبا رہے تھے۔ وہ آج ایک سی ایس پی افسر ہو گیا ہے اور شانتو میں ایس ڈی او ہے۔ باقی لوگ کیا ہوئے ——؟

"فیضو؟ وہ نواب پور کے فٹ پاتھ پر تہمد، لنگا، بنیان اور پیٹی کوٹ بیچتا ہے۔"

"عالمگیر؟ وہ باپ کے مر جانے کے بعد سے لکڑیوں کی دکان پر خود بیٹھنے لگا ہے۔ اُس کے چھ بچے ہیں۔"

"بادی؟ وہ ڈھاکے کی سڑکوں پر رکشا چلاتا ہے۔"

گلی وہی، بچے وہی۔ مگر سب لوگ ایک ایک کر کے بکھر گئے اور شانتو ہے کہ وہ ڈھاکا کی سڑکوں پر ایک چوپائے ایسا اچک اچک کر بھیک مانگتا ہے۔ میں شانتو سے دوسرے دن اسی جگہ ملنے کا عہد کر کے چلا گیا۔ اب میں ایک تاجر ہوں۔ اتنے دنوں میں جمال احمد سی ایس پی مجھے

بھول گیا ہوگا۔ اس کے باوجود میں اس کا گہرا دوست ہوں کیونکہ اس نبی ایس پی اور مجھ تاجر میں ایک اٹوٹ تعلق ہے اور اس سرزمین کے لئے جس سے ہم لوگ منقطع ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ مگر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے ہماری بگھی کے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا، اور وہ بگھی کھیل کے میدان سے آگے نہ گئی۔ وہیں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ اور شانتو کے دونوں پاؤں کٹ گئے۔ پندرہ۔ برس پہلے ہم لوگ کھیل کے میدان میں یوں آکر ملتے تھے جیسے مختلف سمتوں سے بہتی ہوئی ندیاں آکر ایک سمندر میں مل جاتی ہیں۔ پانی، پانی ہے مگر اس سمندر میں جنگی جہاز تیر رہے ہیں۔ شانتو نے پیٹ بھرنے کے لئے ملازمت کی تھی مگر وہ ایک دن بانس کے اونچے زینوں سے گر پڑا۔ اور اس کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے۔ فیضو ہاکر ہوگیا، عالمگیر لکڑہارا اور ہادی رکشے والا۔ بگھی کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر مل بیٹھنے والوں میں یہ دیوار حائل ہوگئی۔ مگر جب بگھی ہی نہ رہی تو یہ بیچارے کدھر جاتے۔ ویسے آج بھی کوئی کوئی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا لیتا ہوگا۔ میں ٹہلتے ہوئے لیاقت ایونیو پہونچا۔

سڑک پر بہت بھیڑ تھی، موٹریں زن زن گذرتی تھیں اور رکشائیں ٹن ٹن۔ سڑک عبور کرتے وقت اچانک میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہ سڑک زندگی سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ ایک ایک لمحہ اڑتا ہوا، ایک ایک لمحہ حادثات سے بھرپور۔ فیضو، عالمگیر، جمال احمد سی ایس پی، شانتو، ہادی اور میں بیک وقت سڑک عبور کر رہے ہیں۔ ہر سمت سے موٹریں اور لاریاں آرہی ہیں جن سے پلک جھپکنے میں پس جانے کا خدشہ ہے۔ مگر جمال احمد ہوشیار ہے وہ آنکھ بچا کر نکل گیا۔ شانتو لاری کی زد میں آگیا۔ عالمگیر، فیضو اور ہادی ٹھہر گئے اور انھوں نے تقریباً اکٹھے سڑک عبور کی چنانچہ جمال احمد سے یہ لوگ بہت پیچھے رہ گئے میں لپک کر ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ اور گسٹ ہاؤس پہونچا۔ وہیں نیل منی کا خط پایا۔

"ڈیر، میں یہ خط کراچی سے لکھ رہی ہوں۔ آج شام کی فلائٹ سے ڈھاکا پہونچ رہی ہوں۔ ایئرپورٹ ضرور آنا۔"

کراچی ایک بہت بڑا شہر ہے۔ مگر اونچی اونچی عمارتوں اور چمکتی ہوئی موٹروں کے باوجود چھپائے نہیں چھپتا کہ یہ خطۂ ارضی ایشیا کے نقشے پہ ہے اور ایشیا کے ہر شہر کی مانند اس کے بھی دو حصے ہو گئے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ سلم ایریا ہے جہاں ٹٹ پونجیے رہتے ہیں اور اتفاق سے وہی حصہ بڑا ہے کیونکہ ایشیا میں ٹٹ پونجیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور وہ کابلیوں سے ادھار لے کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے بے ساختہ ڈھاکا یاد آیا۔ نیل ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ شہروں کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا ایشیا کی تقدیر ہے۔ نواب پور ریلوے کراسنگ ڈھاکے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ایک خوبصورت ڈھاکا ہے اور دوسرا بدصورت ڈھاکا۔ ایک ڈھاکے میں فیضو وغیرہ بستے ہیں اور دوسرے ڈھاکے میں جمال احمد وغیرہ۔ مگران دونوں کے بیچوں بیچ جو ایک قطعہ ارضی ہے وہاں شانتو رہتا ہے۔ وہ اچکتا ہوا پرانے ڈھاکے سے نئے ڈھاکے میں داخل ہو جاتا ہے اور نئے ڈھاکے سے پرانے ڈھاکے میں۔ رات نیل پھر یہ گفتگو چھیڑ دے گی کہ بنگال کی روح بکرم پور ہے۔ مدتوں پہلے وہ جگہ بدھشوں کی راجدھانی تھی۔ سلہٹ کے رام گڑھ سے تانبے کا ایک پلیٹ برآمد ہوا ہے جو بکرم پور کے راجہ کا فرمان ہے۔ اس نے رام گڑھ بودھ بھکشوؤں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ بکرم پور دیکھئے، مائنامتی دیکھئے، پہاڑپور دیکھئے۔ بودھ ازم کے علاوہ اور کیا ہے۔

وہ اپنا سر پیچھے پھینک کر قہقہے لگاتی ہوئی کہے گی ——— "بنگال کی روح بودھ ازم ہے۔"

"مگر نیل تم نے تو سلہٹ کے میوزیم میں وہ ستون بھی دیکھا ہے جس میں اشوک کے لاٹ بنے ہیں۔"

"دیکھا ہے۔"

"اس میں چینیہ کے بھی نقوش ہیں ———"

"ہاں۔"

"اور وہیں اس کے نیچے کلمۂ توحید بھی نقش ہے نیل۔ یہ الجھا ہوا ہمارا پس منظر ہے۔ ہماری تقدیر ہے۔"

دوسرے کمرے میں دو مرد آپس میں بے چینی سے گفتگو کر رہے تھے۔ جو سنائی نہ دیتی تھی۔ لڑکے باغ میں اچھل کود رہے تھے۔ سڑکوں پر موٹروں کا شور تھا۔ نیل کے والدین چار ماہ کے لئے لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ اب کراچی ہوتے ہوئے وہ لوگ ڈھاکا آ رہے ہیں۔ کئی دن نیل کے ساتھ گذریں گے۔ پھر وہی چٹاگانگ کا دور افتادہ پہاڑی علاقہ۔ جہاں برسوں پہلے چکما لوگ بڑے سکون چین سے رہتے تھے۔ اور پہاڑیوں پر جھومی فصلیں لگاتے تھے۔ اور کنواری زمین کی تلاش میں آگے بڑھتے چلتے تھے۔ آج وہاں مشرقی بنگال کا سب سے بڑا ہائیڈرو ولک پروجیکٹ بن گیا ہے۔ اور چکما سو ورمیں کریم اور غازے لگاتی ہیں اور ان کے مرد پتلون پہنتے ہیں اور کسی کسی کے ہاں ٹرانسسٹر ریڈیو بجتا ہے۔ بانس کی بھینی بھینی خوشبو ختم ہو رہی ہے اور ہر سڑک پر نئے دل کی مانند دھڑکتے رہتے ہیں۔ اور کرنافلی کی دوشیزگی مسخ ہو گئی نیل کہتی ہے کہ یہ سفر لازمی ہے۔ میں کہتا ہوں اتنی تیز دی کیوں۔ وہ کہتی ہے آپ تاریخ سے ناآشنا ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دیہات کیوں اجاڑے جائیں۔ وہ کہتی ہے کہ شہر خوشحالی کی علامت ہیں —— مگر نیل دھان اگانے کے لئے کھیتوں میں اترنا ہی پڑے گا۔ اور دھان کے بغیر پیٹ نہیں بھر سکتا۔

نیل اتنی بڑی چھلانگ ہمیں منتشر کر دے گی۔ کیوں نہ آنکھیں کھول کر چھلانگ لگائیں —— !

دوسرے کمرے سے گفتگو سنائی دینے لگی:

"وہ ہے بڑی شوخ ۲۴ - ۲۵ کا سن ہے۔"

"کتنا لیتی ہے؟"

"رات بھر کے لئے سو روپئے۔ مگر ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔"

"کیوں؟"

"اس کے لئے علاحدہ سے ۲۵ روپئے لیتی ہے۔"

"مگر وہ ہے کون؟"

"وہ ایک —— خاصے معزز پیشے میں ہے۔"

"اچھا؟"

"یہ ڈھاکا ہے پیارے! جناح ایونیو پر بیسیوں دلال منہ کھولے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تعجب کیوں کر رہے ہو۔ لڑکیاں دمادم چل رہی ہیں۔"

پھر ان دونوں نے یہ طے کیا کہ آج رات وہ اس شوخ کو اپنے ساتھ رکھیں گے جس کے لئے کچھ شراب اور کچھ کباب درکار ہوں گے۔ ذرا توقف کے بعد، پہلے نے کہا کہ وہ ہے بڑی اچھی شئس کہتی ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔ ریڈیو سٹ ہے۔ ریفریجریٹر ہے۔ اچھے اچھے زیور ہیں۔ مگر خواہش ہے کہ ایک نئی آسٹن کی سو اس کے لئے روپئے جمع کر رہی ہوں۔

دوسرے نے کہا کہ وہ ایک کار خریدنے والی خود ایک ٹیکسی بنی ہوئی ہے۔ اس پر دونوں بہت بے حیائی سے ہنسے۔

میں شام پڑے ایرپورٹ کے لئے نکلا، سڑک پر کافی رونق دیکھی۔ یہی جگہ ۱۵ برس پہلے ایک اجاڑ میدان تھی۔ وہیں کھمبے سے کوا اچھل رہا ہے بلک بلک بیسیوں موٹریں گذرتی ہیں۔ رکشاؤں کا کیا شمار، لوگ اتنے کہ دھکم پیل ہو رہی ہے چست لباس لڑکیاں ٹھمک ٹھمک چلی جاتی تھیں۔ کوئی نزدیک سے گاتا گنگناتا ہوا گذر جاتا، کوئی انھیں چھیڑ لیتا۔ یہ شہر اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود میرے لئے اس قدر اجنبی ہے۔ اس کی گلیاں جانی پہچانی ہونے کے باوجود

اجنبی اجنبی سی لگتی ہیں۔ یہاں کرشنا چورا کے ہرے بھرے درخت ہیں، جو بہار کے دنوں میں سرخ سرخ پھولوں سے لد جاتے تھے تو میری روح کچھ کرن پھولوں میں سما جاتی تھی۔ ساری اجنبیت کے باوجود وہ تعلق آج بھی ہے۔

مجھے یہاں کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے مجھے حیرت ہے کہ کرشنا چورا سے تعلق کے باوجود یہ گھٹن کیسی ——؟

نیل کہتی ہے کہ ہم لوگ زمین سے منقطع ہوتے جا رہے ہیں۔ فلک بوس عمارتوں پر رہنے والوں کا سوندھی زمین سے کیا تعلق ہے وہ تو بجلی کے تاروں پر رہتے ہیں۔

"نیل۔ تم اپنی تردید آپ کر رہی ہو۔"

"اوہ نہیں —— میں تو کہنے جا رہی تھی کہ دیکھئے چیزیں کیسی بدل جاتی ہیں۔ مثلاً آج مذہب پر سے عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اب آپ مصنوعی بارش کیجئے گا تو کیا اسے باران رحمت کہئے گا؟ یہی چٹاگانگ کے طوفان ہیں۔ پہلی دفعہ آئے تھے تو لوگوں نے اپنے آپ کو گناہگار محسوس کیا تھا مگر پھر وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ خدا کا قہر ایک ہی ضلع کے لوگوں پر کیوں نازل ہوا اور وہ بھی ہر سال اکتوبر کے مہینے میں۔"

اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے اُس پار سے شانتمو گلا پھاڑ پھاڑ کر مجھے پکار رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے کٹے ہوئے پاؤں پر بیٹھ کر فضا میں ہاتھ لہرا دیئے۔ پھر اچک کر بولا کہ ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔ ایک نہایت ہی ضروری بات کہنی ہے۔ میں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور کہا کہ میں آ رہا ہوں کیونکہ اسے سڑک عبور کرنے میں دقت پیش آتی۔ میں دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ وہ بھی سڑک پر آ گیا اور عین اسی وقت ایک لاری سے ٹکرایا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ میں دوڑ کر نزدیک پہنچا۔ سڑک پر خون پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک رکشا میں رکھا تاکہ اسے ہسپتال لے جاؤں مگر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور جسم یخ ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے سینے میں دھواں سا اٹھا اور ایک زخمی سانپ سا بل کھا کر رہ گیا۔ وہ بدنصیب کہ ایک دفعہ پہلے زندگی کی سڑک پر قدم رکھتے ہی پاؤں گنوائے تھے۔ آج وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ وہ سڑک نہ عبور کر سکا۔

میں سڑک کے دوسرے پار۔

خدا جانے وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ بھیک منگے آئے اور رکشا پر سے اس کی لاش اتار لی اور کہا کہ اس کا ہم لوگ کفن دفن کریں گے وہ ہمارا آدمی تھا۔ ہم لوگوں نے اسے پیار کیا ہے۔ شام ویران —— بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ میرے کان بج رہے تھے۔

درختوں پر کرشنا چورا کے سرخ سرخ پھول کھل رہے تھے۔

میں کبھی شانتمو کا خون آلود جسم دیکھتا تھا اور کبھی کرشنا چورا کے سرخ سرخ پھول۔ مجھے دونوں میں وہی ایک تقدیس محسوس ہوئی جو روحوں میں رچ بس جاتی ہے۔ دونوں کی کہانی دکھوں کی کہانی ہے۔ دونوں کے پس منظر میں حسرت ہے۔ کسی نے اسے محسوس کیا، کسی نے اسے محسوس نہیں کیا۔ ویسے یہ ہر شخص جانتا ہے کہ کرشنا چورا پر یہ خون کے چھینٹے بے معنی نہیں ہیں۔ ہر شخص جلدی میں ہے۔ کوئی ٹھہر کر افسوس کر لیتا ہے۔ کوئی پیسے اچھال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور مجمع ہے کہ آہستہ آہستہ چھٹتا جا رہا ہے

فٹ پاتھ پر شانتمو کی لاش پڑی ہے۔ لاش کے گرد چند دردمند لوگ، کئی بھیک منگے اور میں رہ گئے۔ ایک بھیک منگے نے اپنی سفید چادر لاش پر ڈال دی اور چادر پر اسی لمحے کرشنا چورا کے پھول کھل اٹھے۔

یہ پھول جب کھلتے ہیں جب خون کے چھینٹے اڑے اور یہی ان پھولوں کا المیہ بھی ہے اور یہی طربیہ بھی —— اسی سے یہ پھول کھلتے ہیں۔

آغا سہیل

بدلتا ہے رنگ آسماں

دو چار ستارے آسمان میں ٹمٹما رہے تھے۔ جب مخدوم سردی میں کسمساتا ہوا اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی آئی۔ اکا دکا لوگ اترے۔ دو ایک گاڑی میں چڑھے اور گاڑی چل دی۔ مخدوم نے سارا سفر سہم سہم کر طے کیا کہ مبادا کسی کی نظر اس پر پڑ جائے اور پھر اسے گھر پکڑ بلایا جائے۔

جس وقت لکھنؤ شہر کا سجا سجایا اسٹیشن آغا میر کی ڈیوڑھی جیسا آیا اور گاڑی رکی تو لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ گاڑی سے اتری اور ہجوم کا ہجوم گاڑی میں سوار ہوا۔ اس ریل پیل اور دھکم دھکا میں کچھ دیر تک تو وہ ہکا بکا کھڑا ایک ایک کو تکتا رہا اور اس کے دماغ میں طوطیا چاچا کا وہ فقرہ چکر لگاتا رہا۔

"ارے لکھنؤ کی کا کہت ہو ایک سے ایک نواب رہت ہیں۔ سارا شہر سونے میں پیلا اور چاندی میں سپید دکھت ہے۔ مانو ہن برستا ہو ہن۔"

مخدوم گاڑی سے اترا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، سڑکیں ہی سڑکیں اور گلیاں ہی گلیاں۔ آدمی بھی طرحدار بانکے سجیلے، رنگ برنگی کے گھٹنے، تنگ آستینوں کے انگرکھے، دوپلی چنی ہوئی ٹوپیاں، کیسے سپید سپید بگلے کے پروں کی طرح صاف شفاف کپڑے اور پھر چنے ہوئے دوپٹے گلوں میں پڑے ہوئے۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا۔ مخدوم کو اپنے قصبے کا زمیندار یاد آگیا جو عید، بقر عید صاف کپڑے پہن کر بستی بھر میں اترایا اترایا گھومتا تھا۔ یہاں اس کو ہر شخص زمیندار نظر آتا تھا۔

میلی دھوتی میں چلتا لپٹایا مخدوم اسٹیشن کے باہر پہنچا تو دیر تک لوگوں کی آمد و رفت میں محو رہا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب کیا کرے، کہاں جائے اور کس سے نوکری طلب کرے۔ وہ دیر تک ایک جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ ایک درخت کے نیچے ایک بگھی کھڑی تھی۔ گھوڑے دانا کھا رہے تھے۔ سائیس جلیبیاں کھا کھا کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا اور کبھی کبھی اسے گانے کی لہر آتی تو گانے لگتا:

چلا نہیں جائے ہم سے بیتوں بیتوں چلا نہیں جائے
اب چلا نہیں جائے ہاں چلا نہیں دیکھو چلا نہیں جائے

اور ساتھ ہی ساتھ دیدے بھی مٹکاتا جاتا، کولہے بھی چلاتا جاتا اور جلیبیوں کے چٹخارے بھی لیتا جاتا:

پہلی پہلوٹی مورے سسر گھر آئے ۔۔۔ سسر گھر آئے
سسر کے سنگ مورا ٹھینگا جائے۔ مورا ٹھینگا جائے

ہم سے بیتوں بیتوں چلا نہیں جائے

مخدوم کو یاد آیا کہ زمیندار کے نوزائیدہ بچے کا عقیقہ جب ہوا تھا تو لکھنؤ کی ایک طوائف نے یہی گانا بھاؤ بتا بتا کر گایا تھا۔ سارا قصبہ گو نے پر ریجھا ہوا تھا اور طوائف پر تو گویا لٹو ہو رہا تھا۔ رات بھر گیس کی روشنیوں میں اس سے یہی گانا سنا گیا اور اس پر روپوں پیسوں کی بارش ہوتی رہی۔ اسے یہ بھی

یاد آیا کہ اس گانے میں دلھن نہ سسر کے ساتھ جانے پر تیار ہوتی ہے نہ جیٹھ اور دیور کے ساتھ۔ جب بلما کا ذکر آتا ہے تو جھٹ جانے پر تیار ہو جاتی ہے:

بلما گھر آئے ——

بلما کے سنگ موراجیا للچائے۔ ہم سے بیتوں بیتوں…

اور جب سائیں نے آخری بول گائے تو مخدوم ہنس دیا۔ سائیں بھی ہنس دیا۔ بولا۔

"کرسی سے آ رہے ہو؟"

اور جب مخدوم نے نفی میں گردن ہلائی تو بولا "پھر گونڈے سے آئے ہو گے؟"

اور جب گونڈے پر بھی مخدوم نے انکار کیا تو وہ بولا "نانپارے سے؟"

اور جب اس پر انکار ہوا تو جھنجھلا کر بولا "تو کیا جناب سیدھے عرش معلیٰ سے تشریف لا رہے ہیں"

مگر مخدوم بولا "جرول ضلع بہرائچ سے:"

بگھی سے اتر کر گھوڑوں کو تھپتھپاتے ہوئے سائیں بولا "گھر سے بھاگے ہو؟"

اور مخدوم سن سے ہو گیا کہ اب اس کی خیر نہیں لیکن سائیں دوسرے ہی لمحے بولا "برخوردار گھبراتے کیوں ہو۔ ادھر سے ادھر جو بھی آتا ہے" یا بھاگ ہی کر آتا ہے اور جو آتا ہے یہیں کا ہو جاتا ہے۔" اور پھر گھوڑوں پر ساز رکھتے ہوئے ایک لمحے ٹھٹھکا اور ٹھٹھک کر بولا "بڑا ظالم شہر ہے میاں ابھی تم کیا سمجھو گے اس شہر کو، بھئی یہ شہر تو جادو کا تہ خانہ ہے، جس کی کوٹھریاں طلسمات سے بھری ہوئی ہیں۔ اور — اور — خیر چھوڑو — یہ بتاؤ کدھر جانا ہے؟"

مخدوم کو تو خود بھی اپنی منزل کا پتہ نہیں تھا، جواب کیا دیتا سر کھجانے لگا۔

سائیں بھی قیامت کا آدمی تھا۔ جھٹ تاڑ گیا۔ بولا "ابھی ہم سمجھ گئے تمہیں نوکری چاہیئے ہے — خیر تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ آج ہی نواب چھبن صاحب کے اصطبل پر نوکری مل جائے گی۔ مگر یاد رکھنا میرے یار بڑا بانکا رئیس ہے۔ بات کے لئے لاکھ بھی خاک کر دیتا ہے۔ ایک سے ایک قیمتی گھوڑا پڑا ہے اصطبل میں۔ ایسا ایسا چکنا گھوڑا کہ میاں مکھی تو مکھی، نگاہ بھی پھسلتی ہے۔ جو ٹھیک سے کام نہ کیا تو کوڑے سے کھال ادھیڑ دے گا نواب۔ ہاں بھائی — غصہ تو ایسا ہی ہے۔ منظور تو ہاں کرنا نہیں تو نا کر دینا۔" اور پھر گھوڑوں کو بگھی میں جوت کر سائیں بولا "ایک بات ہے میاں صاحبزادے! اگر نواب تم سے خوش ہو گیا تو سمجھو دلدر دور ہو گئے، دن پھر گئے، ناکوں ناک دولت میں ڈوب جاؤ گے۔" اور پھر مزے سے بگھی پر جا بیٹھا۔ لگام اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ مڑا اور بولا "منظور ہو تو پیچھے پاؤں دان پر کھڑے ہو جاؤ۔"

اور مخدوم بلا چون و چرا لپکے پاؤں دان پر کھڑا ہو گیا۔

بگھی بان نے لگام اٹھائی۔ سر پر ٹوپی ٹھیک سے جمائی۔ گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو چوما، گھوڑوں پر دعا پڑھ کر دم کی اور پھر یا علی اور کہنی کہہ کر گھوڑے ہانک دیئے۔ بگھی چل پڑی اور بگھی ایک کشادہ سڑک پر آئی ہی تھی کہ سائیں بگھی روک کر نیچے اترا اور دو آدمیوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور لگا جھک جھک کر سلام کرنے۔ دونوں آدمی بوڑھے تھے، خشخشی داڑھیاں تھیں، سفید براق سے کپڑے پہنے تھے۔ ایک نے بگھی بان سے پوچھا "کیوں بھئی مرزا خیرو۔ بھلا کدھر جا رہے تھے؟"

"حضور" بگھی بان یعنی مرزا خیرو جھکا اور بولا "سرکار کی قدم بوسی کو حاضر ہو رہا تھا۔" اور مخدوم اچنبھے میں آ گیا کہ چند لمحے پہلے مٹکنے تھرکنے والا سائیں کیسا ثقہ بن گیا تھا! اور کس ادب تمیز سے گفتگو کر رہا تھا۔

سواریاں بیٹھیں اور بگھی دریا والی سڑک پر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ راستے میں ہزاروں بگھیاں، یکے، ٹمٹمیں، شکرمیں، تانگے ملے جن میں سواریاں بیٹھی تھیں اور لوگ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ دریا والی سڑک پر انگریز اور ان کی میمیں اور انگریزی فوج کے گورے صاحب لوگ بھی سیر کرتے تھے۔ ڈولیاں، چوپہلے، نینسیں اور سکھ پال بھی کہار اٹھائے اٹھائے دوڑتے تھے۔ خدمتگار، پیش خدمت، چوبدار اور مصاحب ڈولوں کے جلو میں چلتے تھے۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر جدا لوگ چلتے تھے اور شہر میں ایک آدھ موٹر بھی نظر آجاتی تھی جسے لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ سودے سلف کے بیچنے والے، خوانچے والے پھرتے تھے اور مخدوم پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہر کو دیکھتا کہ یا اللہ اتنا بڑا شہر اور ایسی رونق اپنے قصبے میں کئی میلے ٹھیلے اس نے دیکھے۔ ہاٹ بازار بھی دیکھے تھے۔ مگر اس رونق کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے سنگی ساتھی لپ چھپ کر بہرائچ کی نمائش دیکھ آئے تھے تو کیا کیا ہوا باندھتے تھے کہ اتنے لوگ دیکھے، اتنا مجمع دیکھا، کہیں دیکھ لیں لکھنؤ تو چھاتی پھٹ جائے۔ راستے بھر اس نے نئے نئے سودے دیکھے، نئی مٹھائیاں، نئے نئے تماشے، بانک بنوٹ والے بھی دیکھے، نٹ اور پہلوان بھی، ڈوم ڈھاڑی بھی اور بھانڈ کشمیری بھی۔

جھٹپٹا وقت ہونے لگا۔ دور افق میں سورج ڈوبا اور چراغ میں بتی پڑی کہ مرزا خیرو مخدوم کو لے کر ایک حویلی کے سامنے جا پہنچا کئی کئی ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں طے کرتا ہوا جب مرزا خیرو ایک دالان میں پہنچا تو وہاں تختوں کا چوکا لگا تھا، جھاڑ فانوس روشن تھے، مردنگیں پنجشاخے اور دوشاخے روشن تھے۔ اور دیوان جی مصاحبوں کے جمگھٹ میں بیٹھے تھے۔ داستان گو بیٹھا داستان کہتا تھا۔ افیم گھلتی تھی اور لوگ واہ واہ کے نعرے لگاتے تھے۔ اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر پہلے وہ دیوان جی ہی کو نواب چھبن صاحب سمجھ بیٹھا تھا لیکن دیوان جی تو نواب صاحب کے مختار تھے۔ مرزا خیرو نے جھک کر سلام کیا۔ پھر دیوان جی نے نگاہ اٹھا کر ایک ذرا مخدوم کو دیکھا، بولے "خیر تو ہے مرزا خیرو کیسے آنا ہوا؟"

"درحقیقت یہ چھوکرا جرول سے بھاگ کر ادھر آ نکلا تھا۔ میں نے سوچا چلو نواب صاحب کے اصطبل میں کھپ جائے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی۔"

دیوان جی نے ناقدانہ نظروں سے مخدوم کو دیکھا۔ مخدوم سہم گیا۔ دیوان جی اسے یوں نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتے رہے تھے جیسے قصائی گائے کو دیکھتا ہے۔ پھر گردن ہلا کر بولے "میاں تم تو جانتے ہی ہو۔ اس سرکار میں بیسیوں کی پرورش ہوتی ہے لیکن ہر شخص کچھ نہ کچھ ہنر بھی جانتا ہے، کوئی کنکوا بنانے میں طاق ہے تو کوئی اڑانے میں۔ کوئی کبوتر بازی میں شہرۂ آفاق ہے تو کوئی مرغ بازی میں کسی کو بٹیر بازی میں ملکہ حاصل ہے تو کسی کو شاعری میں ــــ مگر یہ چھوکرا تو بالکل ہی گاؤدی نظر آتا ہے۔ بھلا یہ کیا ہنر جانتا ہے۔"

مرزا خیرو نے کہا، "دیوان جی یہ تو بس گھوڑوں کو کھریرا کیا کرے گا اور اصطبل میں پڑا رہے گا اسے پیٹ بھر کی روٹی اور تن بھر کا کپڑا چاہیے۔"

دیوان جی کے بولنے سے پہلے ہی ایک مصاحب بولے "اجی صاحب ذرا ٹھونک بجا کے سودا کیجیے گا۔ بڑا موذی زمانہ آلگا ہے ہر نفس طمع، ہر شے کھوٹی۔ کہیں رہبر کے بھیس میں رہزن نہ ہو۔ ہزاروں چور اچکے، بدمعاش لفنگے سوانگ بھر بھر کے خلق خدا کو لوٹتے پھرتے ہیں ــــ" دوسرے بولے: "نا صاحب ہمیں تو یہ لڑکا کوئی یتیم معلوم ہوتا ہے، ضرور اپنی سوتیلی ماں کی بدسلوکی سے بھاگا ہے کیوں رے لڑکے؟"

سوتیلی ماں کے نام پر مخدوم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ رقیق القلب مصاحبین بھی رو پڑے۔ پھر کیا تھا۔ اسی دم اسے نوکری مل گئی۔ پھٹی پرانی گدڑی بھی مل گئی۔ اسی میں لپٹ کر اصطبل سے ملحق کوٹھڑی میں جب وہ جا کر پڑا ہے تو پڑتے ہی بےسدھ ہو گیا۔ جب

صبح کا گجر بجا اور دی بجی اور موذن نے اذان دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لالٹین لئے ہوئے جب سائیں اصطبل میں داخل ہوا تو گھوڑے ہنہنانے لگے۔

مراد علی نواب چھمین صاحب کے اصطبل کا نگراں تھا۔ اصطبل میں سات گھوڑے تھے اور ہر گھوڑے کے خواص الگ الگ تھے۔ کچھ گھوڑے ران سواری کے لئے تھے اور کچھ ٹم ٹم اور دوسری سواریوں کے لئے۔ مراد علی نے مخدوم کو ہر ہر گھوڑے کے بارے میں سمجھایا اور بتایا۔ ہر گھوڑے کی غذا بتائی اور اس کے مزاج کا حال اس کے ذہن نشین کرایا۔ ران سواری کے گھوڑوں کی کاٹھیاں اور ساز سمجھائے۔ ہر گھوڑے کی چال بتائی۔ پویہ کسے کہتے ہیں، دُلکی کیا ہوتی ہے، سرپٹ کیسی ہوتی ہے۔ ہوا خوری کے لئے کون کون سے گھوڑے موزوں ہیں۔ سیر اور شکار کے لئے کون کون سے۔ موسم بدلنے پر گھوڑوں کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے اور نواب صاحب کو کون کون سے گھوڑے زیادہ عزیز ہیں اور وہ کس وقت کون سے گھوڑے پر سواری کرتے ہیں کس پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں اور کونسا سیر و شکار کے لئے استعمال میں آتا ہے۔ مہینوں تربیت حاصل کرنے کے بعد مخدوم کو اس بات کی ہمت ہوئی کہ وہ ایک صبح نواب صاحب کی ہوا خوری کو گھوڑا لے کر حویلی کے سامنے پہنچا۔ نواب صاحب خوب لمبے تڑنگے، دوہری ہڈی کے وجیہہ نوجوان آدمی تھے۔ انگریزی برجیس میں سرخ و سپید رنگ پھوٹا نکلتا تھا۔ مضبوط چہرے کی ساخت پر سنہری چمکدار مونچھیں سو سو جوبن دکھاتی تھیں۔ ہاتھ میں چمڑے کا تازیانہ تھا جسے وہ اپنی پنڈلی پر بار بار پٹختے تھے۔ مخدوم پہلی ہی نظر میں نواب صاحب کے جلال کا شیفتہ ہو گیا۔ جیسے ہی اس نے گھوڑا پیش کیا۔ نواب صاحب نے مڑ کر مراد علی کو دیکھا۔ مراد علی نے سلام کیا اور مخدوم کو اشارہ کیا۔ مخدوم جھک کر آداب بجا لایا۔

نواب بولے "کون؟"

اور جھٹ مراد علی بولا "حضور کا نمک خوار"

نواب نے پوچھا "نام؟"

مخدوم نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "خانہ زاد کو مخدوم کہتے ہیں"

نواب مسکرائے۔ گھوڑے کی باگ اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔ اس مسکراہٹ نے مخدوم پر جادو کر دیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کرشن کی من موہنی مسکراہٹ میں رادھا نے تن من دھن تج دیا تھا۔ اس طرح نواب کی مسکراہٹ نے اُسے خرید لیا۔ اس کی شب و روز کی محنت اور ریاضت ٹھکانے لگی یہی مسکراہٹ اس کا انعام تھی۔ مراد علی نے فاتحانہ نظروں سے مخدوم کو دیکھا اور مخدوم کا جی چاہا کہ مراد علی کے پاؤں پکڑ لے جس کی تربیت نے اُسے نواب سے سرخرو کیا۔ اس طرح متعارف ہونے کے بعد مخدوم اکثر صبح اور سہ پہر کے اوقات میں نواب کو گھوڑے پیش کرنے لگا اور اس کی جھجک ختم ہونے لگی۔ دیوان جی کے پیر بھی دبانے لگا اور ان کے مصاحبوں کے حقے بھی بھرنے لگا۔ داستانیں سنتا تو گم ہو کے رہ جاتا اور طلسماتی محل جادو کے گھوڑے، خوبصورت شہزادیاں اس کے خوابوں میں آنے لگیں۔ رات گئے جب مخدوم اپنے حجرے میں قدم رکھتا تو نواب صاحب کے دیوان خانے سے رسوکن بائی کے الاپنے کی آواز آتی:

مرلی والے شام

مرلی والے شام

اور وہ بھی جھومی موسیقی کی لے پر اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے مندنے لگتیں۔

ایک روز رسوکن بائی نے مخدوم کو تنہائی میں بلوایا۔ وہ سہما سہما ڈرا ڈرا جب پہنچا تو رسوکن بائی نے اس کو چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نواب صاحب علاقہ پر گئے ہوئے تھے، محفل اٹھائی تھی، چند ملازمین رہ گئے تھے کسی کو کانوں کان اس کے یہاں آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی

مخدوم کا مارے ڈر کے بُرا حال تھا۔ رسولن بائی پختہ عمر کی عورت تھی، ڈیل ڈول بھاری تھا، رنگ سانولی تھی گھٹنے پاتے میں، بوڑھی گوندنی کی طرح لدی پھندی تھی، چہرے پر بے فکری اور آسودگی تھی۔ سامنے پاندان دھرا تھا، ناگردان میں پان رکھے تھے۔ آگے سنگ حقہ لگا ہوا تھا۔ اگالدان بھی قرینے سے لگا تھا ایک ملازمہ پیچھے کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ باچھوں کی سرخی انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے سمیٹتے ہوئے رسولن بائی بولی: "بیٹھ جاؤ۔"

مخدوم بیٹھ گیا تو رسولن بولی: "بیٹا تم تو جانتے ہو کہ لوگ ہمارے سائے سے بھاگتے ہیں۔ گو ہم گانے بجانے اور مجرے کے سوا کوئی پیشہ نہیں کرتے پھر بھی بدنام ہیں کوئی منہ تک نہیں لگاتا۔"

مخدوم نے گردن ہلا کر کہا "جی"

رسولن بولی "تم سے کیا چھپانا، میری ایک بیٹی ہے، نانپارے میں اپنے ماموں کے ہاں رہتی ہے وہ موذی اُسے اپنے چنگل میں دبوچے ہوئے ہے۔ نہ بچی یہاں آسکتی ہے نہ میں وہاں جاسکتی ہوں مگر میرا جی اُسے دیکھنے کو تڑپتا ہے۔"

یہ کہہ کر رسولن رونے لگی۔ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پاک کرکے بولی "نواب کی نوکر ہوں، اس سرکار کو خدا سلامت رکھے سو روپئے ماہوار ملتا ہے اور عید محرم الگ انعام و اکرام مل جاتا ہے۔ لگی لگائی روزی کو لات مارنا بھی کفرانِ نعمت ہے۔"

مخدوم بیوقوفوں کی طرح بولا "جی جی"

"تو میاں میرا ایک کام کردو تو گویا مجھے بے دام خرید لو اور جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا ویسی تمہاری خدمت بھی کروں گی۔"

"جی"

رسولن بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں دامن پھیلا کر تم سے بھیک مانگتی ہوں، لِلّٰہ مجھے بے آس نہ کرنا۔"

"جی؟" مخدوم ہکا بکا رہ گیا۔

"مجھے میری بسم اللہ سے ملا دو، میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہیں دیدوں گی، اپنی ساری عمر کی کمائی تمہاری نذر کردوں گی۔ تمہیں اپنی بسم اللہ بھی دیدوں گی۔"

"جی، جی، میں — میں۔"

"ہاں بیٹے تم ہی یہ کام کرسکتے ہو، میں نے سُنا ہے کہ تم بہرائچ کی طرف کے رہنے والے ہو اور جو یہ کہو کہ یہ بڑھیا فریب کرتی ہے، مکر کرتی ہے تو لاؤ قرآن پاک پر رکھ دوں کہ زبان سے پھر دوں تو اللہ سمجھے۔ اور جو یہ کہو کہ نواب سے کیوں نہیں کہتی تو بیٹا تم تو جانتے ہو کہ نواب کو لڑکی کی بھنک بھی مل جائے تو قذری ہوجائے پھر وہ اس کی نتھ اتارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور میں مولا مشکل کشا علی اور عباس علمبردار کو گواہ کرتی ہوں کہ بسم اللہ کو شریف بہو بیٹی کی طرح رکھنا چاہتی ہوں، اس کا نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ اور بیٹا اگر تم اس نیک کام کے لئے تیار ہوسکے تو میری پیٹھ قبر سے لگ جائے گی

جب رسولن بائی سب کچھ کہہ چکی تو دیر تک مخدوم کا منہ تکتی رہی کہ اب وہ کچھ کہے مگر مخدوم کو کچھ بن نہ پڑا، کام اتنا خطرناک تھا کہ اس کے ہوش و حواس بھی بجا نہیں تھے۔

رسولن پھر بولی: "نہیں زیادہ زحمت نہیں ہوگی یہ عورت" اس نے پنکھا جھلنے والی عورت کی اشارہ کیا: "یہ عورت اُسے تمہارے پاس لے آئے گی، تم ریل گاڑی پر بٹھا کر لئے چلے آنا۔"

اور مخدوم سکتے کے عالم میں آگیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ نواب صاحب کے دیوان خانے میں، وہاں بیٹھا ہوا تھا جہاں نواب کی موجودگی

میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ رسولن مضطرب تھی، جلدی جواب چاہتی تھی، بولی "پھر کیا منظور ہے؟"

اور مخدوم بمشکل صرف یہ کہہ سکا کہ "میں سوچوں گا" اور پھر وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

شام کو جب وہ اپنے حجرے میں لیٹ کر اس معاملے پر غور کرنے لگا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ دوسری طرف دولت سے کھیلنے کا خواب اسے شرمندۂ تعبیر ہوتا معلوم ہو رہا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اتنے بڑے معرکے کو سر کر لیتا۔

کچھ روز تک رسولن بائی کی آواز بار بار اس کے کانوں میں گونجتی رہی اور اسے ایک نئی زندگی کی دعوت بھی دیتی رہی۔ بسم اللہ کا ہوش ربا تصور بھی اس کی جان سے چمٹا رہا لیکن نواب صاحب جیسے ہی علاقے سے واپس آئے روزانہ کے معمولات نے اس کے تصورات کو اس طرح تھپک تھپک کر سلا دیا جیسے یہ تصورات کبھی تھے ہی نہیں۔

نواب صاحب نے مخدوم کو اپنا مقرب بھی مقرر کر لیا تھا۔ ایک رات وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا کہ اچانک اس کو کسی نے جگایا۔ حکم ملا، نواب صاحب دیوان خانے میں بلاتے ہیں۔ چادر لپیٹ لپاٹ آنکھیں ملتا ہوا جب وہ دیوان پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ عجب جشن ہو رہے ہیں۔ بلور کی جھاڑ کنول اور مردنگوں کی روشنیوں میں بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیے اور مسندیں لگی ہیں۔ نواب کے احباب جمع ہیں، زندگی کے طائفے حاضر ہیں، ساز ندے ساز بجاتے ہیں۔ رنڈیاں آ آ کر بصد ناز و انداز مجرے کرتی ہیں۔ بیل پڑتی ہے۔ جھک جھک کے سلام کرتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ نواب ہیں کہ جام پر جام چڑھائے جاتے ہیں، اور مٹھی بھر بھر کے روپے لٹاتے جاتے ہیں۔ دلن بائی کو کبھی بھجن گانا پڑتا ہے اور کبھی بھیرویں الاپنا پڑتی ہے۔ مقصودن کو کبھی کتھک نچایا جاتا ہے، کبھی خیال۔ ساری محفل عجب بے ہنگم اور بے تکان تھی۔ مخدوم کو دیکھتے ہی دیوان جی ایک کونے میں لے گئے اور کان میں ایک بات کہی جسے سنتے ہی مخدوم الٹے پیروں اصطبل واپس آیا۔ گھوڑا انگاڑ کسا، سڑک پر آیا۔ رات کی تاریکی میں اللہ کا نام لے کر ایک سمت کو چل پڑا۔ جاڑے کی یخ بستہ رات کہ جگر تک ٹھٹھر تا تھا، اور ایسا سناٹا کہ ہو مارتا تھا اور مخدوم گھوڑے پر اُڑا چلا جاتا تھا۔ ایک سنسان سے میدان میں ایک جگہ ایک چراغ جلتا تھا اور ایک لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی دوکان میں ایک بڈھا بیٹھا اونگھتا تھا۔ مخدوم نے پہنچتے ہی کہا "دیوان جی نے سلام کہا ہے۔"

اور بڈھے نے جواباً اس کی طرف دیکھا، کچھ سوچ کر ٹھنکا، پھر بولا "مرزا بانکے کہاں ہیں؟"

"علاقہ پر" اور پھر معاً کچھ سوچ کر بولا "نواب صاحب رت جگا منا رہے ہیں۔"

بڈھے نے توڑے سے چار بوتلیں نکال کر اس کے حوالے کیں، بولا "رت جگے منائیں، سبھائیں رچائیں، اندر بن جائیں، پریاں نچائیں، دولت لٹائیں، ہم کون؟ ہم تو کہتے ہیں میاں کہ یہ سرکار بنی رہے اور ہمیں روٹی ملتی رہے۔"

مخدوم نے بوتلیں لے تھیلے میں ڈالیں اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا چشم زدن میں واپس آ گیا۔ آیا تو دیکھا دیوان جی کھڑے راہ دیکھتے تھے۔ اور نواب صاحب پکار رہے تھے "دیوان جی! دیوان جی!"

دیوان جی بھاگے ہوئے پہنچے "جی سرکار"

"اب تو جام صبوحی کا وقت آ گیا، حلق میں کانٹا پڑا جاتا ہے اور تم ہو کہ تم نے اس لال پری کو سات کنوؤں میں چھپا کے رکھا ہے۔ ہائے ظالم! یہی تو وہ آتش سیال ہے، جو رگوں میں بجلیاں دوڑاتی ہے۔"

ایک مصاحب نے جام بھرا، چسکی لی اور لہک کر بولا "قبلہ آپ کس زاہد خشک کے منہ لگتے ہیں۔"

ایک شوخ سی رنڈی نے دیوان جی کو آنکھ ماری اور بولی "حضور ان زاہدوں کے دل کا حال کچھ ہمیں جانتے ہیں۔"

محفل ایک قہقہہ زار بن گئی۔ دیوان جی نے اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور جھینپ کر الگ جا کھڑے ہوئے۔ دوسرے مصاحب بولے "واللہ مزہ آگیا۔ آہاہا! بھئی حافظ شیرازی نے بھی خوب کہا ہے۔

من حالِ دلِ زاہد با خلق نخواہم گفت   وین قصہ اگر گویم باچنگ و رباب اولیٰ

ابھی شعر ختم ہی ہوا ہوگا کہ چنگ و رباب پھر حرکت میں آگئے۔ رسولن بائی گا رہی تھیں:

این خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ   وین دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

من حال .... الخ

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

(یہ مصرع پھر دیوان جی کی طرف اشارہ کرکے پڑھا گیا)

رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

اور پھر ہاہا واہ واہ کے نعرے بلند ہونے لگے کہ اچانک صبح کی نوبت بجنا شروع ہوئی۔ پو پھٹی اور موذن نے اذان دی۔ مخدوم نے دیکھا نواب کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ دیوان جی جل جلالہ، جل شانہ کا ورد کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ جب مخدوم اور نواب کے سوا کوئی نہ رہ گیا اور موذن کی آواز لا الٰہ الا اللہ کہتی ہوئی فضا کی خاموشیوں میں تحلیل ہونے لگی تو نواب دھڑسے سجدے میں گر کر گڑگڑا گڑگڑا کر استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ، استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ کے جاں گداز نعرے مارنے لگے۔ مخدوم وہاں سے چپ چاپ ہٹ آیا۔ اور اپنے حجرے میں آکر نہایت خضوع و خشوع سے نماز فجر ادا کرنے لگا۔

اسی زمانے میں یکایک محلسرا میں ایک بڑی بھاری تبدیلی ہوئی۔ نواب چھبن صاحب کی شادی شہر کے سب سے بڑے رئیس نواب پتنگ صاحب کی صاحبزادی سے بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور انھوں نے ہاتھی گھوڑے پالکی نالکی کے سوا چھکڑے بھر بھر کے اپنی لڑکی کو جہیز دیا۔ اور ہیرے جواہرات سے نواب صاحب کا گھر پاٹ دیا۔ بارات میں روپئے اشرفیوں کی تھیلیاں لٹوا دیں۔ نوکروں، چاکروں، غلاموں کنیزوں کے علاوہ کئی تعلقے بھی دیے۔ لیکن دولت کی اس ریل پیل پر بھی نواب صاحب ذرا نہ پسیجے۔ مزا یہ کہ دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر جو انھوں نے منہ پھیرا تو کئی دن تک اٹھوائی کھٹوائی لئے پڑے رہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب، مصاحب خواص ہزار ہزار جتن کر تھکے کسی کی ایک نہیں سنی۔ تو خود بخود شدہ شدہ یہ خبر چوک کے بالاخانوں تک پہنچ گئی۔ پھر کیا تھا۔ وہاں تو ایک ایک زہرہ جبیں نواب کے نام پر جان چھڑکتی تھی۔ ہونے لگیں تدبیریں۔ ایک سے ایک شہر کے چھٹے ہوئے گٹنے بہانے بتوں سے ملنے لگے نواب صاحب سے اور لگے اپنے اپنے حربے آزمانے، مگر واہ رے نواب کہ ہر وار اور ہر حملے کی خوب خوب کاٹ کی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اپنے سبزے گھوڑے پر نواب بانکی چتونوں اور پیاری اداؤں کے ساتھ چوک سے گزر رہے تھے اور خلقِ خدا تماشہ دیکھتی تھی کہ ایک بالاخانے پر ایک نازنین مہ جبیں بصد تمکین سوگوار لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کی ادا میں ایسی فراغت تھی کہ نواب ٹھٹھک کر رہ گئے۔ گھوڑے سے کود دنادن زینہ چڑھتے ہوئے اوپر جا پہنچے۔ لوگ پیشوائی کو دوڑے آئے۔ عورتیں صدقے واری گئیں۔ قدموں پر روپئے بچھا دئے گئے۔ نواب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مسند اور گاؤ تکیے پیش ہوئے، مجرے ہوئے، سلامیاں ہوئیں مگر

نواب خاصدان سے ایک گلوری کھا، اشرفی کا ایک توڑا پھینک دل برداشتہ سے واپس چلے آئے ——— جو نازنین ان کو نظر آئی تھی جب وہی نمودار ہوتی تو دل کی کلی کیونکر کھلتی۔ اب کیا تھا نواب روز اُس نازنین کے فراق میں جاتے۔ پہلے تو وہ نظر آتی جب اندر پہنچتے تو غائب ہو جاتی۔ نواب نے بھی ہزاروں اشرفی لٹادی اور آنکھ پر فردا میل نہ آیا۔ اِدھر سارے شہر کی زبان پر یہی افسانہ تھا۔ ہر محفل، ہر صحبت میں یہی ذکر۔ محلسرا کے اندر اور باہر ایک واویلا مچی ہوئی۔ نواب روز شام کو گھر آتے۔ خاصہ تناول کر کے اب جو باہر دیوان خانے میں اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑتے تو بس صبح ہی کی خبر لاتے۔ صبح کی ہوا خوری بھی موقوف اور سیر و سیاحت بھی۔ دوست احباب سیرِ شکار پر لے جانے کو کہتے۔ مشاعروں میں چلنے کی ترغیب دیتے، نئی نئی رنڈیوں کا ذکر کرتے لیکن نواب نے بس اپنی جان کو ایک ہی روگ لگا لیا تھا۔ رسولن بائی کے بھجن اور ٹھمریاں سن سن کر نواب کو وجد آتا تھا۔ اب رسولن کا مجرا بھی پڑا زنگ کھاتا تھا۔ بی مقصودن نے کئی بار رقص کی پیش کش کی، نواب نے قبول نہیں کی۔

ایک رات نواب چھپر کھٹ پر پڑے سر میں پٹی باندھے ہائے ہائے کرتے تھے کہ مخدوم کسی کام سے ادھر گیا۔ خود بخود اس کے قدم بارہ دری کی طرف اٹھ گئے۔ چپ چاپ نواب کے پائینتی جا کھڑا ہوا۔ نواب کروٹیں بدلتے تھے اور اُف اُف کے نعرے مارتے تھے، مخدوم پر جو نظر پڑی تو دیکھا وہ زار و قطار روتا ہے۔ بولے "کیوں بھئی تجھے کیا ہوا؟"

اور مخدوم بولا "کچھ نہیں سرکار، آپ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

نواب نے دوسری کروٹ بدلی، اُف کا نعرہ مارا اور پہلو دبا کر بولے "ہاں بھئی تو نمک حلال نوکر ہے۔ کیوں نہ ہو۔ پھر کچھ دیر چپ رہے تھوڑی دیر کے بعد بولے" ایک ذرا سر تو دبا دے۔"

اور مخدوم چپ چاپ سر دبانے لگا۔ پھر خود بخود بولا "سرکار اس کا علاج نہیں ہے؟"

نواب چپکے رہے۔ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولے "مخدوم میرا ایک کام کرے گا؟"

مخدوم بولا: "سرکار کام کیسا جان بھی حاضر ہے۔"

"تو کل میرا سبزہ گھوڑا دریا پر رات کے آٹھ بجے لے کر آ جانا مگر دیکھ کسی کو پتہ نہ چلے۔"

"کیا مجال سرکار۔"

"وہاں میں ٹھیک آٹھ بجے پہنچوں گا۔ سبزے پر بیٹھ کر چلا جاؤں گا اور لال گھوڑا چھوڑ جاؤں گا۔ جو کچھ میرے ساتھ دیکھنا کسی سے نہ کہنا۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

وہ رات مخدوم کے لئے عذاب بن گئی، کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو شام پکڑنی دشوار ہو گئی۔ سات بجے مخدوم نے گھوڑا کسا اور دریا چل دیا۔ دریا والی سڑک پر ٹھیک آٹھ بجے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا کوئی آیا۔ نکڑ پر گھوڑا رکا۔ آواز آئی "مخدوم"

مخدوم بولا "جی سرکار گھوڑا حاضر ہے۔" مخدوم نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان عورت گھوڑے پر آگے بیٹھی ہے۔ نواب نے گھوڑا بدلا، عورت کو آگے بٹھایا، ایک اشرفی مخدوم کے ہاتھ پر رکھی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد تو شہر میں اودھم مچ گیا کہ نواب چھبن صاحب نے چوک سے فلاں فلاں عورت کو یوں اڑا لیا۔ ہر محفل، ہر صحبت میں یہی چرچا۔ ہر طرف یہی ذکر۔ نواب چھبن صاحب ایک ہفتے تک تو مفقود الخبر رہے مگر ایک رات ٹھیک بارہ بجے کسی نے مخدوم کو پکارا۔ اب جو اس نے دیکھا تو نواب کھڑے ہیں، منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کو کہا۔ مخدوم نے نواب کے پاؤں پکڑ لئے۔ نواب نے

کہا کہ محب اللہ پور میں فلاں فلاں باغ میں پڑاؤ ہے۔ وہاں آجایا کرا اور پھر سبزہ گھوڑا باندھ کر لال گھوڑے پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔

اب جو صبح ہوئی تو ہر ایک حیران پریشان، گھوڑا بدلنے کا واقعہ ہر ایک کی زبان پر مخدوم سے سب پوچھیں تو وہ صاف مکر جائے۔ لوگوں نے اسے لالچ بھی دیئے دھمکیاں بھی دیں لیکن اس نے نہیں سے ہاں نہیں کی۔ اپنی نہیں پر اڑا رہا۔ آخر لوگ تھک ہار کر بیٹھ رہے کہ ایک روز شام ہوتے ہی مخدوم گھوڑا لے محب اللہ پور چل دیا اور پتہ لگاتے لگاتے نواب کے پاس پہنچ ہی گیا۔ دیکھا تو آموں کے باغ میں بیچوں بیچ ایک سپید بارہ دری ہے کہ جھما جھم چمکتی ہے۔ چاندی کی چاندنی میں اور آموں کے بور سے باغ بڑا مہکتا ہے۔ دروازے پر پہنچ کر مخدوم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب چھبتن صاحب برآمد ہوئے۔ آتے ہی مخدوم کو چھاتی سے چمٹا لیا اور بولے "تو نے حق نمک ادا کر دیا۔"

مخدوم بولا "سرکار گھوڑا بدلنے سے سارے لوگ چوکنا ہو گئے ہیں اور میرے اوپر شک کرتے ہیں۔"

لیکن آج نواب کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ بپھر کر نواب نے کہا "کوئی بات نہیں ہم نے جو کچھ کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا جس کو مقابلہ کرنا ہو یہاں آجائے ——— ہم ہر ایک سے نپٹ لیں گے۔"

مخدوم واپس گیا تو اس نے بھی بڑی دلیری سے سارا بھانڈا پھوڑ دیا لیکن اندر بیگم صاحبہ کو جو اس کی اطلاع پہنچی تو جھٹ دیوان جی کے ہاتھوں کچھ اشرفیاں دے کر چوک کی مشہور نائکہ کو بلوایا اور چپکے ہی چپکے سارا معاملہ تلپٹ کرا دیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حالات دھیرے دھیرے معمول پر آ گئے۔ نواب زنان خانے میں بھی آنے جانے لگے۔ مجرے بھی سننے لگے اور صاحب جان کے لئے مکان بھی الگ لے لیا گیا۔ مخدوم اس مکان کا داروغہ مقرر ہو گیا۔ جب نواب زنان خانے میں رہتے تو مخدوم ڈیوڑھی میں پلنگ بچھا کر لیٹتا اور رات رات بھر حقے پیتا رہتا اور کھنکھارتا اور گانے گاتا یا خراٹے لے کر سوتا رہتا۔

صاحب جان چھریرے بدن کی نازک کامنی سی عورت تھی سونے کی طرح پکا پیلا رنگ، کتابی چہرہ، کٹورا کٹورا ناک نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں، خوب لمبے گھنے بال، کالا لباس تو اس پر قیامت ڈھاتا تھا۔ ایسی سوگ میں ڈوبی تصویر بن جاتی جیسے جوگن۔ مخدوم نے اکثر کنکھیوں سے صاحب جان کو دیکھا لیکن اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ سوچنے کے تصور ہی سے اس کے اعصاب پر رعشہ طاری ہوتا تھا۔

نواب چھبتن صاحب پہلے تو ہفتے میں دو چار بار صاحب جان کے پاس ضرور آتے لیکن رفتہ رفتہ ہفتے مہینے میں بدل گئے اور اس کے دیکھتے دیکھتے مہینے سال کی مسافت طے کرنے لگے اور پھر اسی زمانے میں سنا گیا کہ نواب نے دوسری رنڈی بٹھالی۔ صاحب جان بھی عجب اللہ کی بندی تھی کہ نہ تو زبان سے اف کرتی تھی اور نہ نواب سے شکوے شکایت کرتی تھی۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں نواب کو انگریز سرکار سے کئی کروڑ روپیہ ہاتھ لگا۔ کہتے ہیں کہ نواب کے آباؤ اجداد سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوئی قرضہ لیا تھا۔ یہ اس کی ادائیگی تھی۔ روپے پیسے کی آگے ہی گھر میں ریل پیل تھی اب جو نواب چھبتن صاحب کو اس قدر روپیہ ملا تو بولا گئے اور رنگے اور بھی الٹے تلّلے کرنے، خوب خوب انگریزوں اور میموں کی دعوتیں کیں، شکار کھلوائے، شرابیں لنڈھائیں، رنڈیوں پر پیسہ بہایا، جوئے کھیلے اور کھلوائے اور جب پھر بھی روپیہ ختم نہ ہوا تو ایک دن ایک نئی رنڈی پر رعب گانٹھنے کے لئے سارے سو سو کے نوٹ آگ کی انگیٹھی میں جھونک دیئے اور یوں جب لاکھ کا گھر خاک ہو گیا اور نواب ننگلو ہو گئے تو تھوڑے ہی عرصے میں دھیرے دھیرے نواب کے لواحقین علیحدہ ہونا شروع ہوئے اور جب صوبے کے گورنر کو اس المیے کی خبر ہوئی تو ایک پارٹی میں وہ نواب صاحب کے پاس آیا ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "ول نواب اب ہم تم کو نواب سن دس دسنا پکے گا"

گورنر نے جانے کس بھلی ساعت سے کہا تھا کہ فقرہ بھی ہونٹوں نکلا کوٹھوں پہنچا اور دیکھو اس طرح سارے شہر میں گردش کرتا پھرا جیسے کھرا سکہ جو ٹکسال سے نکلتا ہے۔ لوگ انہیں نواب سن دس ہی پکارنے لگے اور دیکھتے دیکھتے لوگ چھبتن صاحب بھول ہی گئے۔ بچے بچے کی زبان پر نواب سن دس نواب سن دس چڑھ گیا۔

اب باقاعدہ انحطاط کا زمانہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مصاحبین اور نوکران چپ نے گھر سے بوریا بستر باندھا۔ پھر زنانِ نازنین مغلانیاں، استانیاں خواصیں اور پیش خدمتیں پھر اڑا کر یوں اڑیں جیسے مرغابیاں سوکھا تال چھوڑتی ہیں اور سال دو سال میں تو اندر باہر ملا کر پانچ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے جن میں نواب کی بیگم رسولن، صاحب جان اور مخدوم بھی شامل تھے جیسے موسمِ خزاں میں درخت لنڈ منڈ ہو جاتا ہے۔ اس طرح نواب سن دس پر خزاں آئی، نہ کوئی پتہ نہ کوئی کونپل، نہ کوئی پھول نہ کوئی پھل۔ جائداد بکنا شروع ہوئی، باغ بغیچے بکے، علاقہ بکا، مکانات بکے حتیٰ کہ گھر کی سواریاں بکیں، سونے چاندی کے ظروف اور زیورات بھی بکنے لگے۔ ایسے وقت میں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے لیکن رسولن بائی، مخدوم اور صاحب جان نواب کے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہے۔ ایک دن رسولن بائی کے جی میں بیٹھے بٹھائے جانے کیا آئی کہ نواب سے بسم اللہ کا ذکر کر ہی بیٹھیں۔ نواب نے کچھ اوپری دل سے بسم اللہ کو بلانے کی اجازت دیدی بسم اللہ کو مخدوم جا کر اسی عورت کے ساتھ بڑی ہوشیاری اور کمال حفاظت کے ساتھ اغوا کر لایا۔ دیکھا تو واقعی بڑی چنچل چھانٹ، تیز طرار اور کرّاری عورت تھی۔ رسولن بائی نے اس کی یہ اٹھان دیکھی تو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی جی میں ٹھان لی۔ مخدوم جیسا حکم کا غلام تو موجود ہی تھا۔ نکاح کا بندوبست ہونے لگا، بڑے بڑے گول مال ہوئے کہ اچانک نکاح سے چند روز قبل ایک صبح کیا دیکھا کہ نواب صاحب بھی غائب اور بسم اللہ بھی ندارد۔ اب کیا تھا رسولن رو پیٹ کے ہائے واویلا مچا کر چپکی ہو کر بیٹھ رہیں۔ مخدوم کی بھلا کیا مجال تھی کہ وہ ذرا بھی دم مار سکے۔ بس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ رسولن بائی مخدوم سے یوں چمٹ چمٹ کر روئی جیسے اپنی اکلوتی بچی کی جوان مرگی پر روتی ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولن بائی کی عمر بھر کی کمائی بی بسم اللہ لے اُڑی ہیں اور اپنی بیگم کے کل زیورات نواب صاحب لے کر چمپت ہوئے۔ خالی درخت پر تو پرندے بھی بسیرا نہیں کرتے، جب سارے پرندے اُڑ گئے تو رسولن بائی نے مخدوم سے کہا کہ میاں اب کیا کہتے ہو۔ مخدوم نے بے چون و چرا رسولن کے حکم کے بموجب بمبئی جانا طے کر لیا اور بالآخر ایک روز تاروں کی چھاؤں میں بگھی بلائی گئی، کچھ سامان لدا، رسولن آ کر بگھی میں بیٹھیں تو میاں مخدوم اپنی سرکار کو سلام کر کے رخصت ہوئے۔ دوسرے دروازے کی آڑ سے جیسے ہی نکلے کہ برقعے میں لپٹی لپٹائی گٹھری بغل میں دبائے دبے پیروں ایک اور عورت نکلی اور نکلتے ہی مخدوم کا دامن پکڑ کر مچل گئی کہ "اب مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"تم!"

اور صاحب جان نے نقاب اُلٹ دی: "ہاں میں۔"

"مگر تم تو نواب صاحب کی امانت ہو۔"

"لیکن اب اس امانت کی حفاظت کون کرے گا؟"

مخدوم لاجواب ہو گیا اور بہت سٹپٹایا مگر اس کے پاس وقت کم تھا گاڑی چھوٹ جاتی اس لئے اس نے عورت کو بگھی میں بیٹھ جانے دیا۔ جب بگھی چار باغ اسٹیشن پر جا کر رکی تو بوڑھے بگھی والے کو پیسے دیتے وقت مخدوم ٹھٹھکا "مرزا.......... خیرو!"

"جی سرکار ــــ مگر معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

مخدوم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "میاں ہمیں اب تم کیا پہچانو گے ــــ ہم تو آج بھی تمہارے بارِ احسان سے سر نہیں اٹھا سکتے بھائی میں ہوں مخدوم۔"

"مخدوم!" مرزا خیرو چلایا "بھئی اللہ مبارک کرے، مگر میاں یہ تو بتاؤ کہ یہ نواب سن دس کو کیا سوجھی تھی کہ گھر پھونک تماشہ دیکھ ڈالا ــــ ہائے ہائے کیا تباہی آئی ہے۔ سچ ہے میاں جہاں اللہ دولت دیتا ہے عقل بھی سلب کر لیتا ہے۔ خیر بھائی خوش رہو ــــ" مرزا خیرو دعائیں دیتا ہوا ایک طرف کو چل دیا اور مخدوم اسٹیشن کی طرف لپکا۔ گاڑی تیار ہی کھڑی تھی۔

ذکاء الرحمٰن

سرحد

مروٹ اور بیکانیر کی سرحد کے قریب، شاہنو والے ٹوبے سے ذرا ادھر گلارے کی کٹیا یوں ایستادہ تھی جیسے کوئی جوگی، سر جھکائے نہ ختم ہونے والی سوچوں میں گم ہو۔

شمال، مشرق اور جنوب میں صحرائے مروٹ کی خشک، دُکڑ زمین کا ایک وسیع قطعہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس بے آب گیا قطعے میں چند سخت جاں، سرخ صحرائی جھاڑیوں کے علاوہ، جن میں سے ہوا فرّاٹے بکھیرتی ہوئی گزرتی تھی، اور کچھ نہ تھا۔ مغرب کی طرف زمین میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور یہاں کسی سخت جان صحرائی جھاڑی نے بھی اُگنے کی ہمت نہ کی تھی۔ شاہنو والے ٹوبے سے پانی کی پتلی سی دھار، ایک مدقوق ندی کے روپ میں، زمین کی سیاہ سطح پر بہتی ہوئی، دور تک نکل گئی تھی۔ اس مدقوق، گدلی ندی کے کنارے کیکر کے درختوں کی ایک چھدری سی قطار یوں لگتی تھی جیسے کسی علیل یرقانی آنکھ پر جھڑی ہوئی پلکیں سایہ فگن ہوں۔

اگر کیکر کے درختوں کی یہ چھدری سی قطار نہ ہوتی تو گلارے نے برسوں پہلے خودکشی کر لی ہوتی۔ صحرائے مروٹ کے باشندے، لکڑی کی شدید کمی کی وجہ سے، ان درختوں کے دیوانے ہوتے ہیں جو انھیں لکڑی مہیا کر سکیں۔ ٹوبہ گہرا ہو یا پایاب، پانی گدلا ہو یا صاف، اس کی انھیں پروا نہیں۔ ٹوبے کے کنارے یا ارد گرد موٹے تنوں اور توانا شاخوں والے درخت ہیں، تو گویا اپنے تئیں، وہ جنت میں رہتے ہیں۔

گلارے نے اپنی یہ کٹیا کسی کی مدد کے بغیر تعمیر کی تھی۔ جب وہ قحط کے کارن بیکانیر کی سرحد عبور کر کے، مروٹ میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونے کا ارادہ لے کر شاہنو والے ٹوبے کے کنارے پہنچا تھا تو اس زمانے میں ادھر ادھر بیس بیس میل تک انسان کی کسی آبادی کا نشان تک نہ تھا — یہ کبڑی کٹیا اس نے کیکر کے ٹیڑھے میڑھے تنوں، سرکنڈوں اور ٹوبے کی دلدلی تہہ کے گارے سے تعمیر کی تھی۔ اس کی مخروطی چھت ڈالنے کے لئے اسے کئی دنوں تک پھاوڑے سے خشک، دُکڑ مٹی کھودنی پڑی تھی اور اس کی مضبوط ہتھیلیوں پر، جہاں صحرائی جھاڑیوں کے نوکیلے کانٹے بھی چبھنے کی تاب نہ رکھتے تھے، اتنے چھالے پڑ گئے تھے کہ مارے تکلیف کے اسے کئی راتیں ستاروں کی ہمکلامی میں بسر کرنی پڑی تھیں۔ کٹیا کے دروازے کی چوکھٹ کیکر کے ایک ایسے تنے سے بنائی گئی تھی جس کی شکل آٹھ (۸) کے ہندسے سے ملتی جلتی تھی۔ ایسا تنا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، لیکن مروٹ کے قدیم باشندوں کا یہ خیال ایمان کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور آج بھی وہ اپنے اس ایمان کو گنوانے کے لئے تیار نہیں کہ گلارا جب اکیلا جھونپڑی تعمیر کرتے کرتے تنگ آ گیا اور چوکھٹ بنانے کے لئے اس کی ہر تجویز ناکام ہو گئی تو اس نے غصے میں آ کر کیکر کا ایک تنا اپنے گھٹنے پر رکھا اور زور لگا کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیا۔

چھت کے وسط میں گیدڑ کی کھالوں کا پردہ لٹکا کر جھونپڑی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں چولہا تھا، چولہا کیا تھا، زمین کھود کر ایک گڑھا بنا لیا۔ اس گڑھے میں کریر اور ون کی سوکھی جھاڑیوں کا ایک ڈھیر سردیوں، گرمیوں، ہر وقت سلگتا رہتا تھا۔ گلارا گیدڑ یا ہرن کا گوشت ابھی

سلگتے ہوئے الاؤ پر بھونتا تھا۔ دوسرے حصے کے ایک گوشے میں ریت کا ہموار مستطیل ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر ٹوبے کے کناروں پر اُگنے والی نرم گھاس بچھا دی گئی تھی۔ یہ گلارے کا بستر تھا۔ گرمیوں میں تو گلارا جھونپڑی سے باہر ریت کے کسی ٹیلے پر سو رہتا تھا لیکن سرما میں جب پورے صحرا کو یخ بستہ ہوائیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔ گھاس اور ریت کا یہ بستر اس کی ہڈیوں کو رات بھر اتنی حرارت بخشتا رہتا کہ وہ آرام کی نیند سو سکے۔ اس بستر کی سرہانے والی دیوار کی ایک بے ہنگم سی کھونٹی پر سانپوں کی کئی خشک کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ دو بدنصیب سانپ تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ گلارے کو دکھائی دے گئے تھے۔ گیدڑ اور ہرن کے گوشت کے بعد، سانپ گلارے کی مرغوب غذا تھے۔ اسے سانپ پکڑنے میں اتنی مہارت تھی کہ انھیں بغیر کسی ہتھیار کے زندہ پکڑ لیتا تھا اور پھر نکوے سے بالشت بھر سر کی جانب سے اور بالشت بھر دم کی طرف سے کاٹ کر اور درمیانی دھڑ کی کھال بڑی نفاست کے ساتھ اتار کر، الاؤ پر بھون کر کھا جاتا تھا۔ مروٹ میں گلارا جس قبیلے کا بانی ہوا، وہ قبیلہ آج بھی سانپ کھاتا ہے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ سانپ کے درمیانی دھڑ کا گوشت مچھلی کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

گلارے کی جھونپڑی میں سب سے حیرتناک چیز چکنی مٹی کی ایک بڑی سی گول رکابی تھی جو دروازے کے سامنے والی دیوار پر آویزاں رہتی تھی۔ یہ رکابی بناتے سمے شاید چکنی مٹی میں کئی رنگ بہت سلیقے سے گوندھے گئے تھے۔ اسے اگر دور سے دیکھا جائے تو یوں لگتا تھا کہ محض سجاوٹ کے لئے استعمال میں آنے والا ایک خوبصورت سا رنگدار پہیہ ہے لیکن قریب سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ ان رنگوں سے ایک مخصوص منظر ابھارا گیا ہے ـــــ ایک ٹوبے کے چاروں طرف صحرائی پھول اور ہر پھول کے عقب سے ایک سانپ کا پھن جھانکتا ہوا ـــــ آج بھی گلارے کے قبیلے کے ہر فرد کی جھونپڑی میں اس منظر والی، رنگدار رکابیاں دیواروں پر آویزاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ رکابیاں کہاں سے آتی ہیں؟ وہ آرٹسٹ کون ہے جو ان رکابیوں کی مٹی میں اس قدر سلیقے سے رنگ گوندھتا ہے کہ محض رنگوں کے امتزاج سے ایک مخصوص منظر ابھر آئے؟ یہ باتیں اب تک سربستہ راز ہیں ـــــ گلارے کے قبیلے کے لوگ اس اِنی دور میں بھی مٹی کے برتنوں اور ان کے استعمال سے قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کی زندگی کا ڈھرا ہی کچھ ایسا ہے کہ انھیں برتنوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ باقی رہے رنگ تو میں کئی ماہ تک ان لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ لوگ رنگوں کے اندھے ہیں۔ ان رکابیوں کا یہ منظر دراصل گلارے کے قبیلے کے مذہبی اعتقاد کا اظہار ہے ـــــ ٹوبہ انسانی زندگی کا مظہر ہے اس کے چاروں طرف اُگے ہوئے پھول، خیر کی یا دوسرے لفظوں میں یزداں کی علامت ہیں۔ ان پھولوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے سانپوں کے پھن شر کی ان قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو یزداں کی حریف ہیں اور ہر اس جگہ موجود ہوتی ہیں۔ جہاں خیر موجود ہو ـــــ یہ انسانی فطرت ہے کہ اس چیز یا وجود کی عبادت کی طرف راغب ہوتی ہے، جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ چنانچہ گلارے کا قبیلہ پھولوں کی پرستش کرتا ہے۔ پھولوں کی پرستش کا یہ عقیدہ گلارا بیکانیر سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا ـــــ مروٹ کے صحرا میں تو کہیں کہیں پھول مل جاتے ہیں لیکن بیکانیر کا وہ علاقہ جس کی سرحد مروٹ سے ملتی ہے، پھولوں کے اعتبار سے بالکل بنجر ہے۔

گلارے کو بیکانیر کی سرحد عبور کئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ شاہو والے ٹوبے کے قریب کٹیا تعمیر ہو چکی تھی۔ اور وہ مروٹ میں موسم سرما کا پہلا دن تھا۔ گلارا، اپنے چولہے پر گیدڑ کے گوشت کے پارچے بھون رہا تھا۔ اس کا سات فٹ لمبا مضبوط جسم چولہے پر جھکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا جسم سیدھا کیا اور بڑی کاہلی کے ساتھ مندی مندی آنکھوں سے دروازے کے باہر اتھاہ، بھورے آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں ان سرخ صحرائی جھاڑیوں پر تیرنے لگیں جو اس کی جھونپڑی کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی تھیں ـــــ وہ ان جھاڑیوں کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتے کو جانتا تھا۔ اس نے ان جھاڑیوں کا بہاراں، بہاراں نکھار بھی دیکھا تھا اور ان کی خزاں، خزاں افسردگی سے بھی اسے آشنائی تھی۔ اس نے ان جھاڑیوں کو مروٹ

کی بلا خیز گرمیوں میں جلتے ہوئے، برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں میں نہاتے ہوئے، صرصر کے ہولناک طوفانوں میں جڑوں سے اکھڑتے ہوئے اور پھر ٹڈی دل کے حملوں کے دوران شاخ شاخ ویران ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ موسم گرما کے عروج کے دنوں میں، جب سورج زمین پر آگ برساتا ہے، ان جھاڑیوں میں خود بخود آگ لگ جاتی ہے اور حد نگاہ تک کئی جہنم جل اٹھتے ہیں۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور بھاری بھاری قدموں سے چلتا ہوا دروازے میں آکھڑا ہوا۔ سامنے جھاڑیوں سے پرے، کچھ فاصلے پر ریت کے اونچے اونچے ٹیلے، سرما کی دھوپ میں چاندی کے ڈھیروں کی طرح چمک رہے تھے اور ان پر ہرنوں اور ہرنیوں کی کئی ڈاریں باہم لاڈ پیار اور اچھل پھاند میں مصروف تھیں۔ چند جوڑے اختلاط کی منزل تک پہنچنے کے لئے بوس و کنار کے مرحلے طے کر رہے تھے ـــــ معاً سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور وہ دروازے کو یوں عبور کرنے لگا، جیسے اس کا جسم قدموں کو بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہا ہو ـــــ مروٹ اور بیکانیر کی سرحد پر رہتے ہوئے اسے عمریں گزر گئی تھیں پہلے وہ اُس طرف تھا اور اب اِس طرف ـــــ صرف چند میل کا فرق پڑا تھا ـــــ وہ یہاں کے ہر موسم کا عادی تھا لیکن سردیوں سے اس کی جان نکلتی تھی۔ اس نے اس علاقے کی کئی سردیاں دیکھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ ان سردیوں کا مطلب کیا ہوتا ہے ـــــ ٹھٹھری ہوئی ہڈیاں، کانپتا جسم، ہر کام معطل اور چاروں طرف پھیلا ہوا ویرانی کا گہرا احساس ـــــ مروٹ اور بیکانیر کی سرحد پر رہنے والے سردیوں سے اسی طرح خوف کھاتے ہیں جیسے بچے راکھشس سے اور بنگال کے باسی سائیکلون سے۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر گھوم کر وہ پھر جھونپڑی میں آگیا اور غربی دیوار کے قریب پڑا ہوا کھوا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے کھوے کی نوک زمین میں گاڑ دی اور اس کی ہتھی پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ اس وقت وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی جذبے کا پرتو نہ تھا، لیکن آنکھوں میں گہری سوچ کے سائے لہرا رہے تھے، جیسے کسی اہم مسئلے پر غور کر رہا ہو۔ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور کھوے کو اسی جگہ رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔

اپنی جھونپڑی سے دن میں کئی بار باہر نکلنا اور صحرا میں کہیں دور چلے جانا اس کے لئے ایک اہم ضرورت بن کر رہ گئی تھی ـــــ اس جھونپڑی میں رہتے ہوئے اسے کئی ماہ گزر گئے تھے۔ ہڈیوں کے اندر تک اُتر جانے والی سردی، بدن کو بھوننے والی گرمی، آنکھوں کے اندرونی پردوں کو بھی جھلسا ڈالنے والی صرصر، ٹوبے کا گدلا پانی، یہ سب اس کا مقدر تھے، اور آج بھی وہاں رہنے والے ہر انسان کا مقدر ہیں ـــــ موسموں کی ناقابل برداشت سختیوں کے کارن مروٹ اور بیکانیر کی اس سرحد پر خودکشی اور پاگل پن کے واقعات عام ہیں۔ جب صحرا کی کوکھ سے جہنمی بگولے اٹھتے ہیں یا شمال کی اور سے منجمد کرنے والی ہوائیں آتی ہیں تو ریت کے کسی ٹیلے پر، کسی ٹوبے کے کنارے، کسی جھاڑی کے سائے میں ایک، دو بے گور و کفن انسانی لاشیں آپ ہی اپنی زندگیوں پر نوحہ کناں دکھائی دے جاتی ہیں ـــــ ممکن ہے مروٹ اور بیکانیر کی اس سرحد پر آنے والی نسلیں راحت آشنا ہوں، ان کی زندگیاں اتنی کٹھن نہ ہوں مگر یہ نسل قدرت کے بے لگام عناصر کی چکی میں بُری طرح پس رہی ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ وقفِ ماتم ہے، اس کے ذہنوں میں مبہوت خیالوں کی تلواریں ہیں، جو ہمہ وقت دل و جگر کاٹتی رہتی ہیں۔ اس کی سانسوں میں صحرا کی آگ ہے اور اس کی آنکھوں میں وحشت ہے پاگل پن ہے۔

گلادے کے ذہن میں بھی دل و جگر کاٹنے والی مبہوت خیالوں کی تلواریں تھیں، سانسوں میں صحرا کی آگ تھی، آنکھوں میں وحشت تھی، پاگل پن تھا لیکن اس کی وحشت اور پاگل پن اس درجے تک نہ پہنچا تھا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس نے کیکر کی چھال اور دن کی جڑوں سے تیار کردہ تند شراب پینی شروع کر دی تھی۔ ٹوبے کے شمالی کنارے سے ذرا پرے، دکڑ زمین میں اس نے ایک گڑھا کھود رکھا تھا۔ یہ گڑھا شراب کی بھٹی کا کام بھی دیتا تھا اور ساغر و مینا کا بھی۔ گرما کے آغاز میں وہ اس گڑھے کو ٹوبے کے پانی سے لبالب بھر دیتا تھا اور پھر اس پانی میں کیکر کی چھال اور دن کی جڑیں ڈال کر اس کو سرکنڈوں سے ڈھانپ دیتا تھا۔ تین چار مہینوں کے بعد کھولتا تو شراب تیار ہوتی اور وہ دن میں جب بھی جی چاہتا، اوک میں بھر بھر کر

چڑھا جاتا۔ جب وہ بیکانیر میں تھا تو اسے شراب کی عادت نہ تھی لیکن جب وہاں قحط کے عفریت نے اپنے خوفناک جبڑے کھولے اور اس کے تمام عزیز واقربا ان جبڑوں کی خوراک بن گئے اور اسے ہجرت کر کے مروٹ آنا پڑا تو یہاں نہ ختم ہونے والی تنہائی میں، اکتا دینے والے اکیلے پن میں اسے شراب کے سوا کوئی ساتھی نہ ملا۔ اس دختِ رز کی صحبت اسے کچھ ایسی راس آئی کہ جب تک دن اور رات میں کئی بار اس کے لب نہ چوم لیتا، اسے اپنی زندگی ادھوری ادھوری محسوس ہوتی۔ وہ ایک عظیم جثے والا شخص تھا اور فطری طور پر اس میں مدافعت کی بے پناہ قوت تھی۔ اس لئے بعض اوقات وہ جتنا شراب کا عادی تھا اس سے زیادہ گھڑا پی جاتا، تب کہیں جا کر اس پر پورا نشہ طاری ہوتا اور جب سرور کی لہریں دماغ کے ان خلیوں تک پہنچتیں جن کا تعلق حواس سے ہے تو وہ اپنے کھوسے کو سرہانے رکھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور اپنی الجھی ہوئی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنے لگتا، آنکھیں دروازے سے باہر جھانکتی رہتیں اور اسی عالم میں اسے نیند آ جاتی۔

شراب مختلف آدمیوں پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کا سرور انسان کی چھپی ہوئی فطرت کو باہر لے آتا ہے ــــــ ایک بے وقوف آدمی شراب پی کر رونے لگتا ہے۔ کوئی کمزور دل پی لے تو اس میں شیطنت جاگ اٹھتی ہے۔ کسی کم حیثیت کے حلق میں اتر جائے تو وہ ذلیل اور گھٹیا حرکتوں پر اتر آتا ہے لیکن گلا را پیتا تھا تو اس پر ہو جاتا تھا اور اس کے ذہن میں دگیر اندھیرے پھیل جاتے تھے اور جب وہ سرور و بے خودی کے عالم میں اپنے سات فٹ لمبے بستر پر لیٹتا تو زندگی کی تمام مشکلات، تمام خوف اور تمام کٹھنائیاں، اس کے تشنہ اور سلگتے ہوئے محسوسات پر برسنے لگتی تھیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو راحت اور خوشی کا نام تک نہ جانتا تھا۔ اس کی زندگی ایک مسلسل مشقت تھی ــــــ تنہائیوں اور مشکلوں کے ہجوم میں گھری ہوئی مشقت ــــــ ایک ایسے فرہاد کی مشقت، جس کا پہاڑ دودھ کی کوئی نہر نہیں جاری کر سکا تھا ــــــ وہ ریگزار کا ہی ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی جس پر بھرے ہوئے بچھوؤں کے عقب سے سانپوں کے پھن جھانکتے تھے۔

اور جب ایک قبیلہ بیکانیر کے قحط سے بچ بچا کر سرحد پار کر کے مروٹ کے علاقے میں، شاہنو والے ٹیبے کے پانچ میل مشرق میں سرکنڈوں کے جھنڈ کے قریب ایک چھوٹے سے ٹوبے کے کنارے آباد ہوا تو ہمسائے ملنے کی خوشی میں گلا را اچھل پڑا اور اسے اپنی اتھاہ تنہائیاں سمٹتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن اتنا عرصہ اکیلا رہنے کی وجہ سے گلارے کی معاشرتی حس قدرے مرجھا گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے نئے ہمسائے بیکانیر کے علاقے میں گلارے کا شہرہ سن چکے تھے اور اس کی بے پناہ طاقت، عظیم جثے، خاموش طبیعت اور جھکی ہوئی گھنی پلکوں سے خوف کھاتے تھے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ اس کے قریب آتے، اس سے دور دور رہنے لگے، اور گلا را ان کے لئے کئی پردوں میں چھپا ہوا ایک بھید اور دلوں کو لرزانے والی ایک دہشت بن کر رہ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو اس کے جثے، طاقت اور شراب کی عجیب و غریب، خوفناک کہانیاں سنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک رات شراب کے نشے میں دُھت، گلا را گیدڑ کے شکار کے لئے صحرا میں نکلا، اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اس کی آنکھیں بیلوؤں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ راستے میں کریر کی ایک بڑی سی جھاڑی میں ایک صحرائی نیل گائے چھپی کھڑی تھی۔ گلا را نشے میں اس جھاڑی میں جا الجھا۔ خوفزدہ نیل گائے نے گھبرا کر ایک ایسی بھرپور دولتی جھاڑی کہ اس کے دونوں کھر گلارے کے ماتھے پر لگے اور خون بہہ نکلا۔ گلا را ایک لمحے کے لئے تو لڑکھڑا گیا لیکن پھر سنبھل کر اس نے نیل گائے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں اور انھیں اپنے سینے کے ساتھ سختی سے بھینچ لیا۔ اب نیل گائے ٹانگیں چھڑاتی تھی اور گلا را چھوڑتا نہ تھا۔ یوں رات بھر حیوانی طاقت، انسانی طاقت سے نبرد آزما رہی۔ اور جب اگلے دن قبیلے کا ایک کمسن لڑکا حسنِ اتفاق سے اس راہ سے گزرا تو اس نے یہ منظر دیکھا کہ گلا را بڑے اطمینان سے نیل گائے کی پچھلی ٹانگیں اپنے سینے سے بھینچے پڑا سو رہا تھا۔ نیل گائے اپنی اگلی ٹانگوں پر جھکی ہوئی تھی اور مارے خوف کے اس کا پورا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے تیز ہوا میں سوکھا پتہ کانپتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس واقعے کے بعد صحرائے مروٹ میں پھر کبھی کوئی نیل گائے نہیں دیکھی گئی ــــــ گلارے کے بارے میں یہ کہانی آج بھی مروٹ کے ویرانوں

میں گونجتی ہے اور وہاں کی مائیں اپنے بچوں کو گلارے کے نام سے ڈراتی ہیں۔

چنانچہ اس قبیلے کی آمد بھی گلارے کی تنہائیوں کو ختم نہ کر سکی۔ وہ اسی طرح اکیلا اکیلا رہا اور اس کی دماغی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔

صحرائے مروٹ میں موسم بہار بس یوں آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ رات میں بجلی کا کوندا لپکے اور غائب ہو جائے۔ بہار کا یہ مختصر سا وقفہ ہی اپنے ساتھ ایسے چند لمحے لاتا ہے جب مروٹ کے باسیوں کو عشق لڑانے، گیت گانے، رقص کرنے اور پرانی اور نئی دشمنیاں چکانے کی فرصت نصیب ہوتی ہے ——— ایسے ہی ایک موسم بہار کی دلنواز سی صبح کا ذکر ہے کہ اس قبیلے کے دو خاندان کسی پرانے جھگڑے کی بنا پر باہم ٹکرا گئے ——— ٹکموں کی دھاریں تیز ہوئیں، سر پھٹے، ماتھے زخمی ہوئے اور صحرائی بہار کی رعنائیوں میں انسانی خون کی مہک رچ گئی ——— اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ایک خاندان قبیلے سے الگ ہو کر شاہنو والے ڈوبے کے شمال میں ایک اور چھوٹے سے ڈوبے کے کنارے آ بسا ——— یہ ڈوبہ شاہنو والے ڈوبے سے چند گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے کناروں پر کریر کے گھنے جھنڈ تھے۔ اس خاندان نے گلارے کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا اور اس کی گھٹن تنہائیاں میٹھی میٹھی پہلیوں سے آشنا ہو گئیں

یہ خاندان تین افراد پر مشتمل تھا ——— بڈھا یاسن، اس کی بیوی گوری اور اس کی نوجوان بیٹی شاکی ——— یاسن ہر وقت اتنی شراب پیئے رہتا تھا کہ کسی سے محبت کرنے یا خوف کھانے کا اسے ہوش ہی نہیں ہوتا تھا۔ گوری اس قدر باتونی اور گپ شپ کی اتنی رسیا تھی کہ اس چسکے کی تسکین کے لئے وہ آدمی تو رہا ایک طرف، بھوت سے بھی ملاقات کرنے کو تیار رہتی تھی۔ اور شاکی عمر کے اس دور میں تھی جب جوانی کی بدمستیاں کسی خوف کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ گلارے کی ہیبت ناک شخصیت کی دھاک، کچھ تو اپنی افتاد طبائع کی وجہ سے ان پر پہلے ہی کم تھی اور جو تھوڑی بہت تھی وہ قبیلے سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی چنانچہ گلارے کو ان سے میل جول بڑھانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ سر شام ہی وہ ان کے ڈوبے پر چلا جاتا۔ وہ اور یاسن مل کر شراب پیتے۔ یاسن بلا نوش اور کم گو آدمی تھا۔ شراب جونہی اس کے دماغ کو چڑھتی وہ اینٹا غفیل ہو جاتا۔ گوری پہلے ہی موقعے کی تاک میں ہوتی۔ یاسن کے رخصت ہوتے ہی وہ گلارے کے پاس آ بیٹھتی اور پھر باتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا کہ رات ڈھلنے پر بھی ٹوٹنے میں نہ آتا۔

دن گذرتے رہے۔ بیکانیر میں قحط کی ہولناکیاں اتنی بڑھ گئیں کہ انسان تو انسان، ہرن، گیدڑ اور دوسرے صحرائی جانور بھی سرحد عبور کر کے قافلہ در قافلہ مروٹ کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ بیکانیر میں تین برس سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ ٹوبوں کا پانی سوکھ گیا تھا اور درختوں اور جھاڑیوں کی جڑیں تک خشک ہو گئی تھیں۔

اس اثنا میں کئی قبیلے ہجرت کر کے مروٹ میں آ چکے تھے۔ شاہنو والے ڈوبے کے آس پاس ان قبیلوں نے کئی ڈھوکیں آباد کر لی تھیں اور وہ علاقہ جو صدیوں سے سنسان پڑا تھا انسان کی آوازوں سے گونجنے لگا تھا۔ وہ ڈوبہ جس کے کنارے چند ماہ پیشتر، صرف یاسن، اس کی بیوی اور بیٹی نے ایک جھونپڑی تعمیر کی تھی، اب کئی جھونپڑیوں سے گھر گیا تھا۔ وہاں دو قبیلے اور آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس ڈوبے کو شاہنو والے ڈوبے سے زیادہ وسیع کر لیا تھا اور یاسن چونکہ اس ڈوبے کا پہلا آباد کار تھا، اس لئے اس کا نام یاسن والا ڈوبہ مشہور ہو گیا تھا اور اس کے کنارے ابھرنے والی جھونپڑیوں کی یہ آبادی یاسن ڈھوک کے نام سے موسوم ہو گئی تھی۔ یاسن ڈھوک نے ایک اکائی کی صورت اختیار کر لی تھی اور یاسن کا خاندان بھی، اپنے آبائی قبیلے کو بھلا کر اس اکائی میں مدغم ہو گیا تھا۔

گلارا بدستور یاسن کے ہاں آتا تھا، شراب اُڑتی تھی اور رات ڈھلنے تک گپ شپ کی پھلجھڑیاں چھوٹتی تھیں۔ ہوتے ہوتے پوری یاسن ڈھوک میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ گلارا یاسن کی بیٹی شاآلی پر عاشق ہے اور اس سے شادی کرنے والا ہے —— ڈھوک کی تمام نوخیز لڑکیاں، شاآلی کو گلارے کا نام لے لے کر چھیڑتیں اور کہتیں کہ یہ بڈھا گیدڑ پہلی رات ہی تیرا انجر پنجر ڈھیلا کردے گا۔ اس پر شاآلی فحش گالیاں بکنے لگتی۔

اس میں شک نہیں کہ گلارا شاآلی پر عاشق تھا لیکن اس نے آج تک کبھی شاآلی سے براہِ راست گفتگو نہ کی تھی اور نہ کبھی تنہائی میں اس سے ملا تھا۔ وہ آتا تو خاموشی سے یاسن کے ساتھ شراب پیتا، یا اس کی بیوی سے گپیں ہانکتا اور کبھی کبھی چور نظروں سے شاآلی کو دیکھ لیتا۔ اس منزل سے آگے اس نے کبھی قدم نہ بڑھایا۔ بس یہی چور نظریں تھیں جن کو شاآلی کی شریر سہیلیوں نے بھانپ لیا تھا اور اس کے عشق کا راز پوری ڈھوک میں پھیل گیا تھا۔

ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی۔ لوگوں نے پر کے کوّے بنالیے اور ڈھوک کے وہ نوجوان جو رات دن اپنے خوابوں کے آسمان پر، چھیچھے پتنگوں کی طرح شاآلی کی جوانی کے بلند پرواز پرندے کے پیچھے ڈول رہے تھے، رقابت کی آگ میں جلنے لگے۔ ایک دن کسی منچلے نے سرِ عام گلارے پر بڈھی گھوڑی، لال لگام کی پھبتی کس دی بس پھر کیا تھا۔ گلارے کا پرانا وحشی پن عود کر آیا اور اس نے اس منچلے کو سر سے اوپر اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ موت سے تو بچ گیا لیکن ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور وہ ساری عمر کے لئے چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ کے لئے لڑکوں کے تو کان ہوگئے، مگر شاآلی گلارے سے بدظن ہوگئی جس بات کو وہ اب تک شریر سہیلیوں کا مذاق سمجھتی تھی، اس واقعہ نے اس کی تصدیق کردی تھی۔ اس کی مغرور جوانی نے پھن اٹھایا اور پھنکار پھنکار کر کہا —— میں ایسی ناگن نہیں کسی بڈھے سانپ کی آغوش گرم نہ کروں گی۔ یہ میرے جوان خون کی توہین ہے۔ چنانچہ اس نے ڈھوک کے ایک پھرتیلے جسم والے گبھرو سے پینگیں بڑھالیں —— اس گبھرو کا نام میرن تھا اور گیدڑ اور ہرن کا شکار کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

میرن اور شاآلی کی راہ و رسم کچھ ہی دنوں میں اس درجے تک پہنچ گئی کہ وہ صحرا کے تنہا تنہا گوشوں میں چھپ چھپ کر ملنے لگے، اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے درمیان انھوں نے ہمیشہ کے لئے ایک ہوجانے کے وعدے کر لئے۔ مگر جب بوڑھی چور نظریں نہ چھپ سکیں تو جوان سرگوشیوں کو پھیلنے سے کون روک سکتا تھا!

شاآلی کی اس بے رخی، بلکہ انتقامی کارروائی سے گلارے کے دل پر بڑے کاری زخم لگے تھے۔ اس کی تنہائیاں اور خاموشیاں لوٹ آئی تھیں اور اس کی پوری زندگی میں یہ پہلا مرحلہ آیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس سمجھا تھا۔ اس نے تمام عمر موسم کی سختیوں اور زندگی کی مشقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن عورت کی ستم رانیوں سے اسے پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔ اس سے پہلے اسے معلوم ہی نہ تھا کہ من چاہی عورت کا حصول، گیدڑ اور ہرن کے شکار سے زیادہ محنت طلب اور زیادہ مشکل ہے۔ وہ جب جوان ہوا تھا اور اس کے جسم نے عورت کی ضرورت محسوس کی تھی، تو عزیز و اقربا نے خود بخود اس کے تنہا تنہا لمحوں کی عماری میں تنے ہوئے اعضاء والے ایک آبنوسی بدن کو دھکیل دیا تھا —— وہ تنے ہوئے اعضاء والا آبنوسی بدن اس کے جسم کی پکار کا جواب تھا اور شاآلی اس کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھنے والی صدا تھی —— جسم کی پکار کے جواب کو بیکانیر کا قحط چاٹ گیا تھا اور دل کی صدا نے ایک غیر جوانی سے ناطہ جوڑ لیا اور خنجر بن کر خود دل پر برسنے لگی —— گھاؤ لگانے —— اس نے یاسن ڈھوک آنا ترک کردیا تھا۔ وہ سارا سارا دن اپنی جھونپڑی میں بند پڑا رہتا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اکیلے میں وہ کیا کرتا ہے اور کیا سوچتا ہے۔ مگر یاسن ڈھوک کے لوگوں کو یقین تھا کہ گلارے کے ہاتھوں میرن موت کے گھاٹ اُترے گا یا پھر شاآلی کی خیر نہیں۔

یہ باتیں شاآلی کی ماں گوری کے کانوں تک پہنچی تھیں —— ایک شام وہ گیدڑ کا گوشت بھون رہی تھی کہ اس نے گنگناتی ہوئی شاآلی سے کہا۔ امبڑی کیتی تھیوے[1] اس بھیں میرن کے ساتھ تیرے تعلقات کہیں تیرا انجام بد نہ کریں۔ اس کے علاوہ بھی کئی آدمی ہیں جن کے ساتھ تو شادی کر سکتی ہے۔

---

[1] امبڑی کیتی تھیوے ۔۔۔۔ ماں مر جائے، ماں قربان ہو۔ مروٹ کے لوگوں کا عام تکیہ کلام

شالی نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور چلا کر بولی "میں کسی ذال سرے[1] سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ باقی رہا میرن تو جب تک اس کا جسم پھرتیلا ہے اور جب تک وہ ایک دن میں کئی گیدڑ اور ہرن شکار کر سکتا ہے میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ معلوم ہے جب میرن کے ساتھ میرا تعلق نہیں تھا تو ہمیں گیدڑ اور ہرن کا شکار کرنے میں کتنی مشکل پیش آتی تھی؟ کئی راتیں ایسی گذریں کہ ہمیں بھوکا سونا پڑا۔ بابا کو تو دارو نے ناکارہ کر دیا ہے۔ وہ شکار کرنے جاتا ہی نہیں۔ اور اب ہمیں بغیر کسی مشکل کے بیٹھے بٹھائے ہر روز ایک ہرن یا گیدڑ مل جاتا ہے۔"

"یہ تو تیری بات ٹھیک ہے۔ مگر تو جو شادی کے بغیر میرن کے ساتھ رہتی ہے، تیرے اگر بچے ہو گئے تو کیا کرے گی؟ کون سنبھالے گا انھیں پہلے ہی کھانے کو نہیں ملتا۔ ایک اور مصیبت۔ کبڑی ہو گئی تو بالکل بھوکے مر جائیں گے۔ بیکانیر میں جیبی کا انجام پتہ ہے کیا ہوا تھا؟ ڈوبے میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ اور پھر گلارے کو تو اچھی طرح جانتی ہے ـــــ وہ ضد میں آ کر ہم سب کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔"

گلارے کے ذکر پر شالی چڑ گئی "بس رہنے دے امڑی اپنے گلارے کو۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ سارے بیکانیر اور مروٹ کی طاقت اسی میں آ گئی ہے اونہہ ...... بھیں"

اور گالی ابھی شالی کے منہ میں ہی تھی کہ گلارا جھونپڑی کی چوکھٹ میں نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

شالی کی ماں کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آنے لگا اور اس کا رنگ کیکر کے پھولوں ایسا زرد پڑ گیا۔ اور گیدڑ کا گوشت بھونتے بھونتے اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مگر اس نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کی اور کہنے لگی "آ بھئی گلارے، تینڈی جندڑی ول ول وڈھی تھیوے[2]۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھی پتہ نہیں کون ہے ـــــ یاسن پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے ـــــ ابھی تو یہیں تھا ـــــ پر تو وہاں کیوں کھڑا ہے ـــــ؟ اندر آ کر بیٹھ جانا۔"

گلارا اسی طرح خاموش اور شانت، اندر آ کر لوتی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر شالی کو نہ دیکھا ـــــ اس کے سخت اور کھردرے بال الجھے ہوئے تھے اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے کالے ہرن کی کھال کا کرتہ پہن رکھا تھا اور اس کی داڑھی میں شاہ ہنو ولے ٹوبے کے کناروں پر اگنے والی نرم گھاس کی پتلی پتلی خشک ڈنٹھلیں الجھی ہوئی تھیں ـــــ وہ شاید آج کئی روز کے بعد بستر سے اٹھا تھا۔ شالی اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر ہولے ہولے ہنسنے لگی ـــــ گلارے کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ لیکن اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔

اتنے میں کہیں سے یاسن بھی شراب کے نشے میں دھت، جھومتا جھامتا آ گیا۔ اسے دیکھ کر گلارا اٹھ کھڑا ہوا۔ یاسن نشے میں واہی تباہی بک رہا تھا گلارے نے اس کا بازو تھام لیا اور پرسکون لہجے میں کہنے لگا "یاسن سنو۔ میں آج اس لئے آیا ہوں کہ تم مجھ سے اپنی بیٹی کی شادی کر دو۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ شالی کو میں آج ہی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"آج ہی؟" یاسن نے ہچکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میں کل یا پرسوں تک انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اکیلا رہتے رہتے تنگ آ گیا ہوں۔"

یاسن اپنے لرزتے ہوئے جسم کو سنبھال کر دھاڑا "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ایک شرابی کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہتا کر دوں گا؟ اس آدمی کے ساتھ جو سانپ کھاتا ہے، کچی دارو پیتا ہے ـــــ باہر ہو میرے گھر سے۔ ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا ـــــ تیری ذال کو ...... باہر ہو" یہ

---

[1] ذال سرا ...... عورت کا دیوانہ، عورت کے پیچھے پیچھے پھرنے والا، زن مرید۔

[2] تینڈی جندڑی ول ول وڈھی تھیوے ...... تیری زندگی بیل کی طرح دراز ہو۔

کمہ کر یاسن ہچکیاں لیتا ہوا، لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

گلارے نے یاسن کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی پرسکون انداز میں شالی کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر، اس کا گداز بازو اپنی مضبوط انگلیوں میں جکڑ کر کہنے لگا "یہاں سے جو کچھ لینا ہے لے لے اور چل میرے ساتھ۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ بابا کی طرح آج تو نے بھی کچھ زیادہ دارو پی لی ہے ـــــ تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے بڈھے؟"

"اگر تو خود نہیں چلے گی تو میں تجھے اٹھا کر لے جاؤں گا ـــــ بہتر یہی ہے کہ چپ چاپ میرے ساتھ چلی آ۔" گلارے کا لہجہ ویسا ہی شانت اور پرسکون تھا۔

شالی نے قریب پڑی ہوئی لاٹھی گلارے کو مارنے کے لئے اٹھائی، لیکن گلارے نے اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر یکایک اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے اپنے کندھے پر اٹھا لیا ـــــ شالی اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی، چیخ رہی تھی، گالیاں بک رہی تھی۔ یاسن زمین پر پڑا ہچکیاں لیتا رہا، گوتی چولھے کے قریب بیٹھی بین کرتی رہی، اپنا سر پیٹتی رہی، اور گلارا شالی کو اپنے کندھے پر اٹھائے جھونپڑی سے نکل گیا۔

آہستہ آہستہ شالی کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو گلارے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یاسن کی ہچکیاں اور گوتی کے بین دور ہوتے گئے اور شالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ گلارا اسے کہاں لئے جا رہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ لٹک کر گلارے کی توانا چھاتی پر جھول رہا تھا اور اس کے کانوں میں ہوا ہلکی ہلکی سیٹیاں بجا رہی تھی۔

گلارا شالی کو اپنے کندھے پر سختی سے بھینچے، اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ ہوا کے دباؤ سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں اور سانس رکا جاتا تھا۔

جب وہ اپنی کٹیا میں پہنچا تو اس نے شالی کو آہستگی سے کندھے سے اتار کر ریت اور گھاس کے بستر پر بٹھا دیا ـــــ شالی کے گھنیرے بال بکھر گئے تھے، اور اس کے تمتماتے ہوئے، سانولے رخساروں پر آنسوؤں کے داغ تھے اور اس کا گداز جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا ـــــ گلارے نے اس سے کوئی بات نہ کی اور چپ چاپ چولھے میں آگ سلگانے لگا۔ آگ سلگا کر وہ شالی کے قریب آ گیا اور اس کے لرزتے جسم کو وحشی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ پھر اس نے کھونٹی سے سانپ کی دو خشک کھالیں اتاریں اور ان سے شالی کے ہاتھ پیر باندھ کر جھونپڑی سے باہر، شام کے گہرے دھندلکوں میں غائب ہو گیا۔

شالی کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ بھاگنے کا تصور کرنا بھی فضول تھا۔ وہ اتنی حساس نہ تھی کہ اپنے غرور کے چکنا چور ہو جانے پر آنسوؤں کی لڑیاں پروتی رہتی۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ گلارے کے بس میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بغاوت کے آخری شعلے بجھ رہے تھے اور وہ یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو تسکین دے رہی تھی کہ قسمت تو محض ساتھ کا ہے، میرن کا ساتھ نہیں تو گلارے کا ساتھ سہی ـــــ وہ تھک چکی تھی، اس کی کمر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے از حد کاہلی کے ساتھ سر اٹھا کر جھونپڑی کے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ ماحول ایک ایسے شخص کے رہن سہن کا مکمل غماز تھا جو برسوں تنہا اور اداس رہا ہو۔ شالی کے دل میں اس شخص کے لئے ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا ہوئے اور اس نے زیر لب اپنے آپ سے کہا "بے چارہ!"

پھر اس کے خیالوں کا رخ میرن کی طرف مڑ گیا۔ "اگر میرن کو اس تمام واقعے کا پتہ چل گیا تو وہ کیا کرے گا؟ ـــــ اونہہ ـــــ کرنا کیا تھا ـــــ بھلا اس کا اور گلارے کا کیا مقابلہ ـــــ گلارا اگر انگلی لگا دے تو زال سڑے کی ہڈیاں چٹخنے لگیں!"

لمحے تھکے تھکے انداز میں گذرتے رہے ـــــ گلارا ابھی تک واپس نہ آیا تھا اور شالی ایک الجھن محسوس کر رہی تھی۔ شام کے دھندلکے رات کے سایوں میں ڈھل گئے تھے۔ یہ ایک پُراسرار اور ڈراؤنی رات تھی۔ دور کہیں گیدڑ بول رہے تھے اور فضا میں وہ سکوت اور حبس تھا جو مروٹ میں طوفان

گردوباد کی آمد کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ تب پہلی مرتبہ اس کی نظر سانپوں کی ان خشک کھالوں پر پڑی جو کھونٹی پر لٹک رہی تھیں۔

"گلارے ـــــ گلارے" اس نے خوف سے لرزتے ہوئے زور زور سے پکارا لیکن اس کی آواز صحرا کی بیکراں وسعتوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

"گلارے ـــــ گلارے" اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب چیخ چیخ کر روئے۔ معاً جھونپڑی کے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحوں کے بعد گلارا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی میں ریت کے نقرئی ذرے چمک رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، روشنی کر دو۔"

گلارے نے چولہے میں مزید خشک جھاڑیاں جھونک دیں۔ آگ بھڑک اٹھی اور جھونپڑی کی بے ہنگم دیواروں پر روشنیاں اور سائے مل جل کر رقص کرنے لگے ـــــ گلارا پھر جھونپڑی سے باہر آگیا اور "عقب میں" ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دوبارہ شالی کی آواز سنی۔

"اب کیا ہوا ہے تجھے؟" اس نے اندر آکر پوچھا۔

"مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے ـــــ اچھا میں یاسن ڈھوک سے تیری ماں کو بلا لاتا ہوں۔" وہ جانے کے لئے اٹھا۔

"نہیں رہنے دے اسے، وہ نہیں آئے گی۔

"آئے گی کیسے نہیں، میں لے آؤں گا۔"

"نہیں، نہیں، اگر وہ آ بھی گئی تو نال سڑی بین کر کر کے ناک میں دم کر دے گی۔"

"اچھا تو تیرے باپ کو بلا لاتا ہوں۔"

"نہیں مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں صرف تجھے چاہتی ہوں۔" اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور آواز اتنی مدھم تھی کہ گلارے کو اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے جانا پڑا تھا۔

ایک لمحے کے لئے گلارا سحر زدہ سا، خاموش کھڑا رہا اور پھر اس کے حلق سے غرغراہٹ سی نکلی۔ شالی نے گھبرا کر اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں ـــــ گلارا زنگدار رکابی کے سامنے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ اس کا سات فٹ لمبا مضبوط جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا اور اس کی گھنی داڑھی میں آنسوؤں کے قطرے جذب ہو رہے تھے۔

حسین شاہد

چور

فاطمہ دلہن کو دیکھ کر حویلی والوں کے گھر سے باہر نکل رہی تھی کہ اسے نکلنے کے کمرے میں کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ اچانک اس کی زبان پر "ہائے کیمہ ہے!...." کے الفاظ آگئے لیکن اس سے آگے اس نے زبان کو اپنی بتیسی میں بند کر لیا جیسے چلتی کار کو اچانک بریک لگا دی جائے اور کار کے پہیوں سے چیخ سی نکل کر رہ جائے۔

فاطمہ ایک لمحے کے لئے اپنے پاؤں پر تھم گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی جب اسے اطمینان ہو گیا کہ نہ تو کسی نے اس کی آواز سنی ہے اور نہ اس وقت اسے کوئی دیکھ رہا ہے، اس نے دو ڈگ بھرے اور اس چمکنے والی چیز کے سر پر پہنچی۔ ایک دفعہ پھر آنکھوں کا سہارا لیا اور جھک کر وہ چیز اٹھائی۔

"سونے کی انگوٹھی؟" فاطمہ کو یوں لگا جیسے وقت کی کمانی ٹوٹ گئی ہو اور وہ تڑاخ سے پانچ برس پیچھے جا گرا ہو۔

آج سے پانچ برس پہلے جب فاطمہ اس گاؤں کی بہو بن کر آئی تھی تو پہلے ہی روز نلکے پر ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی ایک انگوٹھی گر گئی تھی سسرال والوں نے اسے برا شگون اور فاطمہ کو منحوس سمجھا تھا۔ اس کی ساس تو آج تک اسے اس بات کا طعنہ دیا کرتی تھی کہ انگوٹھی تو مکا دنے نہ جانے کسی یار کو دی تھی اور بہانہ کر دیا کہ گم ہو گئی ہے۔ غضب خدا کا کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ ہاتھ سے انگوٹھی گر پڑے اور جس نے پہن رکھی ہو اسے پتہ بھی نہ چلے!

فاطمہ کے پاس اس طعنہ کا کوئی جواب نہیں تھا جواب تھا بھی تو وہ اس کی زبان پر نہیں آ سکتا تھا۔ اگر اس کی ساس اپنے بیاہ کا زمانہ یاد کرنے کی تکلیف کر لیتی تو ممکن تھا اسے جواب خود بخود مل جاتا کہ ان دنوں تو لڑکی اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوتی ہے۔ وہ تو ایک گٹھڑی سی ہوتی ہے جسے کبھی سسرال والے اٹھائے جاتے ہیں اور کبھی میکے والے۔ ماں باپ اسے ڈولی میں ڈالتے ہیں تو اسے یوں لگتا ہے جیسے اندھیرے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ اس وقت تو اگر کسی لڑکی کے حواس قائم بھی ہوں تو اسے بھی مصنوعی گھبراہٹ ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت تو لڑکی کی زندگی ایک زندہ موڑ پر پہنچی ہوتی ہے، جہاں اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ موڑ کی دوسری جانب کھڑا ہوا اجنبی زندگی بھر کا ساتھی بنے گا یا زندگی بھر کے لئے ساتھی سے محروم کر دے گا۔

جب زندگیوں کا سودا ہو رہا ہو تو انگوٹھیوں کا ہوش کسے ہوتا ہے۔ یہ وقت ہر لڑکی پر آتا ہے لیکن پنجاب کی ہر لڑکی جب بہو سے ساس کی منزل پر پہنچتی ہے تو اس وقت کو بھول جاتی ہے۔ کل ساس کے پاس طعنوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور آج فاطمہ کے پاس کوئی نہیں...... لیکن بات تو انگوٹھی کی ہو رہی تھی! وہ انگوٹھی جو پانچ برس پہلے فاطمہ کے ہاتھ سے گر گئی تھی یا وہ انگوٹھی جو اسے پانچ سال بعد حویلی والوں کے گھر سے ملی تھی جس نے وقت کو پانچ سال پیچھے دھکا دے دیا تھا۔

انگوٹھی کو فرش سے اٹھانے والا لمحہ فاطمہ نے عدالت میں گزارا۔ انگوٹھی میری ہے یا حویلی والوں کی دلہن کی؟ عدالت کا

وقت ختم ہو گیا۔ فاطمہ نے کہا انگوٹھی میری ہے۔ اس نے انگوٹھی ٹب میں اڑس لی اور حویلی سے باہر آ گئی۔

فاطمہ کا گھر حویلی سے زیادہ دور نہیں۔ دو دن میں کئی کئی دفعہ اٹھتے بیٹھتے حویلی والوں کے ہاں سے ہو آیا کرتی تھی بس دونوں گھروں میں اونچی سی ایک صدا کا فاصلہ تھا لیکن آج حویلی سے گھر کو جاتے ہوئے فاطمہ نے محسوس کیا کہ وہ اپنے جنم دن کو حویلی سے چلی تھی اور آج گھر پہنچی ہے۔

راستے میں نواب بی بی "اونچے دیر بڑے والی" کا مکان پڑتا تھا فاطمہ کا معمول تھا کہ وہ گزرتے ہوئے نواب بی بی کے ہاں ضرور جھانکتی۔ اگر نواب بی بی سامنے آنگن میں نظر آتی تو اس سے بھی ایک آدھ بات ہو جاتی آج اگرچہ نواب بی بی کا دروازہ بھی کھلا تھا اور وہ سامنے ہی بیٹھی تھی اور فاطمہ نے بھی اس کے ہاں جھانکنے کی کوشش کی لیکن جیسے اس کی گردن اکڑ گئی اور وہ جلدی سے آگے گزر گئی۔ نواب بی اس خلافِ معمول حرکت پر حیران ہوئی اور اپنے دروازے میں دروازے میں پہنچ کر فاطمہ کو پکارا۔

نواب بی بی کی آواز نے فاطمہ کے تن سے لباس نوچ لیا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نواب بی بی کہہ رہی تھی "نی آج تو یوں بھاگی جا رہی ہے جیسے کسی کا کچھ اٹھا لائی ہے۔"

فاطمہ کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ تو کیا نواب بی بی کو پتہ چل گیا ہے! لیکن یہ کم بخت وہاں تھی ہی کہاں! خدا جانے یہ اپنے گھر سے برآمد ہوئی ہے یا حویلی سے میرا پیچھا کر رہی ہے! لیکن وہاں تو میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

فاطمہ نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور نواب بی بی کو جواب دیا "چاچی! بچہ رو رہا ہوگا، میں نے سوچا جلدی گھر پہنچوں۔"

"نی وے تیرا سانس کیوں پھول رہا ہے؟" نواب بی بی نے کہا اور فاطمہ کے لئے وہ چاچی نواب بی بی نہ رہی بلکہ انگوٹھی کی تفتیش پر مامور تھانیدارنی بن گئی۔

فاطمہ نے ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا "سانس کیوں پھولنے لگا۔ میں کتنی دیر سے حویلی والوں کے ہاں بیٹھی تھی۔ ان کی دلہن تو منہ سے کپڑا ہی نہیں ہٹانے دیتی۔ اب مجھے جلدی تھی کہ کہیں ماسی ناراض نہ ہو رہی ہو۔"

فاطمہ اپنی ساس سے بہت ڈرتی تھی۔ اس کا نواب بی بی کو بھی علم تھا اس لئے یہ بہانہ کچھ کام تو کر گیا لیکن نواب بی بی نے پھر بھی کہہ دیا "کڑیئے! چاہے مان یا نہ مان، پر آج کوئی بات ضرور ہے۔"

فاطمہ کو یقین ہو گیا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑی رہی تو نواب بی بی کی آنکھیں اس کے لباس سے پار ہو کر انگوٹھی دیکھ لیں گی، وہ جلدی سے چل پڑی اور جاتے جاتے کہتی گئی "چاچی تمہیں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ دکھتا ہی رہتا ہے۔"

فاطمہ نے گھر میں قدم رکھا تو عدالت دوبارہ لگ چکی تھی۔ انگوٹھی میرے پاس ہو کر بھی میری نہیں۔ اسے وہاں سے تو اٹھا لائی ہوں لیکن رکھوں گی کہاں میرے گھر کو ہر کونا ایک کھلی کتاب ہے جسے کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ انگوٹھی چھپانے کے لئے فاطمہ نے گھر کی جس جگہ کا بھی سوچا وہ اسے غیر محفوظ نظر آئی۔ اس کے سسرال کا مکان گاؤں کے بڑے بڑے مکانوں میں شمار ہوتا تھا لیکن آج فاطمہ کے لئے ہاتھ کی ایک انگوٹھی بڑی تھی اور مکان چھوٹا تھا۔ گاؤں میں کسی کا ذاتی کمرہ نہیں ہوتا کوئی پرائیویسی نہیں ہوتی۔ کسی کی ذات کسی وقت تنہا نہیں ہوتی ——

وقت ایک دفعہ پھر لڑھکا اور پانچ سال پیچھے جا گرا۔ فاطمہ کو خیال آیا کہ آج سے پانچ سال پہلے میں نے انگوٹھی گم کی تھی تو مجھے منحوس سمجھا گیا تھا۔ آج یہی حال حویلی والوں کی بہو کا ہوگا۔ فاطمہ نے ایک دفعہ فیصلہ کر لیا کہ ابھی جا کر حویلی والوں کو بتا دے لیکن عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے اور اب عزت اسی میں تھی کہ چوری کا مال ہضم کیا جائے۔

وقت تیزی سے گھڑی کے پنڈولم کی طرح پانچ پانچ سال کے جھٹکے لگاتا رہا اور فاطمہ کی ہڈیاں ٹوٹتی رہیں۔ اب انگوٹھی کے بارے میں

سوچنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے تہمد اتار کر شلوار پہن لی اور انگوٹھی کو نیفے میں اڑس لیا۔ دن کا باقی حصہ اس نے نیفے والے بچھو کے ڈنک سہہ سہہ کر گزارا۔

شام ہوئی تو فاطمہ کو ایک اور خیال آیا۔ یہ خیال اسے ہمیشہ شام کو آیا کرتا اور ہستی کا ایک جھولا جھلایا تھا لیکن آج یہی خیال اسے سولی پر لٹکا گیا۔ اپنے خاوند لال خاں کا خیال اگر رات کو لال خاں میری چارپائی پر آ گیا تو ...... نیفا! ...... انگوٹھی ...... بچھو!

فاطمہ بڑے گھر کی بیٹی اور اس سے بھی بڑے گھر کی بہو تھی۔ اس کی نظر میں اپنی ذات کا اتنا بڑا بت بنا ہوا تھا کہ اگر اس بت کے نام چوری لگ جائے تو دنیا میں قیامت آ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ آج فاطمہ دھرتی ماتا کی مثال بنی ہوئی تھی جس کی سطح پر سکون ہوتا ہے لیکن پیٹ میں لاوے ابل رہے ہوتے ہیں جو کسی وقت بھی باہر آ کر سطح کا سکون برباد کر سکتے ہیں لیکن اپنی لال خاں کی، اپنے باپ اور اپنے سسرال کی عزت کا خیال ہر لاوے کو روکے ہوئے تھا۔ لاوا ابلتا تو فاطمہ کے بظاہر خاموش ہونٹوں پر فریاد بکھر جاتی: "سچیا سائیاں! تیرے لئے کیا مشکل ہے۔ جو آج میری عزت بچا لے؟"

اور اسی کشمکش میں سچا سائیں اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ گاؤں کے چوکیدار کی صورت میں، جو گلی میں کھڑا منادی کر رہا تھا "بی بیو! بھینو! آج سویرے سویرے حویلی والوں کی ایک انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔ جو بیبیاں آج سویرے دلہن کو دیکھنے گئی تھیں وہ عشا کے بعد حویلی والوں کے گھر راکھ کی جھولیاں ڈالیں۔ اگر انگوٹھی اس طرح نہ ملی تو کل حافظ غلام قادر صاحب لوٹا گھمائیں گے"

چوکیدار کے ایک ایک لفظ نے فاطمہ کے دل سے کئی کئی کانٹے کھینچ لئے۔

چوکیدار کا ڈھنڈورا نواب بی بی اچھے ویہڑے والی نے بھی سنا تھا اور سننے کے ساتھ ہی اسے سویرے والی بات یاد آ گئی۔ "بچیا! تو فاطمہ اس لئے گھبرائی ہوئی تھی۔ میں بھی کہوں کہ پہلے تو وہ جب بھی گلی سے گزرے میرے ہاں ضرور جھاتکا کرے لیکن آج! ...... آج اس کا بچہ رو رہا تھا اور اسے ماسی سے خوف آ رہا تھا۔" تکے نی بچا پھو! مینوں چارتی ویں؟"

نواب بی بی کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو حویلی والوں کی انگوٹھی فاطمہ ہی نے چرائی ہے لیکن دیکھنے والی بات تو اب یہ ہے کہ وہ اسے رات جھولی میں واپس کرتی ہے یا نہیں۔

عشا کے بعد فاطمہ نے جھولی میں راکھ اور راکھ میں انگوٹھی رکھ لی اور عدالت کو چل دی۔ آج اسے جھولیاں ڈالنے کی رسم کتنی پیاری لگ رہی تھی، اتنی پیاری جتنی نواب بی بی اچھے ویہڑے والی کو۔ وہ بھی فاطمہ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ فاطمہ راکھ کی جھولی خالی کر کے باہر آ رہی تھی تو نواب بی بی اندر جا رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس کے بعد گئی تھی۔ دونوں کا میل دروازے میں ہوا اور پلک جھپکنے میں فاطمہ باہر آ گئی اور نواب بی بی اندر چلی گئی۔

حویلی سے نکل کر فاطمہ یوں گھر کو بھاگی جیسے گائے رسا تڑا کر بھاگتی ہے۔ آج پھر حویلی اور فاطمہ کے گھر کا فاصلہ وہی ایک صدا کا فاصلہ بلکہ اس سے بھی کم تھا اور یہ راستہ چلتے ہوئے فاطمہ بچے کو جنم دینے والی تھکن اور خوشی محسوس کر رہی تھی۔

فاطمہ گھر پہنچی تو لال خاں کہیں سے آیا بیٹھا تھا۔ لال خاں سے اس کی یہ ملاقات کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن لال خاں کو کہاں معلوم تھا کہ آج اس کی فاطمہ نے کتنے جنم لئے اور کتنی موتیں مری۔ فاطمہ کا جی چاہتا تھا کہ لال خاں کے کان میں چپکے سے کہے: "بھیڑیا! تیری فاطمہ تو آج سویرے سویرے گم ہو گئی تھی اور تو کتنا بھاگوان ہے کہ تیری ہینگ لگی ہے نہ پھٹکڑی اور تیرے گھر میں آنے سے پہلے پہلے فاطمہ پھر تیری خدمت کے لئے حاضر ہے۔"

پھر فاطمہ لال خاں کی خدمت میں لگ گئی۔ اس نے یہ بھی معلوم کروانے کی تکلیف نہ کی کہ راکھ میں سے حویلی والوں کو انگوٹھی مل گئی یا نہیں۔ جیسی میٹھی نیند اسے آج آئی وہ خدا ہر ایک کے نصیب میں کرے۔ فاطمہ تمام رات جھولنا جھولتی رہی۔ صبح کو اٹھی تو اس کا بدن پھول کی طرح ہلکا تھا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھول جیسے کملا سا گیا۔ کسی نے خبر دی کہ رات گئے تک لوگ ڈھونڈتے رہے لیکن راکھ میں سے انگوٹھی نہیں ملی اس لئے آج حافظ صاحب لوٹا گھمائیں گے۔ فاطمہ کتنی دیر سوچتی رہی کہ جب وہ انگوٹھی راکھ میں چھوڑ آئی تھی تو پھر ملی کیوں نہیں۔ اسے افسوس ہوا کہ واپس کر دینے کے باوجود انگوٹھی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لیکن جلد ہی وہ اس واقعہ کو بھول گئی۔ اس نے سوچا مجھے اس سے کیا۔ میری عزت تو محفوظ ہی رہی۔ اب

انگوٹھی چرانے والی جانتے اور حویلی والے جانیں۔

جب جھولیوں والا منصوبہ ناکام ہو گیا تو حویلی والوں نے حافظ غلام قادر کی منت سماجت کی کہ وہ لوٹے پر کلام الٰہی پڑھیں تاکہ چور پکڑا جا سکے۔

جتنی عورتیں کل حویلی والوں کے ہاں گئی تھیں ان سب کے ناموں کی پرچیاں بنائی گئیں۔ حافظ صاحب نے پرچیاں لوٹے میں ڈال دیں۔ ایک طرف سے حافظ صاحب کی انگلی اور دوسری طرف سے حویلی والوں کے ایک مرد کی انگلی لوٹے کو تھامے ہوئے تھی۔ حافظ صاحب نے کچھ پڑھا، لوٹا پھر گیا۔

پرچیاں آدھی آدھی کی گئیں جن آدھی پرچیوں پر لوٹا پھر گیا۔ انہیں مزید آدھا آدھا کیا گیا۔ جیسے جیسے لوٹا گھومتا گیا لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے گئے۔ پرچیاں آدھی آدھی ہوتی رہیں۔ لوٹا گھومتا گیا اور اس طرح آخر کار ایک پرچی ایسی نکلی جس پر لوٹا گھوم گیا۔ یہی چور کی پرچی تھی۔

چور پکڑا جا چکا تھا اب مال برآمد کرنا حویلی والوں کا کام تھا حافظ صاحب کو اس سے دلچسپی نہ تھی۔ انہیں صرف اس سے غرض تھی کہ ایک طرف سے انگلی کا سہارا دے کر لوٹے پر کلام الٰہی پڑھیں، دوسری طرف سے حویلی والوں سے ایک مرد کا سہارا تھا اور لوٹا کلام کے زور پر گھومتا تھا۔

پرچی کھلنے لگی تو موقع پر موجود تمام مرد و زن پسینے میں ڈوب گئے۔ سانس ان کے گلے میں اٹکے ہوئے تھے۔ اور دن ہونے کے باوجود سب کو تارے نظر آ رہے تھے۔ اطمینان تھا تو صرف فاطمہ کے دل میں۔ اس کا دل سچائی کے نور سے جگمگا رہا تھا لیکن جب پرچی کھلی تو لوگوں کے سانس اوپر کے اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ انکشاف حال گاؤں کی تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ تھا۔

پرچی فاطمہ زوجہ لال خاں لکھا ہوا تھا!

لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پرچی پر فاطمہ کا نام ہو سکتا ہے

ایک آواز آئی "گل من دیج نہیں آوندی"

دوسری آواز آئی "مال ویکھ کر اچھے اچھوں کا دل ڈول جاتا ہے"

ایک اور آواز آئی "ایسی بیٹیاں پیدا ہوتے ہی مر جائیں تو اچھا ہے"۔

بھانت بھانت کی بولیاں، بھانت بھانت کی باتیں آج سارا گاؤں بول رہا تھا اور فاطمہ خاموش تھی۔ ایک بت کی طرح ساکت اور خاموش! بت جو گر گیا تھا اور گرنے کے بعد اس پر ایک خوفناک زخم آیا تھا۔

"فاطمہ! آگے آ جاؤ" کسی نے آواز دی

فاطمہ پل صراط پر دو تین قدم چلی اور آگے آ گئی۔

"اگر تم انگوٹھی واپس کر دو تو ہمیں تم پر کوئی گلہ نہیں۔ بیٹیاں سب کی ایک جیسی ہوتی ہیں" حویلی والوں میں سے کسی نے کہا۔

"شاوا شے" مجمع نے کورس گایا۔

فاطمہ کی زبان یوں حرکت میں آئی جیسے کسی نے غلطی سے بھری ہوئی بندوق کا گھوڑا دبا دیا ہو "لوگو میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے انگوٹھی اٹھائی ضرور تھی لیکن چھوٹی ڈالتے ہوئے اسے راکھ میں پھینک آئی تھی۔ اب میرے پاس کچھ نہیں"

تھوڑی دیر کے لئے مجلس کو سانپ سونگھ گیا اور پھر جس آواز نے سب سے پہلے قبرستان کی اس خاموشی کو توڑا وہ نواب بی بی اچھے ویہڑے والی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "فاطمہ! کیسی باتیں کر رہی ہے، جو ایک دفعہ چیز چرا لے وہ اسے کبھی واپس نہیں کرتا...... اور پھر تو خدا کے کلام کو جھٹلا رہی ہے"

سعد شمیم

معافی

جمعہ کا دن تھا۔ کرامت بابو مسجد کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے یہ سوچ کر بہت مطمئن ہوئے کہ ان سے زیادہ خوش شاید اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کسی قسم کی فکر نہیں۔ دراصل قناعت نے انھیں تمام فکروں سے نجات دلا دی تھی جس کے لئے وہ خدا کا شکر بجالانے باقاعدہ ہر جمعہ کو مسجد جاتے تھے۔

انھوں نے دونوں پاؤں مسجد کے پکے فرش پر رکھے اور جھک کر اپنا پرانا ربر کا جوتا اٹھا لیا ـــــ ہر چند کہ وہ پرانا ہو گیا تھا لیکن ابھی تو وہ آئندہ برسات تک کے لئے کافی تھا۔ برسات میں وہ ہمیشہ ربر کا جوتا استعمال کیا کرتے تھے۔ اب مثلاً اسی برسات میں اگر یہ جوتا نہ ہوتا تو انھیں کتنی پریشانی ہوتی۔ چمڑے کا جوتا تو پانی لگتے ہی خراب ہو جاتا ہے ـــــ یہ ربر کا جوتا بھی کتنا مفید ہوتا ہے ـــــ کیچڑ لگی، دھو لیا ـــــ پھر صاف ستھرا ـــــ انھوں نے جوتے کو اٹھا کر غور سے دیکھا، کافی گندہ ہو گیا تھا گھر سے مسجد تک آتے آتے۔ راستہ بھی تو بالکل خراب تھا۔ کیچڑ سے بھرا ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں! کوئی بستر پر تو رکھنا نہیں ہے ـــــ اور یہاں تو اسے کسی حالت میں چھوڑا نہیں جا سکتا خاص کر جمعہ کی نماز میں۔

انھوں نے نہایت احتیاط سے بائیں ہاتھ میں جوتا پکڑا اور آگے کی صفوں کی طرف بڑھنے لگے۔ خطبہ شروع ہو چکا تھا ـــــ آج تو سچ مچ بڑی دیر ہو گئی۔ انھیں بڑا افسوس ہوا۔ ہفتے میں ایک دن تو نماز پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے، وہ بھی اگر ٹھیک سے نہ پڑھی تو لعنت ہے مجھ پر بھی۔ انھوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کی ـــــ دیوار کے قریب پہنچ کر انھوں نے اپنا جوتا رکھ دیا اور کسی طرح جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگوں نے تھوڑا سا منہ بنا کر انھیں دیکھا اور کسمسا کر خاموش ہو گئے۔

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انھوں نے حسب معمول اپنے جوتے کی طرف نظر کی تو چونک اُٹھے! غلطی سے انھوں نے اپنا غلیظ جوتا ایک سفید براق سے سلیم شاہی جوتے پر رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے اس بے گناہ کا دامن داغدار ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ بدنما دھبے پڑ گئے تھے۔ انھوں نے جلدی سے اپنے جوتے کو ہٹا کر الگ رکھ دیا اور کچھ شرمندہ ہو کر ادھر ادھر اس جوتے کے مالک کی تلاش میں نظر دوڑانے لگے ـــــ اتنے میں ان کے سامنے ہی بیٹھے ایک شخص نے پیچھے مڑ کر اسی سفید سلیم شاہی جوتے کی خیریت معلوم کی اور دھبے پر نظر پڑتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے جیسے اسے اپنے جوتے کے ساتھ یہ سلوک بہت ناگوار گذرا تھا ـــــ کرامت بابو نے غور سے دیکھا ـــــ اور انھیں پہچان گئے۔ وہ میڈیکل کالج کے بڑے ڈاکٹر صاحب تھے جن کا بابو بازار میں اپنا ایک دواخانہ بھی تھا اور جہاں وہ روزانہ شام کو گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھا کرتے تھے۔

"یہ اچھا ہی ہے میں نے بھی خیال نہیں کیا اور خواہ مخواہ ان کے اتنے خوبصورت جوتے کا ستیاناس کر دیا ـــــ" کرامت بابو کو سچ مچ بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ "مان لیا وہ میرے افسر نہیں ہیں لیکن پھر بھی میری یہ حرکت بڑی نامعقول تھی۔ خاص کر اتنے بڑے آدمی کے ساتھ ـــــ" اس خیال نے انھیں اتنا زیادہ پریشان کیا کہ مجبور ہو کر وہ ذرا سا آگے کی طرف جھکے پھر تھوڑا سا کھنکھارتے ہوئے انھوں نے اپنا منہ ڈاکٹر صاحب کے کان کے قریب لے جا کر بہت آہستہ سے معذرت خواہ

لہجے میں کہا۔

"معاف کیجیے گا ۔۔۔ یہ غلطی اس ناچیز سے ہوگئی ہے ۔۔۔ امید ہے آپ ۔ ۔ ۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں!" ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔"

"خدا کے واسطے آپ مجھے معاف کر دیجئے ۔ ہیں ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔ بات یہ ہوئی کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"لاحول ولا قوۃ! اب چپ بھی رہیئے۔ سننے دیجئے۔" انھوں نے خشک لہجے میں کہا اور آگے کھسک کر بیٹھ گئے۔ کرانی بابو بیوقوفوں کی طرح منہ تکتے رہ گئے پھر خالی خالی نظروں سے پیش امام کو دیکھنے لگے، جو بدستور خطبہ پڑھے جا رہے تھے۔ خطبہ وہ ضرور سن رہے تھے لیکن ان کا یہ خیال کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش و خرم آدمی ہیں۔ اب ان کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔

نماز ختم کرنے کے بعد کرانی بابو مسجد کے گیٹ پر کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ میں جونہی ان کی نظر ڈاکٹر صاحب پر پڑی وہ لپک کر آگے بڑھے اور ان کے جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہنے لگے۔

"میں نے آپ کے سفید جوتے پر اپنا غلیظ جوتا رکھ دیا تھا ۔۔۔ مجھے معاف کر دیجیے ۔۔۔ یقین فرمائیے میں نے ارادتاً ایسا نہیں کیا ۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "ادھو یہ بات ہے ؛ میں تو بھول ہی گیا تھا لیکن کیا آپ مجھے اسی طرح پریشان کرتے رہیں گے ۔۔۔؟" انھوں نے خشمگیں نگاہوں سے کرانی بابو کو اس طرح دیکھا کہ وہ سوائے کھڑے ہاتھ ملنے کے کچھ نہ کر سکے۔

ان کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی ۔۔۔ سوچنے لگے۔ "کہنے کو تو انھوں نے کہہ دیا کہ وہ یہ بات بھول چکے ہیں ۔۔۔ لیکن کہاں ؛ ان کے چہرے سے تو صاف ظاہر تھا کہ وہ سخت ناراض ہیں ۔۔۔ نہیں! معاملے کی نوعیت انھیں سمجھانا ہی پڑے گا کہ میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ یہی تو دنیا کا قاعدہ ہے ورنہ وہ خواہ مخواہ سمجھ بیٹھیں گے کہ میں نے سوچ سمجھ کر وہ حرکت کی تھی ۔۔۔ ان یا وہ ابھی اس کا خیال نہ کریں لیکن آئندہ کبھی تو وہ ایسا کر سکتے ہیں ۔۔۔ اتنے بڑے آدمی ۔ ۔ ۔ ۔"

گھر واپس جا کر کرانی بابو نے نہایت تفصیل سے سب کچھ اپنی بیوی کو کہہ سنایا اور اس واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی بیوی نے اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ پہلے پہل وہ ضرور کچھ گھبرا گئی تھیں ۔۔۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر صاحب تھے اور ان کے شوہر کے کوئی بڑے افسر وغیرہ نہ تھے تو انھیں اطمینان ہو گیا اور بے تعلق سی ہو کر کہنے لگیں "ہاں یہ ہے تو ضرور تہذیب کے خلاف۔ ٹھیک ہے، جا کر معذرت کر لینا چاہیے۔"

"ٹھیک کہا تم نے میں معافی مانگنے ہی تو گیا تھا لیکن ان کا سلوک بھی خوب تھا۔ جو کہا اس کے کچھ معنی ہی نہیں ہوتے ۔۔۔ اس کے علاوہ وہ کہنے کی جگہ بھی نہیں تھی ۔۔۔ غلطی میری ہی تھی ۔۔۔"

شام کے وقت کرانی بابو ڈاکٹر صاحب کے دواخانے میں داخل ہوئے۔ وہ اس وقت بہت مصروف تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس کام سے نمٹنا چاہتے ہیں۔ کرانی بابو بھی مریضوں کے درمیان چپ بیٹھ گئے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

جلد ہی ان کی باری آ پہونچی اور ڈاکٹر صاحب بھنویں چڑھا کر استفساریہ لہجے میں ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

کرانی بابو نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہنا شروع کیا ۔۔۔ "میں نے کہا ۔۔۔ شاید آپ کو یاد ہو گا میں نے آج جامع مسجد میں غلطی سے اپنا گندہ جوتا آپ کے صاف ستھرے سفید جوتے پر رکھ دیا تھا ۔۔۔ امید ہے یاد آ گیا ہو گا ۔۔۔ آپ کے جوتے پر بہت سے دھبے پڑ گئے تھے۔

—— مہربانی فرماکر مجھے معاف ....."

"عجیب مصیبت ہے! اچھے احمق سے پالا پڑا ہے۔" انھوں نے نہایت بے چارگی سے کہا اور ایک دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو لئے۔
کرانی بابو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ باوجود کوشش کے ان کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دواخانے سے باہر نکل آئے۔ سوچنے لگے
میری بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ سخت ناراض ہیں مجھ سے۔ لیکن اس طرح انھیں ناراض کرنا تو ٹھیک نہیں۔ دراصل وہ میری
بات ہی نہ سمجھ سکے۔ ان کو صورت حال سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے .....

اتنے میں جلدی سے ڈاکٹر صاحب دواخانے سے باہر نکلے اور تیز تیز قدموں سے اپنی کار کی طرف بڑھنے لگے۔ کرانی بابو کے دل میں امید کی
ایک کرن چمکی اور وہ دوڑتے ہوئے کار کے پاس پہونچے —— اور نہایت عاجزی سے کہنے لگے۔ "ڈاکٹر صاحب معاف کیجیے گا —— میرے دماغ میں
کچھ ایسے خیالات سما گئے ہیں کہ میں آپ کو تکلیف دیئے بغیر نہیں رہ سکا ....."

ڈاکٹر صاحب نے کھا جانے والی نظروں سے کرانی بابو کو دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولے۔ "مجھ سے مذاق کرتے ہو —— ؟" اور کار میں
بیٹھ کر دھم سے اس کا دروازہ بند کر دیا —— کار چل دی ——

"مذاق —— ؟" کرانی بابو کے دماغ میں جیسے ہتھوڑے سے چلنے لگے۔ انھوں نے کان پکڑ کر زور زور سے اپنے گالوں پر تھپڑ مارے ——
توبہ توبہ! بھلا میں اتنے بڑے آدمی سے مذاق کروں گا —— ؟ افسوس کہ وہ میری بات سمجھتے ہی نہیں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے —— ؟ گھر چلتے
جاتے انھوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بہت کوشش کی۔ سوچا ایک خط لکھ کر انھیں سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ لیکن وہ دیر تک اس خط کا مضمون منتخب
نہ کر سکے۔ آخر کار انھوں نے اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرایا کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی —— وہ سخت عجلت میں تھے۔

دوسرے روز صبح سویرے کرانی بابو نے ڈاکٹر صاحب کے مکان کی گھنٹی بجائی۔ نوکر نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور انھیں بیٹھنے کا اشارہ
کر کے اندر چلا گیا۔ وہ جھجکتے ہوئے دروازے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔

یکایک پردے کے پیچھے سے ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے —— کرانی بابو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گردن جھکا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگے۔
"کل مجھ سے حضور کی شان میں گستاخی ہو گئی تھی جس سے آپ کچھ ناراض ہو گئے تھے لیکن اس کا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو آپ نے سمجھا تھا ——
مذاق، اور بھلا میں آپ سے کس طرح کر سکتا ہوں —— اس دن مسجد میں آپ کے سفید جوتے کا ستیاناس کر کے میں نے جو آپ کو دلی تکلیف دی تھی اس
کے لئے معافی کا خواہاں تھا۔ بھلا مجھ میں اتنی جرأت کہاں ہو سکتی ہے کہ آپ سے ہنسی مذاق کروں۔ اگر ہم جیسوں کو اس قسم کا مذاق سوجھتا رہے تو ہمارا اللہ ہی
حافظ ہے۔ اپنی اوقات ہم اتنی جلدی کیسے بھول سکتے ہیں —— مہربانی کر کے آپ کچھ خیال نہ کریں اور مجھے معاف ....."

ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور انھوں نے غصے میں کانپتے ہوئے چلا کر کہا ——

"نکل جاؤ کمینے یہاں سے —— ابھی نکلو ——"

"جی ... جی ..." کرانی بابو گھگھیانے لگے اور ایک ایک قدم کر کے پیچھے ہٹنے لگے۔

"نکلتے ہو یا نہیں —— ذلیل کہیں کے —— انھوں نے دھکا دے کر کرانی بابو کو باہر نکال دیا۔ اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا ——
کرانی بابو کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"یا اللہ! اب میں اور کس طرح کہوں —— یہ بڑے لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہوتے ہیں کہ کسی کا چھوٹا سا قصور بھی معاف نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا

کچھ قلم کے بارے میں

قلم کی قلمرو کس قدر وسیع ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قلم کا لفظ قلمکار کے غلیظ ہاتھوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بعض اوقات مالی کی صاف ستھری انگلیوں اور کبھی کبھار باربر کی چاقو دجو بند پوروں تک بھی جا پہنچتا ہے۔ لیکن میں اس وقت نہ تو آپ سے آم کی قلم کا ذکر چھیڑنے کا آرزو مند ہوں (ہر چند کہ یہ ذکر بہت لذیذ ہوگا) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اس مقراض کا ذکر کروں جو آپ کے کانوں کے گرد کسی بھوکی چڑیا کی طرح "کچ کچ" کرتی منڈلاتی رہتی ہے اور جب رہ نہیں سکتی تو آپ کے بالوں کی قلم کو تیز چونچ سے ہلکا سا کچوکا لگا کر دوبارہ کچ کچ کا ورد کرتی پھدکتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ پر تیز چونچ سے حملہ آور ہونے کے بعد اس کچ کچ میں فتحمندی اور وقار بھی شامل ہو جاتا ہے جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ "یہ سب میرا مفتوحہ علاقہ ہے۔ میں جب چاہوں اور جیسے چاہوں اپنا تختۂ مشق بنا سکتی ہوں۔" لیکن فتح مندی کا یہ احساس کچھ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتا اور بھوک جلد ہی اس پر غالب آجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے بھوک کا کچ کچ کے سہانے نغمے سے کوئی پرانا اور اٹوٹ رشتہ ہے۔

لیکن میں ان تہذیب سے ناآشنا قلموں کا ذکر کر کے آپ کے لطیف اور ارفع ذوقِ نظر کو مجروح کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرا موضوع تو صرف وہ قلم ہے جسے تقدیر نے میری انگلیوں میں اڑس دیا ہے اور جو اب ان انگلیوں کے ہلکے سے دباؤ یا اشارے پر حروف کو جوڑ کر لفظوں اور لفظوں کو جوڑ کر ننھے منے جملوں میں ڈھالتا ہوا کاغذ کے طویل و عریض دالان میں جولانیاں دکھاتا چلا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے یہ قلم ایک کباڑیے کی دکان پر دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی میں اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ کباڑیے کے پاس کچھ اور نادر و نایاب چیزیں بھی تھیں۔ مثلاً لوہے کے پرانے خود، پھٹی ہوئی فوجی وردیاں، شکستہ ٹائر، ٹوٹی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے اور پانی کی زنگ آلود بوتلیں وغیرہ اور میں بڑی آسانی سے ان چیزوں کا ایک ایک نمونہ اپنی تحویل میں لے کر اپنے نانا جان مرحوم کی عظمت اور بہادری کی داستانوں کو اس زندہ ثبوت سے مستحکم کر سکتا تھا۔ لیکن اس وقت بدقسمتی سے میری جیب کچھ تنگ تھی (جو کوشش بسیار کے باوجود ابھی تک کشادہ نہیں ہو سکی) اس لئے میں نے اپنے ارمانوں کا فی الفور گلا گھونٹ دیا اور قلم کے حسین پیکر پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دی۔ ادھر کباڑیا بھی کوئی خاندانی کباڑیا تھا۔ فوراً میری نیت کو بھانپ گیا اور قلم کی قیمت میں پورے پچاس پیسے کا اضافہ کرتے ہوئے گویا ہوا ——"جناب یہ کوئی عام سا قلم نہیں! خدا کی قسم میں نے یہ قلم پھٹتے ہوئے بموں میں سے گزر کر ایک مرے ہوئے سکھ میجر کی جیب سے نکالا تھا۔ خدایا کس قدر بھیانک تھا وہ سماں! ہیں جی —" لیکن میں نے کباڑیے کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر پورے ایک روپے کی ریزگاری سجا دی اور قلم اپنے کوٹ کی بیرونی جیب پر چسپاں کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور اب یہ قلم ایک عرصے سے میری تنہائیوں کا واحد مونس اور غمگسار ہے اور میری طرح یہ بھی دن رات افسانے کی فکر میں رہتا ہے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ یہ خوددار ہے اور اس میں ایک عجیب سا وقار اور قلندری بھی ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ "قبلہ! میں کوئی دریوزہ گر نہیں کہ در در کی بھیک مانگوں یا ایک ہی در پر بار بار حاضری دوں۔ میں تو ایک مست فقیر ہوں جسے کسی دروازے کی حاجت نہیں۔" اس کے بعد وہ پریم بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا

ہے اور آگے بڑھنے کے لئے مچلنے لگتا ہے۔ معاً مجھے اپنا وہ قلم یاد آجاتا ہے جو اب میز کی دراز کے کسی گمنام گوشے میں دبکا پڑا ہے لیکن جو نئے قلم کی آمد سے پہلے مجھ پر پوری طرح مسلط تھا۔ "مسلط" میں نے اس لئے کہا ہے کہ مجھے اس کی یاری ہرگز پسند نہیں تھی۔ اس کی فطرت میں دریوزہ گری تو گویا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب میں اُسے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتا تو وہ ٹھمک کر نیند سے، بوجھل آواز میں کہتا ——— "پہلے میرا ہاتھ منہ تو دھلاؤ، ابھی ابھی جاگا ہوں۔ ہوش میں آلوں تو چلوں۔" پھر جب چلنے کا مرحلہ آتا تو کہتا "دوات سے ایک بوند روشنائی تو دلا دو!" میں دوات کی منت سماجت کرکے اسے ایک بوند روشنائی دلا دیتا تو ایک ہی سطر لکھ کر رک جاتا۔ کہتا "وہ تو ختم ہوگئی کچھ اور دلا دو نا!" دو چار سطروں کے بعد خود میں مزید دریوزہ گری کی سکت نہ پاکر جب صاف انکار کر دیتا تو وہ از خود لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا دوات کے در پر پیشانی رگڑنے کے لئے حاضر ہونا شروع ہو جاتا اور ہر بار اس کی انکساری، گڑگڑاہٹ، چاپلوسی اور خوشامد میں اضافہ ہونے لگتا۔ اور ابھی بمشکل ایک صفحہ ہی سیاہ ہو پاتا کہ وہ ہر لفظ کے بعد دوات کے حضور میں پہنچنے لگتا۔ کہتا "ہے کالی ماتا! (جگ جگ جئے) تیری کیرتی پورب سے پچھم تک پھیلے۔ اسے بھاگوان! سادھو سنت کو دان دے کہ دان نہ دینے سے دھن دولت گھٹ جاتی ہے۔ کالی ماتا! تیرا قلم سارے سنسار پر راج کرے (شرما جاتا) نہ نہ۔ تو خود راج کرے۔ میرے حلق میں ایک بوند روشنائی ٹپکا دے، ٹپکا دے کالی ماتا!" ——— اور کالی ماتا؟

اور کالی ماتا قدم قدم پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی۔ کبھی جب اُس کا مزاج برہم ہوتا تو نب کے ماتھے پر گرم گرم روشنائی کا پلستر کر دیتی اور بے چارہ قلم شیرے میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔ پھر جب وہ کنجوسی کے موڈ میں ہوتی تو قلم اپنا سا منہ لے کر واپس آجاتا اور اس کا نب کاغذ پر کچھ لکھنے کی بجائے اُسے مجروح کرنے لگتا۔ کبھی کبھی کالی ماتا پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ ساون کی برکھا کی طرح ایک تار پر روتی چلی جاتی۔ اُس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا اور کاغذ کے علاوہ میری انگلیوں پر بھی غلیظ سے دھبے ابھر آتے ——— عجیب مزاج تھا اُس کا! مگر اب وہ بھی دراز کے کسی گمنام گوشے میں سر نیہوڑے پڑی ہے۔ اُس کا باطن خشک ہو چکا ہے۔ آنکھیں بے نور اور لب سل چکے ہیں۔ اب کوئی سادھو اس کے در پر سنکھ بجانے کے لئے نہیں آتا۔ ہاں جب کبھی اسے دراز کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے تو اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی لرزش ضرور نمودار ہو جاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ———

"راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا!"

پرانے قلم اور اس کی کالی ماتا سے مجھے اب کوئی غرض نہیں۔ وہ تو بجھا ہوا ماضی ہے اور بجھے ہوئے ماضی کی اور جانا مجھے کسی صورت بھی منظور نہیں۔ میں تو اب اپنے نئے قلم کی ہمراہی میں خوش باش زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ ایک خود کار قلم ہے جو کسی دوسرے کا دست نگر نہیں۔ وہ زمانہ اب گیا جب انفرادیت کو خوف اور غصے کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو ہر شخص اپنے قدموں پر خود کھڑا ہے۔ یہی حال میرے اس قلم کا بھی ہے۔ اس کی گزر اوقات اب اس نقطے پر نہیں جس کے لئے کسی در پر حاضری دینا ضروری ہے بلکہ اس گرم اور تازہ خون پر ہے جو اس کی رگوں میں دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ جب تک یہ خون گرم موجود ہے، میرے قلم کی جولانیاں بھی جاری ہیں۔ مجھے اپنے اس قلم پر ناز ہے جو پہاڑوں کی چٹانوں کو صفحۂ قرطاس بنا کر ان پر لکھتا ہے اور جو چیونٹی کی طرح اپنا رزق خاکِ راہ میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے کوہان سے کشید کرتا ہے اور اس کے بعد گرمی اور لو کی پروا کئے بغیر دشت نوردی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد

ماہرِ لسانیات

"لسانیات" ایک علم ہے جس میں یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ساری زبانیں آپ کی مادری زبان سے نکلی ہیں اور یہ کہ ملکی زبان کا آغاز ملک کے اس خطے سے ہوا تھا جہاں آپ پیدا ہوئے تھے۔ ماہر لسانیات لسانی میں بھی ماہر ہوتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چنانچہ دکھن والے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا دکھن سے ہوئی۔ پنجابیوں کا دعویٰ ہے کہ اردو پنجاب کے میدانوں میں پیدا ہوئی۔ یوپی والے دلیلیں لاتے ہیں کہ ہم تو زبان شروع ہونے سے پہلے بھی اہل زبان تھے۔ اردو نہ صرف یہاں شروع ہوئی بلکہ مدتوں ان کے گھر کی لونڈی بن کر رہی۔ یہاں تک کہ کسی بات پر ناراض ہو کر انھوں نے اسے دیس نکالا دیدیا۔ یہ تھیوری بھی نکل آئی ہے کہ اردو سب سے پہلے صوبہ سرحد میں پھیلی، پھر خانہ بدوشوں کے ذریعہ دوسری جگہوں تک پہنچی۔ سندھ کا دعویٰ ہے کہ جب محمد بن قاسم سب سے پہلے یہاں آیا تو اردو کی کیا مجال تھی کہ کسی اور علاقے میں چلی جاتی۔ چنانچہ سب اپنے اپنے دعووں کے ثبوت میں مقامی زبان کے الفاظ کا اردو سے موازنہ کرتے ہیں اور اردو ایسی شریر زبان ہے کہ ہر ایک کو بڑھاوا دیکر خود تماشا دیکھ رہی ہے۔

لسانی میں مہارت کی ایک مثال اور سنیئے۔ ایک صاحبہ جو مارواڑ کے علاقے کی رہنے والی ہیں۔ کوئی دس پندرہ سال سے یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ لسانیات میں ایم اے کر رہی ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں دنیا کی ساری بڑی بڑی اور قدیم زبانوں میں ریسرچ کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ وہ مارواڑی جانتی تھیں انھوں نے کتنے ہی مصری، یونانی اور عبرانی الفاظ بتائے جن کے ماخذ مارواڑی زبان میں اب تک موجود ہیں۔ ایک گھنٹے تک ان کی تقریر بغیر سنے مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا کی ساری زبانیں مارواڑی سے نکلی ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ اردو کے بارے میں ان کا دعویٰ کیا ہے۔ ظاہر ہے یہی کہ اردو نے سب سے پہلے اسی ریگستان میں آنکھ کھولی اور جب قحط پڑا تو نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں کی طرف نکل گئی۔ گو وہ مارواڑی کو اردو کی ماں کہہ رہی تھیں مگر میری اس بات سے بعد میں اتفاق کر گئیں کہ جن زبانوں سے اردو وجود میں آئی ہے وہ خود مارواڑی سے نکلی ہیں اس لئے مارواڑی اردو کی ماں نہیں نانی ہے۔

علم لسانیات کے ماہروں کو جاننے دیجئے اس کے طالب علم تک ایسے جادوگر ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہیں الفاظ کی شکل و صورت بدل دیتے ہیں۔ اگر نہ بدل سکیں تو بھی اپنی بات بڑی آسانی سے ثابت کر لیتے ہیں یعنی جب دوسری زبان میں الفاظ کی شکل ان کی زبان سے بدلی ہوئی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس زبان سے اس زبان میں دبراستہ ان زبانوں کے آئے ہیں ان الفاظ کی شکل یہ ہو گئی ہے مگر معنی وہیں ہیں۔ اور جہاں معنی بدلے ہوئے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ الفاظ وہیں ہیں ذرا معنی تبدیل ہو گئے ہیں۔ مثال ملاحظہ فرمایئے۔ کہیں گے "اردو میں یہ جو لفظ مرغ ہے فارسی میں مرغ ہوا مگر معنی بدل گئے، پھر افریقی میں کرغ ہو گیا، یہاں تک کہ برطانیہ پہنچتے پہنچتے کاک ہو گیا۔" نیچے نوٹ دیا ہوگا کہ یہ وہی لفظ ہے جس سے

ہندی لفظ کاگا بنا۔ اللہ اللہ! سوچنے کی جا ہے کہ اس لمبے سفر میں مرغے کا کیا رہ گیا۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاگا اردو کے لفظ کوا ہی سے نکلا ہو کیونکہ دونوں کے معنی ایک ہیں۔ یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ اب ان سے پوچھیے کہ جب دوسری بات زیادہ قرین قیاس تھی تو آپ نے پہلی بات کہی ہی کیوں اور پھر اس صورت میں آپ کی پہلی تھیوری کا کیا ہوا۔ یہ لوگ ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ اصل میں الفاظ کے الٹ پھیر پر سوچ بچار کرنے کی وجہ سے بچارے اور کسی بات پر غور کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔

ان ماہر لسانیات کو گڑے مردے اکھاڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ کسی بھی ملک کا بہترین ادب وہ نہیں پڑھتے۔ پردیس سے بیوی کا خط آئے تو اسے فرصت کے وقت پڑھنے کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ خلا میں جو ہوا باز پیدل چلا ہے، اس کا حال بھی نہیں پڑھیں گے مگر اس فکر میں ہر وقت گھلیں گے کہ فراعین مصر جو کتبے اپنے اہرام میں رکھ گئے ہیں وہ پڑھ لیں۔ جانے وہ پڑھ لینے سے ان کے نقد علم میں ایسا کیا اضافہ ہو جائے گا۔ سینکڑوں سال کی کاوشوں کے بعد ماہر لسانیات نے آخر یہ معلوم کر لیا کہ مصر کی مشہور ملکہ قلوپطرہ کا نام یوں لکھا جاتا تھا تو بتائیے ہوا کیا۔ اگر یوں نہ لکھا جاتا۔ تو کسی اور طرح لکھا جاتا۔ جانے کیا کیا جوڑ توڑ اور دھوبی پٹرہ کر کے یہ تصویر قلوپطرہ میں ڈھلے گی مگر پھر بھی کسی کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ لوگوں کی سمجھ میں ایلزبیتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن والی "کلیوپیٹرا" ہی آئے گی۔

ماہر لسانیات اگر گڑے مردے اکھاڑنے پر ہی اکتفا کریں تو کوئی ایسی حرج کی بات نہیں مگر جب کبھی کسی زبان کی شامت آتی ہے تو یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ صاحبان دوسری زبان کی اصطلاحات اپنی زبان میں ڈھالنے کا کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور "قاموس اللغویات الاصطلاحات" قسم کی کئی ایسی جلدیں وجود میں آتی ہیں جنھیں ہر پہلی نظر میں اہرام مصر کے کتبوں کا چربہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں مگر جب غور کرتے ہیں تو بعض الفاظ میں کچھ کچھ اپنی زبان کی شباہت نظر آتی ہے مگر صرف شباہت۔ اگر سنسکرت، لاطینی، فارسی، عربی، موجودہ ہندی اور موجودہ اردو کے چند ایسے الفاظ لے کر جوڑ دیئے جائیں جو آپس میں کسی طرح میل نہ کھاتے ہوں تو ان کی شکل کچھ کچھ ان اصطلاحات سے ملتی جلتی ہوگی۔ یاد رکھئے صرف کچھ کچھ چونکہ ماہر لسانیات کو ہم آپ سے کہیں زیادہ زبانیں آتی ہیں اس لئے ان کی وضع کردہ اصطلاحات کہیں زیادہ گنجلک اور دقیق ہوتی ہیں۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اناڑی ان کو نہ سمجھ لے یہ اصطلاحات صرف ان مضامین کے اساتذہ کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ ان مضامین کے طلبا کو خصوصی رعایت کے تحت انھیں پڑھنے اور استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ باقی لوگوں کے لئے یہ مضمون ایسا "قاموس" ہی رہتا ہے جس کے آگے بورڈ لگا ہو کہ ہر کہ ومہ کو تیرنے کی اجازت نہیں۔ مثالیں اس لئے نہیں دی جا رہیں کہ عام کاتب انھیں صحیح نہیں لکھ سکے گا اور اصطلاحات کچھ کی کچھ ہو جائیں گی۔ ویسے اگر وہ کچھ کی کچھ ہو جائیں تو کچھ ایسا فرق نہیں پڑے گا۔ صرف صاحب اصطلاحات کو اس مضمون کا جواب لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ جیسے ایک افسانہ نگار کے ایک افسانے پر کسی صاحب نے اعتراض چھاپا اور زبان کی بے شمار غلطیاں گنوائیں۔ جب ہم ان افسانہ نگار صاحب سے ملے تو وہ بولے "میں اس مضمون کا جواب لکھ رہا ہوں کیونکہ نقاد صاحب نے کاتب کی غلطیاں بھی میرے سر تھوپ دی ہیں۔" ان کا لفظ "بھی" آج تک ہمیں مزا دیتا ہے۔ بہر حال جن صاحب کو ان اصطلاحات سے دلچسپی ہو وہ شیریں زبان کے بدلنے پر چڑیں یا خود "قاموس اللغویات" سے رجوع کریں۔

ماہر لسانیات کو زبان کے محاوروں اور ضرب الامثال سے بھی بڑا شغف ہوتا ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے میں وہ ایسی ایسی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں کہ الف لیلہ کے سوا کہیں سننے میں نہیں آئیں۔ ان کو اس لئے گھڑا جاتا ہے کہ بعد میں آنے والے ماہر لسانیات سالہا سال تحقیق کر کے انھیں غلط ثابت کر سکیں کہ "الٹے بانس بریلی کو" دراصل بریلی نہیں بلکہ بانسو پور تھا جو سندربن میں ایک جگہ ہے جہاں کے بانس بہت مشہور ہیں۔ اس لئے یہ کہانی کہ ایک شخص بانس دہلی سے بانس بریلی لے جا رہا تھا سراسر غلط اور صاحب تصنیف کے اپنے دماغ کی اختراع ہے۔ ان لوگوں کو برسہا برس کے محاوروں

کی اصلاح کرنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ حال ہی میں نے ایک مضمون پڑھا ہے جس میں محاوروں کی حجامت کچھ یوں بنائی گئی ہے: "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی غلط ہے۔ اونٹ کوئی مشین تو ہوتا نہیں جس میں کل ہو، اور پھر جانوروں میں کوئی بھی سیدھا نہیں اس لئے اونٹ کی تخصیص بے معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اونٹ کی جگہ کوئی اور لفظ ہے، اب اوٹنا لفظ آپ نے سنا ہوگا جس کے معنی ہیں روئی سے بنولوں کو الگ کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہمیشہ سے کسی نہ کسی کل کے ذریعہ ہوتا ہوگا، خواہ لکڑی کی ہو یا بجلی سے چلتی ہو۔ یعنی ممکن ہے کہ اس اوٹنے والی مشین کو "اونٹ" کہا جاتا ہو۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" اوٹنے سے بنا ہے نہ کہ چوپائے اونٹ سے، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ "اونٹ بڈھا جوا پر موتنا نہ آیا" چوپائے اونٹ کی نسبت کہا گیا ہے کیونکہ واقعات آج بھی اس محاورے کے صحیح ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ رہ گیا پہلا محاورہ تو اس میں ایک پہلو اور بھی ہے: "اوٹنا کہتے ہیں ساڑھے تین کے پہاڑے کو۔ ظاہر ہے کہ ساڑھے تین کا پہاڑا شروع سے آخر تک کج ہے۔ نہ آسانی سے یاد کیا جا سکتا ہے نہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کسی مشین کا کوئی کل پرزہ خراب ہو جائے تو مشین ٹیڑھی میڑھی چلتی ہے اسی طرح ساڑھے تین کا پہاڑا تو بھی ٹیڑھا چلتا ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ یہ محاورہ اسی وجہ سے وضع کیا گیا ہو مگر پہلی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔"

ایک ماہر لسانیات نے مجھے بتایا کہ جب زبان کا ارتقا نہیں ہوا تھا اور ابجد ایجاد نہیں ہوئی تھی تو لوگ تصویروں سے اور پھر نشانوں سے کام چلاتے تھے جو جگہ بہت گھیرتے تھے اور ان کا لکھنا مشکل بھی ہوتا تھا۔ میرے نہ سمجھنے پر انھوں نے ایک مثال دی یعنی ایک ہی لفظ کو مختلف زبانوں میں لکھ کر بتایا: (اردو فارسی) آدمی - (عربی) آدمی - (رومن) ADMI - (چینی) 人 - (ہندی) आदमी

انھوں نے بتایا کہ چینی طریقہ ابجد ایجاد ہونے سے پہلے کا طریقہ ہے اور ابتدائی و خام ہے۔ اب پڑھنے والے خود انصاف کر لیں کہ ان الفاظ میں سب سے زیادہ جگہ کس نے گھیری ہے اور کس کا لکھنا سب سے آسان ہے۔ گو مجھے چینی لفظ صاف سب سے چھوٹا اور آسان نظر آ رہا تھا مگر میں نے ان کے سامنے کچھ نہ کہا کیونکہ مجھ میں اور زیادہ لسانی "سننے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ان لوگوں میں ایک یہ خداداد قابلیت بھی ہوتی ہے کہ جن دو زبانوں کو چاہتے ہیں ایک کر دیتے ہیں اور جن دو زبانوں میں چاہیں پھوٹ ڈلوا دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی دور دراز خطے کے متعلق کہیں گے کہ لباس اور خوراک میں اکثر وہی چیزیں استعمال ہوتی ہیں جو ہمارے ہاں ہوتی ہیں اور ان میں سے بیشتر کے نام وہی ہیں مثلاً قورمے کو کورمہ اور کباب کو چواب اور پگڑی کو بگڑی۔ میں نے یہاں تک پڑھا ہے کہ جیکوسلوواکیہ میں شلوار کو شلوار کہتے ہیں۔ اب یہ بتائیے وہ شلوار پہنتے کب ہیں، جو اسے کچھ کہنے کی نوبت آئے۔ مگر صاحب یہ ماہر لسانیات ہیں۔ ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں۔

ہرن کا نام گدھا رکھ دیا گدھے کا ہرن جو چاہے آپ کا علم کرشمہ ساز کرے

مشکور حسین یاد

سطح

سطح ہر سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایسا نقطہ جس کا تعین کئے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ دنیا کو برتنے کے لئے ہی نہیں اُس پر غور کرنے کے لئے بھی سطحی ہونا ضروری ہے۔ پانی کو پہلے پانی تسلیم کریں تب کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ مفرد نہیں مرکب ہے۔

لطیف ہو یا کثیف، سطح تمام تر احساس ہے۔ یہ ایک تیز تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہے۔ اس سے ہمارے جسم و جان ہر وقت نگار ہوتے رہتے ہیں۔ سطح دکھ پہنچائے یا سکھ، ہر حال میں ہمیں چونکاتی اور بیدار کرتی ہے۔ ہم پر سطح کے ان گنت احسانات ہیں۔

بقول شخصے ہماری ذات ایک ایسی عمارت کی مانند ہے جس کے بے شمار دروازے ہیں۔ ان دروازوں سے ہر لحظہ سطحوں کی آمد جاری رہتی ہے۔ عمارت میں داخل ہو کر یہ سطحیں مختلف احساسات کا روپ دھار لیتی ہیں۔ احساس میں تبدیل ہوتے ہی سطح کو پر لگ جاتے ہیں۔ یہ کبھی نور ہوتی ہے تو کبھی نار۔

وقت کو کسی نے نہیں دیکھا، کسی نے نہیں پایا، لیکن سطح کی بدولت ہمیں اُس کے صدہا روپ نظر آ جاتے ہیں۔ سطح نہ ہوتی تو وقت خلاؤں میں مارا مارا پھرتا۔ وقت سطح کے دامن میں پروان چڑھ رہا ہے۔

سطح کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس کی آغوش میں اندھیرا بھی ہے اور اجالا بھی۔ یہاں گلچینوں کو بھی پناہ ملتی ہے اور حملہ آوروں کو بھی۔ اس کے سائے میں پھول اور کانٹے دونوں پرورش پاتے ہیں۔ سطح مٹ جائے تو زندگی کی رنگا رنگی ختم ہو جائے۔ تضاد کا سارا لطف سطح سے قائم ہے۔

ہر چمکتی ہوئی شے سونا ہو یا نہ ہو، چمک اپنی جگہ ایک قدر و منزلت رکھتی ہے۔ ہم سطح سے اُسی وقت دھوکا کھاتے ہیں جب اُس کے حسن و جمال کو اپنی غرض کے تحت ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ غرض شامل حال نہ ہو تو ظاہر و باطن کا فرق بھی یک گونہ مسرت بخش دیتا ہے۔

ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے سب سطح ہے۔ بلندی پر جائیں یا گہرائی میں اُتریں، سطح ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

ہم بھی کس قدر ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ جو چیز ہمیں سہارا دیتی ہے جس پر ہمارے پاؤں ٹھہرتے ہیں، اُسی کو ہم سطح کا سطحی نام دے کر در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ دراصل سطح سامنے کی حقیقت ہے، اور انسان سامنے کی حقیقت سے فائدہ تو پورا پورا اٹھا لیتا ہے لیکن اُس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کا بہت کم عادی ہے۔ پاس کا احساس دور کے احساس کی نسبت زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔

سطح ہمیں بہت دور لے جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اُس سے غافل نہ ہوں۔ سطح سے غفلت کی سزا بے حسی ہے۔ ہم عام طور پر جن

لوگوں کو سطحی کہتے ہیں وہ اسی غفلت کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ سطح کی طرف توجہ کی جائے تو وہ سماؤں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ سطح انسان کا ظرف ہی نہیں اُس کا پیمانہ بھی ہے۔

انسان اپنے آپ کو سطح پر بہت کم محسوس کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس سے اونچا یا نیچا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی روزانہ زندگی میں نہ سطح پر ہوتے ہیں اور نہ ہی بلندی یا گہرائی میں، بلکہ ایسے مقام پر ہوتے ہیں جو ہمارا اپنا تخلیق کردہ ہوتا ہے۔ ہم اس مقام کو مقام گریز کہہ سکتے ہیں۔ ہماری ذات یہ مقام اس لئے تخلیق کرتی ہے کہ اسے اپنے آپ میں کون و مکاں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نظر نہیں آتی۔ سطح کو محسوس کریں تو پوری کائنات کو محسوس کرنا پڑتا ہے۔ ہم مقابلہ کئے بغیر آفاق کو زیر کرنا چاہتے ہیں۔

تغیر پذیری سطح کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے۔ جس نے اس خصوصیت کو نہیں سمجھا اُسے سطح کو ہاتھ لگانے کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر کوئی سطح کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ سطح بھاگتی ہی نہیں، راستے بھی بدلتی ہے۔ اسے ساکن یا سیدھی لکیر سمجھنے والا ہمیشہ مبتلائے فریب رہتا ہے۔ دھوکے سے بچنے کے لئے سطح کو چھونا ضروری ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو سطح آدمی کو آسمانوں میں اُڑا کر لے جاتی ہے۔ اگرچہ روزمرہ زندگی میں سطح لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے لیکن وہ اسے برائے نام بھی چھونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اسی چھونے اور نہ چھونے پر انسانوں کے مقدر بنتے اور بگڑتے ہیں۔ جس نے سطح کو چھو لیا اس کی قسمت جاگ اُٹھی، جس نے نہ چھوا وہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گیا۔

محمد خالد اختر

سواتی مہم

۲

فادر کرسمس

میں نے تھل کے صحرا میں پڑتے ہوئے اس شہر پر پہلی بار نظر دوڑائی اور واحد چیز جو مجھے اس کے متعلق پسند آئی یہ تھی کہ گلابی پہاڑیاں اس کے قریب تھیں۔ ریلوے لائن کی پرلی طرف وسیع فیکٹری ایریا تھا۔ شاندار مکانوں کے بلاک اور تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے دفاتر کی مرعوب کن، مہیب عمارات۔ وہ بابل کے محلات لگتی تھیں اور اُفق پر اُفتادہ معلوم ہوتی تھیں — ریلوے لائن کے اس طرف جہاں ہم کھڑے تھے، جوہر آباد کا اصل شہر تھا۔ یہ ایک نقشے کی مانند صاف اور سپاٹ پڑا ہوا تھا۔ سڑکیں چوڑی اور سیدھی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ اس کے مکان زیادہ تر یک منزلہ تھے، اور تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے منظور شدہ ٹائپ ڈیزائنوں کے مطابق بنے ہوئے تھے۔ ہریالی بہت کم تھی اور شہر ایک چٹیل بھورے میدان میں سورج کی بے رحم کرنوں کے نیچے کھلا پڑا تھا — ایچ کیورس نے میرے سامنے جوہر آباد کی کافی تعریفیں کی تھیں لیکن یہ اس قسم کا شہر نہ تھا جسے میں پسند کرتا ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ میں سیدھی سڑکوں اور ٹائپ ڈیزائنوں کے مکان بنانے کے جدید خبط کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرے نزدیک اچھا شہر وہ ہے جس کے کوچے خوش آیند طریق پر ٹیڑھے میڑھے اور پیچیدہ ہوں اور جس کی اونچی دو دو سہ سہ منزلہ جھلملیوں کے دریچوں والی حویلیاں باہم دست و گریباں ہو رہی ہوں۔ سب ایماندار شہروں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگر اس شہر کے گرداگرد فصیل ہو اور ایک پرانی خندق بھی، تو تم وہاں ساری عمر گزار سکتے ہو اور تمہارا دل ایک لمحے کے لئے بھی نہیں تھکے گا۔ ایک شہر کے لئے لازم ہے کہ اس کا ایک کردار ہو — ایک روح — ٹیڑھی گلیوں میں کتنا رومان اور اسرار ہوتا ہے؟ اور رومان اور اسرار کے بغیر ایک شہر رہنے کے لائق جگہ نہیں ہے۔ ہمارے مورث اس چیز کو جانتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ٹیڑھی گلیوں اور فصیلوں والے شہر تعمیر کئے اور اسی لئے وہ ہم سے زیادہ خوش تھے — ہاں! جوہر آباد جدید اور بے رنگ اور بے روح تھا۔ صرف وہ لوگ یہاں رہنا گوارا کر سکتے تھے جو رہنے پر مجبور تھے یا جن میں تخیل کی لو کبھی نہ بھڑکی تھی۔

ہم تپتے ہوئے سورج کے نیچے اپنے سوٹ کیس اور بستر لئے کسی تانگے کا انتظار کرنے لگے۔ پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد تانگہ تو کوئی نہ آیا البتہ مزدور بچوں کے ایک دستے نے ہم پر ہلہ بول دیا۔ وہ کوئی ایک درجن تھے۔ ہمارے احتجاجوں کے باوجود بیک وقت سب نے ہمارا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ ایک نے اٹیچی کیس اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ ایچ کیورس کے بستر کو تین لڑکوں نے اپنے سروں پر اس طرح رکھ لیا جیسے ایک بیش بہا خزانہ ہو۔ چوتھا لڑکا اسے درمیان سے سہارا دیئے ہوئے تھا تاکہ وہ گر نہ پڑے۔ میرے بستر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ ہمارے کل

چار تنگ تھے۔ دو بستر، ایک اٹیچی اور ایک سوٹ کیس۔ ایک درجن بچے ان کو اٹھائے تھے یا اٹھانے والوں کو اخلاقی سہارا دے رہے تھے۔ ہم ایک قافلے کی صورت میں بچوں کی فوج کو جلو میں لئے اس بزرگ آدمی کے مکان پر پہنچے جس سے ایپی کیورس کو کام تھا۔ وہ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ایک چھوٹے ٹائپ مکان میں اقامت پذیر تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت مکان پر موجود تھا — اُجلے کپڑوں میں سفید داڑھی والا ایک شگفتہ مزاج بوڑھا آدمی — فادر کرسمس بس وہ اس سے بڑا مشابہ تھا۔ اپنی بیٹھک میں چارپائی پر لیٹا مولانا پرویز کی ایک کتاب "سلیم کے نام" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پرویز صاحب میرے باپ کے چہیتے دینی مصنف ہیں اور مذہب کے بارے میں اس کے بیشتر نظریے اسی مصنف کے خیالات کے مرہونِ منت ہیں۔ اس حسن اتفاق نے میرے دل میں فادر کرسمس سے ایک گونہ ہمدردی پیدا کر دی۔

فادر کرسمس کے تھوڑے بہت تعارف کی ضرورت ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ سول انجینیر تھا۔ اس کی ایپی کیورس کے باپ سے گہری دوستی تھی۔ ایپی کیورس کے باپ نے تھل میں زمینیں خریدی تھیں اور ریٹائر ہونے کے بعد یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے پہلی ضروری چیز ایک رہائشی مکان تھا اور فادر کرسمس دوستی کی بنا پر اور موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے اس مکان کی تعمیر کی نگرانی کر رہا تھا — ایپی کیورس کو اسی مکان میں بعض مجوزہ تبدیلیوں کے بارے میں فادر کرسمس سے گفتگو کرنا تھی۔ اس کا جوہر آباد میں آنے کا یہی مقصد تھا۔

فادر کرسمس نے ہمارا کل سامان اپنی چارپائی کے نیچے رکھوا دیا۔ ایپی کیورس نے مصلحتاً جھوٹ بولا کہ ہمیں شام کو پانچ بجے تک خوشاب میں اپنے ایک دوست کے یہاں واپس پہنچنا ہے جو ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ فادر کرسمس اس اطلاع سے کافی مطمئن سا معلوم ہوا۔ پھر اس نے پوچھا کہ ہمیں کھانا تو کھانا ہی ہوگا۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے پرامید نظروں سے ایپی کیورس کی طرف دیکھا۔ مگر ایپی کیورس نے کمال ضبط سے فادر کرسمس کو یقین دلایا کہ ہم خوشاب سے کھانا کھا کر چلے تھے۔ فادر کرسمس نے کہا "تکلف کی بات نہیں، نہ کھایا ہو تو میں تیار کرنے کے لیے کہلا دوں۔" مگر ایپی کیورس اپنی بات پر ثابت قدمی سے ڈٹا رہا — اس امر واقعہ کے باوجود کہ پچھلے دن لنچ کے بعد ہم نے باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا اور اب ہم دونوں بھوک کے مارے تقریباً جاں بلب ہو رہے تھے۔

ایپی کیورس اور فادر کرسمس تھوڑی دیر مکان کے منصوبے کی تبدیلیوں پر بحث کرتے رہے۔ ایپی کیورس، میرا خیال ہے، مکان میں دو گیراج بنانے کا خواہشمند تھا۔ فادر کرسمس کی رائے میں ایک گیراج ہی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھا۔ فادر کرسمس نے دھوپ میں ایپی کیورس کے ساتھ موقع پر چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ہم پھدری نمے سایہ دار سڑکوں پر چلتے اس جگہ پر پہنچے جہاں ایپی کیورس کا مکان زیر تعمیر تھا۔ فادر کرسمس اور ایپی کیورس نے مکان کی پلین پر ایک طویل بحث کی اور ایک گھنٹے کے بعد اس نے گیراجوں کے مسئلے کو تسلی بخش طور پر حل کر لیا۔ اس امر کے باوجود کہ میں پتھر اور اینٹوں کی سب عمارتوں کے خلاف ہوں، میں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔

فادر کرسمس پھر ہم سے تھوڑی دیر کے لئے جدا ہو گیا۔ اس نے مزدوروں کو اپنے مکان کے بارے میں چند ہدایات دینا تھیں جو اب تکمیل کے آخری مرحلے پر تھا۔ یہ مکان ایک وسیع مسجد لگتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ انجینیرنگ کے پیشے کے لوگ عمارتوں کے جمالیاتی پہلو سے اس درجہ نابلد ہوتے ہیں (ایپی کیورس اس سے مستثنےٰ ہے)۔

واپس لوٹتے ہوئے (فادر کرسمس کے بغیر) ایپی کیورس جوہر آباد کے بارے میں جوش اور وارفتگی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ صحراؤں سے محبت کرتا ہے ان سے بھی زیادہ پہاڑیوں سے۔ اور جوہر آباد میں دونوں چیزیں موجود تھیں۔ "اس جگہ کی بڑی کشش یہ ہے۔" اس نے کہا کہ پہاڑیاں اتنی قریب ہیں اور آدمی کسی وقت بھی ان تک پہنچ سکتا ہے۔"

"وہاں" ایچی کیوریس نے پہاڑیوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "ندیم کا گاؤں انگہ ہے"

اس نے ان پہاڑیوں کو میری نگاہ میں اور رومینٹک بنا دیا۔

سیدھے فادر کرسمس کے مکان پر جانے کی بجائے، اور تھکاوٹ اور گرمی کے باوجود ہم جوہر آباد کے بازار میں نکل آئے۔ دو رویہ ستونوں پر استادہ چوڑے برآمدوں والی دوکانیں تھیں۔ یہ دوکانیں خوشنما تھیں مگر بیشتر دوکاندار چھوٹے نانبائی یا اشتہاری حکیم یا حجام تھے۔ یہ ایک مایوس کن بازار تھا۔ میں نے متعدد قصبے دیکھے ہیں۔ جہاں کے بازار اس سے کہیں پر رونق اور پُر رنگ ہیں۔ ایک فرلانگ کی سیر میں ہم نے پانچ ہیر کٹنگ سیلون دیکھے۔ انھیں دیکھ کر ہمیں یاد آیا کہ ہمیں شیو کی سخت ضرورت تھی۔ ہم ایک سیلون میں جا گھسے۔۔۔ یہ ایک بے انتہا غلیظ اور تاریک جگہ تھی۔ حجام صورت سے ایک قاتل معلوم ہوتا تھا مگر ایک بار اندر جا کر پلٹنا ناممکن تھا۔ میں نے ایک بالکل کند استرے سے حجامت کرائی اور میری سفارش پر ایچی کیوریس بھی اس آزمائش میں سے گذر گیا۔ بازار میں کچھ اور وقت ضائع کرنے کے بعد جب ہم فادر کرسمس کے مکان پر پہنچے تو وہ ہماری راہ دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ ہم کہاں گم ہو گئے تھے۔ اسی کمرے میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد ایچی کیوریس نے غسل کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ہم نے چائے پی۔ فادر کرسمس نے انتہائی نیک دلی اور مروت سے چائے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے ندیدے بچوں کی طرح کھایا۔ فادر کرسمس کی آنکھیں تمتمائیں۔ اسے معلوم ہو گیا کہ کھانا کھا چکنے کا ہم نے جھوٹ بولا تھا۔

چار بجے ہم فادر کرسمس کے نوکروں سے سامان اٹھوا کر بس کے اڈے پر پہنچے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس کے آثار نہ تھے مگر ہمیں بڑی سڑک پر ایک اور لاری مل گئی جو خوشاب تک جا رہی تھی۔ یہی ہمارا مدعا تھا۔ ہم وہاں سے پانچ بجے شام چلنے والی مسافر گاڑی پکڑ کر ملکوال جانا چاہتے تھے۔ ملکوال سے ساڑھے گیارہ بجے رات ہم چناب ایکسپریس پکڑ سکتے تھے۔

ہم خوشاب کے اڈے پر اس وقت پہنچے جب پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ہم نے سڑک پر سے مسافر گاڑی کو اسٹیشن پر کھڑے اور بے صبری سے سیٹیاں مارتے سنا تھا۔ کیا ہم اس بھاگ دوڑ کے بعد اس گاڑی کو پکڑ لیں گے؟ بس سے اترتے ہی ہم نے سامان کو ایک تانگے میں رکھا اور بھاگم بھاگ اسٹیشن پر پہنچے۔ پانچ میں دو منٹ! اور ہم نے گارڈ کی تیز وسل کی آواز سنی۔

ہم اس گاڑی میں سوار کیا ہوئے، کود گئے اور جب وہ پانچ بج کر پانچ منٹ پر خوشاب کے پلیٹ فارم پر حرکت کرنے لگی تو میں اور ایچی کیوریس اپنے سامان سمیت بچوں کی طرح خوش اس کے ایک انٹر کلاس کے ڈبے میں متمکن تھے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ ہم تو گاڑی سے تقریباً رہ گئے تھے۔

ہم نے سگریٹ سلگائے اور بھوری پہاڑیوں کی طرف طمانیت سے دھواں اڑانے لگے

بھوری پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ

یہ مسافر گاڑی شاید دنیا بھر کی گاڑیوں میں سب سے آہستہ رفتار تھی۔ یہ زریں سہ پہر میں چمک چمکاتی اس کاہلی اور آلکسی سے چل رہی تھی جیسے اسے کسی خاص منزل پر نہ جانا ہو بلکہ بس یونہی سیر گشت کرنے نکلی ہو، مگر اسے ملکوال تک ہی تو جانا تھا۔ جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک ایسی رفتار سے جو بیس میل سے شاذ و نادر ہی بڑھتی تھی، یہ اچھی بوڑھی گاڑی گلابی پہاڑیوں کے نیچے چٹیل سیاہ ترائی کے میدان میں اچھلتی اور کودتی چلنے اور بھاگنے کی درمیانی کیفیت میں مبتلا تھی۔

ترائی ایک مستقل دلچسپیوں کی تصویروں کا البم تھی۔ آدمی اسے دیکھتا دیکھتا سیر نہ ہو سکتا۔ ابھی تمہارے سامنے ایک اونچی گھاس اور

سبزے کی چراگاہ ہوتی۔ دوسرے لمحے ایک سیاہ بے آب و گیاہ چٹیل میدان تمہارے سامنے آجاتا اور اس کی ویرانی تمہارے خون کو برف کر دیتی۔ پہاڑی نالوں نے ترائی کو جابجا چھیدا ہوا تھا اور برساتی پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ ریلوے لائن کے آس پاس بن گئے تھے۔ جوں جوں شام قریب آتی گئی ترائی ایک ہولناک حسن کا روپ اختیار کرتی گئی۔ "وورنگ ہائٹز کے" موڑ بھی ان میدانوں سے زیادہ اداس نہ ہوں گے کبھی کبھی تم کاشت زدہ زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ دیکھتے۔ اس کے گرد پتھر کی دیواروں کی باڑ ہوتی تاکہ فصل پہاڑی نالوں سے بچ سکے مگر بیشتر زمین ریتیلی تھی اور اس پر ہل نہ چلتا تھا۔ ایچ کیورس نے مجھے بتایا کہ اگر حکومت ذرا تخیل سے کام لے تو اس ترائی میں شاندار جنگلات اگائے جا سکتے ہیں اب اس میدان میں اکا دکا خال خال درخت تھے اور لوگوں نے جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر ختم کر دیا تھا۔

تاہم عجیب بات یہ تھی کہ گو ترائی بظاہر آدمی اور حیوان کے لئے روزی اور پرورش کے ذرائع مہیا نہ کرتی تھی۔ مگر انسان یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ہم نے کئی ایک اچھے خاصے گاؤں اور قصبے دیکھے ـــ برساتی نالوں کے ریتیلے کناروں پر پتھر اور گارے کے بڑے گدڑ سے دلفریب گاؤں۔ وہ اپنی پیچدار گلیوں اور اونچے مکانوں کے ساتھ بھڑوں کے چھتے لگتے تھے۔ کتنے خوش قسمت وہ لوگ تھے۔ جو ان قصبوں میں بود و باش رکھتے تھے۔ ان کی پتھریلی حویلیوں میں رہتے تھے۔ ان کی تنگ ٹیڑھی ناہموار گلیوں میں چلتے تھے۔ آدمی کو ان لوگوں کی خوش نصیبی پر رشک آتا تھا۔ کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ آدمی ایسی جگہوں میں رہے اور اس کا دل خوشی سے دور ہو۔ ہمارے ڈبے میں نکر اور کھلے کالر کی قمیص میں ایک سکول ماسٹر سفر کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا مگر شاداں تھا۔ وہ چھٹیوں پر اپنے بیوی کے ہمراہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا۔ وہ راستہ بھر اپنے ایک دوست سے باتیں کرتا رہا جن کی بھنک ہمارے کانوں میں کبھی کبھار پڑ جاتی۔ اس نے کئی ایک سیانی اور ہنسانے والی باتیں کہیں اور اپنے بیشتر ہم پیشوں کے برعکس ایک سمجھدار پر مذاق اور شستہ نوجوان تھا۔ ایک اسٹیشن پر اس شخص نے ہمیں چھوڑ دیا۔ گاڑی کے اسٹیشن سے باہر آجانے کے بعد ہم نے اسے پھر دیکھا۔ وہ اور اس کی بیوی دیہاتیوں کے ایک گروہ کے ساتھ نیلے جھٹپٹے میں ایک پہاڑی نالے کے راستے کے بیچوں بیچ رواں تھے ـــ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں نالے کی ریت گویا پسے ہوئے لعلوں کی خاک تھی۔ ان کا خوبصورت گاؤں، پہاڑیوں کے دامن میں ہمیں بے انتہا سحر آگیں لگا۔ مجھے یقین ہے، اس کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے سکول ماسٹر کا دل گاتا ہوگا۔ قابل رشک آدمی! کاش میں وہ سکول ماسٹر ہوتا اور اس گاؤں کو اپنا وطن کہہ سکتا۔ پھر میں نے سوچا میرا اپنا گاؤں بھی پہاڑیوں کے دامن میں ہے اور کوئی کم خوبصورت نہیں ہے۔

اس سفر میں بعض لوگوں کی نمود پرستی اور دوسروں سے بے اعتنائی کی ایک مثال دیکھنے میں آئی جس نے اس وقت تو ہمیں ہنسایا مگر اب اس کی یاد آتی ہے تو غصہ محسوس ہوتا ہے۔ گاڑی میں ایک مسجع مقطع پیر اپنے بے شمار مریدوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ دو اسٹیشنوں پر اس نیک آدمی نے پلیٹ فارم پر اپنے مریدوں اور دوسرے مسافروں کی جماعت کو نماز پڑھائی اور گاڑی کو ان کے لئے کچھ دیر رکنا پڑا۔ پیر بڑے اطمینان اور سکون سے جماعت کراتا تھا جیسے اسے یقین تھا کہ گاڑی اس کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اس کے مقتدیوں کے ایمان البتہ اتنے پختہ نہ تھے۔ وہ نماز پڑھتے ہوئے بھی گاڑی پر چوری کی ایک نگاہ ڈال لیتے تھے ـــ بے چارے گارڈ کو مجبوراً اس وقت تک گاڑی کو ٹھیرانا پڑتا جب تک کہ پیر اور اس کے مرید نماز سے فارغ نہ ہو چکتے نماز یقیناً ایک اچھی چیز ہے۔ دو درجن دیندار لوگوں کی باجماعت نماز ایک روح پرور منظر ہے لیکن کیا اس پیر کے لئے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ اپنی پارسائی اور خدا شناسی کا یوں دکھاوا نہ کرتا؟ دوسرے مسافر جنھوں نے ڈبے ہی میں نماز پڑھ لی تھی اسے اور اس کے نمازیوں کو گاڑی لیٹ کرنے پر کوس رہے تھے میں نے ایچ کیورس سے کہا کہ اگر میں اس گاڑی کا گارڈ ہوتا تو گاڑی ٹھیک وقت پر چلا دیتا۔ تب مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اپنی نماز توڑ کر ڈبوں کی طرف بھاگتے اور اس سے ان لوگوں کو قومی ذمہ داری کا ایک ایسا سبق مل جاتا جسے وہ جلد نہ بھول سکتے

تمام کے میدانوں اور پیلی پہاڑیوں پر رات پڑ گئی تھی۔ کھیوڑہ دور نیلی پیلی روشنیوں کا انبوہ تھا ــــ آٹھ بجے گاڑی ملکوال جنکشن میں داخل ہو گئی۔ ہمارے سید و شریف کے سفر کی تیسری منزل اختتام پر تھی

پہاڑیوں کے اُوپر اور دُور دُور

چناب کے آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے ملکوال پر پاکستانی شرفاء کے کمرے میں کھانا کھایا۔ اس کی ہر چیز غیر حقیقی اور ہوائی تھی۔ پاکستانی شرفا کے لئے یہ ریلوے کا اسٹینڈرڈ کھانا ہے ــــ باسی پلاؤ کی ایک پلیٹ، آلو گوشت کا سالن اور فیرنی کی سائمر۔ مجھے شک ہے کہ اسے ریلوے اپنی خاص خفیہ ترکیب سے تیار کراتی ہے اور پھر اسے ایک کتاب کی طرح ہزاروں جلدوں میں شائع کر دیا جاتا ہے، تم اسے لاہور میں کھاؤ یا لالہ موسیٰ میں، اس کے ذائقے میں ذرہ بھی فرق نہ ہوگا۔ یہ تمہاری اشتہا کو مطمئن نہیں کرے گا بلکہ اسے گویا ایک کند اوزار سے قتل کر دے گا۔

چناب کا انٹر کلاس کا مردانہ ڈبہ مسافروں اور اسباب سے بالب ٹھنسا ہوا تھا۔ ساری گاڑی میں لے دے کر ایک ہی ڈبہ تھا۔ ایک مردانہ ڈبہ اور بھی تھا لیکن وہ چند زبردست اور دلیر خواتین کے تصرف میں تھا۔ ریلوے اسٹاف کی سب دھمکیاں اور منتیں ان خواتین سے ڈبہ خالی کرانے میں ناکام رہیں۔

رش کی حالت دیکھ کر ہمارا جی بیٹھ گیا مگر قلیوں نے ہماری ہمت بندھائی۔ انھوں نے پہلے تو جوں توں کر کے بند دروازے کی کھڑکی سے ہمارا سامان اندر پھینکا اور پھر سامان کے بعد ہماری باری آئی اور قلیوں نے ہمیں باری باری اٹھا کر دروازے میں سے اندر گھسیڑ دیا۔ کافی عرصے تک ہمیں پتہ نہ لگ سکا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا اسباب کونسا۔ آدمی آدمی پر چڑھا بیٹھا تھا۔ بعض لوگ دوسرے لوگوں کی گود میں بیٹھے تھے۔ بعض اسباب کے اوپر لٹکے ہوئے تھے۔ اور میں نے کم از کم ایک ایسا مسافر بھی دیکھا جس کے اوپر اسباب بیٹھا ہوا تھا ــــ اپنی کیوریس اور میں ٹرنک پر رکھے ہوئے ایک بستر کے اوپر بڑے غیر آرام دہ طریق پر ایک دوسرے سے ٹیک لگائے بیٹھ گئے۔ میری گود میں ایک سوئے ہوئے بچے کے پاؤں تھے۔ بعض وقت وہ بچہ پاؤں پھیلا کر میرے پیٹ کے نچلے حصے میں مارتا یا غصے میں دانت پیستا اور خواہش کرتا کہ کاش میں اس بیہودہ پلندے کو اٹھا کر باہر پھینک سکتا مگر یہ ناممکن تھا کیونکہ بچے کے ساتھ اس کا مالک بھی تھا اور وہ بچے کے پیٹ پر ٹانگیں رکھے اونگھ رہا تھا۔

"چناب گھٹا ٹوپ اندھیرے میں فراٹے بھرتی چلتی رہی۔ یہ ایک مستقل اذیت کی رات تھی ــــ ایک اسٹیشن پر کھلی کھڑکی میں سے ایک پاگل اندر چھلانگ آیا۔ وہ الف ننگا تھا اور اس کے پتلے جسم پر میل کی تہیں جم جم کر اس کی جسم کی رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ لمبوترا چہرہ، جھکی ہوئی مونچھیں اور اونچی فراخ پیشانی۔ میرا خیال ہے وہ پاگل ہونے سے پہلے کسی قسم کا پروفیسر تھا۔ وہ اپنی کیوریس کے ساتھ بستر پر بیٹھنا چاہتا تھا ہم نے اُسے آگے نکل جانے پر اکسایا۔ وہ ایک مسخرا سا تھا اور اس کے پاگل پن کا باقاعدہ ایک اسلوب تھا۔ بعض وقت وہ تیر کی طرح کھڑا ہو جاتا اور پاؤں ملا کر سیلوٹ کرتا۔ بعض وقت وہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھا لیتا اور اس کے گھٹنے کو پکڑ کر دوسری ٹانگ پر بچوں کو محظوظ کرنے کے لئے گھومتا۔ اب وہ اپنی انگلیوں کو ہوا میں چٹخاتا اور اب اپنے کو ایک ناچنے والی عورت تصور کر کے ہاتھوں کے اشارے سے ایک بڑے سنجیدہ انداز میں ناچتا اور اپنے پاؤں فرش پر مار کر غیر مرئی پازیبوں کی چھنک سنتا ــــ اس پاگل کے آجانے سے ہماری مصیبت کا پیالہ بے شک اتنا بھر گیا جتنا کہ خواہش کی جا سکتی تھی ــــ تین چار اسٹیشنوں کے بعد وہ ہمارے ڈبے میں سے خود ہی باہر پھلانگ گیا۔ کیا وہ واقعی پاگل تھا یا بن رہا تھا؟ اگر وہ پاگل ہی تھا تو ایک معصوم بے ضرر پاگل تھا جس کی حرکات چھوٹے بچوں کو ہنساتی تھیں۔ وہ ان خطرناک پاگلوں میں سے نہیں تھا جن کی دیوانگی طاقت حاصل کرنے یا روپیہ جوڑنے کی ہوس کا روپ دھار لیتی ہے اور جو اپنے حقیر فائدے کے لئے ہزاروں اور لاکھوں جانوں کو قربان کرنے سے نہیں چوکتے۔ نہیں یہ بے چارہ ننگ دھڑنگ انسان تمہارے افسروں اور سیاست دانوں اور سٹہ بازوں سے زیادہ ہوشمند

تھا۔ اس کی دیوانگی ایک معصوم ڈگر پر چل نکلی تھی۔

جب گاڑی راولپنڈی پہنچی تو عمل چار بجے کا ہوگا۔ یہاں تقریباً سارے مسافر اترتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے راولپنڈی تہذیب کی آخری سرحد ہو اور کسی کو اس سے آگے جانے میں دلچسپی نہ ہو ــــ ماسوا چند سرحدی دلیر روحوں کے ــــ ڈبے کے خالی ہوتے ہی ہم نے بستر کھول کر بچھائے اور لمبی تان کر سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو سورج بڑی دیر کا نکل چکا تھا اور گاڑی عنبری رنگت کی چٹانوں کے دیس میں بل کھا رہی تھی۔

ہم نے گاڑی میں ناشتہ کیا۔ ۹ بجے کے قریب ہم اٹک کے پل پر سے گزرے ــــ دریائے سندھ نیچے چٹانوں میں سے بل کھاتا ہوا۔ اور شہر اپنے پتھریلے مکانوں کے ساتھ ایک چٹان پر بنا ہوا۔ یہی کیوریس نے اس کے قلعے کی طرف اشارہ کیا۔ زمین اب قدرے سیاہی مائل تھی اور میرا خیال ہے کہ زرخیز ہوگی۔ گاؤں بہت سے تھے۔ بھیڑیں ڈھلانوں پر اٹھلاتے ہوئے۔ ان کے کوچے چوڑے اور کھلے تھے۔ ہر ایک کے بیچ میں چار برجوں کا ایک مٹیالا قلعہ تھا۔ یہ ہمیں یاد دلاتا تھا کہ یہ اس بہادر جنگجو قوم کی سرزمین تھی جس کی تاریخ قبائلی خونریزیوں اور اپنی آزادی کے لئے لڑائیوں سے پُر تھی ــــ مضطرب، مضبوط پٹھانوں کی سرزمین جن کے مزاج بلکے سے، سبک سے جھلے سے بھی بھڑک اٹھتے اور وہ بر افروختہ ہو جاتے تھے۔ کئی سو برس سے قبائلی احساس اور غرور ان میں زندہ تھا۔ اس غرور نے ان کے بہادر بے پروا کردار کی تشکیل کی تھی۔ یہ قبائلی غرور اب بھی مرا نہ تھا اور پرانی عداوتوں کو قبیلوں نے ابھی بھلایا نہ تھا۔

گاڑی کے کھلے دروازے کے پاس ادھیڑ عمر کا ایک پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی میلی اور کھچڑی ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ قدرے زرد اور غیر صحت مندانہ طور پر عجیب تھا اور ہر پانچ منٹ کے بعد وہ اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک ڈبیہ نکالتا اور نسوار منہ میں رکھتا۔ وہ بار بار کھلے دروازے میں سے تھوکتا۔ شاید اسی وجہ سے وہ دروازے کو مستقلاً کھلا رکھے ہوئے تھا۔ یہ نسوار کھانے کی عادت اور متواتر تھوکنے کی عادت ان اچھے پہاڑی لوگوں میں عام ہے۔ اس نے میرا خیال ہے ان کی صحتوں اور کرداروں پر برا اثر ڈالا ہے اور شاید آج کل کے نوجوان پٹھان اپنے جفاکش اسلاف سے قد میں قدرے چھوٹے رنگت میں پیلے، طاقت میں ہیٹے ہو گئے ہیں۔ ایک آدمی تمباکو کیوں کھائے یا اسے مٹھیاں بھر بھر کر اپنی ناک میں کیوں گھسیڑے، جب وہ اسے ایک پائپ یا سگریٹ میں بھی پی سکتا ہے اور دھوئیں کے مرغولوں میں خوشی کے خواب دیکھ سکتا ہے۔

یہ آدمی خٹک قبیلے کا تھا (جیسا کہ ہمارے پوچھنے پر اس نے ہمیں بتایا)۔ چودہ سال پہلے اس نے اپنے کوہستانی پہاڑوں کو چھوڑا تھا اور اس مدت میں ایک بار بھی اس نے ان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اس نے بڑی دنیا میں کسی کاروبار میں روپیہ کمایا تھا لیکن (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) صحت کھو بیٹھا تھا اور اب مایوس ہو کر اس امید سے اپنے وطن کو لوٹ رہا تھا کہ کھلی پہاڑی ہوا اور صاف آہنی پانی پھر اس کی رگوں میں خون کی حدت کو تازہ کر دیں گے اور اس کے جسم (اور روح) کے ان گنت عوارض کو دور کر دیں گے۔

"تم اپنا وطن چھوڑ کر کیوں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا "یہاں کام کوئی نہیں۔ زمین ظالم ہے اور کچھ نہیں اگاتی۔ میں روزی کے لئے باہر نکل پڑا۔ اور میں نے حیدرآباد میں کاروبار میں بہت روپیہ کمایا ہے۔ اب میں امیر آدمی ہوں۔"

"لیکن تم نے اپنی صحت کھو دی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ سچ ہے" اس نے سوچ کر کہا "مگر روزی کا سوال تھا ــــ" اور پھر اس نے کھڑکی میں سے زرد، وحشی چٹانی ڈھلانوں کو اپنی عقابی سخت آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا۔ (ان آنکھوں میں اس وقت ایک نرمی سی آگئی) "میرے وطن جیسا دنیا میں کوئی وطن نہیں ہے۔ ایسی ہوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ یہاں کا پانی اکسیر ہے ــــ سراسر صحت ہے۔ تم اسے پیو تو تمہارے اندر لوہا بھی ہو تو ہضم ہو جاتا ہے ــــ اگر مجھے یہاں روزی مل جاتی تو میں یہاں سے کبھی بھی نہ جاتا۔ ایسی جگہ ہے۔

کون جانے۔ ایسی ہوا کو کون چھوڑے۔۔۔ میں نے روپیہ کما لیا ہے مگر سندھ میں صحت برباد کرلی ہے۔ وہاں کا پانی بڑا خراب ہے۔ وہاں جتنی اچھی خوراک کھاؤ اتنی ہی بدہضمی اور پیچش پیدا ہوتی ہے۔"

"کیا تمہارے وطن میں تمہاری تھوڑی بہت زمین نہ تھی؟"

"دو ایکڑ زمین تھی لیکن اس سے کیا بنتا تھا۔"

"ایک آدمی اس پر زندہ رہ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ابھی ایک نوجوان لڑکے ہو۔" ادھیڑ عمر پٹھان نے کہا۔

ہم نے پھر اس سے سوات جانے کے راستے کے بارے میں پوچھا۔ کیا ہمیں نوشہرہ اُترنا چاہیئے یا آگے پشاور جانا چاہیے۔ ان علاقوں سے اتنا عرصہ دور رہنے کی وجہ سے وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے اپنے چند رشتہ دار یاد تھے جو سرحد کے پہاڑوں میں پیر بابا کے مزار پر گئے تھے۔ وہ پشاور سے چارسدہ کو روانہ ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ اسے پتہ نہ تھا۔ اور شاید اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ وہاں سوات کے نام کی کوئی جگہ ہے۔ وہ اپنی گٹھڑیوں کے ساتھ اکوڑہ خٹک کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ چودہ سال کے بعد اپنے وطن کے پلیٹ فارم پر پہلی بار کھڑے ہو کر اور اس آشنا صحت افزا ہوا میں سانس لے کر اس کے احساسات کیا ہوں گے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زیادہ تخیل سے مالا مال نہ تھا۔ دنیا کی حقیقتوں نے اسے عملی، عیار اور تنگ دل بنا دیا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ چاندی کی لعنت اس پر پڑ گئی ہے۔ اس لعنت سے زیادہ روح اور نیک جذبے کو کچلنے والی کون سی چیز ہے؟

اکوڑہ خٹک کا گاؤں۔۔۔ خوشحال خاں کا خٹک۔۔۔ جیسا کہ ایچ کیوریس نے مجھے یقین دلایا، ایک اونچے ننگے سرخ پہاڑ کی ڈھلان پر ہے۔ یہ مجھے ایک شیر کی کچھار کی طرح لگا۔ اس جگہ میں نے سوچا۔۔۔ اکبر اور اورنگ زیب کے مغل اور راجپوت شاہسواروں اور پہاڑی پٹھان قبیلوں میں کتنے ہی معرکے ہوئے ہوں گے مغل توپ خانے یہاں گونجے ہوں گے اور چٹانیں خون سے لال ہو گئی ہوں گی۔۔۔ اقبال کی شاعری نے خوشحال خان کے نام کو ایک دوست کے نام کی طرح آشنا کر دیا ہے۔ ایک آتشیں شاعر، بہادر سپاہی۔۔۔ اور مغرور محب وطن۔۔۔ خوشحال ان وحشی پہاڑیوں کی آزاد روح کو اپنی ذات میں مجسم کئے ہوئے ہے۔ یہ سادہ پٹھان فولاد کی طرح سچا، چٹان کی طرح کڑیل اور بلبل کی طرح نغمہ گو تھا۔۔۔ سب اچھے آدمیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تم اسے سن کر محسوس کرتے تھے کہ زندگی کو اسی طرح بسر کرنا چاہیئے۔ اکوڑہ خٹک کے اسٹیشن پر ہم نے تین چار بچے دیکھے جو ہار بیچ رہے تھے۔ پٹھانوں کو پھولوں سے بڑی محبت ہے۔ ایچ کیوریس نے اس جگہ کی نشانی کے طور پر چنبیلی کے چند ہار خریدے اور انھیں میرے گلے میں ڈال دیا۔

پھر ہم نوشہرہ پہنچ گئے۔ یہاں ہم اُترے۔۔۔ کیا ہمیں سیدو جانے کے لئے یہیں اُترنا چاہیئے تھا؟ ہمیں اس کے بارے میں یقین نہ تھا۔ نہ ہی ہم نے کسی سے پوچھا بلکہ سیدھے سامان اُٹھوا کر تانگے کے اڈے پر آ گئے۔

تانگے کا کوچبان ایک روکھا پھیکا پٹھان تھا۔۔۔ بڑا ناخوشگوار اور بڑا کڑوا۔۔۔ اسے ہمیں لے چلنے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ وہ ہمیں گستاخ مضحک نظروں سے دیکھتا رہا جب قلی نے سامان اس کے تانگے میں رکھ دیا تو وہ چلنے سے پہلے ہم سے کرایہ طے کر لینا چاہتا تھا۔

"لاری کے اڈے تک دو روپیہ لے گا۔" اس نے درشتی سے کہا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی چیز تھی کہ ہماری کنپٹیوں میں خون جمع ہو گیا۔ جی میں آئی۔ اس کا تانگہ چھوڑ کر کوئی دوسرا تانگہ لے لیں لیکن اب ہم اس میں سوار ہو چکے تھے۔ ہم غصے کو پی گئے۔

"دو روپے ہی دے دیں گے۔ چلو،" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس شخص نے غالباً یہ یکہ گرگو دو روپوں پر ہم نے آنکھ تک نہ جھپکی تھی اور اس کی مانگی ہوئی اجرت دینے پر فوراً تیار ہو گئے تھے۔ ہمیں شاید امیرزادے سمجھا۔ اس نے شاید یہ بھی بھانپ لیا کہ ہم نو وارد تھے۔ اس نے اب ہمیں نصیحت کی کہ ہم سوات جانے کے لئے ویگن کرایہ پر لے لیں۔ وہ اپنی ساری باتوں میں ہمیں یہ تاثر دیتا رہا کہ سوات تک بس میں پہنچنے کا خیال انتہائی مضحکہ خیز ہے اگر ہم نے ایسا سوچا تو یا ہم بے وقوف تھے یا باؤلے۔ غالباً ویگن والوں سے اس کی کوئی "انت سٹا" تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "ویگن کا پورا کرایہ کیا ہوگا؟" وہ حیران رہ گیا جیسے ہم نے ایسا سوال سن کر اسے بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ اس نے کھرے انداز میں کہا "میں نہیں جانتا۔" ہم سڑک کے کنارے ایک بڑے شیڈ کے پاس پہنچے۔ چار پانچ ٹوٹی پھوٹی ویگنیں یہاں کس مپرسی کے عالم میں کھڑی تھیں۔ کوچبان نے کہا "ایک اڈہ یہ ہے۔ ہم تانگہ کو ادھر کھڑا کرتا ہے۔ آپ ویگن والوں سے بات کر آئے۔"

"ہمیں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر لے چلو،" ہم نے غصے سے کہا۔

یا تو وہ ہم سے وہیں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا یا وہ ویگن والوں کے لئے مسافر لاکر ان سے کمیشن ہتھیانا چاہتا تھا — میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر ہمارے جواب نے اسے بے حد خفا کر دیا۔ اس سے ہمیں خوشی ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر خون کی جھلکاہٹ دیکھی۔ اس کی گھنی مونچھیں اینٹھیں۔

"آپ لوگ خراب ہوگا" اس نے جھلاہٹ میں کہا "ہمارا بات مانو۔"

"گورنمنٹ بس کے اڈے پر چلو،" اب میں اس کی خفگی کا لطف اٹھانے لگا تھا

یہ دیکھتے ہوئے کہ ہم نے اس کے قابل قدر مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا، اسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ہمارے خلاف غصے سے دل ہی دل میں کھولتا رہا۔ وہ بالکل چپ اور زیادہ روکھا ہو گیا اور گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے تک وہ ایک لفظ نہ بولا۔ نہ ہی ہم نے اس سے کوئی مشورہ لیا۔

نوشہرہ ایک چمکیلا مسکراتا ہوا شہر ہے اور سرحد کے اکثر شہروں کی طرح ایک ماڈرن، ستھری "لک" رکھتا ہے۔ اڈے پر پہنچ کر ہم نے اس بگڑے دل کوچبان کو پیسے دیئے۔ اس کی خفگی ابھی تک اس کی کنپٹیوں میں تھی اور وہ ہمیں قاتلانہ نگاہوں سے گھورتا تھا۔

اڈہ ایک ڈھلوانی برآمدے کی لمبی پتھر کی عمارت تھی۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی نیلی بسیں اس کے سامنے قطار اندر قطار کھڑی تھیں اور یہ جگہ ایک ریلوے اسٹیشن کی طرح مصروف اور پُر رونق تھی۔ اپی کیورس غائب ہو گیا۔ پھر وہ یہ پتہ لگا کر آیا کہ سیدو شریف کو لاری غالباً مردان سے چلتی ہے۔ (کسی کو یقین نہ تھا) مگر مردان کو جانے والی بس آدھ گھنٹہ پہلے نکل چکی تھی...... خوش قسمتی سے ایک اور مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس مردان جانے کے لئے تیار ہمیں مل گئی۔ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ایک منشی اس کے رنگین ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ اپی کیورس ٹکٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم سامان کو اوپر رکھوا کر بیٹھ گئے اور جلد ہی ہم مردان کی سڑک پر تھے۔

مردان کی سڑک کے دو رویہ چپٹے کھیت اور زمردیں درخت لہلہاتے ہیں۔ زرد گلاب کی پہاڑیاں چاروں طرف سے گھرتی آتی ہیں۔ گو یہ اپریل کا آخر تھا، یہاں ابھی گندم کی فصل کی کٹائی نہ ہوئی تھی اور سنہری خوشے ہواؤں میں غرور سے ہلتے تھے۔ بہار کا سانس ہر بیل اور ہر بوٹے۔ ہر پھول اور ہر پتی کو بیدار کر رہا تھا۔ سڑک تدریجی طور پر اوپر پہاڑوں کی طرف چڑھتی تھی لیکن ہم چڑھائی سے آگاہ نہ ہوتے تھے۔ ہمارے دل گانے لگے اور اپی کیورس مضطرب اور خوش، بار بار رنگی ہوئی پہاڑیوں کی طرف اشارے کرتا۔ مردان میں داخل ہونا اتنا اچھا تھا کہ ہمیں یقین نہ آیا۔ ہم اس کے عمدہ بازار میں سے گذرے اور پھر لاری نے ایک چوڑے پارک کا چکر کاٹا جس میں ایک قسم کا مانومنٹ تھا اور پھیری والوں کی دوکانیں اس کے چاروں طرف رنگوں کے بھڑکتے نمونے تھیں ۔۔۔ اور پھر ہم ایک اڈے کے پاس سے گذرے۔ ایک لاری وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی

پڑ سیدو شریف پڑھا۔ میرا دل اُچھلا۔ یہ ہمارا جادو کا قالین تھی مسافر اس میں بیٹھ رہے تھے اور اس کی چھت پر سامان رکھا جا رہا تھا — ہماری بس کچھ آگے جا کر رکی اور ہم دھڑکتے ہوئے دلوں سے سامان اُتروا کر سیدو شریف کی لاری کے اڈے کی طرف دوڑے۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں لاری چل نہ جائے۔ لاری ابھی کھڑی تھی (یہ دو گھنٹے بعد چلی) — ایچ کیورس نے ایک جگہ منگورا کے ٹکٹ خریدے۔ میں نے سامان چھت کے اوپر رکھوایا۔ لاری کے پاس ایک آدمی جو ایک بوسیدہ بھک منگا لگتا تھا مگر دراصل اس بس سروس کا کوئی اہم عہدیدار تھا، پشتو میں چلا چلا کر ہر کس و ناکس کو منگورا چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ لوگ کتنے بد ذوق ہیں کہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے — اس عہدیدار نے غالباً ہمارے لباس سے یہ جانتے ہوئے کہ ہم کوئی عام مسافر تھے۔ ایچ کیورس اور میرے لئے فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھولا "ادھر بیٹھو" پھر اسے خیال آیا کہ ہم دو تھے اور نشست ایک۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پچھلی نشستوں کی سمت اشارہ کیا۔ اس کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے کہا کہ فرنٹ سیٹ ایک کالج کے پروفیسر کے لئے ریزرو ہے (یہ کالج کا پروفیسر ایک افسانوی پروفیسر تھا۔ وہ آخر تک نمودار ہی نہ ہوا) — ہمارے بیٹھ جانے کے تھوڑی دیر بعد یہی عہدیدار (اسے دیکھ کر ذہن میں کئی چور اُبھر آتے تھے) پیچھے سے اندر آیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "کیا بات ہے؟"

"پانچ روپیہ اور دو" اس نے کہا — "آپ نے سامان کا کرایہ نہیں دیا۔"

ایچ کیورس اس وقت اتنا خوش تھا کہ اسے روپے کی پرواہ نہ تھی۔ وہ عہدیدار کو پانچ روپے دینے پر تیار ہو گیا لیکن میں بھانپ گیا کہ یہ شخص چالاکی سے ہم سے رقم اینٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ سختی برتی۔

"ہم بسوں ہی کے ذریعے یہاں تک پہنچے ہیں" میں نے اسے بتایا "اور ہمیں کہیں بھی سامان کا کرایہ ادا نہیں کرنا پڑا۔"

"اچھا تین روپیہ دو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا — وہ تھوڑی دیر متامل کھڑا رہا — ایک مکار بھک منگے کا انداز اپنی آنکھوں میں لئے اور پھر یہ دیکھ کر کہ ہم اتنے سادہ لوح نہ تھے کہ اس کے جھانسے میں آ جائیں، وہ چلا گیا۔ بلاشبہ اگر ہم اسے رقم دیتے تو وہ اسے خود اپنی جیب میں ڈال لیتا اور ہمیں رسید دینے کی ضرورت نہ سمجھتا۔ ایک غریب منگنے والے کو کچھ دینا اور چیز ہے اور اس طرح آہن کر اپنی نقدی سے ہتھیا بیٹھنا بالکل مختلف چیز ہے اور وہ آدمی ایک ناتجربہ کار مسافر ہے جو سفر میں اپنے بٹوے پر دھیان نہیں رکھتا۔ وقت گذرتا گیا۔ لاری اسی طرح کھڑی رہی۔ کنڈکٹر اب بھی بانگ پر بانگ لگائے جا رہا تھا "منگورا چلو منگورا" میں نے ایچ کیورس سے شکایت کی کہ بس چلتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس نے کلبی بن کر کہا کہ اسے اس کی کوئی فکر نہیں اور وہ اس لاری میں ایک سال انتظار کر سکتا ہے۔

لاری میں مسافر بھر چکے تھے اور جب سب نشستیں پُر ہو چکیں تو لکڑی کے تختے نشستوں کے بیچوں بیچ جوڑ دیئے گئے۔ مزید مسافر ان پر بیٹھ گئے۔ کنڈکٹر ابھی تک "منگورا منگورا" چلا رہا تھا معلوم ہوتا تھا ابھی چھت پر جگہ باقی ہے — کچھ وقفے کے بعد ایچ کیورس بھی لاری کے چلنے سے مایوس ہو گیا۔ اس نے اپنا سفری جرنل نکال لیا اور واڈے پر اپنے تاثرات پنسل سے تحریر کرنے لگا۔

بس کے اندر اور باہر سوات اور سیدو کی فضا تھی۔ مسافر گول ہلکے دار سواتی ٹوپیوں میں جفاکش پہاڑیے تھے۔ ان میں سے بیشتر سلیٹی ملیشا کی شلوار قمیص میں ملبوس تھے بعض مونج کے سلیپر پہنے تھے۔ افغانوں کی طرح وہ بھی بڑے تمبا کو کھانے والے تھے اور بڑے تھوکنے والے بھی۔ ایک جوان آدمی جو ہماری پچھلی نشست بیٹھا تھا اپنے ساتھی سے پشتو میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک خوش باش، بے پروا اور شیخی خورہ نوجوان تھا (جیسا کہ ہم میں سے بیشتر اپنی جوانی میں ہوتے ہیں) بعد کے ایک واقعہ سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے دوست کو محبت کی وادی میں اپنا دل ہار دینے کا قصہ سنا رہا تھا — ایک چھوٹا بچہ گلے میں خوانچہ لٹکائے آیا۔ وہ رنگا رنگ ازار بند اور پراندے بیچ رہا تھا۔ نوجوان سواتی نے اسے بلا کر پراندے دیکھے اور پھر بڑی احتیاط سے اور اپنے دوست سے مشورہ لے کر ان میں سے ایک کو پسند کیا — تم اب ساری کہانی مکمل کر سکتے ہو — میں ایک لفظ نہ کہوں گا۔

پونے بارہ بجے ڈرائیور لاری میں آ بیٹھا دکنی چور کے ڈرائیور ہونے کے بارے میں میرا وسوسہ غلط ثابت ہوا اور تھوڑی بہت جھوٹی خبرداریوں کے بعد ہم واقعی روانہ ہو گئے۔ ہم اُسی نیٹ پھتوں پارک اور میموریل کی طرف گئے۔ مردان سے باہر نکل آئے اور پھر فیکٹری کے بڑے پھاٹک پر آ رکے۔ یہاں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند کاروباری آدمیوں کو اپنے مال کے بورے لاری پر لدوانے تھے۔ اس عمل نے پورا ایک گھنٹہ لیا۔ بوروں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ ساری فیکٹری چھت پر لادی جا رہی ہے۔ تعجب یہ تھا کہ بہت اتنے سارے بوجھ سے نیچے پہیں نہ بیل گئے۔ قدرتی طور پر ایک قنوطی ہونے کی وجہ سے میں ہر لحظہ چھت کے بیٹھ جانے کی توقع کر رہا تھا اور جب بڑی دیر تک یہ حادثہ نہ ہوا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں ان بیوپاریوں کو اپنے گٹھڑوں کے نیچے دبتے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ خدا خدا کر کے ہم وہاں سے چلے — یہ خطہ اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا جس سے ہم آئے تھے۔ ہاں کھیتوں کے قطعے اب خال خال تھے اور چٹانیں قریب آ گئی تھیں — اونگھتے ہوئے ہم نے پہاڑیوں کو دیکھا۔ لاری کے ڈرائیور کی سامنے کے تختے پر ہدایات وغیرہ کو پڑھا۔ ان میں سے بعض بڑی مفید اور عبرتناک تھیں۔ ایک اطلاع دیتی تھی "ایکسپریس مل آگیا جی"۔ اس کے نیچے ایک مصرعہ تھا "قسمت ہمارے ساتھ ہے، جلنے والے جلا کریں"۔ اس شعر کے مخاطب غالباً دوسری رقیب بس لاریوں کے چلانے والے تھے۔ سب سے دلچسپ ہدایت یہ تھی "ڈرائیور کو تیز چلانے کی ترغیب نہ دیں"۔ اس سے شاید بس کمپنی کا مطلب یہ تھا کہ ڈرائیور آخر عام کمزور انسان ہوتا ہے اور تیز چلانے کی ترغیب سے فوراً اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ کمپنی والوں کو یہ علم نہ تھا کہ اس کے ڈرائیوروں کو ترغیب کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ڈرائیور ترغیب کے بغیر ہی لاری کو بڑا تیز چلاتا رہا اور سوئی چالیس پچپن میل کے درمیان ہلتی رہی۔ مگر وہ ایک اچھا تجربہ کار ڈرائیور تھا۔ اور ہم اپنے کو اس کے ساتھ محفوظ محسوس کرتے تھے۔ کوئی دو بجے ہم درگئی پہنچے۔ ہمارے بائیں کو گھاٹی میں پانی کی بجلی کے پاور ہاؤس کی عمارتیں تھیں۔ اوپر پہاڑ سے دو آبشار چاندی کے دھارے کی طرح نیچے دریا میں گر رہے تھے۔ دریا کو پچھلی وادی سے مصنوعی طریقے سے ایک پختہ نہر کی صورت میں پہاڑ کے اوپر سے لایا گیا تھا۔ تاکہ نیچے بجلی پیدا کرنے والی مشینوں کے لئے اس سے بجلی پیدا کی جا سکے۔

مالاکنڈ ایجنسی کی کسٹم پوسٹ پر ہمیں رکنا پڑا۔ ملیشیا میں پٹھان سپاہی لاری پر چڑھ گئے اور سامان کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اپی کیورس اور میں نے چند بچوں سے لوکاٹ خریدے اور انھیں ایک پل کی منڈیر پر بیٹھ کر کھانے لگے — اپی کیورس پھر سامان کے پیچھے چلا گیا۔ ایک ملیشیا میں سپاہی اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اپی کیورس میری طرف اشارہ کر کے اسے کچھ سمجھانے لگا۔ میرا دل ڈوب گیا۔ بے وفا، غدار اپی کیورس! اس نے مجھے بھی شہید کر دیا تھا۔

مالاکنڈ ایجنسی کی پولیس نے ساری صوبہ سرحد کی پولیس کو ہوشیار کر دیا تھا کہ محمد خالد نامی شخص کسی بس کے ذریعے (غالباً بھیس بدل کر) سیدو شریف جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہیں اسے ہر قیمت پر وہاں جانے سے روکنا تھا۔ انھیں حکم تھا کہ اس کے نازک بازوؤں پر ایک مجرم کی ہتھکڑیاں پہنا دیں اور اسے تاریک ترین تہ خانے میں پھینک دیں — اس کے خلاف سنگین الزامات تھے — وہ ایک دہشت پسند کمیونسٹ تھا — اس کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ اس نے ایک بار ایک غدارانہ کتاب لکھی تھی۔ وہ چند خفیہ اہم ملکی دستاویزوں کے ساتھ سوات کے راستے ایک کمیونسٹ ملک میں بھاگ رہا تھا۔ اس خطرناک شخص کو ہر حالت میں روکنا ضروری تھا — کچھ اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں سے گذرے۔

میں بس کے پاس پہنچا تو نوجوان سپاہی مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کا نام محمد خالد ہے؟"

"ہاں" میں نے تعجب سے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ آپ سے مجھے کچھ امید تو ضرور تھی مگر محمد خالد نامی شخص میں کسٹم پولیس کی خصوصی دلچسپی نے میرے دل کو عجیب وسوسوں سے بھر دیا۔

"اچھا میرے ساتھ آؤ" نوجوان سپاہی نے کہا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر ہتھکڑی پڑتے دیکھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان ناتواں بزدل انسانوں میں سے ہوں جن میں جسمانی جرأت نام کو نہیں ہوتی۔ مجھ میں اخلاقی جرأت بھی کوئی زیادہ نہیں اور شاید اپنی جان بچانے کے لئے میں اپنے بہترین دوست

سے بے وفائی کرنے، یا اپنے مذہب کو تبدیل کرنے اور ہر قسم کے حیلے سے کام لینے سے دریغ نہ کریں۔ میں اس مٹی سے نہیں بنا جس سے شہید بنتے ہیں)

نوجوان سپاہی کا رویہ بداخلاقی کا نہ تھا۔ وہ پہلے مجھے چوکی پر لے گیا۔ ایک مونچھوں والے حوالدار نے مجھ سے مزید باز پرس کی: "آپ کراچی سے آرہا ہے نا؟" اس نے پوچھا۔ "بہاولپور سے" میں نے جواب دیا۔ "آپ کا والد کا نام کیا ہے؟ کیا وہ پشاور میں وکیل ہے؟" اس نے مزید دریافت کیا۔ "نہیں" میں نے جواب دیا۔ حوالدار کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر انھوں نے مجھے جانے دیا۔ یہ سب بڑا پُراسرار تھا۔ ابھی میں اپنی نئی پائی ہوئی آزادی پر پوری طرح خوش نہ ہونے پایا تھا۔ کہ نوجوان کانسٹیبل پھر میری طرف آیا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ سامنے کے ایک پتھریلے مکان کے احاطے میں لے گیا جہاں اخروٹ اور ناشپاتی کے درختوں کے ٹھنڈے سائے کے نیچے چارپائیاں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ ایک میز پر لوکاٹ کی بھری پلیٹیں تھیں۔ ایک کھلی پیشانی اور شگفتہ چہرے کا پینتالیس سال کا شخص آرام کرسی سے اٹھا۔ اس نے کچھ قدم آگے بڑھ کر مجھ سے معانقہ کیا اور کمال خندہ پیشانی سے مجھ پر سارا قصہ واضح کیا۔ بات یہ تھی کہ میرا ایک ہم نام جو کراچی میں انجینیر تھا، آج سوات سیر کی غرض سے جانے والا تھا۔ اس کے باپ نے جو پشاور کا مشہور وکیل تھا، اپنے دوست پولیٹکل ایجنٹ صاحب کو فون کیا تھا کہ وہ اس کے آنے کا خیال رکھیں اور اسے ریاست کی سیر میں ہر ممکن سہولت دیں۔ اس نے اس تکلیف کا جو مجھے اٹھانی پڑی تھی معافی چاہی۔ میں اس سارے معاملے پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔۔ لیکن یہ کیسا اتفاق تھا کہ دوسرا محمد خالد بھی میری طرح انجینیر تھا۔ وہ کراچی سے آرہا تھا اور چند دن پہلے میں بھی کراچی میں تھا۔۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے خیال آیا کہ میں دوسرا محمد خالد بن جاؤں۔ پولیٹکل ایجنٹ کی مہمان نوازی کے مزے لوٹوں اور شاہی طریق پر موٹر میں سیدو تک جاؤں۔ یہ ایک اچھا مذاق ہوتا، مگر دوسرے محمد خالد کے آجانے پر میرا پول کھل جاتا۔ ایک سچا بہروپیا بننے کے لئے جرأت کی ضرورت ہے۔ ویسے میں اب بھی اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے دوسرا محمد خالد ہی بن جانا چاہیئے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک معصوم مذاق ہوتا اور کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچتا۔ ہماری مہم پھر دس گنا "ونڈر لنگ" ہوتی اور اتنی ہوشربا جتنی فلپ آپنہم کی کوئی جاسوسی کہانی۔

اس کسٹم پوسٹ سے پہاڑوں پر اصل چڑھائی شروع ہوئی۔ ہم ننگے تپتے ہوئے چٹانی چہرے پر ایک بھونرے کی طرح رینگنے لگے۔ نیچے چمکیلی دھند میں فراخ دریائی وادی تھی۔ تصویر کی طرح خوبصورت۔۔ کئی موڑوں کے بعد ہم اوپر مالاکنڈ میں پہنچے۔ شطرنج کے رخوں کے نمونے کے قلعے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایستادہ۔ خوبانی اور لوکاٹ کے باغات، پتھر کے اکا دکا مکان، چٹانوں پر ان برٹش رجمنٹوں کے نام اور القاب کھدے ہوئے تھے جنھوں نے انگریزی راج کے ایام میں مالاکنڈ میں پڑاؤ ڈالے تھے اور سرکش قبائیلیوں کو قابو میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ قرائین کے اہرام کے مہیب کتبے معلوم ہوتے تھے۔۔ ابدی ۔۔ اور وقت سے آزاد۔۔ تم سوچتے تھے کہ دس ہزار سال بعد بھی یہ کتبے اسی طرح ہوں گے۔۔ وہ مالاکنڈ اور ان افغانی پہاڑوں کی تاریخ کا ایک حصہ تھے۔۔ کیا وہ بہادر پٹھانوں کے لئے ایک مستقل ہتک نہیں؟ وہ ہیں لیکن انھیں مٹانا یا تباہ کرنا شیوۂ مردانگی نہیں ۔۔ ہاں اس سنگلاخ ویرانی میں ان چھوٹے انگلستان کے جگر گوشوں کو دبنے دو۔ سو سال بعد وہ تاریخ کے طالب علموں کے لئے محض ماضی کے پر رعب نشان ہوں گے۔

مالاکنڈ سے اترائی شروع ہوئی۔ ہمارے سامنے سنہری دھند میں ایک وسیع وادی خوابیدہ تھی اور اگر دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی وادی ہے تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بھوری لڑھکتی ہوئی سی چٹانوں پر کھیت پیلے سونے اور زمرد کی مستطیلیں تھے۔ یہ ایک ہلکے رنگین چاک سے رنگی ہوئی وادی تھی اور قوس قزح کے سارے رنگ مل کر اس میں ایک دلفریب نمونہ بنا رہے تھے۔ اس کوہستانی جنت میں دریائے سوات ایک آبدار تلوار کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا تھا۔ بھیڑوں کے چرتے ہوئے ریوڑ برف کے متحرک گالے تھے۔ ڈھلانوں پر کہیں کہیں لکڑی کے برآمدوں کے کچے کوٹھے تھے۔

اپنی کیوڑس اور میں قدرت کے اتنے حسن کے سامنے گونگے ہو گئے۔ ہمارے دل تشکر سے معمور تھے۔ (مسلسل)

راجہ مہدی علی خاں (مرحوم) کے خطوط

۷ر ستمبر ۱۹۶۳ء

یا احمد ندیم

دفترِ فنون کے معزز چپڑاسیو، خاکروبو، نائبو، مومچیو اور چورو!

تم سلامت رہو ہزار برس۔ ۳۰ ستمبر کو پیرو مرشد برادرِ محترم و مکرم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے مجھے ایک محبت نامہ بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ کل یعنی ۲۳ ستمبر کو وہ میرا مضمون رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے واپس بھیج دیں گے۔

میرا مضمون مشغلے بذریعہ پارسل بھیجا گیا۔ یہی کیا کم صدمہ تھا کہ دوسرا صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ وہ مضمون ابھی تک نہیں پہنچا۔ ۲۳ ستمبر کو روانہ کیا ہوا مضمون ۳۰ ستمبر تک مل جانا چاہیئے تھا۔ مسلسل روئے جا رہا ہوں۔ کسی طرح آنسو نہیں تھمتے۔

۲۳ ستمبر کو میری سالگرہ تھی۔ مضمون کا اسی دن واپس ہونا بڑا بڑا شگون ہے۔ ہائے اب تو دس سال تک ایڈیٹر لوگ میرے مضمون واپس کرتے رہیں گے۔ میں تو مر گیا!

مضمون میں بعض ترمیمات میں نے خود کرائی تھیں، بعض ترمیمیں برادرِ محترم وزیر آغا نے مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد کی تھیں۔

آپ لوگ کہیں گے کہ میں نے براہِ راست انھیں خط کیوں نہیں لکھا —— اپنی برادری والوں کو کیوں لکھا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آدمی میرے خطوں ٹیلیگراموں کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ دس ہزار ٹیلیگراموں، بیس ہزار رجسٹرڈ خطوں، تیس ہزار بیرنگ خطوں کا بھی وہ جواب نہیں دیتے۔ آخر سفارش کرانی پڑتی ہے اور بڑی مشکل سے وہ چند پیاری سطریں لکھ کر بھیجتے ہیں۔ زندگی میں ایسے سنگدل اور بے رحم ایڈیٹر سے پالا نہیں پڑا تھا —— بہت سی خوبیاں ہیں جینے والے میں۔

بابا بھائیو تم وہ مضمون دفتر سے چرا کے مجھے بھیج دو بہت ممنون ہوں گا۔

جب ندیم صاحب کو معلوم ہوگا کہ آپ نے یہ حرکت کی ہے تو وہ آپ کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ وہ بے حد شریف آدمی ہیں۔

ندیم صاحب کے خط کا جواب پھر لکھوں گا۔ نظم بھی بھیج دوں گا۔

خاکسار راجہ مظلوم علی خاں

۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

یا احمد، یا ندیم، یا قاسم

یا پیرو مرشد!

آداب۔ آپ کا بہت مفصل گرامی نامہ ملا تھا۔ اس کا جواب بے حد دلچسپ لکھا جا سکتا ہے۔ کبھی لکھوں گا یا شاید نہیں لکھوں گا۔

میں نے آپ کو پیرو مرشد کے القاب سے یاد کیا ہے حالانکہ میں وزیر آغا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں۔ معلوم نہیں بیک وقت دو پیروں کے

ان پر بیعت کرنا جائز ہے یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تمام دنیا سے ذرا الگ واقع ہوا ہوں ایک پیر میرے لئے ناکافی ہے۔ شیطان کے بھی سنتا ہوں دو پیر ہیں۔

آپ نے "مشغلے" والا مضمون "جو مومنوں" کے بارے میں لکھا گیا ہے، غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے اس میں (تعارف میں) صاف لکھ دیا تھا کہ میں ایک بے انتہا دروغ گو اور دروغ نگار انسان ہوں کوئی میرے لکھے پر یقین نہ کرے۔ کاش آپ اس مضمون کو دوبارہ پڑھیں۔ بہرحال آپ کے "ناجائز احتجاج" پر میں نے اس پر کہیں کہیں قلم بھی چلایا ہے۔ بے شمار لوگوں کو معلوم ہے کہ میں نے اس مضمون میں یہی لکھا ہے۔ میں نے اپنے "خلاف" لکھی ہوئی تحریروں کو اسی رنگ میں پڑھا ہے جس رنگ میں یہ لکھی گئی ہیں ——— مجھے ادیبوں شاعروں کی دبیں اس مضمون میں کہیں نظر نہیں آئیں کیونکہ وہ تو میں نے کاٹ دی ہیں۔

قسم خدا کی اگر یہ مضمون چھپ جاتا تو "فنون" کی اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہو جاتی۔ خیر اپنی اپنی رائے ہے۔ آپ "فنون" کے خریداروں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ اب میں آپ کے ان ذاتی معاملات میں کیسے دخل دوں؟

ابھی "فنون" کا صرف طنز و مزاح کا حصہ پڑھا ہے۔ ... صاحب کی نظم جیسی ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ ... صاحب کا ویسے میں بہت مداح ہوں لیکن "فنون" میں اب کی انھیں دیکھ کر خیال آیا کہ معلوم نہیں انارکلی میں کسی کیمسٹ کی دوکان ہے یا نہیں۔ ایک مشہور ادیب (جو آپ کے قریبی دوست ہیں) کی بیوی نے بھی یہ مضمون پڑھا۔ کل میں ان کی خبر لینے گیا تھا۔ بے چاری اب تک بیہوش ہیں۔ دعا کیجیے جان بچ جائے۔ میرے خیال میں سب سے ہلکی پھلکی چیز فکر تونسوی کی تھی۔ فکر لکھنے میں عموماً بے احتیاطی کر جاتے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے جو مضمون لکھا، لکھنے سے پہلے سوچ لیا کہ "فنون" کے لئے لکھ رہا ہوں۔ یکایک خیال آیا ہے کہ محترمہ بھابی صاحبہ (بیہوش خاتون) کو فکر تونسوی والے مضمون کے اوراق کی ہوا کیوں نہ دیدوں شاید آنکھیں کھول دیں ——— میرا مضمون بکواس تھا ——— نظم بھیج دوں گا۔

اتنا موٹا "فنون" دیکھ کر مجھے آپ پر بہت ترس آیا۔ آپ تین مہینے کے اندر اندر اتنے مضامین کیسے جمع کر لیتے ہیں؟ غالباً بہت سے اونٹ بھی آپ نے اسسٹنٹ کے طور پر رکھے ہوں گے جو اتنا مال اپنی کمر پر لاد کر لے آتے ہیں۔ سرزمین عرب کے یہ باشندے زندہ باد!

"آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو"

"فنون" میں ایک ہی خلا نظر آتی ہے جس طرح کسی زمانے میں "ہمایوں" کے ٹائٹل پیج پر "بیادگار جسٹس شاہ دین مرحوم" لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح "فنون" کے ٹائٹل پر اس کا حجم دیکھ کر مندرجہ ذیل فقرہ ہونا چاہیے: بیادگار راجہ مہدی علی خاں ایم جہانی

یا

اگر آپ میری شہرت کے دشمن ہوں تو: بیادگار مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم

خطوط کا جواب آپ نہیں دیتے ہیں دو گروڑ گالیاں آپ کو دیتا رہا۔ اب یہ گالیاں میں نے واپس بلا لی ہیں۔ آخر اتنے مضمون نگاروں کو کوئی کیسے خط لکھ سکتا ہے ——

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

بچہ فی الحال تو شاید کوئی نہیں۔ گھر میں گیارہ بلیاں بیگم نے ضرور پال رکھی ہیں۔ تمام دن انھیں دودھ پلاتی رہتی ہیں ——— بھینس یا بکری کا۔

محترمہ بھابی صاحبہ سے سلام کہہ دیجیے ہم دونوں کا۔ بچوں کو دعا۔

آپ کی دو کروڑ بہنوں کو سلام اور دعائیں۔ ہماری گورنمنٹ غور کر رہی ہے کہ یہاں سے راکھیاں پاکستان امپورٹ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ دس کروڑ راکھیاں تو یہاں کی صنف نازک کی طرف سے آپ کو موصول ہو جایا کریں گی۔ فی الحال یہ خواتین تصور میں آپ کو راکھیاں باندھ لیتی ہیں۔ آپ کا راجہ مہدی علی خاں

کاتب نے میرے مضمون کا عنوان بھی بدل دیا ہے جو مجھے غلط معلوم ہوا چند دوسری گستاخیاں بھی کی ہیں۔ پٹ جائیں گے کاتب صاحب!

آپ کا بغایت ادنیٰ قسم کا خادم راجہ مہدی علی خاں

راجہ مہدی علی خاں

ننھے میرؔ کو لوری

تو چلا نہ اپنی ٹانگیں، میرے ننھے میر سو جا
ارے او خبیث مت رو، ارے او شریر سو جا

تو کھجور بھی نہ کھائے، تجھے دودھ بھی نہ بھائے
تیری ماں، بتا دے ننھے، تجھے اور کیا کھلائے
ارے ہاں — میں آلوؤں کی تجھے دوں گی کھیر سو جا

جو ہیں ماں کے اچھے ننھے، وہ بچارے سو رہے ہیں
جو ہیں اُلّو، جاگتے ہیں، جو گدھے ہیں، رو رہے ہیں
تجھے واسطہ خدا کا، او "بھگت کبیر"، سو جا

تیری شاعرانہ "ریں ریں"، کسی بحر میں نہیں ہے
نہ تو اس میں کوئی ٹھمک ہے، نہ یہ کام کی زمیں ہے
تجھے قافیے میں دوں گی "دو غزل کے پیر"، سو جا

میرے در پہ اک بھکاری، لیے لاٹھیاں کھڑا ہے
تجھے کیا خبر ہے ننھے، وہ یہ مجھ سے کہہ رہا ہے
"نہیں بھیک لوں گا بی بی، میں تو لوں گا میرؔ" سو جا

میں تو ڈر رہی ہوں ننھے کہ ہے پاس اس کے تھیلا
جو نہیں ہے صاف ستھرا، جو ہے گندہ، میلا میلا
تجھے اس میں لے نہ جائے کہیں وہ فقیر، سو جا
میرے ننھے میرؔ سو جا، ارے او شریر سو جا

؎ ماں اپنے بچے کو کچھ بھی کہہ سکتی ہے — راجہ

احمد ظفر

زندہ درگور

(شاد امرتسری کی یاد میں)

سورج میرے کمرے میں جب آجاتا ہے
کرن کرن سے لپٹ لپٹ کر رو لیتا ہوں
اشکوں کی بہتی ندی میں
جھلمل جھلمل کرتے سائے
کتنے رشتوں کے سوداگر بن جاتے ہیں

میں مورکھ تھا، شاعر، پیاسا
زردِ خزاں، آسیب بھتے پتے
پھر بھی کس کے لمس کا جادو ؟
میرے لہو کا قطرہ قطرہ چوس رہا تھا

غم پتھر ہے شاؔد، میری قبر کا کتبہ
اندھے جس کو دیکھ رہے ہیں
جن کے تن کا پیلا چاند ـــــ سحر کا مُردہ
بستی بستی گھوم رہا ہے

مٹی پھول کا پہلا گھر ہے
شبنم درد کا پہلا سجدہ
پانی دکھ میں ڈوبی آنکھیں
روحیں کچھ نادیدہ راہی
میرے ساتھ رواں رہتے ہیں

محسن بھوپالی

قطعۂ تاریخِ وفاتؔ شادؔ امرتسری مرحوم

ہنس ہنس کے زخم کھاتے تھے جِسنے تمام عُمر
فِطرت کا اُس کے ساتھ یہ طُرفہ مذاق ہے
"داغِ فراق" شادؔ کا عنوانِ زیست تھا
تاریخِ مرگِ شادؔ بھی "داغِ فراق" ہے

۱۳۸۶ ھ

○

ے شادؔ امرتسری مرحوم کے مجموعۂ کلام کا نام جو ان کی وفات سے تین سال قبل شائع ہوا تھا۔

شکیب جلالی

آخری غزل

گلے ملا نہ کبھی چاند، بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

ستارے سسکیاں بھرتے تھے اوس روتی تھی
فسانۂ جگرِ لخت لخت ایسا تھا

ذرا نہ موم ہُوا پیار کی حرارت سے
چٹخ کے ٹوٹ گیا، دل کا سخت ایسا تھا

یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک
کوئی نہ سہہ سکے، لہجہ کرخت ایسا تھا

کہاں کی سیر نہ کی توسنِ تخیّل پر
ہمیں تو یہ بھی سلیماں کے تخت ایسا تھا

ادھر سے گزرا تھا ملکِ سخن کا شہزادہ
کوئی نہ جان سکا، سازو رخت ایسا تھا

(یہ غزل شفاخانۂ امراضِ دماغی میں کہی گئی)

سید انیس شیرازی

جُدائی

(شکیب جلالی کی یاد میں)

کتنے بے مہر تھے ہاتھ
جو ترے دیدہ و دل پر
کسی سائے کی طرح لہرائے
کاش وُہ وقت مجھے یاد نہ آئے
جب ترے پاس کھڑے، دُھند میں
مٹتے ہوئے ہم
تیری ویرانی میں گھٹتے ہوئے
چلاتے تھے
اس کے باوصف تجھے
یاد کہاں آتے تھے
وُہ شب و روز کہ جو
تیری رفاقت میں کٹے
تم تو بس جھاگ میں بہتے ہوئے
اِک لہر کی باہوں میں چلے جاتے تھے
کتنے بے مہر تھے ہاتھ
جو ترے دیدہ و دل پر
کسی سائے کی طرح لہرائے
کاش وُہ وقت مجھے یاد نہ آئے

○

ہمسفر

یہی ساتھ دو گے نہ تم!
جیسے بچے
کسی ایک روی سے کاغذ کی
کشتی بنا کر
کسی تیز رو ایک ندی میں
اسکو بہا کر
کناروں پہ خود دوڑتے ہیں
یہی ساتھ دو گے نہ تم!

○

باقی صدیقی

○

رنگِ دل، رنگِ نظر یاد آیا — جلوۂ راہگزر یاد آیا

وہ نظر بن گئی پیغامِ حیات — حلقۂ شام و سحر یاد آیا

یہ زمانہ، یہ دلِ دیوانہ — رشتۂ سنگ و گہر یاد آیا

یہ نیا شہر، یہ روشن راہیں — اپنا اندازِ سفر یاد آیا

راہ کا رُوپ بنی دھوپ اپنی — کوئی سایہ نہ شجر یاد آیا

کب نہ اس شہر میں پتھر برسے — کب نہ اِس شہر میں سر یاد آیا

گھر میں تھا دشت نوردی کا خیال — دشت میں آئے تو گھر یاد آیا

گرد اُڑتی ہے سرِ راہِ خیال — دلِ ناداں کا سفر یاد آیا

ایک ہنستی ہوئی بدلی دیکھی — ایک جلتا ہوا گھر یاد آیا

آنچ دامانِ صبا سے آئی — اعتبارِ گُلِ تر یاد آیا

دل جلا دھوپ میں ایسا اب کے — پاؤں یاد آئے نہ سر یاد آیا

اس طرح شام کے سائے پھیلے — رات کا پچھلا پہر یاد آیا

پھر چلے گھر سے تماشا بن کر — پھر ترا روزنِ دَر یاد آیا

کسی پتھر کی حقیقت ہی کیا — دل کا آئینہ مگر یاد آیا

گر پڑے ہاتھ سے کاغذ باقیؔ
اپنی محنت کا ثمر یاد آیا

باقی صدیقی

موت جس وقت دھیان میں آئی — زندگی درمیان میں آئی

یوں تمنا ہے خوش مرے دل میں — جیسے اپنے مکان میں آئی

سنگِ رہ بن گیا خیالِ سفر — بات کیسی گمان میں آئی

کام آیا نہ مدتوں کا سلوک — دل میں رنجش اک آن میں آئی

زندگی کوڑیوں کے مول بکی — جب بھی اُونچی دکان میں آئی

در و دیوار تلملانے لگے — دھوپ ایسی مکان میں آئی

وہ نظر آپ ہی پیام بنی — آپ ہی درمیان میں آئی

دل کی ہر بات بن گئی آنسو — کیا روانی بیان میں آئی

تیرے جاتے ہی کیا ہوا دل کو — پھر نہ آواز کان میں آئی

جان لے کر بھی کوئی خوش نہ ہوا — کیا کمی امتحان میں آئی

بات کچھ اور اُس کا مطلب کچھ — دل کی لغزش زبان میں آئی

دل کی دیوار گر گئی شاید — اپنی آواز کان میں آئی

کسی قصے میں بھی وہ بات نہیں — جو تمھارے بیان میں آئی

بیٹھے بیٹھے تڑپ اُٹھے باقی
کونسی بات دھیان میں آئی

قتیل شفائی

○

ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو! سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو

خود کو فریب دو کہ نہ ہو تلخ زندگی
ہر سنگدل کو جانِ وفا کہہ لیا کرو

گر چاہتے ہو خوش رہیں کچھ بندگانِ خاص
جتنے صنم ہیں، ان کو خدا کہہ لیا کرو

یارو! یہ دور ضعفِ بصارت کا دور ہے
آندھی اٹھے تو اس کو گھٹا کہہ لیا کرو

انسان کا اگر قد و قامت نہ بڑھ سکے
تم اس کو نقصِ آب و ہوا کہہ لیا کرو

اپنے لیے اب ایک ہی راہِ نجات ہے
ہر ظلم کو رضائے خدا کہہ لیا کرو

دکھلائے جا سکیں جو نہ کانٹے زبان کے
تم داستانِ کرب و بلا کہہ لیا کرو

لے دے کے اب یہی ہے نشانِ ضیا قتیل
جب دل جلے تو اس کو دیا کہہ لیا کرو

○

قتیل شفائی

یارو کسی قاتل سے کبھی پیار نہ مانگو
اپنے ہی گلے کے لیے تلوار نہ مانگو

گر جاؤ گے تم اپنے مسیحا کی نظر سے
مر کر بھی علاجِ دلِ بیمار نہ مانگو

اُس چیز کا کیا ذکر جو ممکن ہی نہیں ہے
صحرا میں کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو

سچ بات پہ ملتا ہے سدا زہر کا پیالہ
جینا ہے تو پھر جرأتِ اظہار نہ مانگو

کھل جائے گا اس طرح نگاہوں کا بھرم بھی
کانٹوں سے کبھی پھول کی مہکار نہ مانگو

یہ بھی ہے غنیمت جو ملے کوئی خریدار
بک جاؤ مگر قیمتِ ایثار نہ مانگو

تقریبِ ملاقات جو پھر سے کوئی بن جائے
قسامِ ازل سے دلِ بیدار نہ مانگو

اُبھرے گا نہ دھڑکن سے قتیلؔ اب کوئی نغمہ
ٹوٹی ہوئی پازیب سے جھنکار نہ مانگو

ادا جعفری

○

بیٹھے ہوئے ایک ایک کا منہ دیکھ رہے ہیں
کہتے پھریں کس کس سے، جو دُکھ ہم نے سہے ہیں
جی کو تو وہ اچھے لگے پر اُن کی عنایت
دُکھ اُن سے بھلے ہیں کہ مرے ساتھ رہے ہیں
کب تم سے گلہ ہم نے کیا کم نگہی کا
ہاں دیکھنے والوں نے کچھ افسانے کہے ہیں
سمجھانا تو ہم نے بھی بہت چاہا تھا دل کو
دل جیسے دوانے کبھی قابو میں رہے ہیں!
ہنسنے سے بھی سنتے ہیں کہ بھر آتی ہیں آنکھیں
اشکوں پہ نہ جاؤ کہ بہر حال بہے ہیں
پھولوں کے کٹوروں سے جہاں چھلکی ہے شبنم
کانٹوں کے بھی آنسو اسی مٹی پہ بہے ہیں
سوچوں کے خزانوں پہ بھی ناگوں کا ہے پہرا
دل چیز ہی کیا ہے، یہاں کعبے بھی ڈھے ہیں
پوچھو کہ تغافل کرو، دنیا ہے یہ لوگو!
چڑھتے ہوئے سورج یہاں پل بھر میں گہے ہیں

فارغ بخاری

○

یادوں کا عجیب سلسلہ ہے　　سویا ہوا درد جاگ اُٹھا ہے
مٹ بھی چکے نقشِ پا مگر دل　　تکی ہوئی چاپ سن رہا ہے
چلتی ہوئی منزلوں کا راہی　　اب اپنا ہی سایا ڈھونڈتا ہے
دیواریں تنی ہوئی ہیں لیکن　　اندر سے مکان گر رہا ہے
سوچوں کے اتھاہ پانیوں میں　　کھویا ہوا چاند تیرتا ہے
ویرانۂ شب میں جلتے جلتے　　دل برف کا پھول بن گیا ہے

پوچھے ہے چٹک کے غنچۂ زخم
اے اجنبی تیرا نام کیا ہے

اظہار کا جس کو حوصلہ ہے　　وہ اپنی صدی کا دیوتا ہے
منصور سے کم نہیں ہے وہ بھی　　جو اپنی زباں سے بولتا ہے

قاتل کو دعائیں دو کہ فارغ
ہر زخمِ وفا غزل سرا ہے

احمد فراز

○

تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں
مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں
تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے ، خبر نہیں
بے درد! میں ابھی انہی گہرائیوں میں ہوں
اے یارِ خوش دیار! تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں
تو لُوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
میں لُٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہوں
بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں
تو ہنس رہا ہے مجھ پہ ، مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں
خود ہی مثالِ لالۂ صحرا ہوں جلوہ گر
اور خود فراز اپنے تماشائیوں میں ہوں

ابن انشا

○

راز کہاں تک راز رہے گا، منظرِ عام پہ آئے گا
جی کا داغ اجاگر ہو کر، سورج کو شرمائے گا

شہروں کو ویران کرے گا، اپنی آنچ کی تیزی سے
ویرانوں میں مست، البیلے وحشی پھول کھلائے گا

ہاں یہی شخص گداز اور نازک، ہونٹوں پر مسکان لیے
اے دل اپنے ہاتھ لگاتے، پتھر کا بن جائے گا

دیدہ و دل نے درد کی اپنے بات بھی کی تو کس سے کی
وہ تو درد کا بانی ٹھہرا، وہ کیا درد بٹائے گا

تیرا نور ظہور سلامت اک دن تجھ پر ماہِ تمام
چاند نگر کا رہنے والا، چاند نگر لکھ جائے گا

تابش دہلوی

○

جب نقابِ رُخ مقابل سے اُٹھی
چشمِ صد نظّارہ مشکل سے اُٹھی

بازگشتِ شورِ غرقابی سہی
کوئی تو آواز ساحل سے اُٹھی

قافلے ہیں کتنے درماندہ خرام
گرد راہوں سے، نہ منزل سے اُٹھی

سر سے بھی گذری ہے طوفاں کی طرح
جب بھی کوئی موجِ خوں دل سے اُٹھی

تھام کر دل کیا اُٹھے اربابِ درد
اک قیامت تیری محفل سے اُٹھی

چشمِ نظّارہ سے مانندِ حجاب
تہمتِ نظّارہ، مشکل سے اُٹھی

عشق بھی تابشؔ نہیں وجہِ نشاط
اب یہ رسمِ درد بھی دل سے اُٹھی

○

جمیل ملک

سب کی آنکھوں میں نظر آتی ہے صورت میری
کتنے سانچوں میں ڈھلی، ایک محبت میری
دیکھ، کس شان سے نکھرا ہے مرا ذوقِ جمال!
بن گئی آئینہ تیرے لیے حیرت میری
تیرا پردہ ہی نہیں، میں ترا اظہار بھی ہوں
تیری ہستی سے نمایاں ہے حقیقت میری
تجھ سے کچھ بھی نہ کہوں، اپنی وفاؤں پہ ہنسوں
تیری بیگانہ روی اور اذیت میری
لوگ اب مجھ سے زیادہ ترا دم بھرتے ہیں
پاس بیٹھے ہیں ترے لے کے شکایت میری
پیار کے لمحۂ جاوید کا حاصل ہے، فراق
دیکھ لے غور سے، جاتے ہوئے صورت میری
وادیٔ مصر میں یوسف کے خریدار بہت
پوچھتے پھرتے ہیں بازار سے قیمت میری
حسن سونے کے ترازو میں سجا بیٹھا ہے
بیچ بازار بکی، آج شرافت میری
میں اگر ہونٹ ہلاؤں تو گنہگار بنوں
وہ اگر مجھ کو سزا دیں تو سعادت میری
رنگ لائے گا جمیلؔ اپنی دعاؤں کا خلوص
یوں تو بیکار نہ جائے گی ریاضت میری

مظفر علی سیّد

○

اللہ نے کیسے خاک کے پُتلے بنا دیے
آنکھیں پلٹ گئیں جو کہیں دل ہلا دیے

جن کی لَویں لرزتی تھیں سائے بھٹکتے تھے
یاروں نے وہ چراغ ہی سارے بُجھا دیے

دیوار رہ گئی ہے عمارت کی یادگار
کڑیاں گئی تھیں ٹوٹ سو دَر بھی گرا دیے

کیا راز آگیا تھا زباں پر کہ آپ نے
پیچھے ہمارے شہر کے کُتّے لگا دِیے

بس یاد ہے تو یہ کہ ہماری بھی نہیں
باقی تمام باہمی قصّے بھُلا دیے

سیّد بہت وَرَق تھے محبت کی یادگار
ہم نے ہی کچھ جلا دیے اور کچھ بہا دیے

مظفر علی سیّد

○

جس کو غرض ہے نام سے اور آوازے سے
اُس کا ٹھکانا باہر ہے دروازے سے

تُم نے یقین سے، ہونٹوں کو سِینا سیکھا
ہم نے کوئی بات تو کی اندازے سے

ناقدری نے صوبرِ قلم کو تیز کیا
یہ نشہ تو اور چڑھا خمیازے سے

قَفَس کے باہر پیلے پتّے اُڑتے ہیں
یارو دو اِک پھول دکھاؤ تازے سے

سیّد تیرے کفر سے دیں کمزور ہُوا
ایک وَرَق تو نکل گیا شیرازے سے

* ترجمہ ہے اس شعر کا جو حضرت بابا فرید گنج شکر کی زبان پہ جاری رہا کرتا تھا، معلوم نہیں اصل میں کس کا ہے ؎

ہر کہ در بندِ نام و آوازہ ست
خانۂ او برونِ دروازہ ست

شہزاد احمد

○

سارا زمانہ اپنی پریشانیوں میں ہے
آزاد جو بھی ہے، ترے زندانیوں میں ہے

کچھ بھی ہو، راستے کی تھکن بھولتی نہیں
دل جستجو میں ہے کہ پشیمانیوں میں ہے

انسان پا بریدہ ہیں، سرسبز ہیں درخت
شاید کہ زندگی ہی تن آسانیوں میں ہے

اپنے ہی دل میں وصل کی لذت تلاش کر
جو لہر کھو گئی ہے، انھیں پانیوں میں ہے

لہرا رہی ہے ریت کفِ آب کی طرح
دریا کے ساتھ دشت بھی جولانیوں میں ہے

آنکھوں میں اشک آئے کہ سیلاب آ گیا
ساری خدائی ویرسے طغیانیوں میں ہے

اُٹھی تھی خاک سے جو صدا، خاک ہو گئی
لیکن سکوتِ شب ابھی حیرانیوں میں ہے

مقدور بھر یہ شہر تو آباد ہو چکے
امکان جس قدر بھی ہے، ویرانیوں میں ہے

کیا ختم ہو سفر — کہ کٹھن ہے یہ راستہ
اور قافلہ بھی بے سروسامانیوں میں ہے

یہ دیکھتا نہیں کہ نوا تلخ ہو گئی
اپنی طرف سے دل گہر افشانیوں میں ہے

مشفق خواجہ

○

ہجومِ ہم نفساں چارۂ الم نہ ہُوا
کہ اس طرح غمِ تنہا روی تو کم نہ ہُوا

نہ پوچھ دشتِ طلب میں متاعِ دامنِ زیست
یہ تار تار تو ہوتا رہا، پہ نم نہ ہُوا

لکھی گئی ہیں جنوں کی حکایتیں کیا کیا
مگر وہ قصۂ غم جو کبھی رقم نہ ہُوا

ملی نہ آبلہ پایانِ شوق کو منزل
کہ فاصلوں کی طرح حوصلہ بھی کم نہ ہُوا

رہِ طلب میں ہے آسودہ حال روح نہ جسم
خدا خدا ہی رہا اور صنم صنم نہ ہُوا

وہ کون ہیں کہ ہوس راس آگئی ہے جنھیں
یہاں تو عشق بھی چارہ گرِ الم نہ ہُوا

گماں ہوا مجھے احسان ناشناسی کا
جو خود بخود کوئی آمادۂ ستم نہ ہُوا

ساقی فاروقی

○

ریت کی صورت جاں پیاسی تھی، آنکھ ہماری نم نہ ہوئی
تیری دردگساری سے بھی روح کی الجھن کم نہ ہوئی

شاخ سے ٹوٹ کے بے حرمت ہیں ویسے بھی بے حرمت تھے
ہم گرتے پتوں پہ ملامت کب موسم موسم نہ ہوئی

ناگ پھنی سا شعلہ ہے جو آنکھوں میں لہراتا ہے
رات کبھی ہمدم نہ بنی اور نیند کبھی مرہم نہ ہوئی

اب یادوں کی دھوپ چھاؤں میں پرچھائیں سا پھرتا ہوں
میں نے بچھڑ کر دیکھ لیا ہے، دنیا نرم قدم نہ ہوئی

میری صحرازاد محبت، ابرِ سیہ کو ڈھونڈتی ہے
ایک جنم کی پیاسی تھی، اک بوند سے تازہ دم نہ ہوئی

ساقی فاروقی

○

میں نے اُٹھ کر عجب تماشا دیکھا آدھی رات کو
روح کو اندھی روح بلائے، ہاتھ پکارے ہات کو

جانے کیا ہونے والا ہے، نیند نہ آئے خوف سے
رات ڈرائے، شہر ڈرائے، ایک اکیلی ذات کو

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی کے ساتھ ہے
میرا اس کا سمجھوتا ہے، کون بڑھائے بات کو

میں جس کے پیچھے بھاگا ہوں، کیسی پاگل خوشبو ہے
جاں تیرے دامن کو ترسے، دل روئے تیرے سات کو

وہ میرے گھر کا دروازہ جیسے زنداں کھلتا ہے
میں اپنے گھر لوٹ رہا ہوں، دستک دو حالات کو

ساقی فاروقی

○

میں وہ ہوں جس پہ ابر کا جادو چلا نہیں
بنجر پڑا ہوا ہوں، کوئی دیکھتا نہیں

میں تو خدا کے ساتھ وفادار بھی رہا
یہ ذات کا طلسم مگر ٹوٹتا نہیں

یوں ٹوٹنا ضرور، بکھرتا ضرور ہوں
میں چاکِ پیرہن نہیں، خونیں قبا نہیں

میں نے ابجد کے دیکھ لیا اپنی گونج سے
اب کیا صدا لگاؤں، کوئی جانتا نہیں

حد بندیٔ خزاں سے حصارِ بہار تک
جاں رقص کر سکے تو کوئی فاصلہ نہیں

یوں مرے پاس سے ہو کر نہ گزر جانا تھا
بول اے شخص، تجھے کون نگر جانا تھا

روح اور جسم جہنم کی طرح جلتے ہیں
اس سے رو بیٹھے تھے تو اس آگ میں مر جانا تھا

راہ میں چھاؤں ملی تھی کہ ٹھہر سکتے تھے
اس سہارے کو مگر تابِ سفر جانا تھا

خواب ٹوٹے تھے کہ آنکھوں میں ستارے ناچے
سب کو دامن کے اندھیرے میں اتر جانا تھا

حادثہ یہ ہے کہ ہم جاں نہ معطر کر پائے
وہ تو خوشبو تھا، اسے یوں بھی بکھر جانا تھا

احمد مشتاق

O

رُت کیسے بدلے، کون آئے، اس دشت میں پھول کھلانے کو
کیوں خواب دکھاتے رہتے ہو دیوانے کے، فرزانے کو

ہاں ٹھیک تو ہے، کب تک بھٹکیں! وعدہ کھلے گلاب کی وادی میں
رُک جاؤ ذرا، اے ہمسفرو، تیار ہیں ہم بھی جانے کو

گملوں میں اُگے پھولوں ہی سے اب، خوش اہلِ جنوں ہو جاتے ہیں
دیوانے گاڑی کی کھڑکی سے دیکھتے ہیں ویرانے کو

اے بے حس رُت کی تیز ہوا! ان سے بھی الجھ، ان کو بھی اُٹھا
بیٹھے ہیں ابھی کچھ لوگ یہاں دُکھ سہنے کو غم کھانے کو

کچھ آس، مرے دمساز، تو ہے! مرے ساتھ نہ چل، آواز تو دے!
کوئی تو کرن روشن رکھے اس شوق کے بندی خانے کو

محسن احسان

○

سجا سجا کے رکھا جن کو آئنوں کی طرح
گرے نظر سے تو بکھرے ہیں کرچیوں کی طرح

بجھے بجھے ہیں پرانی محبتوں کے گلاب
صبا گذر گئی بے مہر ساعتوں کی طرح

بکھر گئے تو سمیٹا نہ زندگی نے ہمیں
نکھر گئے تو دمکتے ہیں موتیوں کی طرح

نہیں کسی سے شکایت کہ بارہا ہم نے
خود اپنے گھر کو جلایا ہے مشعلوں کی طرح

یہی مزاج ہے اپنا، کسی کا دل نہ دُکھے
جدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

نری طلب کا دلآویز حادثہ ہم نے
بھلا دیا ہے کئی اور حادثوں کی طرح

جو دل کا نور، نظر کا سرور رہتے وہ لوگ
ہمیں سے پیش اب آئے ہیں دشمنوں کی طرح

فلک نشینو، زمیں کی طرف کبھی دیکھو
ہیں پستیاں بھی مقدس بلندیوں کی طرح

بس اک اچٹتی نظر اس طرف بھی اے شہِ حسن
جو راستوں میں کھڑے ہیں مسافروں کی طرح

کوئی قریب تو ہے جس کے فیض سے محسنؔ
خیال ذہن میں بجتے ہیں گھنگھروں کی طرح

محسن احسان

○

نشاطِ قرب بھی ہے، لذّتِ وداع بھی ہے
دیارِ عاشقی میں درد کی متاع بھی ہے

وہ گردِ راہ ہوئے یا فروغِ ماہ ہوئے
مسافرانِ طلب کی کچھ اطلاع بھی ہے

دیارِ دل میں ہے مایوسیوں کا سنّاٹا
مگر یہیں کہیں امید کی شعاع بھی ہے

چلو کہ اس تہی دست و فقیرِ مست کے ہاں
مئے مراد بھی ہے، محفلِ سماع بھی ہے

شگفتِ گل سے سرِ صحنِ گلستاں، یارو
طلوعِ صبحِ بہاراں کی اطلاع بھی ہے

مسافرانِ محبت نہ دل گرفتہ ہوں
معاملاتِ نظر میں غمِ نزاع بھی ہے

فقیہِ شہر! سرائے مغاں کی سمت تو آ
یہیں پہ اہلِ محبت کا اجتماع بھی ہے

فقط روایتِ شعرِ عجم نہیں محسنؔ
مری غزل، مرے فن میں کچھ اختراع بھی ہے

سیف زلفی

○

اب کیا گلہ کریں کہ مقدر میں کچھ نہ تھا
ہم غوطہ زن ہوئے تو سمندر میں کچھ نہ تھا

دیوانہ کر گئی تری تصویر کی کشش
چوما جو پاس جاکے تو پیکر میں کچھ نہ تھا

کب ذہن نے قبول کیا تھا کسی کا پیار
سب دل کا تھا فتور، مرے سر میں کچھ نہ تھا

اپنے لہو کی آگ ہمیں چاٹتی رہی
اپنے بدن کا زہر تھا، ساغر میں کچھ نہ تھا

دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا

سب رنگ سیلِ تیرگیٔ شب سے دُھل گئے
سب روشنی کے عکس تھے، منظر میں کچھ نہ تھا

یارو! وہ بانکپن سے تراشا ہوا بدن
فنکار کا خیال تھا، پتھر میں کچھ نہ تھا

وہ رتجگے، وہ جشن، جو بستی کی جان تھے
یوں سو گئے کہ جیسے کسی گھر میں کچھ نہ تھا

دھرتی ہلی تو شہر زمیں بوس ہو گئے
دیکھا جو آنکھ کھول کے، پل بھر میں کچھ نہ تھا

زلفی ہمیں تو جرأتِ پرواز لے اُڑی
ورنہ ہمارے "زخم زدہ پر" میں کچھ نہ تھا

سیف زلفی

بیادِ شکیبؔ

○

اتنے دکھی ہیں ہم کہ مسرت بھی غم بنے
امرت ہمارے ہونٹ سے مس ہو تو سم بنے

رہئے برنگِ ابر فرشتے بھی گوندھ کر
کس دشتِ اشک و آہ کی مٹی سے ہم بنے

کچھ اور بھی تو شیش محل راستے میں تھے
کیوں ہم فقط نشانۂ سنگِ ستم بنے

آنکھوں کے سامنے ہے شکستہ درِ سکوں
ہم تک رہے ہیں در سے تصویرِ غم بنے

برسے ہیں دشتِ نیستی میں ہم پہ وہ سنگ و خشت
یکجا سمٹ کے آئیں تو کوہِ الم بنے

لہجے کے بانکپن میں چھپاتے ہیں دل کا سوز
ہم ایسے "رکھ رکھاؤ" کے فنکار کم بنے

جو داستاں ہماری، زیادہ لکھی گئی
جتنے ہمارے ہاتھ تراشے، قلم بنے

زلفیؔ، وہ سرزمیں کہ جہاں دفن ہے شکیبؔ
وہ کیوں نہ اہلِ فن کیلئے محترم بنے

صادق نسیم

○

اپنی آنکھوں کو تو دریا بھی سراب آسا ملے
جو بھی نقدِ جاں لٹانے آئے، ہم سے آملے

لب پہ گر نغمہ نہیں، پلکوں پہ ہی تارا ملے
گل نہیں کھلتے تو کوئی زخم ہی کھلتا ملے

امتحاں تھا، مصلحت تھی یا مری تقدیر تھی
میں گلستانوں کا طالب تھا، مجھے صحرا ملے

آج پھر چھیڑوں گا میں مہتاب کی کرنوں کے تار
کاش امشب تو ملے یا کوئی تجھ جیسا ملے

میں نے جن آنکھوں میں دیکھے تھے سمندر موجزن
اُن میں جو بھی ڈوبنے والا ملے، پیاسا ملے

ناز اُس کا پاسباں، انداز اُس کا ہم زباں
خلوتوں میں بھی وہ مجھ سے انجمن آرا ملے

عمر بھر ہر ایک سے ہم نے چھپائے دل کے داغ
آج یہ حسرت کہ کوئی دیکھنے والا ملے

رنگ و بو کے پیرہن میں پھول ہیں یا زخم ہیں
اب نہ وہ کلیاں، نہ وہ پتے، نہ وہ سایا ملے

آنکھ سو رنگوں کی طالب، ہوش سو رنگوں کا زخم
دل کی یہ ضد ہے کہ تیری آرزو تنہا ملے

جھلملاتے ہیں پسِ مژگاں سراب اندر سراب
آنکھ کے صحرا کو طے کر لو تو دل دریا ملے

اجنبی راہیں بھی صادق اجنبی راہیں نہ تھیں
جب کسی کے جانے پہچانے نقوشِ پا ملے

صادق نسیم

○

بات اُس میں بھی ہے کوئی تو مسیحا کی طرح
زہر بھی دے تو سرور آتا ہے صہبا کی طرح

اجنبیت کی رِدا چہرے پہ رکھتا ہے سدا
جس کا اندازِ تکلّم ہے شناسا کی طرح

آج پھر ابرِ کرم بن کے وہ کھُل کر برسا
جس کے ماتھے پہ شکن رہتی تھی صحرا کی طرح

شہرِ محبوب سے پھر آیا ہوا کا جھونکا
زخم کھِل کھِل گئے دامانِ تمنّا کی طرح

کتنی تاباں تھی شبِ غم کہ تری یاد کا چاند
ساغرِ جاں میں اُتر آیا تھا صہبا کی طرح

دل کبھی غنچہ بدستار کبھی خاک بسر
ابھی گلزار کی صورت، ابھی صحرا کی طرح

راس آ جائے تو اعجاز ہے تشنہ دہنی
لب ہیں شعلوں کی طرح سینہ ہے مینا کی طرح

ماہ و انجم کے گھروندے ہوئے ظلمات بدوش
روشنی لاؤ کہیں سے یدِ بیضا کی طرح

ضربتِ تیشہ تو فرہاد کی صنّاعی تھی
ہم چٹانوں سے اُلجھتے رہے دریا کی طرح

گلکدوں سے نہ رسائی نہ شناسائی ہے
وسعتِ دشت میں ہوں لالۂ تنہا کی طرح

ہم ہوئے واں بھی تب و تاب کے طالب تو نسیمؔ
کہیں بن جائے نہ فردوس بھی دنیا کی طرح

صہبا اختر

○

واقف نہیں تو اُس کے لبوں کو کنول نہ لکھ
الفاظ کو خضاب لگا کر غزل نہ لکھ

مومن کے ساتھ صرف خدا ہے، صنم نہیں
صبر و رضا کو عقدۂ مشکل کا حل نہ لکھ

لفظوں میں کب سمٹتا ہے وہ سحرِ بیکراں
شعروں کو حسنِ دوست کا نعم البدل نہ لکھ

انسان آپ اپنی تباہی کو کم نہیں
ویرانیِ حیات کو کارِ اجل نہ لکھ

صہبا کے ساتھ ساتھ نہ چل سایۂ ضمیر
اے میرے ہمنشیں مری فردِ عمل نہ لکھ

صہبا اختر

○

جسم میں جان مرے، شعلۂ جاں سے آئی
تیری جنت میں مگر آگ کہاں سے آئی

رُک ذرا، سُن تو سہی، قافلۂ نومیدی
جرسِ گُل کی صدا، دشتِ خزاں سے آئی

لالہ و گُل تو بہانہ ہیں، سرِ موجِ نفس
جو مہک آئی مرے مزرعِ جاں سے آئی

اہلِ حق کچھ بھی کہیں، خوئے عبادت لیکن
کعبۂ عشق میں تو حسنِ بُتاں سے آئی

وہ مہ و مہر کے بس میں بھی کہاں تھی، دل میں
روشنی جو کرمِ شعلہ رُخاں سے آئی

جاوید شاہین

○

اسیرِ وحشت طلسماتِ آب سے نکلے
بہت دنوں میں سفینے سراب سے نکلے

ہوا کی موج سے کمرے میں ہل گئی چیزیں
شکستہ پھول پرانی کتاب سے نکلے

تپش ہے ایسی شبوں میں کہ اُڑ گئیں نیندیں
سبھی چمکتے ہوئے رنگ خواب سے نکلے

حصارِ جبر سے ممکن نجات تھی لیکن
جُھکا کے سر نہ کسی تنگ باب سے نکلے

کبھی تو درد کا شعلہ زبان پر بھڑکے
دہکتا خون رگوں کے عذاب سے نکلے

عجیب خوف سے پُر شب تھی باد و باراں کی
مہیب چہرے گرجتے سحاب سے نکلے

بھرے گھروں سے بچھڑنے کا غم نہیں شاہیںؔ
یہی بہت ہے کہ شہرِ خراب سے نکلے

سلیم شاہد

○

زمیں کو سجدہ کیا خوں سے باوضو ہو کر
میں رزم گاہ سے لوٹا ہوں سرخ رو ہو کر

جہاں میں پھیل گئی دودِ شعلہ سے ظلمت
فلک پہ بہ گیا سورج لہو لہو ہو کر

مجھے تھا دامِ اسیری، نشیب دریا کا
اچھل گیا میں کناروں سے تند خو ہو کر

ہوں سنگِ سینہ سپر ضربِ تیشہ کی ضد میں
نہ ہاتھ کھینچ ستم سے مرا عدو ہو کر

گریز پائی کو ہے گمرہی کا دشتِ بلا
خطِ سفر تو چمکتا ہے آبجو ہو کر

رہی نہ ٹوٹ کے گرنے سے میری یکتائی
میں پاش پاش ہوا خود سے دو بدو ہو کر

مرا وجود ہے کتبہ ہزار شکلوں کا
میں آئینہ ہوں، کھلا اس کے روبرو ہو کر

وہ لمس، ذائقہ جس نے مری زباں کو دیا
بکھر نہ جائے کہیں تارِ گفتگو ہو کر

کیا ہے پرسشِ احوالِ زخم نے رسوا
یہ چاک اور نمایاں ہوا رفو ہو کر

ہزار دیدۂ خوں ناب میری تاک میں ہیں
کھلا ہے صحنِ چمن دامِ آرزو ہو کر

زبانِ خلق پہ شاہدؔ ہیں حرفِ تلخ رہا
اُڑی نہ خاک مری گردِ آبرو ہو کر

توصیف تبسم

○

مرتے مرتے روشنی کا خواب تو پورا ہُوا
بہہ گیا سارا لہو تن کا تو دن آدھا ہُوا

راستوں پر پیڑ جب دیکھے تو آنسو آ گئے
ہر شجر سایہ تھا تیری یاد سے ملتا ہُوا

صبح سے پہلے بدن کی دھوپ میں نیند آ گئی
اور کتنا جاگتا میں رات کا جاگا ہُوا

شہرِ دل میں اس طرح ہر غم نے پہچانا مجھے
جیسے میرا نام تھا دیوار پر لکھا ہُوا

زیست کے پُر شور ساحل پر گئے لمحوں کی یاد
جس طرح سایہ ہو سطحِ آب پر ٹھہرا ہُوا

گم ہُوئے وہ آشنا چہروں کے آئینے کہاں
شہر ہے سارے کا سارا دھند میں لپٹا ہُوا

وصل کے بادل! ذرا تھم، حسنِ قامت دیکھ لوں
پیاس کا صحرا تو ہے تا چشمِ تر پھیلا ہُوا

مجھ کو آشوبِ حکایت جان بیلنے کی ہوس
اور یہ تیرا بدن اک داستاں کہتا ہُوا

غم جو ملتا ہے تو اے توصیفؔ سینے سے لگاؤ
کس نے لوٹایا ہے یوں مہمان گھر آیا ہُوا

خلیل رامپوری

○

دریا پہ پاؤں رکھ کے گذر جائے گا کوئی
خاطر میں اب کسی کو نہیں لائے گا کوئی

کرنی ہو جس کو سیرِ جہاں، دیکھ لے ہمیں
جب بجھ گیا چراغ تو پچھتائے گا کوئی

اُجڑے ہوئے کھنڈر کا بھیانک سماں نہ بن
صورت کو تیری دیکھ کے ڈر جائے گا کوئی

منظر نہ کھینچ شعر میں زلفِ دراز کا
جنگل میں کالی رات کے، کھو جائے گا کوئی

اُٹھتی ہوئی گھٹا ہیں بدل جائے گی ہوا
اک دن خود اپنے آپ کو دکھلائے گا کوئی

چھاتا جو آسمان کا سر پر لگائے ہوں
اس کو سمیٹ لوں تو کہاں جائے گا کوئی

شعروں میں باندھتا ہے نئے سے نئے خیال
دیکھے گا تیرا رنگ تو جل جائے گا کوئی

سو جا خلیلؔ شام سے چادر لپیٹ کر
بھیگے کی جتنی رات تو یاد آئے گا کوئی

انور شعور

○

سلیماں فطرت و بلقیس آنا ہوں — یکے از شہر یارانِ سبا ہوں

وہ جب کہتے ہیں فردا ہے خوش آیند — عجب حسرت سے مڑ کر دیکھتا ہوں

فراق اے ماں! کہ میں زینہ بہ زینہ — کلی ہوں، گل ہوں، خوشبو ہوں، صبا ہوں

سحر اور دوپہر اور شام اور شب — میں ان لفظوں کے معنی سوچتا ہوں

کہاں تک کاہلی کے طعن سنتا — تھکن سے چور ہو کر گر پڑا ہوں

ترقی پر مبارک باد مت دو — رفیقو، میں اکیلا رہ گیا ہوں

کبھی روتا تھا اُن کو یاد کر کے — اب اکثر بے سبب ہنسنے لگا ہوں

فقط دنیا پہ کیا الزام رکھوں — کچھ اپنے آپ میں بھی جھانکتا ہوں

گلے میں محنتوں کا ہار ڈالے — نمائش گاہِ دولت میں کھڑا ہوں

سنے وہ اور پھر کر لے یقیں بھی — بڑی ترکیب سے سچ بولتا ہوں

کہاں کا حلقۂ دوزخ کہ اک عمر — میں انسانوں کے نرغے میں رہا ہوں

بڑھے وہ نازنیں خود میری جانب — بھلا ایسا کہاں کا دلربا ہوں

طریق انساں کا خصلت جانور کی — سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہوں

اک اُس کے غم میں کیا وحشت ہوئی تھی — جو اب صدہا غموں میں مبتلا ہوں

جہاں جاؤں وہیں فرمائشِ شعر — یہ آخر کس مصیبت میں پھنسا ہوں

اُنھیں حق ہے وہ جو فرمائیں — میں تو
ہمیشہ کے لیے چپ ہو چکا ہوں

محسن بھوپالی

○

یہ طے ہوا ہے کہ قاتل کو بھی دعا دیجے
خود اپنا خون بہا، پھر بھی خوں بہا دیجے

نیاز و ناز بجا ہیں مگر یہ شرطِ وصال
ہے سنگِ راہِ تعلّق، اسے ہٹا دیجے

سنا تھا ہم نے کہ منزل قریب آ پہنچی
کہاں ہیں آپ، اگر ہو سکے، صدا دیجے

سحر قریب سہی، پھر بھی کچھ بعید نہیں
چراغ بجھنے لگے ہیں تو لَو بڑھا دیجے

یہ کیا ضرور کہ احساس کو زباں مل جائے
ہے حکمِ نغمہ سرائی تو گنگنا دیجے

بدل گئے ہیں تقاضے سخن شناسی کے
ادھر عطا ہو اُدھر داد برملا دیجے

صدیق افغانی

○

غازہ تو ترا اُتر گیا تھا　　میں دیکھ کے خود کو ڈر گیا تھا

اب شہر ہیں راستے کا پتھر　　میں جنگلوں سے گزر گیا تھا

تحریرِ جبیں مٹی ہوئی تھی　　تقدیر کا زخم بھر گیا تھا

بے نور تھی جھیل بھی کنول سے　　سورج بھی خلا میں مر گیا تھا

احساس، شباب، غم، محبت　　ایک ایک نشہ اُتر گیا تھا

دل کو وہ سکوں ملا ترے پاس　　جیسے میں نگر نگر گیا تھا

کیا چیز تھی بادِ صبحگاہی　　رُوئے گُلِ تر نکھر گیا تھا

ہمراہ تھے اَن گنت زمانے　　مَیں دشت سے اپنے گھر گیا تھا

موتی تھا درونِ قعرِ دریا　　آئی جو ہوا اُبھر گیا تھا

نظروں کا ملاپ کون بھولے　　اک سانحہ سا گزر گیا تھا

اقرارِ وفا کیا تھا اُس نے
مَیں فرطِ خوشی سے مر گیا تھا

مشہود انور

○

خدشہ جو تھا ہم سے، وہ بنے یار کے سائے
ہم لوگ رقیبوں کے کسی کام تو آئے

یوں لفظ سجائے کہ ترا نام نہ آئے
سازش کی طرح درد کے افسانے بنائے

یوں دیکھا ہے اکثر کہ تجھے بھول گئے ہم
یوں چاہا تجھے، تو ہمیں پہچان نہ پائے

تصویر کی مانند رہے چپ ترے غم میں
تحریر کی مانند چھلکتے رہے سائے

ہمسائے کے گھر میں کبھی پھینکا نہ شرارہ
ہم اپنے ہی دامن میں پھرے آگ لگائے

ہنسنے کے لیے لب ہیں تو رونے کے لیے آنکھ
یہ دل ہے کہ دونوں ہی کناروں کو ملائے

اک دل کو جو توڑا تو سزا مجھ کو ملی ہے
آنسو مری آنکھوں سے پلک تک نہیں آئے

دیکھو میری نظروں سے نظر آئے تمہیں بھی
دنیا میں کبھی پھرتے ہیں اپنے کو چھپائے

سرسبز خیالات کی کھیتی ہے فروزاں
سورج میری آنکھوں سے کہیں دور نہ جائے

اختر ہوشیار پوری

○

دل میں اک جذبۂ بیداد و جفا ہی ہو گا
وہ خداوند بھی ہو گا تو خدا ہی ہو گا

گرد سی اُڑتی نظر آتی ہے، آندھی ہو گی
دُور تک نقشِ قدم ہیں، کوئی راہی ہو گا

کون جیتا ہے تمنّا کے لہو ہونے تک
اُجلی صبحوں کا نشاں رنگِ قبا ہی ہو گا

ہم سے جو پوچھنا ہے پُوچھ لو، ورنہ کل کو
کس کو اندازۂ ناکردہ گنہ ہی ہو گا

کہیں گرتی ہوئی دیواریں کہیں جھکتی چھتیں
آپ کہتے ہیں تو یہ قصرِ وفا ہی ہو گا

پھُول سے ترشے ہوئے لوگ خرابوں میں کہاں
دشت وحشت میں کوئی آبلہ پا ہی ہو گا

جاتے جاتے مرے دروازے کے پٹ کھول گئی
یہ بھی اختر کوئی اندازِ صبا ہی ہو گا

اقبال ساجد

○

سُورج ہوں، چمکنے کا بھی حق چاہیئے مجھ کو
میں کہر میں لپٹا ہوں، شفق چاہیئے مجھ کو

ہو جائے کوئی چیز تو مجھ سے بھی عبارت
لکھنے کے لیے سادہ ورق چاہیئے مجھ کو

خنجر ہے تو لہرا کے مرے دل میں اُتر جا
ہے آنکھ کی خواہش کہ شفق چاہیئے مجھ کو

ہو وہم کی دستک کہ کسی پاؤں کی آہٹ
جینے کے لیے کچھ تو رمق چاہیئے مجھ کو

ہر بار مری راہ میں حائل ہو نیا سنگ
ہر بار کوئی تازہ سبق چاہیئے مجھ کو

جو کچھ بھی ہو باقی وہ مرے ہاتھ پہ لکھ دے
مضمون بہر طور ادق چاہیئے مجھ کو

جو ذہن میں تصویر ہے، کاغذ پہ اُتر آئے
دنیا میں نمائش کا بھی حق چاہیئے مجھ کو

ہر پھُول کے سینے میں گِلِ سنگ ہو ساجد
ہر سنگ میں اک رنگِ قلق چاہیئے مجھ کو

رُوحی کنجاہی

○

شعر لکھنے کی وہ فرصت بھی گئی
وقت کے ساتھ یہ دولت بھی گئی

ذہن گم اور ہی سوچوں میں ہوا
وہ مزاج اور طبیعت بھی گئی

اب تو ہر بات پہ رو دیتا ہوں
دُکھ اٹھانے کی وہ ہمت بھی گئی

بے وقار ایسا ہوا ہوں پیارے
کہ ترے پیار کی عزت بھی گئی

کون دلجوئی کرے گا رُوحی
وہ لحاظ اور مروّت بھی گئی

○

اِک پیکرِ اضطراب ہوں میں
خود اپنے لیے عذاب ہوں میں

مٹی میں اَٹا ہوا پڑا ہوں
شہکار تو لاجواب ہوں میں

ڈھونڈھو گے تمام رات مجھ کو
ڈھلتا ہوا آفتاب ہوں میں

ہر لمحہ کی کشمکش میں شامل
ہر موج کے ہم رکاب ہوں میں

صدیاں مرے پاؤں میں ہیں رُوحی
اِک ساعتِ لاجواب ہوں میں

کمار پاشی

○

آیا بسنت، پھول بھی شعلوں میں ڈھل گئے
میں چومنے لگا تو مرے ہونٹ جل گئے

لپکا مرے خیال کا کوندا کچھ اس طرح
چاروں طرف جو لفظ پڑے تھے، پگھل گئے

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کی دُھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے

جھونکے نئی رُتوں کے جو گزرے قریب سے
بیتے دنوں کی دُھول مرے منہ پہ مل گئے

سر پر ہمارے دُھوپ کی چادر سی تن گئی
گھر سے چلے تو شہر کے منظر بدل گئے

○

جو کچھ نظر پڑا، میرا دیکھا ہُوا لگا
یہ رُوح کا لباس بھی پہنا ہُوا لگا

جو شعر بھی کہا وہ پُرانا لگا مجھے
جس لفظ کو چھُوا، وہی برتا ہُوا لگا

دل کا نگر تو دیر سے ویران تھا مگر
سُورج کا شہر بھی مجھے اُجڑا ہُوا لگا

اپنا بھی جی اُداس تھا موسم کو دیکھ کر
اُس شوخ کا مزاج بھی بدلا ہُوا لگا

پاشی سے کھُل کے بات ہوئی ہے ہماری بھی
وہ نوجوان تو ہمیں سُلجھا ہوا لگا

نظیر صدّیقی

O

کچھ میرا تصوّر ہے تو کچھ اس کی ادا ہے
اِن دونوں عناصر سے جمال اس کا بنا ہے

معلوم ہے کیا کچھ مجھے فردا سے ملے گا
فردا مرے ماضی کے گناہوں کی سزا ہے

باقی ہے فقط قاتل و مقتول کا رشتہ
جس سمت، جہاں دیکھئے، مقتل کی فضا ہے

کس طرح رہے گا کوئی محفوظ بلا سے
کہتے ہیں جسے دِل، وہ گذرگاہِ بلا ہے

جو کام کیا دل نے کبھی سوچ سمجھ کر
آخر میں وہ اُس پر بھی پشیمان ہوا ہے

ظفر ابن متین

O

میں پریشان ہوں، دُنیا چپ ہے
موج بے تاب ہے، دریا چپ ہے

کچھ تو ہے بات کہ ہر راہگذر
صُورتِ نقشِ کفِ پا چپ ہے

کون دیوانہ جہاں سے گذرا
کوہ خاموش ہے، دریا چپ ہے

کون بیمار کی حالت پُوچھے
آج تو خود بھی مسیحا چپ ہے

شور برپا ہے زمانے میں ظفر
اک دلِ زار ہی تنہا چپ ہے

حزیں لدھیانوی

○

مرکز سے جب گرے دلِ انساں اٹھائیے
آئینۂ خیالِ پریشاں اُٹھائیے

جن پتیوں کو خاک پہ پت جھڑ بکھیر دے
آنکھوں پہ اُن کو صورتِ مژگاں اٹھائیے

جھوٹی مسرتوں کے دھنک جائیں گے پہاڑ
لہرا کے تیشۂ غمِ پنہاں اٹھائیے

آندھی سمندروں کی تہوں میں نہ پھینک آئے
اب تو سوالِ خاکِ پریشاں اُٹھائیے

سیلابِ غم نے گھیر لیا جسم کو حزیںؔ
مٹی کے اس مکان سے ساماں اُٹھائیے

تاج سعید

○

دل میں کوئی چھُپا ہوا ہے
خالی کمرہ بول رہا ہے

دل دریا کا انت نہ پایا
کس کو اس کا انت ملا ہے

جس کا سایہ من بھایا تھا
پیڑ وہی اب کٹا پڑا ہے

تاریکی ہے گھیرا ڈالے
سُورج رستہ بھُول گیا ہے

یاد کی روشن آنکھ سے کوئی
تاجؔ کو چھُپ کر دیکھ رہا ہے

فاضل رشیدی

○

جب کبھی یاد کے صحراؤں میں گلزار کھلے
ہم کو کرنے ہی پڑے تنگیِ داماں کے گلے

سرگراں دوست، خفا آپ، زمانہ دشمن
کتنے آلودہ ہیں بے نوش غذاؤں کے صلے

ہائے کس دور کی ایجاد ہے یہ بخیہ گری
ہونٹ سِل جائیں مگر چاکِ گریباں نہ سِلے

بارشِ سنگ ابھی جاری ہے بازاروں میں
میکدے والو! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے

تم سِلے بیٹھے رہو اپنی زلیخائے ہوس
چاکِ ملبوسِ پیمبر ہے، سِلے یا نہ سِلے

کامل القادری

○

آغوشِ صدف میں ہوں نہ دریا میں پڑا ہوں
وہ قطرۂ نیساں ہوں کہ صحرا میں پڑا ہوں

ہر ذرّہ ہے خمخانۂ سرجوشِ معانی
میں بحثِ تنک بخشیِ مینا میں پڑا ہوں

رفتار پہ قابو ہے، نہ منزل کا پتا ہے
میں خس کی طرح موجۂ دریا میں پڑا ہوں

فرصتِ غمِ پنہاں سے جو مل جائے تو سوچوں
اعدا میں پڑا ہوں کہ احبّا میں پڑا ہوں

میں یوسفِ گم گشتہ کی صورت، پسِ زنداں
صورت گرِ خوابِ زلیخا میں پڑا ہوں

میر نسیم محمود

○

یوں تو سب حادثے عیاں گزرے
دل پہ جو گزرے وہ نہاں گزرے

اب کوئی اور آرزو اے دل!
عمر کیوں ساری رائگاں گزرے

کل جو بجلی گری قفس کے قریب
ذہن سے کتنے آشیاں گزرے

پھول سی تھی عدو کی سنگ زنی
دوستوں کے کرم گراں گزرے

بے سبب تیری کم نگاہی پر
دل میں کیا کیا مرے گماں گزرے

میرا ماضی بھی تو ہے، حال بھی تو
مجھے گزرے ہوئے کہاں گزرے

دل کی تنہائی سے صدا نہ اُٹھی
کارواں آئے کارواں گزرے

عاصی کرنالی

○

ہر نقش کو حیرت سے نہ تکنے کی دعا مانگ
آئینے کی ظلمت سے دمکنے کی دعا مانگ

یا ہاتھ بڑھا نخلِ سرافراز کی جانب
یا پھر کسی ٹہنی کے لچکنے کی دعا مانگ

صحرا درِ خورشید پہ دامن کو نہ پھیلا
ظالم! کسی ذرّے کے چمکنے کی دعا مانگ

نازک سے ستارے! نگہِ گرم طلب کر
ننھی سی کلی! دل کے دھڑکنے کی دعا مانگ

تخلیق یونہی ہوتی ہے ہر جادۂ نو کی
صحرائے تجسّس میں بھٹکنے کی دعا مانگ

زاہد منارانی

○

کئی دلوں میں پڑی اس سے شور و شر کی طرح
ترا خیال ہے اُڑتی ہوئی خبر کی طرح

نہیں ہے تابِ نظر کم عیار آنکھوں میں
چمک رہا ہے وہ چہرہ دکانِ زر کی طرح

ہٹے گی گردِ مہ و سال کس کے ہاتھوں سے
زمانہ بند پڑا ہے قدیم در کی طرح

خیالِ غیر نکلتا نہیں مرے دل سے
کسی کے گھر میں یہ بیٹھا ہے اپنے گھر کی طرح

ٹھٹھک گیا میں اُسے اپنے سامنے پا کر
مجھے لگا وہ گذرگاہِ پُر خطر کی طرح

سکوں کے ساتھ تھکن بھی ہے اس کی یادوں میں
گذشتہ عمر ہے بھُولے ہوئے سفر کی طرح

پسِ روائے نظر چھُپ گئی ہے تاریکی
وہ بے نقاب ہوا اوّلیں سحر کی طرح

جو میرے سامنے مدّت کے بعد آیا تھا
گذر گیا ہے اچٹتی ہوئی نظر کی طرح

ڈھلے ہیں ان میں مری زندگی کے شام و سحر
ہیں میرے شعر حکایاتِ مختصر کی طرح

○

رستہ انھیں پسند نہ آیا خدائی کا
الزام اہلِ دل پہ رہا کج ادائی کا

آیا نہ بھول کر کوئی ملنے کے واسطے
مدّت سے میرے گھر میں قدم ہے جدائی کا

پھر سر اُٹھا رہے ہیں ہر اک دل میں واہمے
پھر وقت آ گیا ہے بتوں کی خدائی کا

یادش بخیر جب سے ہوئے اُس کے آشنا
ہم کو کسی سے زعم نہیں آشنائی کا

چل کر رہِ زیاں پہ توقع ہے سُود کی
دل کو بُرائی پر بھی گماں ہے بھلائی کا

چھُپتا ہے اپنا آپ دکھانے کے واسطے
آتا ہے خوب اُس کو ہُنر خود نمائی کا

در باز ہونے والے ہیں ہفت آسمان کے
وقت آ رہا ہے اہلِ زمیں کی رہائی کا

رام ریاض

○

بارہا تن کا لبادہ اُترا
تم نے دیکھا مرا چہرہ اُترا

رہ گیا نام ترا یاد مجھے
تو مرے دھیان سے کیسا اُترا

کوئی منظر، کوئی پرچھائیں نہ یاد
اشک بھی آنکھ میں تنہا اُترا

چہرۂ گل پہ تبسم بکھرا
سینۂ شاخ میں کانٹا اُترا

دل میں آیا ترے پیکر کا خیال
یا کوئی کانچ کا ٹکڑا اُترا

برف قدموں کی پگھل جائے گی
رامؔ اس بار جو دریا اُترا

○

پانی پر تصویر اُتارا کرتے تھے
ہم تالاب میں پتھر مارا کرتے تھے

اگلے لوگوں نے بھی وقت گزارا ہے
سوچتا ہوں، کس طرح گزارا کرتے تھے

کوئی بات تھی، میرے سر پر چاند نہ تھا
تم جو میری سمت اشارا کرتے تھے

ہم سے کوئی اندیشہ، کوئی خوف نہ تھا
پھر بھی اُونچے لوگ کنارا کرتے تھے

رامؔ جی! اب تو نیند سے بھی ڈر لگتا ہے
پہلے ہنس کر موت گوارا کرتے تھے

احمد ندیم قاسمی

○

ہجر کی رات کا انجام تو پیارا نکلا
وہی سورج کہ جو ڈوبا تھا، دوبارہ نکلا

ظلمتِ شب سے مجھا دن کا تصور ممکن
یہ اندھیرا تو اُجالے کا سہارا نکلا

تو کہ تھا بزم میں تصویرِ کم آمیزی کی
میری تنہائی میں کیوں انجمن آرا نکلا

میں ترے قرب سے ڈرتا ہوں کہ تو زندہ رہے
میں سمندر میں جب اُترا تو کنارا نکلا

وقت نے جب بھی مرے ہاتھ سے مشعل چھینی
ذہن میں تیرے تصور کا ستارا نکلا

جانے یہ کرب ہے دوری کا کہ مٹی کا طلسم
سطحِ دریا پہ تو مہتاب دوپارا نکلا

اپنی ہستی کو مٹانے کا نتیجہ یہ ہے
پھول توڑا تو مرے خون کا دھارا نکلا

نفسی نفسی بھی وہی، سچ کی دہائی بھی وہی
تیرا محشر مرا مانوس نظارا نکلا

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیمؔ
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارہ نکلا

سیّد علی عباس جلالپوری

روحِ عصر

۵

صدیٔ رواں اور زوالِ مغرب

ہمارے عہد کے بعض مورخینِ تمدن بیسویں صدی کا آغاز ۱۹۱۴ء سے کرتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں پہلی جنگِ عالمگیر کو انیسویں اور صدیوں کے معاشرے کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کے خیال میں اِس جنگ کے ساتھ عہدِ وکٹوریا کے معاشرے کا خاتمہ ہوا اور روس کے اشتمالی انقلاب اور فرائڈ کے نظریہ تحلیلِ نفسی نے اجتماعی قدروں کے ساتھ اِحساس و فکر کے انداز کو بھی بدل دیا۔ یہ خیال ایک حد تک قابلِ قبول ہے لیکن اِس پر صاد کرتے وقت اِس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ روس کا اشتمالی انقلاب برقِ خرمن سوز کی طرح دفعتہً آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ گذشتہ دو صدیوں کے عمرانی، اقتصادی اور سیاسی رجحانات کی تخلیق تھا، اسی طرح فرائڈ کی فردیت، داخلیت اور قنوطیت میں ذہنوں کے نقطۂ نظر کی تشکیلِ جدید ہوئی تھی۔

صدیٔ رواں کے علمی و ادبی رجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے پس منظر کے طور پر اہم تاریخی واقعات، اقتصادی عوامل اور اجتماعی موثرات کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اِس مقصد کے لیے ہمیں ایک صدی قبل کے واقعات سے آغاز کرنا پڑے گا۔

انقلابِ فرانس اور نپولین کی معرکہ آرائیوں نے یورپ کے عوام میں بیداری کی ایک طوفان پرور لہر دوڑا دی تھی جمہوری قدروں کی ہمہ گیر اشاعت سے یورپ کے مستبد سلاطین متوحش ہو گئے تھے اور اُنھوں نے باہم مل کر آزادیٔ فکر و نظر کے سدِ باب پر کمر باندھی تھی۔ نپولین کی شکست کے بعد جمہوریت کے خلاف جو ردِ عمل ہوا، اُس کا سب سے بڑا نمائندہ آسٹروی وزیر کلیمنز مترنخ تھا جو ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک رجعت پسندی کا سب سے بڑا سہارا بنا رہا۔ اُس کے ایما پر فرانس، ہسپانیہ، ہالینڈ اور اطالوی ریاستوں کے سابق سلاطین کی بحالی عمل میں آئی، وہ عوام کو سخت حقارت اور تنفر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے مطالبات اور توقعات کو بے دردی کے ساتھ پاؤں تلے کچل دینا چاہتا تھا۔ اُس کی کوششوں سے آسٹریا، پرشیا اور روس کے درمیان ستمبر ۱۸۱۵ء میں ایک 'معاہدۂ مقدس' ہوا جس کا مقصدِ واحد یہ تھا کہ سلاطین کے تسلط و استبداد کو بزورِ شمشیر برقرار رکھا جائے اور یورپ کی سرزمین سے جمہوری اداروں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے، لیکن زمانے کا رُخ بدل چکا تھا۔ عوام جذبۂ حریت سے سرشار تھے ۱۸۳۰ء میں اہلِ فرانس چارلس دہم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور بادشاہ ملک سے بھاگ گیا۔ اس سے دوسرے ممالک میں بھی ازسرِ نو انقلابی تحریکیں برپا ہو گئیں۔ جرمنی، پولینڈ اور اطالیہ میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں جنھیں مترنخ نے کچل دیا، لیکن ۱۸۴۸ء میں خود آسٹروی شہنشاہیت میں انقلاب برپا ہوا، مترنخ آسٹریا سے بھاگ گیا اور جمہوریت کے خلاف جو دیوارِ چین تعمیر کی گئی تھی، اُس میں چاروں طرف شگاف پڑنے لگے۔ ہسپین، پرتگال، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں دوبارہ جمہوریت برسرِ کار آ گئی۔

جہاں تک ایشیا اور افریقہ کا تعلق ہے، وہاں کے باشندوں کو غلامی کا طوق پہنانے کے لئے مغربی اقوام نے ایک خفیہ قسم کا "معاہدۂ ناپاک" کر رکھا تھا۔ اہل مغرب نے ان براعظموں کے وسیع و عریض علاقوں آبائی ورثے کی طرح آپس میں تقسیم کر لیا۔ فرانسیسیوں نے شمالی افریقہ، جرمنوں نے مشرقی افریقہ، انگریزوں نے سوڈان، اطالویوں نے سومالی لینڈ اور ایری ٹیریا، پرتگیزوں نے انگولا اور بلجیم نے کانگو کے طاس پر قبضہ کر لیا

اس عہد میں اہل مغرب کی سیاسیات کا بنیادی اصول یہ تھا کہ اپنے ملک میں جمہوریت کو رواج دیا جائے اور ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں تجارتی ملوکیت اور استبداد کو قائم کیا جائے۔

۱۸۷۰ء میں فرانس اور پرشیا میں جنگ چھڑ گئی اور پرشیا نے فرانس کو شکست فاش دے کر السیس اور لورین کے معدنی علاقے اپنی اپنی مملکت میں شامل کر لئے۔ فرانس اور جرمنی کی سیاسی رقابت نے طول کھینچا اور تجارتی چشمک کو ہوا دی اور پہلی جنگِ عالمگیر کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس جنگ کے دوران میں بولشویکوں نے لینن کی سرکردگی میں روس میں اشتمالی انقلاب برپا کیا۔

۱۹۲۹ء میں کساد بازاری کا دور دورہ ہوا جس سے اہل مغرب کی صنعت و حرفت کو سخت ضرر پہنچا۔ لاکھوں مزدور بے کار بیٹھ گئے۔ ان کی داویلا کو دبانے کے لئے کارخانہ داروں نے فاشستی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی جس سے اطالیہ میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آ گئے۔ اب "عظیم جرمنی" اور "دولتِ اکبری" کی تشکیل کے لئے ہمسائے ممالک پر ترکتاز کا آغاز ہوا جس کا نتیجہ دوسری عالمگیر جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ جنگ سابقہ عالمگیر جنگ سے کہیں زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوئی۔ اگست ۱۹۴۵ء میں امریکیوں نے جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکے جن سے لاکھوں نہتے شہری جل بھن کر خاکستر ہو گئے۔

دوسری جنگِ عالمگیر کے خاتمے پر بحیثیت عالمی طاقتوں کے برطانیہ اور فرانس کے اثر و رسوخ کا خاتمہ ہو گیا اور کرۂ ارض دو واضح حلقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف سرمایہ دار اور دوسری طرف اشتمالیت پسند۔ سرمایہ داروں کے سرخیل امریکی ہیں اور اشتمالیوں کے سربراہ روسی۔ چین اور مشرقی یورپ کے ممالک میں اشتمالیت کے نفوذ سے عالمگیر اشتمالیت کو تقویت بہم پہنچی ہے۔ امریکی مغربی ممالک کو اشتمالیت سے بچانے کے لئے انہیں کروڑوں ڈالر کی مالی امداد دے رہے ہیں۔ مارشل ایڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں :

> "امریکیوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنا سامانِ تجارت غیر ملکوں میں فروخت کریں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے جب تک کہ غیر ممالک کے باشندوں میں اسے خریدنے کی سکت نہ ہو۔ میں مارشل ایڈ کے متعلق غیر فیاضانہ بات کہنا نہیں چاہتا وہی کہہ رہا ہوں جو خود امریکہ میں اس امداد کے حامی کہتے ہیں یعنی اس امداد سے یورپ اور امریکہ دونوں کا مفاد وابستہ ہے۔ یہ کہنے سے میرا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ اس امداد سے یورپ میں اشتمالیت کا نفوذ رک گیا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ یورپ کو مالی امداد دے کر خود امریکہ کو بھی مالی فائدہ پہنچے ہیں۔"[۵۱]

اس میں شک نہیں کہ اگر امریکی دوسرے ممالک کو وسیع پیمانے پر مالی امداد نہ دیتے تو ان کے اپنے صنعتی ادارے معرضِ خطر میں پڑ جاتے اور خوردنی اجناس کے نرخ گر جاتے۔ فاضل گندم باہر بھیجنے سے بھی امریکہ کے کسانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔

آج کل مغرب کے سرمایہ دار تیسری جنگِ عالمگیر سے اتنے خائف نہیں ہیں جتنا کہ ۱۹۲۹ء جیسی کساد بازاری کے خیال سے دہشت زدہ ہو رہے ہیں۔ معاشیات کے طلبہ جانتے ہیں کہ سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا تو اسلحہ سازی اور دوسرے متعلقہ کارخانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اشیاء کے نرخ گر جانے سے

---

۵۱ New Hopes For a Changing World.

کارخانے بند ہو جائیں گے اور لاکھوں مزدور بے روزگاری کے شکار ہو جائیں گے۔ انہی وجوہ کی بنا پر مغرب کے کارخانہ دار۔ اور اہلِ اقتدار امن کے بم کو ہائڈروجن بم سے زیادہ مہلک سمجھتے ہیں۔ بقول آلڈوس ہکسلے[۵]:

"اگر جنگ چند سالوں تک کے لئے ملتوی ہو گئی تو موجودہ اسلحہ سازی کی رفتار سست پڑ جائے گی اور نتیجۃً ۱۹۲۹ء جیسی مندی دوبارہ تمام دنیا میں پھیل جائے گی۔"

ان حقائق کے پیش نظر اس بدیہی حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ مغرب کے صنعتی اور تجارتی اجارہ داروں کی خود غرضی چٹان بن کر امنِ عالم کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔ مغربی ممالک کی ساری دولت و ثروت چند سو خاندانوں میں جمع ہو کر رہ گئی ہے اور حکومتوں کی داخلی اور خارجی حکمت عملی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ انگریز فلسفی سی۔ای۔ایم جوڈ مغرب میں افلاس اور تموّل کے تضاد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جدید تہذیب کی اُلجھن ہے تموّل و افراط کے درمیان افلاس و احتیاج جب میں روس میں تھا تو وہاں کے کارخانوں کی دیواروں پر ایک پوسٹر لگا ہوا دیکھا جو اس اُلجھن کی وضاحت کرتا تھا۔ اس کی تصویر میں ایک انگریز مکان کی کا گھر دکھایا گیا تھا۔ جس کا چولھا سرد پڑا تھا اور ایک ننھی بچی چیتھڑوں میں ملبوس اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی "امی! ہمارے ہاں آگ کیوں نہیں جلتی؟" ماں نے جواب دیا "کیونکہ کوئلہ نہیں ہے میری بچی" لڑکی پوچھتی تھی "امی جان! کوئلہ کیوں نہیں ملتا؟" ماں کا جواب تھا "کیونکہ تمہارے ابا جان بیکار بیٹھے ہیں اور کوئلہ خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہے۔" لڑکی نے پھر پوچھا "ابا جان کیوں بیکار بیٹھے ہیں؟" ماں کا جواب تھا "کیونکہ کوئلہ کی افراط ہو گئی ہے۔"

امریکہ کے مشہور اہلِ قلم ول ڈیورنٹ نے اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ہمارے لئے اس سے اچھی بات اور کون سی ہو سکتی ہے کہ ہمارے تاجر اپنے ہی ملک کی منڈیوں میں اپنا مال بیچیں۔ کبھی ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے حصولِ مسرت کے لئے غیر ملکی منڈیوں پر قبضہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ صنعت و حرفت اور اختراع و ایجاد کے برکات کو اپنے ہی عوام تک پہنچانا لازمی ہے۔ ہمارے ملک کی کثیر آبادی ایک بہت بڑی منڈی ثابت ہو سکتی ہے۔"

بنظرِ غور سے دیکھا جائے تو اشتمالیت اور سرمایہ داری کی موجودہ عالمگیر کشمکش ایشیا اور یورپ کی تاریخی آویزش کی ہی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہیروڈوٹس کے الفاظ میں "مشرق و مغرب کی نزاع و پیکار ازلی و ابدی ہے۔"

مشرق و مغرب کی اس تاریخی کشمکش اور جنگ و جدال کا آغاز محاصرۂ ٹرائے سے ہوا تھا جب یونانیوں نے ایشیا کے ایک ایسے شہر کو تباہ و برباد کر دیا جو تجارت میں اُن کا حریفِ غالب ثابت ہو رہا تھا۔ ہیلن کی بازیافت تو محض ایک بہانہ تھا۔ اس کے بعد یونانی اور رومی صدیوں تک ہند و چین کو جانے والے تجارتی راستوں پر قابض ہونے کے لئے ہخامنشیوں، ساسانیوں اور پارتھیوں سے برسرِ پیکار رہے۔ خشیارشا نے ایتھنز کو فتح کر کے جلایا تو سکندر نے اصطخر کو نذرِ آتش کیا۔ سکندر کے بعد رومی سپہ سالار پومپے اور کراسس ایرانیوں سے نبرد آزمائی کرتے رہے۔ مغرب کی اس تاخت کا جواب صدرِ اسلام کے عرب شہسواروں نے دیا جو فاتحانہ یلغار کرتے ہوئے فرانس تک جا پہنچے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں میں اہلِ مغرب نے عربوں سے انتقام لینے کی ناکام کوششیں کیں۔ جب تاتاریوں کے ہاتھوں عربوں کی قبائے سطوت تار تار ہوئی تو اہلِ مغرب خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ سنہ ۱۲۶۳ء میں پوپ نے ہلاکو خاں کو خط لکھا جس میں اُسے عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ مقصد یہ تھا کہ تاتاریوں سے مل کر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ترکوں کے اسلام قبول کرنے اور ایشیائے کوچک پر قابض ہو جانے سے عثمانی سلاطین اور قیاصرۂ بازنطین کے

---

[۵] Ends and Means

درمیان جدال و قتال کی تجدید ہوئی۔ عثمانی ترک فاتحانہ پیش قدمی کرتے ہوئے ہنگری کے دار السلطنت جا پہنچے۔ جنگ کاسووو (۱۳۸۹ء) میں سلطان بایزید یلدرم نے یورپ کی متحدہ افواج کو شکستِ فاش دے کر تباہ کر دیا تو اہلِ مغرب نے تیمور لنگ سے ساز باز کر کے اس خطرے سے نجات پائی۔ دوسری طرف انگریز شرلے بھائیوں نے ایرانیوں کو توپیں ڈھالنے کا فن سکھایا تاکہ وہ اپنے پشتینی دشمن عثمانی ترکوں کے توپ خانے کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ شاہ اسمٰعیل صفوی اور سلطان سلیم عثمانی کے درمیان جنگ و جدال کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے دونوں ملکوں کو کمزور کر دیا اور اہلِ مغرب نے اطمینان اور آزادی کا سانس لیا۔

نشاۃ الثانیہ کے بعد پھر مغرب کی باری آگئی۔ انھوں نے اہلِ مشرق کے معاشرتی تنزل، عسکری کمزوری اور باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر مشرقی ممالک پر بے پناہ حملوں کا آغاز کیا اور انھیں ہر طرف شکست دے کر مغلوب کر لیا۔ صدیوں کی سیاسی اور اقتصادی غلامی کے بعد گزشتہ ایک صدی سے اہلِ مشرق کو اپنی زبوں حالی کا احساس ہونے لگا ہے اور وہ اہلِ مغرب کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ اہلِ مغرب ایشیائی اور افریقی اقوام کی روز افزوں آبادی اور بڑھتی ہوئی طاقت سے لرزہ براندام ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ شاید پھر مشرق کے جوابی اقدام کرنے کی باری آگئی ہے۔

پروفیسر ٹائن بی[1] نے اشتمالی روس اور سرمایہ دار یورپ کی موجودہ کشمکش کا بھی مشرق و مغرب کی قدیم نزاع کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شہزادہ کیوہ ولادی میر نے ۹۸۸ء میں شہنشاہ بازنطین کی ہمشیرہ سے شادی کی جس سے روس میں عیسائیت کا آغاز ہوا اور روس کلیسائے یونان یا مشرقی کلیسا سے وابستہ ہو گیا۔ مشرقی کلیسا اور مغربی کلیسا جس کا مرکز روم تھا، ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ علاوہ ازیں روس کی اکثر اقوام منگول، ازبک، کرغیز، قفقاز وغیرہ ایشیائی ہیں اور سلاووں کی رگوں میں بھی ہنوں اور سیتھیوں کا خون موجزن ہے۔ یہ نسلی اختلاف بھی روس اور مغرب کی باہمی منافرت کا باعث بن گیا ہے۔ پروفیسر ٹائن بی لکھتے ہیں:

> "ایک ہزار برس سے روسی بازنطین کے تمدن کے حامل ہیں، جو یورپ کے تمدن سے مختلف ہے۔ روسیوں کی طبائع نے ہمیشہ یورپی تمدن کو قبول کرنے سے ابا کیا ہے اور کبھی بازنطین کے تمدن کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی اقوام نے ہمیشہ روسیوں کو نفرت و عناد کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اہلِ یورپ شروع سے انھیں اجنبی سمجھتے رہے ہیں کیوں کہ وہ مشرقی کلیسا کے پیرو تھے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی تسخیر کے بعد ماسکو بازنطین تمدن کا مرکز بن گیا اور کلیسائے روم کے پیرو روسیوں کو غیر سمجھتے رہے۔ دوسری طرف روس میں سلیو فائل (لغوی معنی "سلاو سے محبت کرنے والے")، جو مشرقی کلیسا کے کٹر پیرو تھے اہلِ یورپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور ان کے تمدن سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یہی باہمی منافرت اشتمالی روس اور سرمایہ دار یورپ کے درمیان باقی و برقرار ہے۔"

تمدنِ مغرب کا تنزل

پہلی جنگِ عالمگیر کے دوران میں جرمنی کے مشہور فاضل اوسوالڈ سپنگلر[2] نے بے شمار تاریخی شواہد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا تھا کہ مغرب کا تمدنِ جدید تنزل پذیر ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے زمانے کے اکابر مورخین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں ٹائن بی، سوروکن، بادنسٹر اور بردیف قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا پیش رو روسی مفکر نکولائی دانی لیوفسکی تھا جس کی کتاب "روس اور مغرب" ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دانی لیوفسکی کہتا ہے کہ یورپ آغازِ تمدن سے ہی روس کو بیگانہ سمجھتا رہا ہے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا رہا ہے۔ اس کا محکم

[1] Civilization On Trial.

[2] Decline of the West.

عقیدہ ہے کہ یورپ کا تمدن تنزل پذیر ہو چکا ہے اور روسی تمدن ترقی پذیر ہے۔ وہ یورپ کے تمدن کو ہمہ گیر نہیں سمجھتا بلکہ اُسے "جرمن رومی" تمدن کا نام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آغازِ تاریخ سے دنیا میں متعدد تمدن پنپتے رہے ہیں۔ انہی بیرونی تمدنوں میں سے ایک روسی تمدن بھی ہے جس کا یورپ کے تمدن سے قطعاً کوئی ربط و تعلق نہیں ہے کیوں روسیوں نے ہمیشہ یورپ سے الگ تھلگ رہ کر اور اس کے اثرات سے آزاد رہ کر زندگی بسر کی ہے۔ اس کے بعد دانی لیوفسکی کہتا ہے کہ یورپ کا تمدن اپنی معراجِ کمال کو پہنچ کر تنزل پذیر ہو چکا ہے۔ یہ تنزل سترھویں صدی کے اواخر سے شروع ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی میں اس کے خدوخال واضح ہو گئے تھے۔ اس تنزل کا ظہور عیسائیت کے انحطاط اور ہمہ گیر کلبیت کی ترویج سے ہوتا ہے۔ اسی تنزل پذیری کے باعث اہلِ یورپ تمام دنیا پر اپنا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دانی لیوفسکی کو اس بات کا یقین ہے کہ یورپ کے عمر رسیدہ تمدن اور روس کے نوخیز تمدن کا تصادم ناگزیر ہے۔ اس جنگ میں روس فتح مند ہوگا اور اس کے ہاتھوں یورپ کے تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دانی لیوفسکی کی تاریخی بصیرت اور ژرف بینی قابلِ داد ہے کہ اس نے آج سے کم و بیش ایک صدی پیشتر تاریخی حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

سپنگلر نے لفظ تہذیب (کلچر) کو وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ جب کسی قوم کی تہذیب تنزل پذیر ہو کر جاں بلب ہو جاتی ہے تو اس آخری مرحلے کو اس نے تمدن (سولائزیشن) کا نام دیا ہے۔ اس کے خیال میں مغرب اب تمدن کے انحطاط پذیر مرحلے سے ہی گذر رہا ہے۔ اس تنزل کے علامات جو اس نے قدیم تمدنوں کے سیر حاصل تبصرے کے بعد اخذ کئے ہیں، موجودہ مغربی تمدن میں بھی رونما ہو گئے ہیں۔ یہ علامات اس کے خیال کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جدید دور میں بڑے بڑے شہر نمودار ہو گئے ہیں جو تمدنِ مغرب کی فطری تازگی اور شگفتگی کو سلب کر رہے ہیں۔

۲۔ ادبی اور فنی تخلیق کا عمل رُک گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری، موسیقی، تعمیر وغیرہ میں اول درجے کے شاہکار پیش کرنے کا زمانہ گذر چکا ہے۔

۳۔ پیدائش کم ہو گئی ہے مغرب کے اکثر ممالک انگلستان، فرانس، اطالیہ وغیرہ کی آبادی ایک خاص نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔

۴۔ مذہب کے احیاء کی کوشش شروع ہو چکی ہے۔ سپنگلر کے خیال میں جب کسی مذہب کے احیاء یا تجدید کی کوشش شروع ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ مذہب ختم ہو چکا ہے کیونکہ زندہ چیز کے احیاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

۵۔ قیصریت برسرِ اقتدار آ گئی ہے اور عظیم جنگوں کا آغاز ہو گیا ہے۔

اِن علامات کا ذکر کر کے سپنگلر کہتا ہے کہ مغربی تمدن تاریخ کے جبری عمل کے ماتحت جسے اس نے Schicksal کا نام دیا ہے، حالتِ نزع میں کشمکش کر رہا ہے۔ اس کے تنزل اور خاتمے کے سدباب کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ سپنگلر نے تہذیبوں کی پیدائش، ارتقا اور فنا کا جو نظریہ پیش کیا ہے اسے وہ Morphology of culture کہتا ہے:

ٹائن بی کو تسلیم ہے کہ تمدنِ مغرب تنزل پذیر ہو چکا ہے لیکن وہ اہلِ مذہب کی حیثیت سے تاریخ کے جبری عمل کا قائل نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمدنِ مغرب کے موجودہ تنزل و انحطاط کا مداوا ممکن ہے۔ اس تنزل نے اہلِ مغرب کو ایک چیلنج پیش کیا ہے۔ اگر انھوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور تنزل کے عمل کو روکنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں تو وہ اپنے تمدن کو موت کے پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اور تنزل کی قوتوں پر قابو پا کر انھیں ترقی کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔ ٹائن بی نے تمدن کو درخت سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ درخت کا پھل پختہ ہو جائے تو وہ بیج بن کر دوبارہ زمین میں گرتا ہے اور پھوٹ کر نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمدن کی پختگی میں ہی اس کی تجدید اور اعادے (return) کے ممکنات و اسباب مخفی ہوتے ہیں۔ ٹائن بی، سپنگلر کے برعکس افراد کے فعال ہونے پر عقیدہ رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں چند فعال افراد ہی معاشرے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ عوام ان کی پیروی اور تقلید پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس تقلید کو وہ نقالی کے عمل

(mimesis) کا نام دیتا ہے۔ ٹائن بی کا نقطۂ نظر دانی لیوفسکی یا سپینگلر کی طرح محققانہ نہیں متکلمانہ ہے۔ اس کے خیال میں بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود عیسائیت کی ہمہ گیر اشاعت میں مضمر ہے۔ عیسائیت سے بے پروائی جدید تمدن کے زوال کا اصل سبب ہے اور عیسائیت کا احیاء اس تمدن کو موت کے منہ سے بچا سکتا ہے۔

دانی لیوفسکی اور سپینگلر نے تمدنِ مغرب کے خاتمے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ ٹائن بی ابھی تک متردد و متشوش ہے لیکن یہ بات اُس نے بھی تسلیم کی ہے کہ اگر اہلِ مغرب نے موجودہ حالات کے چیلنج کو قبول نہ کیا اور مسلسل کوشش سے تخریبی رجحانات کا سدِّ باب نہ کر سکے تو تمدنِ مغرب کی تباہی یقینی ہے۔

ان مورخین کے علاوہ دورِ جدید کے مشاہیر فلاسفہ اور اہلِ دانش نے بھی اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور تمدنِ مغرب کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا ہے۔ آلڈوس ہکسلے کا خیال ہے کہ روحانیت کا فقدان تمدنِ مغرب کے تنزل کا سب سے بڑا سبب ہے۔ بیکس نے موضوعیت (Subjectivism) کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ کہتے ہیں کہ اعلیٰ معروضی قدروں سے بے نیازی برتنے کے باعث مغرب تنزل کا شکار ہو گیا ہے۔ چیسٹرٹن بیلک اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ موجودہ تنزل کا مداوا کلیسائے روم میں تلاش کرتے ہیں۔ افرڈ نوائے، آلڈوس ہکسلے اور جیرالڈ ہرڈ تصوف و عرفان کے احیاء کو مفید و موثر سمجھتے ہیں۔ ژونگ کا خیال ہے کہ کھوئی ہوئی "روح" کی بازیافت ہی دورِ حاضر کے انسان کو بربادی سے بچا سکتی ہے۔ کرسٹوفر کاڈول کا عقیدہ ہے کہ عوام کو سرمایہ داروں اور ملوکیت پسندوں کے معاشی تصرف و استحصال سے نجات دلا کر فرسودہ عمرانی قدروں میں زندگی کی حرارت پیدا کی جا سکتی ہے۔

راقم کے خیال میں روحانیت تمدنِ مغرب کے تنزل کا سب سے اہم سبب ہے۔ اٹھارھویں صدی میں اس بات کے قوی امکانات پیدا ہو گئے تھے کہ سائنس کے انکشافات اور برکات کے طفیل حقیقت پسندی کے جس تعمیری نظریۂ حیات کی تشکیل ہوئی تھی، اس کی مدد سے بنی نوعِ انسان اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کی سعی کریں گے لیکن رومانیت نے ان توقعات کو مجروح کر دیا۔ رومانی جماعت پر فرد کو اور عقل و دانش پر جذبہ و جبلت کو فائق سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف فرد کی انا کو بیش از بیش اہمیت حاصل ہو گئی جس سے فردیت اور موضوعیت کے تخریبی رجحانات کو تقویت ہوئی اور دوسری طرف خرد دشمنی کی اشاعت ہوئی جس سے مغرب کے انسان کا اعتماد عقل و دانش پر باقی و برقرار نہ رہا اور اس کے غور و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ جیسا کہ قدیم تمدنوں کے زوال و انحطاط کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، فردیت اور موضوعیت کے سلبی رجحانات ہمیشہ سے معاشرۂ انسانی کی تخریب و تباہی کا باعث ہوتے رہے ہیں۔ خود غرضی، انانیت، نفس پرستی اور تساوت و بےحسی کی منفی قدریں فردیت کے دامن میں ہی پرورش پاتی ہیں۔ اسی کے زیرِ اثر فرد اپنی کوششوں کو جماعت کے مفاد کے لئے وقف نہیں کرتا بلکہ الٹا جماعت کو اپنی ذاتی اغراض کی پرورش کے لئے آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ نتیجۃً فرد اور جماعت کا عضویاتی (Organic) ربط و تعلق باقی نہیں رہتا اور جماعت ریت کے ذروں کا ایک ٹیلا بن کر رہ جاتی ہے، جسے ناسازگار حالات کی بادِ صرصر کے جھونکے آنِ واحد میں اڑا کر چاروں طرف بکھیر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی فرد اور جماعت کے ربطِ باہم کو استوار کرتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فرد کو جماعت سے الگ کسی قسم کا مستقل مقام حاصل نہیں ہے اور وہ جماعت سے وابستہ رہ کر ہی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ حقیقت رجائی اور خوش گذران ہوتے ہیں کیونکہ وہ خارج سے دلچسپی لیتے ہیں۔ رومانی فردیت پسند خارج کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں جس سے وہ مریضانہ انانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر رومانی قنوطی ہوتے ہیں۔ مزید براں

The Future of the West. J.G. De Bens. — Ends and Means.

Religion and Modern Mind. — Decadence.

Modern Man in Search of a Soul. — Studies in a Dying Culture.

فردیت: (individualism) کو انفرادیت (individuality) سے گڈمڈ نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب ہے فرد کا جماعتی روابط اور خارجی تقاضوں سے قطعِ نظر کر لینا۔

موضوعیت: (subjectivism) کا مطلب ہے خارجی یا معروض object کو پسِ پشت ڈال کر صرف موضوع (subject) کا پاس و لحاظ روا رکھنا۔

روحانی، اجتماعی تقاضوں سے قطع نظر کر لیتے ہیں۔ اس لئے اُن کے وجود سے جماعت کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یونانِ قدیم کے زوال کے علامات لذت پرستوں اور کلبیوں کی فردیت میں نمایاں ہوئے تھے۔ اسی طرح روما کا انحطاط ابیقوریت کی ترویج سے ہوا تھا۔ ابیقورس اور اس کے پیرو سیاسی اور عمرانی امور میں دلچسپی لینے سے گریز کرتے تھے۔ اسی طرح فلاطینس بھی زاویہ نشینی اور ترکِ علائق کی تلقین کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ "عمل استغراق کو مجروح کر دیتا ہے"۔ یورپ کے جدید تمدن میں بھی رومانیت نے فردیت کے تخریبی رجحان کی اشاعت کی ہے جو انجام کار اس کے خاتمے کا باعث ہوگا۔ تنزل پذیری کی یہی کیفیت یورپ کے جدید فنون و ادب میں بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ مسلکِ لاشعور، لاماعقلیت اور موجودیت کی ادبی تحریکوں میں اس کے خد و خال واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

فلسفہ

عقل و خرد اور حقیقت پسندی کی مخالفت میں دو مکاتبِ فکر مشہور ہوئے۔ برگساں کا نظریۂ ارتقائے تخلیقی اور فلسفۂ موجودیت۔ برگساں نے سپنسر اور لامارک کے ارتقائی نظریات کی نئے سرے سے ترجمانی کر کے اپنا فلسفہ مرتب کیا ہے۔ سپنسر کے نظریۂ زماں پر غور کرتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ عقل زماں کا غلط تصور پیش کرتی ہے کیوں کہ وہ اسے سہولتِ فہم کے لئے لحات و آنات میں تقسیم کر لیتی ہے۔ برگساں کہتا ہے کہ زماں ایک سیلانی حرکت ہے جس کا ادراک صرف وجدان سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس کے خیال میں ایک پر اسرار قوت جسے وہ جوششِ حیات کا نام دیتا ہے، تمام انسانی اعمال کی محرک ہے۔ انسان اپنی زندگی میں نئے نئے حقائق کی تخلیق کرتا رہتا ہے بلکہ اُس کی زندگی تخلیقِ مسلسل کا ہی دوسرا نام ہے۔ اسی بنا پر برگساں نے اپنے فلسفے کو تخلیقی ارتقاء کا نام دیا ہے۔ برگساں نے غائیت سے انکار کیا ہے۔ اُس کے خیال میں انسانی کوششوں کے پیشِ نظر کسی قسم کا کوئی مقصد یا نصب العین نہیں ہے۔ اس خیال کی مزید تشریح کرتے ہوئے اُس نے ایک عجیب تمثیل سے کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بنی نوعِ انسان فوجی گھوڑ سواروں کے ایک حملہ آور رسالے کی مانند ہیں اور بے تحاشا گھوڑے مارتے ہوئے آگے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اپنے راستے میں حائل ہونے والی فطری رکاوٹوں کو پامال کرتے جا رہے ہیں۔ اس بے پناہ ترکتاز، اس پرجوش تگ و دو کا محرکِ اول جوششِ حیات ہے۔ اس سوال کا جواب کہ یہ سوار کس منزل کی طرف گھوڑے اُڑاتے ہوئے جا رہے ہیں، برگساں نے کچھ نہیں دیا۔ اس کے خیال میں نوعِ انسان کو پیچھے سے آگے دھکیلا جا رہا ہے۔ کسی منزل یا مقصد کی کشش اس حرکت و عمل کا باعث نہیں ہے۔ یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ منزل یا نصب العین کا تعین تو صرف عقل و خرد ہی کر سکتی ہے۔ یہ بات جذبہ و وجدان کے بس کی نہیں ہے اور عقل و خرد کو برگساں وجدان و جبلت کے مقابلے میں حقیر و صغیر سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں عقل کا کام محض اتنا ہے کہ وہ گرد و راہ بن کر ان حملہ آور گھوڑ سواروں کے پیچھے پیچھے بھاگتی پھرے۔ ان حالات میں برگساں کے شہسواروں کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ خرد دشمنی کے باوجود برگساں نے اپنے نظریے کی تشکیل و اثبات میں عقلی دلائل سے ہی کام لیا ہے۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "برگساں اپنے تمام عقلی استدلال سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عقل حقیقت کا جو تصور پیش کرتی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اس طرح گویا وہ اپنے ہی فلسفیانہ نظریے کی تردید کرتا ہے۔ عقلی دلائل کی بنا پر جتنا وہ اپنے نظریے کی صداقت پر زور دیتا ہے، اتنا ہی اُسے غلط ثابت کر رہا ہے کیوں کہ اس کا استدلال عقلی ہی ہے۔"

برگساں اور صوفیہ دونوں وجدان کو حقیقت و صداقت کا معیار قرار دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ارتقائے تخلیقی کا نظریہ بھی متصوفانہ ہے۔ اگرچہ برگساں نے علم الحیات

Hedonists. — Cynics

Existentialism — اردو میں اس کا ترجمہ بعض لوگوں نے وجودیت سے کیا ہے جو صریحاً غلط ہے کیونکہ وجود Being کا ترجمہ ہے Existent کا ترجمہ موجود ہونا چاہئے

Duration. — Elan Vital — Teleology.

سے استفادہ کرکے اُسے علمی صورت و شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

فلسفۂ موجودیت کا بانی ڈنمارک مفکر کیرکے گارڈ (متوفی ۱۸۵۵ء) کو سمجھا جاتا ہے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد مارٹن ہائی ڈگی، کارل جاسپرز اور جبرئیل مارسل نے کیرکے گارڈ کے افکار کی نئے سرے سے ترجمانی کرتے ہوئے جس مکتب فکر کی تشکیل کی اُسے موجودیت کا نام دیا گیا ہے۔ ان مفکرین میں سے ہر ایک موجودیت کی ترجمانی اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے کی ہے۔ غالباً اسی لئے پال سارتر نے جھلا کر کہا ہے کہ موجودیت کی ترکیب ہی سرے سے بے معنی ہے۔ مارسل اپنے نظریے کو "مسیحی موجودیت" کا نام دیتا ہے اور پال سارتر علانیہ الحاد کا مدعی ہے۔ موجودیت کا نظریہ دراصل ہیگل کے افکار کے خلاف ردعمل کے بطور ظہور پذیر ہوا تھا موجودیوں کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہیگل کے عقیدے کے برعکس موجود (Existent) جوہر (Essence) پر مقدم ہے۔ یہ تحریک رومانی اور موضوعی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں فرد کے شخصی جذبات و احساسات کو عقل و فکر کی گرفت سے مطلقاً آزاد سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے موجودیت نطشے اور برگساں کے نظریات سے بھی متاثر ہوئی ہے۔

موجودیوں کو اپنا وجود کائنات کی وسعتوں میں بالکل حقیر محسوس ہوتا ہے۔ اس تلخ احساس سے جو ذہنی اذیت پیدا ہوتی ہے اُسے "عذاب"[51] (Angst) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ احساس بے حد اذیت ناک ہے کیونکہ موت اور فنا سے نجات پانے کی کوئی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔ موجودی انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں لیکن انسان فنا کے سامنے بے بس اور دست و پا شکستہ ہے۔ سارتر کو فطری مظاہر اور انسانی زندگی کے درمیان کسی قسم کا ربط محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس کے خیال میں خود انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات بھی باہم غیر مربوط ہیں۔ فرد اور فطرت یا ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور داخلی مواصلت کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے

سارتر معروضی قدروں کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ ہر شخص اپنی اخلاقی قدریں خود تخلیق کرتا ہے اور ایسا کرنے میں وہ آزاد ہے لیکن یہی آزادی انجام کار اس کے لئے جانگزا مصیبت بن جاتی ہے۔ بقول سارتر "انسان کو آزادی کی سزا دی گئی ہے"[52]۔ سارتر نے اپنی ادبی تالیفات میں بھی انہی نظریات کی اشاعت کی ہے اور جا بجا انسانی کوششوں کے بے مصرفی اور لاحاصلی پر زور دیا ہے۔

نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودیت دراصل رومانیت اور فردیت ہی کی ایک فرع ہے جو مردم بیزاری، کلبیت اور قنوطیت پر منتہی ہوئی ہے۔ موجودیوں نے بھی نطشے کی طرح اس واضح حقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے کہ فرد کی شخصیت جماعت سے مربوط اور وابستہ رہ کر ہی تکمیل پذیر ہو سکتی ہے اور فرد جماعت کے مفاد پر شخصی مفاد کو قربان کرکے ہی ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب کی دولت کو پا سکتا ہے۔ حقیقی مسرت بغیر ایثار و قربانی کے میسر نہیں آ سکتی۔ مزید براں سارتر اور اس کے ہمنوا جن کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مطلقاً آزاد ہے، روسو اور دوسرے رومانیوں کی طرح آزادی و قدر کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ انسانی قدر و اختیار چوپایوں اور درندوں کی جنگل کی آزادی کے مترادف نہیں ہے۔ انسان عمرانی علائق کا پابند رہ کر اور معاشرتی فرائض کو ادا کرکے ہی سچی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ ارسطو نے سچ کہا تھا کہ آدمی انسان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ایک شہری نہ ہو۔ سارتر کے ناولوں اور تمثیلوں کے اکثر کردار اس نام نہاد آزادی کی تلاش میں انسانیت اور اخلاق کا جامہ چاک کرکے وحوش و بہائم کی سطح تک پست ہو جاتے ہیں۔ اس مریضانہ انا پرستی نے مغرب کے "مہذب" طبقات کو عمرانی فرائض کی ادائیگی سے غافل کر دیا ہے۔

نفسیات انیسویں صدی کے اواخر میں نفسیات نے ایک مستقل شعبۂ علم کی صورت اختیار کر لی۔ اس سے پہلے اسے فلسفے کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا علوم کی ترقی کے ساتھ جمالیات، اخلاقیات، سیاسیات اور طبیعیات کو جنہیں قدما فلسفے کی شاخیں سمجھتے تھے فلسفے سے الگ کرکے مدون کیا گیا فلسفے کو بقول ول ڈیورنٹ، شاہ لیئر کی طرح اس کی بیٹیوں نے گھر سے نکال دیا اور اس کی میراث آپس میں تقسیم کر لی۔

[51] Reason And Existenz. Karl Jaspers [52] Being And Nothingness.

نظری نفسیات کو تجربی سائنس میں تبدیل کرنے کا آغاز جرمنی کے مشہور فلسفی اور ماہر نفسیات ڈاکٹر وُنٹ نے کیا۔ اس نے ۱۸۷۵ء میں لپزگ کے مقام پر نفسیات کی ایک باقاعدہ تجربہ گاہ قائم کی۔ ۱۸۹۵ء میں مغربی دانش گاہوں میں نفسیات کا مستقل شعبہ قائم کیا گیا اور ۱۹۰۰ء تک ہر کہیں اسے مستقل سائنس کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

تجربی سائنس کے محققین میں ٹچنر، واٹسن، کوفکا، کوہلر، بخترییف اور پاف لوف نے شہرت حاصل کی اور مختلف مکاتبِ فکر کی تاسیس کی۔ ٹچنر موجودی نفسیات کا بانی ہے اور حسیات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ واٹسن اصالتِ عمل کا موسس ہے۔ اس نے محرک اور ردِ عمل کے اصول پر اپنا نظریہ مرتب کیا ہے۔ وہ شعور، انا، ذہن وغیرہ تصورات کا منکر ہے۔ کوفکا اور کوہلر کے مسلک کو Gestalt کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ذہنِ انسانی کو حسیات اور جذبات کی اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ موجودی نفسیات اور اصالتِ عمل دونوں کے مخالف ہیں۔ موجودیوں سے انھیں یہ شکایت ہے کہ وہ ذہنِ انسانی کو حسیات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اور اصالتِ عمل سے اُن کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس میں محرک اور ردِ عمل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ بخترییف اور پاف لوف عضویات کے عالم تھے۔ اُن کے نظریۂ عادت پذیری کے اثرات نفسیات پر بڑے دور رس ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر واٹسن نے اس نظریے کو قبول کر کے اس کی اشاعت بڑے جوش و خروش سے کی ہے۔ یہ نظریہ اعصابی عادت پذیری کے عمل کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر واٹسن نے کہا ہے کہ روزمرہ کی معمولی عادات سے لے کر مذہبی عقائد، سیاسی نظریات اور ذہنی عوامل تک سب اعصابی عادت پذیری کے ہی رہینِ منت ہیں۔

متذکرہ بالا مکاتبِ نفسیات اکادمی اور تجربی تھے۔ فرائڈ کا نظریہ تحلیلِ نفسی اور میک ڈوگل کا نظریہ رجحاناتِ طبعی دونوں نظری نفسیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نظریات ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جنھیں تجربہ گاہ میں جانچا نہیں جا سکتا۔

تحلیلِ نفسی دراصل نفسیاتِ عللِ ذہنی کی ایک شاخ ہے۔ فرانس کے دو اطبا، ڈاکٹر شارکوٹ اور ڈاکٹر ژینے کی تحقیقات سے فرائڈ اور اس کا دوست برائر متاثر ہوئے۔ ابتدا میں دونوں مل کر کام کرتے رہے۔ ان ایام میں وہ ہسٹریا کے علاج میں ہپناٹزم سے کام لیتے تھے۔ ایک دن برائر کی ایک مریضہ نے اُسے بتایا کہ جب کبھی دورانِ نشست میں اُسے اپنے متعلق باتیں کرنے کا موقع دیا ہے، اُس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اسے گہری مسرت اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ برائر نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور اُسے زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جس سے وہ خاتون شفایاب ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ جس عورت کو اپنے متعلق بے تکان باتیں کرنے کا موقع دیا جائے وہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس طریقِ علاج کا نام "علاجِ گفتگو" رکھا گیا، اور فرائڈ نے اسے اپنا لیا۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ بچپن میں جنسی جذبے کے دباؤ سے انسان کے لاشعور میں چند اُلجھنیں جا گزیں ہو جاتی ہیں جو شدید صورت اختیار کر جائیں تو اُس کے ذہنی توازن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ ان میں ایڈیپس کی اُلجھن سب سے اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن میں ہر لڑکا اپنی ماں سے اور ہر لڑکی اپنے باپ — ثانی الذکر کو الیکٹرا کی اُلجھن کہا جاتا ہے — شدید محبت کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا باپ کو رقیب سمجھنے لگتا ہے اور لڑکی ماں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ یہ اُلجھن بعد میں احساسِ معصیت، فوق انا اور ضمیر کی تشکیل کا باعث ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں فرائڈ نے انا اور اڈ، شعور اور لاشعور، رجحانِ مرگ اور رجحانِ زیست، اصولِ حظ اور اصولِ حقیقت کی دوئی کو اپنے نظریے میں

Existential Psychology. Sensations. Behaviourism.

Stimulus And Response. Physiology. Conditioned Reflex.

Instincts. Psychiatry. Death Instinct, Life Instinct.

Pleasure principle, reality principle.

بڑی اہمیت دی ہے۔ ان مفروضات کے باعث سائنس داں اور اکادمی نفسیات کے علما، فرائڈ کو محقق نہیں سمجھتے بلکہ عطائی، صوفی یا زیادہ سے زیادہ مفکر خیال کرتے ہیں۔

فرائڈ کے نظریۂ تحلیل نفسی کو دوسرے مکاتب نفسیات کی بہ نسبت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کا علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے شاید وہ مستحق نہیں تھا اس مقبولیت کا راز اس کے نظریۂ ہمہ گیر جنسیت[1] میں مخفی ہے جس سے شعراء اور ادبا کی حساس طبائع بڑی متاثر ہوئیں اور ان کی وساطت سے اس نظریے کی ہر کہیں اشاعت ہو گئی۔

فرائڈ کے فلسفیانہ یا ماورا نفسیاتی[2] افکار خرد دشمنی کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے نظریے کا حاصل یہ ہے کہ عقل و خرد لاشعور کے ہاتھوں میں ایک بے جان آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے جسے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا ہے۔ بقول سی۔ ای۔ ایم جوڈ فرائڈ کے خیال میں عقل انسانی جبلت کی پیروی کرنے پر اتنی ہی مجبور ہے جتنی کہ ایک بھوکے کتے کی ٹانگیں اس کی ناک کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ایک اور جگہ یہی فلسفی لکھتا ہے کہ فرائڈ کے ہاں عقل ایک کارک کے ٹکڑے کی مانند ہے جو جبلتوں کی طوفان پرور لہروں میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ عقل انسانی کبھی بھی لاشعور پر قابو پا سکے گی۔ اس لحاظ سے وہ جبریت اور قنوطیت کا مبلغ ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کے مستقبل سے مایوس ہے کیونکہ ظاہر ہے تہذیب و تمدن کا انحصار اس بات پر ہے کہ عقل و خرد کو جذبہ و جبلت پر سیادت و تصرف حاصل ہو۔ سی۔ ای۔ ایم جوڈ[3] لکھتے ہیں:

"مہذب اشخاص کی دلچسپیاں ان کے جذبات سے نہیں بلکہ ان کی عقل و دانش سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جذبات و خواہشات کی سطح پر ہم ایک دوسرے سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ آج کل کا انسان کم و بیش ایک ہی طرح محبت و نفرت کا اظہار کرتا ہے اور ان معاملات میں اس کے اور عہد حجریہ کے انسان کے درمیان کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ صرف عقل و دانش کی سطح پر ہی اس فرق کا احساس ہو سکتا ہے جب میں بھوک محسوس کرتا ہوں یا تشنہ کی حالت میں ہوں تو مجھے اپنے قدیم آبا و اجداد کی طرح بے تکلف کھانے اور خوبصورت عورت کی حاجت محسوس ہوتی ہے لیکن کسی مابعد الطبیعی مسئلے، عمرانی اصلاح یا باخ کے نغمے کے متعلق میرا ردِ عمل اپنے قدیم آبا یا اپنے اکثر پڑوسیوں سے مختلف ہوتا ہے۔"

دیگر سے میوزنے[4] اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے:

"تحلیل نفسی کی رو سے انسان کے اعمال بلکہ خیالات تک پر عقل کی بجائے جذبہ و جبلت کی کارفرمائی ہے۔ ہمیں جذبہ و جبلت کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ان کی کارفرمائی کو تسلیم کر لینے سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ ہمارے اور چوپایوں کے درمیان جذبہ و جبلت مشترک ہیں۔ انہیں عقل و خرد کے ضبط و تصرف میں رکھنے سے ہی ہم انسان کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جذبہ و جبلت کو بتدریج عقل کے ماتحت کرنا ہی انسانی ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔"

فرائڈ کے طرزِ تحقیق کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ فرد کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت معاشرے کے عوامل و موثرات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ اپنی تحقیقات کو صرف اوائل طفولیت کے احوال تک محدود رکھتا ہے۔ اسی بنا پر مس کارن ہوانی نے فرائڈ پر کڑی نکتہ چینی کی ہے، وہ کہتی ہیں[5]:

"فرائڈ تہذیب و تمدن کے خارجی عوامل کو قابل لحاظ نہیں سمجھتا اس لئے غلط نتائج کا استخراج کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ بڑی حد تک ان قوتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جو ہمارے رویے اور طرزِ عمل کی محرک ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسی بے توجہی کے باعث تحلیل نفسی فرائڈ کے نظریے

---

[1] Pan-sexualism. [2] Metapsychological [3] Guide to Modern Thought.
[4] Psychology And Modern Problems. [5] The Neurotic Personality of Our Times.

کی اندھا دھند تقلید کر رہی ہے اور اپنی صلاحیتوں کے باوجود ایک اندھی گلی میں گُم ہو چکی ہے اور ظلمات نظریات کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔"

فرائڈ نے اپنے تمام نتائج فرد کے مطالعے سے اخذ کیے ہیں اور اجتماع کے عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے اس طرزِ تحقیق اور زاویۂ نگاہ نے فردیت اور موجودہ عہد کے تخریبی رجحانات کو تقویت دی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نظریہ مغرب کے تنزل پذیر معاشرے کی تخلیق بھی ہے اور اُس کا ترجمان بھی ہے۔

آج کل کے علمائے نفسیات، جو تجربہ گاہوں میں اصول و قواعد مرتب کرنے پر اصرار کرتے ہیں، فرائڈ کے نظریات کو قابلِ لحاظ نہیں سمجھتے۔ اب نفسیات تحلیلِ ذہن کے علماء خالص طبّی اور عضویاتی نقطۂ نظر سے ذہنی عوارض کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ زود یا بدیر مناسب ادویہ کے استعمال سے ذہنی امراض پر قابو پا لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں بعض تجربات کامیاب بھی ثابت ہوئے ہیں اور Psycho-somatic طب کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

مسلکِ لاشعور[1]

پہلی عالمگیر جنگ میں مردوں اور عورتوں کو آزادانہ میل ملاپ کے مواقع ملتے رہے جن سے اخلاقی بے راہ روی مغربی معاشرے کی ایک مستقل روایت بن گئی۔ جنسی تعلقات میں ہر قسم کے تکلف و عار کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اس پر فرائڈ کے نظریات سے نوجوانوں کے ہاتھوں میں علمی سند ہاتھ آ گئی اور اظہارِ ذات کی دُھن ہر کس و ناکس پر سوار ہو گئی۔

فرائڈ نے اختلالِ نفس پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جنسی جذبے کا دبا رہنا ہی تمام عوارضِ ذہنی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر اس جذبے کی آسودگی کے سامان بہم پہنچتے رہیں تو انسان اس قسم کے عوارض سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ جنسی آسودگی کو اظہارِ ذات (Self-expression) کا نام دیا گیا ہے۔ مغرب کا نوجوان طبقہ بڑے انہماک سے دن رات اظہارِ ذات میں مصروف رہتا ہے۔ جنسی معاملات میں ضبطِ نفس سے کام لینا گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں جنسی آسودگی کو ہی زندگی کا مقصدِ واحد بنا لیا جائے، وہاں نہ اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق ممکن ہے اور نہ عورت کا وقیع مقام برقرار رہ سکتا ہے۔ کلاسیکی فن و ادب کی عظمت کا راز انضباط میں ہی مخفی تھا۔ علاوہ ازیں اس معاشرے میں، جہاں عورت کو محض جنسی آسودگی ایک وسیلہ سمجھ لیا جائے، فتوت اور جوانمردی نہیں پنپ سکتی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ مغرب کی عورت اظہارِ ذات کے شوق میں خود اپنے حقیقی مرتبے سے غافل ہو گئی ہے اور آزادی حاصل کرتے کرتے اپنے جذبۂ ہوا و ہوس کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ تو اظہارِ ذات کا عمرانی پہلو تھا۔ اب اس نظریے نے ادب و فن پر بھی گہرے اثرات ثبت کیے ہیں۔ مغرب کے ناول نگار اور شعراء لاشعوری واردات و کیفیات کے آزادانہ اظہار کو ضروری سمجھنے لگے ہیں اور "لاشعوری رَو" باقاعدہ ایک اسلوبِ فن و ادب کی حیثیت دی گئی ہے۔ موضوع کے انتخاب میں بھی اختلالِ نفس کے مریضوں کے کوائف کو اہمیت دی جاتی ہے اور ناولوں اور تمثیلوں کے اکثر کردار اسی زمرے سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ پروسٹ اور جائس اس مسلک کے سب سے بڑے ترجمان اور نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ جائس کے ناول "یولیسیز" کو بالخصوص اس مکتبِ نگارش کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ہیرالڈ گولڈ نے کہا ہے، بے ربطی، عدمِ تسلسل اور انتشارِ خیال کے لحاظ سے ایک ٹیلیفون ڈائرکٹری یولیسیز سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> "جائس ہر چیز کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ یولیسیز میں وہ ایک دن میں ایک ہی شخص کے خیالات، جذبات اور واردات کو پیش کرتا ہے۔ اگر یہ ناول چوبیس ٹیلیفون ڈائرکٹریوں جیسا ضخیم ہو جائے تو بھی اس میں کسی شخص کے ایک ہی گھنٹے کے

---

[1] Cult of the Unconscious.

خیالات اور واردات نہیں سما سکتے۔ ٹیلیفون ڈائرکٹری اپنے انتخاب کی سختی کے باعث ردی کی ٹوکری کے مقابلے میں ایک فن پارہ ہے اور یولیسیز ردی کی ٹوکری ہی ہے۔"

اس قسم کے ناولوں میں کرداروں کی تحلیل نفسی پر زور دیا جاتا ہے۔ ان کے کرداروں کی اکثریت جرائم پیشہ نوجوانوں، غلط کار بچوں اور فاترالعقل لڑکیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ آج کل کے بعض فرانسیسی اور امریکی ناولوں میں سدومیت اور محرمات کے معاشقوں کو ادب کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے بعض ادبار نے تصوف اور جنس کے امتزاج سے ایک نئے مکتب عرفان کی بنیاد رکھی ہے۔ فرانسیسی ناول نگار ژاںل روبیں کا ناول Body's Rapture اس قسم کے ادب کی ایک اچھوتی مثال ہے۔ پال سارتر نے اپنی ایک تمثیل[1] میں ایک فوجی افسر کا معاشقہ اپنی سگی بہن سے دکھایا ہے اور ناقدین ادب اس تمثیل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس قسم کے ادب کی معذرت میں کہا جاتا ہے کہ ایک ادیب اپنے معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھے گا اُس کی جھلک لازمًا اس کی تحریروں میں دکھائی دے گی۔ اگر معاشرہ تنزل پذیر ہے تو ادیب سے یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہ اس میں ترقی پرور قدروں کو تلاش کرتا پھرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلیہ صرف دوسرے درجے کے ادبا پر صادق آتا ہے۔ ایک بڑے ادیب کا کام عکاسی تک محدود نہیں رہتا۔ تنقید و تنقیح معاشرہ بھی اُس کے حدود منصب میں داخل ہے۔ ایک اول درجے کا ادیب نہ صرف اپنے معاشرے کی عکاسی کا حق ادا کرتا ہے بلکہ اس کی نمو پذیر قدروں کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور اُن کی ترجمانی سے انسان دوستی کے نصب العین کو تقویت بخشتا ہے

ہمارے زمانے کے رومانی اور لاشعوری ادیب "انضباط" کو غیر ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق عقل خرد سے ہے۔ جبلت کی والہانہ پرستش کا اندازہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

"میرا عظیم مذہب یہ ہے کہ میں جبلت کا معتقد ہوں۔ میرے خیال میں جبلت عقل سے زیادہ دانش مند ہے۔ ہمارا ذہن غلطی کر سکتا ہے لیکن ہماری جبلت ہمیشہ صداقت کی حامل ہوتی ہے۔ عقل محض باگ ڈور ہے جو گھوڑے کو قابو میں رکھتی ہے۔ مجھے علم کی کیا پروا ہے۔ میں تو صرف جبلت کی پکار کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں اور اس میں ذہن یا اخلاق کے واسطوں کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں۔"

ایک اور جگہ کہتا ہے: "میرا اپنا آرٹ میرے لئے۔" یہی وہ مریضانہ قنوطیت ہے جو مغرب کے جدید تمدن کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے اور جس کا عکس رومانیوں کے ناولوں اور منظومات میں دکھائی دیتا ہے۔ سپینگلر اور اس کے ہمنوا کہتے ہیں کہ مغرب میں شاعری کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اب اس کے دوبارہ پنپنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ شاعری کا خاتمہ تو خیر اس وقت ہوگا کہ جب انسان کے احساسِ جمال اور ذوقِ اظہار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے مغربی شعرا کی سقیم داخلیت نے شاعری کو اپنے مقام سے گرا دیا ہے۔ جب شاعر شخصیت کو محض واردات قلب کا ایک گٹھا سمجھنے لگے ـــــ گٹھا بھی تو رسی سے بندھا ہوتا ہے ـــــ جب غرابت پسندی اور اُپچ نگاری کے شوق میں سیدھی سادی بات کو چیستان کی صورت میں پیش کیا جائے۔ جب اختلال حواس کو ـــــ کان دیکھ رہے ہوں، ناک سُن رہی ہو، اور انگلیاں راگ الاپ رہی ہوں اور آنکھیں چکھ رہی ہوں ـــــ باقاعدہ اسلوب کی حیثیت دے دی جائے تو شاعری کیسے اپنے مقامِ اعلیٰ و ارفع پر قائم رہ سکتی ہے۔

لاحاصلیت پہلی جنگ عالمگیر کے شدائد و مظالم نے ادبا و شعرا کی رُوح کی گہرائیوں تک متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی اکثریت انسانی فطرت سے بدظن ہو گئی۔ پڑھے لکھے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انسان فطرتًا خبیث ہے اور تہذیب و تمدن کے الفاظ بے معنی ہیں۔ انسان تعمیر سے زیادہ تخریب میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ صدیوں کی محنت کے بعد تمدن کی عمارت کھڑی کرتا ہے لیکن یکلخت اس کی رگ تخریب بھڑک

---

[1] Les Sequestres d' Altona.

اُٹھتی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس شاندار عمارت کو ریت کے گھروندے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ تاریخ کا عمل دولابی ہے۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا خیال محض فریب ہے۔ اس اندازِ فکر کو فرائڈ کی جبریت اور قنوطیت نے تقویت دی۔ فرائڈ کا عقیدہ تھا کہ عقل لاشعور کے ہاتھوں میں ایک بے جان کھلونے کی مانند ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے، اُس کا شعور اُس کے لاشعور پر قابو نہیں پا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں انسانی فطرت میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں ہے۔ مزید براں جماعت فرد کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتی، نہ فرد کی انا کا مطالعہ اجتماعی عوامل کی روشنی میں کرنا ضروری ہے۔ انسان کا فعل و عمل کسی مقصد یا نصب العین کی کوشش سے حرکت پذیر نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی نفسیاتی اُلجھنیں ہی اُسے دھکیلتی ہوئی آگے آگے لئے جاتی ہیں۔ اس ہمہ گیر قنوطیت اور جبریت نے جہاں افراد کو اختلالِ ذہن میں مبتلا کر دیا ہے، وہاں معاشرے میں بھی خلفشار پیدا کر دیا ہے۔ لن یوتانگ[۵۱] لکھتے ہیں:

"ہمارے دین اور قومی انتشارِ فلسفہ، قنوطیت پر مبنی ہے۔ بادلیئر، بائی سین، ڈرائزر، ہارڈی، ٹی ایس ایلیٹ، ریمو کیل جنز، ڈین اِنگ، آلڈس ہکسلے، پکاسو، ہکیبوں، مادرِ حقیقین، پیروانِ فرائڈ اور جمالیین کی قنوطیت۔"

یہ معلوم کرنے کے لئے چنداں نفسیاتی بصیرت کی ضرورت نہیں ہے کہ عظیم جنگوں کا باعث انسان کی خلقی خباثت یا تخریب پسندی نہیں ہے یہ جنگیں چند خود غرض مہم آزماؤں کے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ سترھویں صدی سے لے کر آج تک مغرب کے ساہوکار اور تجارتی اجارہ دار ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ پر اپنا معاشی تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سیاسی جنگ اور عسکری رقابت کے پس پردہ یہی تجارتی اور ملوکی مناقبت کام کر رہی ہے اور قیامِ امن و دوام کے نام پر دوامی جنگ کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ باورڈ سیلسم[۵۲] نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک دن کلیمنسو نے ورسائی کے عہد نامے کے مذاکرات کے دوران میں وڈرو ولسن اور لائڈ جارج سے کہا "میں نے سنا ہے کہ تم لوگ دوامی امن کے متمنی ہو اور اس کے قائم کرنے کے خواہاں ہو" دونوں سیاستدانوں نے اثبات میں سر ہلائے۔ کلیمنسو نے کہا "لیکن دوامی امن کی تمہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی" انھوں نے تعجب سے پوچھا "وہ کیا" کلیمنسو نے کہا "دونوں کو ہمیں نوآبادیوں سے دست کش ہونا پڑے گا۔ انگریزوں کو ہندوستان خالی کرنا ہوگا اور امریکہ کو فلپائن، پورٹوریکو اور میکسیکو چھوڑنا پڑیں گے اور ہمیں شمالی افریقہ کو خیرباد کہنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں تمام تجارتی راستوں اور اپنے اثر و رسوخ کے حلقوں کو چھوڑنا ہوگا کیا تم دوامی امن کی یہ قیمت ادا کر سکو گے؟" دونوں کہنے لگے "دوامی امن سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہ تھا" کلیمنسو کہنے لگا "تو پھر تم دوامی امن کی بات نہیں کر رہے بلکہ دوامی جنگ کا ذکر کر رہے ہو"۔"

تجارتی اور ملوکی مصلحتوں سے قطع نظر اہلِ مغرب خود اپنے ممالک کے مزدوروں کی تنظیم سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ مقتدر طبقے کے خیال میں اس اندرونی خطرے کا سدِ باب بھی سوائے اس کے ممکن نہیں ہے کہ جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے۔ بیرونی خطرے کا انسداد تو فتح و نصرت سے وابستہ ہوتا ہے لیکن جنگ سے اندرونی خطرے کا دفعیہ یقینی ہے کیونکہ ایک طرف تو مختلف ممالک کے مزدور اور کسان ایک دوسرے کے گلے کاٹ کاٹ کر ختم ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اشیا کے نرخ بڑھ جانے سے کاروباری اجارہ داروں کے خزانے زر و سیم سے بھر جاتے ہیں جنگ کے خاتمے پر از سرِ نو کساد بازاری کا دور دورہ ہوتا ہے اور نئے نئے بہانے تراش کر نئی جنگ کی داغ بیل ڈال دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر مبنی چکر خود غرض تجارتی اداروں نے چلا رکھا ہے۔ اس لئے تمام بنی نوعِ انسان کو فطرتاً خبیث قرار دینا قرینِ دانش نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے سی۔ ای۔ ایم جوڈ[۵۳] لکھتے ہیں:

"جنگ ایک حیلہ ہے جس کے ذریعے شرفا کی اکثریت چند لفنگوں کے مفاد کی حفاظت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ شرفا کو یہ فریب دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں۔"

---

[۵۱] Wisdom of China [۵۲] Socialism And Ethics. [۵۳] The Book of Joad.

عوام تو خیر کم سواد اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں۔ اچھے خاصے ذی ہوش پڑھے لوگ بھی پروپیگنڈے کے سحر و سیمیا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثال کے طور پر آلڈوس ہکسلے کو تسلیم ہے کہ جنگ کی تیاریاں کسا دبازاری کے سد باب کے لئے کی جاتی ہیں لیکن ان تخریبی کاروائیوں کا پردہ چاک کرنے اور معاشی ناانصافی اور طبقاتی تفریق کو رفع کرنے کی دعوت دینے کی بجائے آپ روحانیت اور معنویت کی تلاش میں مشرق کا رخ کرتے ہیں اور ہندو یوگیوں کے سامنے سمادھی میں بیٹھ کر شانتی طلب کرتے ہیں۔ ادھر مشرقی خوش ہو رہے ہیں کہ دیکھو مغرب کا بھٹکا ہوا انسان اپنے داخلی خلا کا مداوا ویدانت اور تصوف میں تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ تصوف کی یہ افیون جو اُن کے بزرگوں نے صدیوں پہلے مغرب کو برآمد کی تھی اب وہاں سے مہلک تر صورت میں واپس مشرق کو برآمد کی جا رہی ہے۔ فرانس کا معاصر شاعر اور تمثیل نگار کوکتو اپنی کتاب "افیون" میں لکھتا ہے:

"نوجوان ایشیا اب چرس نہیں پیتا کیونکہ اس کا دادا پیتا تھا۔ نوجوان یورپ چرس پیتا ہے کیونکہ اس کا دادا نہیں پیتا تھا۔ چونکہ نوجوان ایشیا یورپ کی نقالی کر رہا ہے اس لئے ہماری وساطت سے ہی یہ افیون اپنے اصلی وطن کو واپس جائے گی۔"

یہ بات تصوف کی افیون پر زیادہ صادق آتی ہے جو مغرب کے صوفی آلڈوس ہکسلے کرسٹوفر اشرووڈ، جیرالڈ ہرڈ وغیرہ ایشیا کو برآمد کر رہے ہیں۔

اس صدی کے اوائل میں لاحاصلیت نے مغرب کے ناول میں بار پایا۔ اس قسم کے ناولوں میں رومیں رولاں کا "کرسٹوفر" ژول رومیں کا "مین آف گڈ ول"، جیمز جوئس کا "یولیسس"، ورجل کا "پاسکوائر کرانیکلز"، روجر مارتن دو گار کا "تھیبو"، طامس مان کا "میجک ماؤنٹین"، سومرسٹ مام کا "آف ہیومن بانڈیج" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ضخیم ناولوں میں مغربی معاشرے کے داخلی عوامل کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مصنفین ظلم و استبداد سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور مغربی معاشرے کے استحصالی نظام کا پردہ چاک کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے لیکن اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے یا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے کہ جدید معاشرے میں ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔ جابر کون ہے مجبور کون؟ اس تذبذب، خلجان اور کشمکش سے نجات پانے کے لئے آخر جھلا کر یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے۔ اسے قضا و قدر نے، فلک کج رفتار نے ایک بے پناہ شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ انسان فطرتاً اصلاح پذیر نہیں ہے اور اس کی اصلاح کی کوشش بے سود ہے۔ علاوہ ازیں اس دنیا میں اُسے فرصتِ مستعار دی گئی ہے۔ فنا اور موت سے مفر کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ قنوطیت اور جبریت کے یہ اسیر اس سیدھی سادی حقیقت کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے کہ دنیا میں موت اور فنا اہم نہیں ہیں کیونکہ وہ ناگزیر اور اٹل ہیں۔ زندگی کو احسن طریقے سے گذارنا اہم ہے کیونکہ زندگی گریز پا ہے۔ سپینوزا نے کہا تھا:

"ایک مرد آزاد موت کے متعلق کبھی نہیں سوچتا، اُس کا تفکر و تامل زندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے موت کو نہیں۔"

لاحاصلیت یہ روایت دوسری جنگ عظیم کے دوران میں زیادہ سقیم صورت اختیار کر گئی۔ رومیں رولاں، طامس مان، دوگار دو وغیرہ بہر حال وسیع القلب، انسان دوست تھے۔ اُن کے جانشیں سارتر، کوکتو، مالرو، کامیو وغیرہ کی لاحاصلیت میں مشونت آمیز کلبیت اور رقیق قنوطیت کی آمیزش ہو گئی ہے۔ یہ لوگ مظلوموں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کی بجائے اُن پر زہر خند کرتے ہیں جس سے ان کے جذبۂ اذیت دہی کی تسکین کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ یہ لوگ انسان دوستی کے نصب العین اور متعلقہ اخلاقی قدروں کو کھوکھلا اور مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔ زندگی کو بے مصرف، بے معنی اور بے حاصل سمجھتے ہیں اور عقل و خرد کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی عذاب ناک خود آگہی کے شکار ہو گئے ہیں جو شراب کے نشے اور عورت کی آغوش میں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس اندازِ احساس و تفکر کی مثال فرانسیسی اہل قلم کوکتو کا ناول "سقوط"[1] پیش کرتا ہے جسے ایک نقاد نے "دورِ حاضر کی انجیل" کا نام دیا ہے۔

اس ناول کا ہیرو تال کلیمنس ایک شناسا کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اُسے بتاتا ہے کہ ایک دن دریائے سین کے کنارے

[1] The Fall.

کنارے جاتے ہوئے اُس نے ایک لڑکی کو ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ مردانگی اور ہمدردیٔ انساں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اُسے بچانے کے لئے فی الفور دریا میں چھلانگ لگا دیتا لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا اور لڑکی مدد کے لئے چلاتی ہوئی غرقاب ہوگئی۔ اس سے ژاں کلیمنس گناہ کی شدید اُلجھن میں مبتلا ہوگیا جس نے اُس کی زندگی تلخ کردی۔ اس ذہنی اذیت سے نجات پانے کے لئے اس نے کثرت سے شراب پینا شروع کردی بے تحاشا جوا کھیلنے لگا اور فسق و فجور کی دلدل میں دھنس گیا۔ شراب کی بدمستی اور عورت کی ہمکناری بھی اُسے اس عذاب ناک احساس سے نجات نہ دلا سکی۔ رفتہ رفتہ وہ تشکک اور کلبیت کا شکار ہوگیا اور اخلاق و تہذیب پر ریشخند کرنے لگا۔ اُس کے دل میں انسانی ہمدردی اور ایثار و قربانی کے احساسات ٹھٹھر کر رہ گئے اُس کی انانیت مریضانہ صورت اختیار کر گئی۔ اور اس کے اپنے الفاظ میں اُسے ہر جگہ "میں" "میں" ہی دکھائی دینے لگی۔ لیکن گناہ کے احساس سے نجات پانے کے لئے اُس نے تلافیٔ مافات کی کوئی مثبت کوشش نہیں کی بلکہ اس احساس کو بھی لذت طلبی کا ایک وسیلہ بنا لیا۔ آخر میں کہتا ہے کہ اگر دوبارہ اس کو وہی موقع مل جائے جب ڈوبتی ہوئی لڑکی اُسے مدد کے لئے پکار رہی تھی تو ...." لیکن دریا کا پانی یخ بستہ ہے اور اب یہ داستان پارینہ ہوچکی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ واقعہ ماضی کا جزو بن چکا ہے۔"

اس ناول میں جدید دور کے مغربی انسان کو نہایت بے رحمی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ انسان حد درجہ خود غرض ہے۔ اُس کے دل میں انسانی ہمدردی، مروت، احسان، قربانی کے سوتے خشک ہوچکے ہیں۔ وہ محبت اور انسانیت کے الفاظ کو بے معنی اور لغو سمجھتا ہے اور اس پر قہقہے لگاتا ہے۔ اُس کا اندرون ویران ہوچکا ہے جسے شراب کا نشہ اور فسق و فجور آباد کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی موضوعی نظریۂ حیات، یہی مریضانہ فردیت مغربی ادب و شعر کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ زندگی کی بے حاصلی اور بے معرفی کے احساس نے اہلِ مغرب کو قنوطی اور کلبی بنا دیا ہے۔ ژونگ کہتے ہیں:

"میرے مریضوں کی کم و بیش ایک تہائی کسی قسم کے ذہنی عوارض میں مبتلا نہیں ہوتی، بلکہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اپنی زندگی کو بے معنی اور لاحاصل سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں لاحاصلیت کو ہی دورِ جدید کا خللِ ذہنی کہا جا سکتا ہے۔"

کامیو نے اہلِ مغرب کی اخلاقی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"مجھے ہمیشہ سے یہ محسوس ہوتا رہا ہے، اگرچہ میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں کرسکتا کہ پیرس کے باشندے صرف دو باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ نئے نئے خیالات اور بدکاری۔ ہمیں اُن کو مطعون نہیں کرنا چاہئے کیونکہ صرف وہی ایسا نہیں کرتے، بلکہ تمام یورپ اس حمام میں ننگا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ مستقبل کا مورخ ہمارے متعلق کیا کہے گا۔ جدید دور کے انسان کے متعلق صرف ایک ہی فقرہ لکھ دینا کافی ہوگا۔ "وہ زنا کرتا تھا اور اخبار پڑھتا تھا۔""

سارتر اور مالرو کے ناولوں اور تمثیلوں میں بھی نظریۂ حیات دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کردار "اخلاقی جذام" میں مبتلا ہیں۔ وہ اپنے تکلیف دہ احساسات سے نجات پانے کے لئے خودکشی کرنا چاہتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے میں خودکشی پر آوازے کسنا شروع کردیتے ہیں۔ "مکھی دسوت" کا ایک کردار کہتا ہے "انسان اور درندے میں فرق صرف یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو ختم کرسکتا ہے اور درندہ نہیں کر سکتا۔" ایک اور جگہ کہتا ہے "تم مجھ سے خودکشی کی وجہ پوچھتے ہو۔ ذرا بتاؤ تمہارے زندہ رہنے کا جواز کیا ہے۔" اس بے پناہ اندرونی اضطراب اور بے رحم کلبیت کے ساتھ ہی نوعِ انسان کی بدقسمتی سے اہلِ مغرب کے ہاتھوں میں ہائڈروجن بم جیسے خوفناک ہتھیار آگئے ہیں اور دنیا کی حالت اس بھرے بازار کی سی ہوگئی ہے جس میں کئی قوی ہیکل پاگلوں کو شمشیر برہنہ دے کر آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

اہلِ دانش نے ہمیشہ مروت، احسان، خدمتِ خلق اور مظلوم کی عملی ہمدردی میں مسرتِ قلبی کا راز ڈھونڈا اور پایا ہے لیکن فردیت

کے یہ مبلغ اجتماعی ذمے داریوں کو پس پشت ڈال کر مسرت کی جستجو کرتے ہیں اور جب اُسے نہیں پا سکتے تو زندگی کو معنویت سے عاری سمجھنے لگتے ہیں۔ انھیں اس بدیہی حقیقت کا احساس نہیں ہوتا کہ معنویت اور مسرت فرد کے ذہن و قلب کی گہرائیوں سے فوارے کے پانی کی طرح اچھل کر نمودار نہیں ہوتی بلکہ ایثار و قربانی اور اجتماعی فرائض کی ادائیگی سے زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ لاحاصلیت کے مغربی ترجمان تمثیل نگار اور ناول نویس عشق و محبت جیسے مقدس جذبے کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ اُن کی سقیم داخلیت نے انھیں اس قابل نہیں رکھا کہ وہ کسی عورت کے لیے معمولی سے معمولی قربانی کرنے پر بھی آمادہ ہو سکیں۔ وہ اپنی "محبوبہ" کو محض ایک بے جان آئینہ سمجھتے ہیں جسے سامنے رکھ کر وہ اپنی انا کا جلوہ دیکھ سکیں۔ انھوں نے محبت اور اخلاق کے ربطِ باہم کو فراموش کر دیا ہے۔ شیکسپیر نے کہا تھا

Love is too young to know what conscience is
Yet who knows not, conscience is born of love.

اس کے معاصر نظیری کا شعر ہے ؎

ہیچ اکسیر بتاثیرِ محبت نرسد — کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

آرٹ

اہلِ مغرب کے موضوعی اندازِ نظر اور تحلیل نفسی کے فردیت پرور نظریے نے جہاں ادب و شعر کو متاثر کیا ہے وہاں دوسرے فنونِ لطیفہ مصوری، تعمیر، موسیقی وغیرہ پر بھی گہرے اثرات ثبت کیے ہیں۔ اظہاریت، اور اثر واقعیت، تاثریت، مکعبیت وغیرہ جدید مکاتب نگاری میں مصور کے داخلی واردات کے بے ساختہ اظہار کو اہم خیال کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کی مصوری میں احساس اور خیال کے درمیان عقل و خرد کو ایک ضروری واسطے کا مقام حاصل تھا اور عقل کے انضباط اور ہیئت کی بندش کا تعلق مسلّم تھا لیکن افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ہمارے زمانے کے مصوروں نے بھی ہیئت اور بندش کا جُوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ جدید مکاتب نگارش اور گذشتہ صدی کی مصوری میں وہی بُعد ہے جو حریت اور حقیقت نگاری کے درمیان پایا جاتا ہے۔ وین گوخ، گوگین، کینڈنسکی، سیزانے، ماتیس اور پکاسو وغیرہ نے خارجی دنیا سے رابطہ منقطع کر کے اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں چونکہ خیالات اور واردات بے ربط اور گریزاں صورت میں اُبھرتے ہیں اس لیے ایک مصور کے لیے چنداں ضروری نہیں ہے کہ وہ اُن میں ربط و تعلق کو تلاش کرتا پھرے۔ نتیجۃً اگر تصاویر میں فطری مظاہر اور انسانی خد و خال مسخ ہو کر ظہور پذیر ہوں تو قصور مصور کا نہیں ہوگا — اگر اسے قصور سمجھا جا سکے — بلکہ لاشعور کا ہوگا جس میں ربط و تسلسل کا فقدان ہے۔ جدید آرٹ میں اظہارِ ذات کا اسلوب بھی تحلیل نفسی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ جے۔ پی ہوگینی کے الفاظ میں اظہارِ ذات کے اس خبط نے جدید مصوری کو انسانیت کی سطح سے گرا دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب جدید آرٹ اظہارِ ذات بن کر رہ جاتے تو وہ انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے۔ اس فقرے سے غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ہر فن کار کو اظہارِ نفس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس کے بغیر اس کا آرٹ گھٹ کر رہ جائے گا۔ تاریخ میں بہت حقیقی فن کار شہرت نہ پا سکے کیونکہ ان کے کم سواد سرپرستوں نے انھیں اظہارِ ذات کا موقع نہ دیا۔ اگر اظہار کا خبط حد سے زیادہ بڑھ جائے تو یہ آرٹ سے انسانی قدریں چھین لیتا ہے۔ اظہارِ ذات کے مقدس نام پر جدید زمانے کے فن کار ہر قسم کی بوالعجبیوں اور بیہودگیوں کو ہم پر ٹھونستے رہتے ہیں۔ وہ فن کار جو صرف اظہارِ ذات کو اپنا واحد مقصود و منتہا سمجھتا ہو وہ آرٹ کو حیوانیت کی سطح تک کھینچ لاتا ہے۔ آرٹ کی دنیا سے باہر کی ایک

Expressionism. Surrealism Impressionism.
Cubism.

یہ مضمون سلیم ہو پاکستان ٹائمز ۱۰ ارنومبر ۱۹۵۵ء

مثال لیجیے: ایک شخص دیوانہ وار بازار میں بھاگ نکلتا ہے، کھڑکیوں کے شیشے توڑ پھوڑ دیتا ہے اور امن پسند شہریوں کو گھونسوں سے مار گراتا ہے۔ جب اسے گرفتار کر لیا جائے تو وہ بڑے جوش اور خلوص سے کہتا ہے "میں تو اپنی انا اور اپنی ذات کا اظہار کر رہا تھا" اس شخص کو قید کر دینا انصاف پر مبنی ہوگا۔ فن کار جو اظہارِ ذات کی عیاشی میں مبتلا ہوتا ہے اُسے قید نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کسی شخص کو آزار نہیں پہنچاتا لیکن اس کا طرزِ عمل حیوانوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی انا کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اپنے آپ کو بند کر کے وہ اپنے آرٹ کو حیوانیت کی نذر کر دیتا ہے جو آرٹ معاشرے سے بے تعلق اور اس کے مخالف ہوگا، وہ حیوانی ہی سمجھا جائے گا۔ آرٹ کے حیوانات کی سطح تک گر جانے کی ایک اور علامت یہ ہے کہ وہ انسان کی شخصیت اور اس کے مقامِ انسانیت کو برقرار رکھنے کی بجائے اُلٹا انہیں حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

وین گوخ کے نقوش میں زندگی کی شگفتگی اور حرارت موجود تھی لیکن پکاسو اور اس کے متبعین کوشکار، ڈانز، مارگ وغیرہ کے نقوش صرف نیم دائروں، قوسوں، مثلثوں، کج مج خطوط اور رنگ کے بے ڈھب دھبوں کے مجموعے بن کر رہ گئے تھے۔ اسی اقلیدسی نقاشی کو تجریدی فن کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نقوش جتنے مہمل، بے ربط اور ناقابلِ فہم ہوتے ہیں اتنے ہی دقیق نکات اور محاسن ان میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہسپانیہ کے معاصر مصور پکاسو کی تصاویر میں جو عورت پیش کی گئی ہے وہ اعجوبۂ روزگار ہے۔ وہ عورت کو دھبوں، رنگوں اور خمیدہ لکیروں کا ایک بے ڈھب مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کی تصویر میں عورت کے کان ہاتھی کے کانوں کی طرح لمبے ہو سکتے ہیں، چہرے پر ایک کی بجائے دو ناکیں ہوں تو عجب نہیں۔ چھاتیاں، گردن یا ران میں دھنسی ہوئی دکھائی جاتی ہیں۔ ناقدینِ فن میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ پکاسو لوگوں کو احمق بنا رہا ہے۔ دوسروں کا خیال ہے کہ وہ مصوری کو قدیم رسومِ نگارش سے آزاد کرا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیمز جوائس اور مارسل پروست کی طرح اس کے ذہن کا رابطہ خارج اور معروض سے برائے نام رہ گیا ہے۔ اس کے اپنے ذہن و قلب کی کیفیات میں کسی قسم کا ربط و تعلق نہیں ہے اس لیے اس کی تصویروں میں بھی ہیئت کا فقدان ہے جس طرح عقل و خرد منتشر جذبات کی شیرازہ بندی کرتی ہے اسی طرح ہیئت آرٹ میں توافق و تناسب کو برقرار رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے جدید مصوری بھی یورپ کی ہمہ گیر خرد دشمنی اور موضوعیت کی ایک فرع سمجھی جا سکتی ہے۔

پکاسو کا شاہکار اس کی تصویر "گورنیکا" کو سمجھا جاتا ہے۔ اس تصویر میں دائیں طرف ایک شبیہ ہے جس پر آدمی کا شبہ ہوتا ہے اور جو چیخیں مارتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متصل ایک عجیب و غریب چہرہ ہے۔ اس کے اوپر ایک بازو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نیچے ایک عجیب سی صورت ہے جو غالباً عورت کی ہے۔ اس سے ملا ہوا گھوڑے کی قسم کا کوئی جانور ہے اور پھر ساتھ ہی ایک عجیب سا حیوان ہے جس کے سر پر خمیدہ سینگ ہیں۔ یہ تمام اشکال بے ربطی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی گئی ہیں۔ اسے ایک عظیم مصور کا عظیم شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

ہنری ماتیس بھی شروع شروع میں کلاسیکی اسلوب کا متبع تھا۔ پندرہ برس کی مشق و ممارست کے بعد اسے انشراح ہوا کہ آرٹ اور فطرت دو مختلف چیزیں ہیں۔ بازنطینی نقش و نگار اور ایرانی قالینوں کے نمونوں اور رنگوں سے متاثر ہو کر اس نے انھیں مصوری میں رواج دینے کا تہیہ کیا۔ اس کے بعد اس کی توجہ شبیہ یا نقش کی بجائے رنگوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اس کی اسلوبِ جدید کی پہلی تصویر "ٹوپی والی عورت" تھی جس نے دنیائے مصوری میں تہلکہ ڈال دیا۔ اس کی دوسری مشہور تصویر "نشاطِ زندگی" تھی جس میں عجیب و غریب، برہنہ نقوش پیش کیے گئے تھے۔ اس تصویر کی نمائش پر ناقدینِ فن نے اسے "بدصورتی کے پیامبر" کا خطاب دیا۔ ماتیس نے خود اپنی تصویروں کے متعلق کہا ہے:

"اگر مجھے گلی میں کوئی ایسی عورت مل جائے جیسی کہ میں نے اپنی تصویروں میں پیش کی ہے تو میں غش کھا کر گر پڑوں۔"

تجریدی مصوری کے نقوش کو دیکھ کر بے اختیار کنڈرگارٹن کے بچوں کے بنائے ہوئے نقوش یاد آ جاتے ہیں۔ البتہ بچوں کی تصویروں میں

انہیں زیادہ معنویت پائی جاتی ہے۔ بچوں کی تصاویر کا ذکر کرکے راقم اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا تھا کہ مسالکِ لاشعور کے پیرو اصولی طور پر آغازِ طفلی کے واردات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ تجرید نگاری کے جواز میں بعض اوقات فرائڈ کا نظریہ "بازگشت بہ طفلی" پیش کیا جاتا ہے۔ ایک نوعمر انگریز تجرید نگار ونڈہم لیوس نے مشہور انگریز شاعرہ ایڈتھ سٹویل کی شبیہ بنانا شروع کی۔ چند نشستوں کے بعد جب شاعرہ نے دیکھا کہ وہ قوسوں مثلثوں اور زاویوں میں تحلیل ہورہی ہے تو وہ خفا ہوکر چلی گئی اور تصویر نامکمل رہ گئی۔ ایک تجریدی مصور کے متعلق مشہور ہے کہ ایک رات اس کے گھر میں چور گھس آیا مصور جاگ اٹھا اور اسے دیکھ چور بھاگ گیا۔ دوسرے دن اس نے پولیس کو خبر کی۔ پولیس افسر نے دورانِ تفتیش میں مصور سے کہا "آپ تو ماشاءاللہ مصور ہیں ذرا حافظے پر زور ڈال کر اس چور کی شبیہ بنا دیجئے تاکہ ہمیں تفتیش میں آسانی ہو۔" مصور مان گیا۔ چند دن کے بعد پولیس افسر آیا تو مصور نے تصویر تصویر پیش کی۔ پولیس افسر دیر تک تصویر پر نظریں گاڑے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا "مجھے یقین ہے کہ ایک ڈبے نے جو گوبھی کے پھول پر رکھا ہے اور جس کے درمیان میں الو کی آنکھ ہے آپ کے ہاں چوری نہیں کی ہوگی۔" انگریز تجریدی مصور فرانسس بیکن نے ۱۹۵۰ء میں ایک تصویر بنائی جس کا نام تھا "پارۂ صلیب"۔ اس میں مصلوب مسیح کو دکھایا گیا تھا۔ یہ تصویر اتنی بیہودہ اور ہتک آمیز تھی کہ کلیسائے روم کے پیرووں نے ہنگامہ برپا کردیا اور تصویر کو نمائش گاہ سے اتارنا پڑا۔ امریکہ میں تجریدی مصوری کو تجریدی اظہاریت کا نام دیا گیا ہے۔ فرانز کلائن، کلفورڈ سٹل، ولیم ڈی کوننگ اور جیکسن پولک اس کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ جیکسن پولک کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قرطاس کو دیوار سے چسپاں کرکے یا فرش پر بچھا کر بے تحاشا اچھل کود کرتا اور ڈنڈیں بھرتا ہوا اس پر رنگ کے چھینٹے پھینکنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ بزعمِ خود اپنے لاشعور کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی تصویریں مختلف شوخ رنگوں کے بے ڈھب دھبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ماتیس کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ اپنے موقلم کی نہایت تیز جنبشوں سے تصاویر کھینچتا ہے کیونکہ بقول اس کے اسے اپنے وارداتِ قلب کا ساتھ دینا ہے جو بڑی سرعت سے لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل جاتے ہیں۔ جو لوگ چینی مصوری میں دلچسپی لیتے ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ چینی مصور موقلم کی چند تیز اور برجستہ جنبشوں سے قدرتی مناظر، جانوروں اور پھولوں کی ایسی حسین تصویریں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں کہ جنہیں کڑے سے کڑے معیار پر پرکھا جاسکتا ہے اور جن کے سامنے ماتیس اور پکاسو کے نقوش چند بدنما دھبوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ہمارے معاصرین میں مشہور چینی مصور چی پائی شی کی تصویریں اس اسلوبِ نگارش کے مثالی نمونے سمجھی جاسکتی ہیں۔

کچھ عرصے سے تجریدی مصوری کے خلاف ردِ عمل ہورہا ہے اور مصور گردوپیش کی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل سے اپنے موضوعات اخذ کرنے لگے۔ اس طرح دنیائے مصوری میں موضوع کا رشتہ معروض سے دوبارہ مستحکم ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس رجحان کے معاصر ترجمانوں میں دو مصور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یوگوسلاویہ کی مصور خاتون زورا پیٹروک اور مصورِ پاکستان زین العابدین۔

زورا پیٹروک نے پیرس کے نگارخانوں میں فنی تربیت حاصل کی تھی جہاں اسالیبِ جدیدہ کے چرچے تھے لیکن سلامتیٔ طبع کے باعث وہ مریضانہ داخلیت اور تجریدیت کے اثرات سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب ہوگئیں۔ تجریدی فن کے متعلق لکھتی ہیں:

> "میرے خیال میں تجریدی آرٹ عملی ہونے کی بہ نسبت زیادہ تر نظری ہے۔ تجریدی مصور ابھی تک اپنے مقصد و مدعا کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکے جس کے وہ نظری نمائندے متمنی تھے۔"

زین العابدین روایتی اور جدید اسالیبِ نگارش میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ زورا پیٹروک کی طرح وہ بھی اپنے موضوعات اپنے گردوپیش سے انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی تصویروں میں مشرقی بنگال کے عوام کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ قحطِ بنگال کے متعلق بالخصوص انہوں نے بڑی دلدوز تصویریں بنائی تھیں۔ وہ دوسرے درجے کے فن کاروں کی طرح زندگی کے محض عکاس ہی نہیں اس کے نقاد بھی سمجھے جاسکتے ہیں۔

شاعری اور مصوری کی طرح اہلِ مغرب کی سنگتراشی میں بھی یہی تنزل پذیر فردیت اور رومانیت کارفرما ہے۔ انگریز سنگتراش ہنری مور کہتا ہے:

"ایک مجسمے میں قطع نظر اس شے کے جسے وہ پیش کرتا ہے مستقل طور پر انفرادی جوششِ حیات اور ذاتی شدتِ احساس موجود ہوتا ہے۔ جب تک کسی مجسمے میں یہ جوشِ حرکیت موجود نہ ہو ہم اس پر حسین ہونے کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ عہدِ یونان کے اواخر اور نشاۃ الثانیہ کے مفہوم میں جس چیز کو حسن کہتے ہیں وہ مجسمہ سازی میں میرا مقصود نہیں ہے۔"

ہنری مور کی پیش کردہ عورت حسن و جمال سے معرا ہے۔ اُس کا سر ننھا مُنا سا ہوتا ہے اور سینے اور آنکھوں میں بڑے بڑے سوراخ دکھائی دیتے ہیں اس کا مجسمہ "نقشِ خمیدہ" جدید سنگ تراشی کا شاہکار ہے۔ اُسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے، گویا کسی بچے نے ایک ان گھڑ پتھر کوٹ پیٹ کر پھینک دیا ہے۔ اسی طرح اُس کے مجسموں کو کسی کی صورت، "بادشاہ اور ملکہ" اور "حاملہ عورت" پر انسانوں کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ وحشی اقوام کے طوطم مناروں کے مجسمے ان سے کہیں زیادہ خوش وضع سمجھے جا سکتے ہیں۔ دنیائے مصوری میں جیکوئے لپ شٹز[۱] سنگ تراشی کا کعبی (Cubist) سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے پتھر کے ٹکڑوں سے عورتوں اور مردوں کے مجسمے بنانے کی کوشش کی۔ ناقدین کوشش کے باوجود اس کے فن کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک اور سنگتراش البرٹو جیومیٹی[۲] نے ایک اور ندرت پیدا کی۔ اس کے مجسمے گھٹتے گھٹتے اتنے چھوٹے ہو گئے کہ وہ انھیں سکوں کی طرح جیب میں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔ الگزینڈر کالڈر[۳] نے مجسموں میں حرکت پیدا کی ہے۔ وہ گتے کے ٹکڑوں سے مجسمہ بنا کر اُسے دیوار کی کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ اِدھر اُدھر ہلنے لگتے ہیں۔ ان مجسموں کو وہ Mobiles (حرکت کرنے والے) کہتا ہے۔

بدصورتی کا یہ مسلک جو رومانی اور موضوعی بے راہ روی کی تخلیق ہے، جدید مغربی تعمیر اور موسیقی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ تعمیر میں بھی کلاسیکی اسلوب کو خیرباد کہہ دیا گیا ہے اور لاشعور کی ترجمانی کی جا رہی ہے۔ چنانچہ جدید فنِ تعمیر کے نمونوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے بڑے بڑے پتے ہوا میں جھوم رہے ہیں یا کشتیوں کے بادبان ہیں جنھیں بے ترتیبی سے ہوا میں لہرا دیا گیا ہے۔ ان میں تناسب یا توافق نام کو نہیں پایا جاتا لیکن جدید آرٹ میں توافق کی کسے پروا ہے۔ تناسب و توافق کلاسیکی آرٹ سے مخصوص ہے اس لئے جدت و ندرت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ موسیقی کا بھی یہی حال ہے۔ واگنر نے غالباً سب سے پہلے کلاسیکی اسالیب سے انحراف کیا تھا جس کی بنا پر اس کا دوست نٹشے خفا ہو گیا تھا لیکن واگنر بہرحال ایک بلند مرتبہ موسیقار تھا جسے فن میں نئے نئے تجربات کرنے کا حق حاصل تھا۔ اس کی تقلید میں دی بسی اور چیکوفسکی نے بھی آرکسٹرا کی ترتیب اور اصوات کے آہنگ میں تجربے کئے مگر ان اساتذہ کے پیرووں نے جو ان کی مہارتِ فن سے محروم تھے، موسیقی کو شور و شغب اور ہاؤ ہو میں تبدیل کر دیا۔ سکریابن اور شون برگ اسلوبِ جدید کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی غنائی منظومات[۴] میں کسی خاص موضوع سے اعتنا نہیں کیا جاتا محض گریزاں کیفیات کو طبعی انتشار کی حالت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ توافقِ اصوات کو جدید موسیقی سے یک قلم خارج کر دیا گیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تجرباتی موسیقی ہے اس لئے اسے کلاسیکی معیار پر نہیں جانچنا چاہئے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ فن و ادب پر ہمیشہ سے تجربات کا سلسلہ شروع ہے لیکن نئے نئے تجربات اسی وقت جاندار روایات کے قالب میں ڈھل سکتے ہیں جب انھیں کسی واضح اصول کے ماتحت کیا جائے۔ پھر ان تجربات کو عامیانہ رقص کی موسیقی تک کیوں محدود رکھا جائے۔ دیہات کے پاکیزہ اور پرسوز گیتوں کا امتزاج بھی روایتی اسالیب سے کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال سے تقویت ہوتی ہے کہ مشرقی ممالک میں لوک گیتوں کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ مستقبل کی موسیقی لوک گیتوں کے زندگی بخش اور پرجوش ولولے کو کلاسیکی اسالیب میں منتقل کرنے سے تشکیل پذیر ہوگی۔

(مسلسل)

۱۔ Jacques Lipchitz
۲۔ Alberto Giometti
۳۔ Alexander Calder
۴۔ Symphonic poems.

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اخذ و اشتقاق

جس طرح زبانوں میں قرابت داریاں ہوتی ہیں کہ ایک زبان مثلاً دوسری زبان کی ماں یا بہن ہے۔ اسی طرح لفظوں میں بھی قرابت داریاں ہیں یہ اور بات ہے کہ قرابت اور اجنبیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں قرابت ہے وہاں اجنبیت ہے، جہاں اجنبیت ہے وہاں قرابت ہے۔ زبانوں کے رشتے تو وہی لوگ جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں جو زبانوں کے پارکھ ہیں۔ ادب کا کاروبار کرنے والوں سے البتہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ زبان کے کسی لفظ کی تاریخ وہ نہ جانتے ہوں، حسب و نسب سے شناسائی حاصل نہ ہو، پچھلی پشتیں یا اوپر کے سلسلے ان کے سامنے نہ ہوں تو کم سے کم انھیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ اپنی ذات میں کیا ہے، کس سے بنا اور کیسے بنا؟ "کیا" "کس سے" اور "کیسے" یہ تین سوال بہرحال ادیب کے لئے اہم ہیں۔ ان کا تعلق خود لفظ سے ہے کہ لفظ اپنی ذات میں کیا ہے؟ باپ ہے یا بیٹا یعنی مشتق منہ ہے یا مشتق۔ اگر بیٹا یعنی مشتق ہے تو اس نے کس سے جنم لیا؟ اس کا جنم داتا کون ہے، کس طرح وجود میں آیا اور کن لفظی تبدیلیوں کے بعد اپنی اصل سے الگ، مستقل، آزاد، بامعنی لفظ کی حیثیت اختیار کی؟

یہ لفظوں کی جان پہچان ہے جس کی ادب میں دوگانہ اہمیت ہے۔ اس سے لفظ کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جس کے بغیر لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی لفظ سازی کا نسخہ ہاتھ آتا ہے جب چاہا کھٹ سے لفظ بنایا اور چلتا کر دیا۔ زبان میں تازگی اور رعنائی نئے وضع کردہ لفظوں سے آتی ہے، جو زبان کو نمو، حرکت یا گرم خون اور اظہار کو روح عطا کرتے ہیں۔

آریائی (نیز دراوڑ) نسل کی زبانوں میں اشتقاق کا طریقہ سامی الاصل زبانوں کے اشتقاق سے کسی قدر مختلف ہے۔ زبانوں میں جب ایک لفظ دوسرے لفظ سے وضع کیا جاتا ہے تو مادے میں اندرونی طور پر کچھ رد و بدل ہو جاتا ہے اور یہ عام ہے۔ اس کے بالمقابل آریائی زبانوں میں ملنے کے شروع یا آخر میں ایک یا ایک سے زیادہ حرف بڑھا کر نیا لفظ ڈھال لیتے ہیں۔ مادے میں اندرونی طور پر عموماً کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا[1]۔ عربی سامی خاندان کی زبان ہے اور اردو آریائی خاندان کی۔ اس امر کی وضاحت کے لیے کہ سامی اور آریائی خاندان کی زبانوں میں اشتقاق کا انداز کیا ہے۔ عربی اور اردو ذخیرۂ الفاظ سے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ ق ر ء عربی زبان کا مادہ ہے جس کا ہم معنی اردو زبان کا مادہ پ ڑ ھ ہے۔ عربی مادے سے ڈھلے ہوئے چند کلمے ملاحظہ ملاحظہ ہوں:

قَرَءَ (= پڑھا) یَقرَءُ (= پڑھتا ہے) اِقرَءْ (= پڑھ) قِراءۃٌ (= پڑھائی) قاریٌ (= پڑھنے والا) مقروءٌ (= پڑھا ہوا)

پہلی مثال میں مادے پر کوئی حرف اضافہ نہیں ہوا، مادے کے حروف متحرک ہوئے۔ دوسری مثال میں شروع میں "ی" بڑھا کر مادے میں حرکاتی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ باقی مثالوں میں اضافے بھی ہوئے اور حرکاتی تبدیلیاں بھی۔ اس کے مقابلے میں اردو مادے کے آخر میں "ے" "ا" بڑھا کر، کہیں "ے" "ائی" کہیں

---

[1] خاص خاص صورتوں میں اندرونی تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے چل سے چال، پڑھنا سے پڑھانا، دکھنا (بجائے معروف) سے دکھنا۔

اہوا، کہیں 'نے والا' اور کہیں 'تا ہے' - خود 'پڑھ' اندرونی طور سے اس نوع کی تبدیلیوں سے محفوظ رہا جو عربی مادے میں ہوئی تھیں۔

آریائی زبانوں میں اشتقاق کا عام طریقہ یہ ہے کہ مادے کے شروع یا آخر یا شروع و آخر دونوں میں کوئی حرف یا لفظ اضافہ کر دیا جائے۔ شروع میں اضافہ ہونے والے لفظ کو سابقہ (PREFIX) کہتے ہیں۔ آخر میں اضافہ ہونے والا لفظ لاحقہ (SUFFIX) ہے۔ عربی میں مشتقات کے اوزان مقرر ہیں۔ اردو میں ان کی جگہ سابقے اور لاحقے ہیں۔ یہ اردو میں وہ کام انجام دیتے ہیں جو عربی میں اوزان کا ہے۔ مثلاً ہار، والا (= الا) وغیرہ لاحقے عربی وزن فاعل (یا مفعل) کے قائم مقام ہیں۔ جیسے پالن ہار (مربی)، ہونہار (کاتب)، رکھوالا (حافظ)، کرنے والا (فاعل) وغیرہ

اس تفصیل سے ذیل کے نقطے واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ اشتقاق عربی ہی میں نہیں اُردو میں بھی ہے

۲۔ عربی میں اسم مشتق کے اوزان ہیں۔ اُردو سابقے اور لاحقے ہیں

۳۔ اسم مشتق وہ اسم ہے جو مادے میں قاعدے کے مطابق تصرف کے بعد آلہ پر دلالت کرنے کے لیے وضع ہوا ہو۔ عربی میں وزن کی مدد سے، اردو سابقے یا لاحقے کی مدد سے۔

اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ، اسم تفضیل، صفت مشبہ۔ عربی میں مشتق کی چھ قسمیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اُردو میں بھی مشتق کی یہی چھ قسمیں ہیں یا کچھ زیادہ ہیں؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ عربی میں مصدر اصل کلمہ ہے جس سے تمام کلمے وضع کیے جاتے اور حسب قاعدہ تصرف و تغیر کے بعد ڈھالے جاتے ہیں۔ اُردو میں اصل کلمہ مادہ ہے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اردو کا مزاج، منہاج، رجحان یا میلان عربی سے یکسر مختلف ہے اُردو مشتقات کی تعداد عربی مشتقات سے کچھ زیادہ ہے۔ عربی میں مصدر مشتق منہ یعنی ماخذ ہے۔ اردو میں مشتق اور ماخوذ[1] ہے۔ مادے پر 'نا' یا '= انا' لگا کر مصدر وضع کیا جاتا ہے۔ 'نا' عام اردو مادوں (یا عربی و فارسی الفاظ) پر اضافہ ہوگا۔ جیسے: چلنا، اُٹھنا، گرنا، پڑھنا، بخشنا، دیکھنا، قبولنا۔ '= انا' حکائی (ONO MATO-POETIC) اسمی (DENOMINATIVE) اور متعدی بنائے جانے والے CAUSATIVE مادوں پر جیسے:

۱۔ بلبلانا، کھٹ کھٹانا، پھڑپھڑانا، سنسنانا، گنگنانا (حکائی)

۲۔ چھتیانا، تھپڑانا، مٹھیانا، سٹھیانا، برقانا، فلمانا (اسمی)

۳۔ چلانا، اُٹھانا، دکھانا، بجانا، چلانا، چرانا (متعدی)

اسم مصدر اور حاصل مصدر اردو فارسی وغیرہ آریائی زبانوں کے مشتقات کی دو نئی قسمیں ہیں۔ یہ مادۂ فعل، اسم یا صفت کے آخر میں لاحقے لگا کر وضع کیے جاتے ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مثلاً صرف چند لاحقوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ مادۂ فعل کے آخر میں:

(الف) '= ا' بڑھا کر جیسے: بھڑکا، ٹھپکا، دھڑکا، جھگڑا، کھٹکا۔

(ب) '= ن' لگا کر جیسے: مرن، رکھن، سمجھن، بھڑکن، پھسلن، چلن، چبھن

(ج) '= ان' اضافہ کر کے جیسے اٹھان، اڑان، ڈھلان، لگان۔

(د) '= ائی' جوڑ کر جیسے: دھلائی، پسائی، رنگائی، سلائی[2]

---

[1] مصدر کو جدید علمائے لغت نے مشتقات میں شمار کیا ہے

[2] یہ اس صورت میں ہے جب مادۂ فعل لازم کو ماخذ قرار دیا جائے اور اگر فعل متعدی کو اصل سمجھا جائے تو لاحقہ 'ئی' ہوگا۔

۲۔ اسم کے آخر میں :

(الف) "پن" یا "پنا" بڑھا کر جیسے: لڑکپن، بچپن، گنوارپنا۔

(ب) "ی" لگا کر جیسے: چوری، ٹھگی، مردی

۳۔ صفت کے آخر میں:

(الف) "ان" لگا کر جیسے: لمبان، اونچان، چوڑان۔

(ب) "ائی" لگا کر جیسے: اچھائی، برائی، لمبائی، چوڑائی، بڑائی

(ج) "ہٹ" اضافہ کرکے جیسے: کڑواہٹ، چکناہٹ، نیلاہٹ

عام طور سے اسم مصدر اور حاصل مصدر میں فرق نہیں کیا جاتا اور انگریزی گرامر کی تقلید میں دونوں کو اسم کیفیت کہا جاتا ہے[1] ایرانی فاضل ڈاکٹر معین اور بعض دوسرے نحوی ان میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو اسما مادۂ فعل سے وضع ہوئے وہ حاصل مصدر ہیں اور جو اسم یا صفت سے بنائے گئے وہ اسم مصدر ہیں۔ میرے خیال میں آسانی اس میں ہے کہ دونوں کو حاصل مصدر کہا جائے۔ بناوٹ اور مفہوم دونوں اعتبار سے یہ مصدر کا گویا حاصل اور نتیجہ ہیں۔

اردو مشتقات کی، عربی کی نسبت سے، چار قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ وہ مشتقات جو عربی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی جیسے اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف وغیرہ۔ اردو میں ہیں عربی میں نہیں، جیسے حاصل مصدر، اسم حالیہ، اسم استقبالیہ وغیرہ عربی میں ہیں اردو میں نہیں جیسے اسم تفضیل (سنسکرت اور فارسی میں اسم تفضیل بھی ہے)۔ اردو میں آج سے پہلے تھے آج دستبرد روزگار کی نذر ہو چکے ہیں۔ اس کی تنہا مثال اسم آلہ ہے۔ اردو میں آلہ قدیم زمانے میں اسم یا مادۂ فعل پر "نی" لگا کر بنایا جاتا تھا اور وضع کا یہ طریقہ عام تھا چھننی یا چھلنی (چھاننے کا آل) اور چھینی یا چھیونی (چھیلنے یا چھیدنے کا آل) کے استعمال کی تین قدیم مثالیں درج ذیل ہیں۔

سو چھلنی تے چھانیا ہوں دریا کا نیر

ــــــــــــــــ

دیپک پتنگ، عشرتی (متوفی ۱۶۹۶ء)

سینہ سب کا ہوا ہے جوں چھلنی   ہر پلک تج مثال سوزن ہے

ــــــــــــــــ

دیوان فائز (مرتبہ ۱۷۱۴ء)

چھینی سوں غم کی چھیدیاں ہیں جیو جیو کی خاطر

ــــــــــــــــ

ہاشمی (متوفی ۱۶۹۷ء)

ان کے علاوہ ذیل کے آلے بھی اردو میں مستعمل ہیں۔

اوڑھنی، پھٹکنی یا پھونکنی، دھونکنی، ڈھکنی، چھینی، کترنی، کرنی یا کنی، چٹنی یا چٹکنی، چھاؤنی (چھاؤں کرنے کی چیز)، نہنی (نکھ = ناخون + نی) وغیرہ "ی" پر ختم ہونے والے الفاظ اردو میں عموماً مونث ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے اہل اردو نے ان تمام کلموں کو مونث سمجھا اور زبان کے عام مزاج کے مطابق ان کی "ی" کو "ا" سے بدل کر ان کے ہم معنی مذکر الفاظ وضع کر لیے، جیسے

---

[1] خود انگریزی میں اسم مصدر اور حاصل مصدر کا مترادف VERBAL NOUN ہے۔

اوڑھنا، چھننا، ڈھکنا، کستا، پالنا وغیرہ

بعض صورتوں میں آخر سے 'ی' گرا دی گئی جیسے :

ڈھکن، چھپن، بیلن۔

"نی" آلی لاحقہ غالباً سنسکرت لاحقہ استقبال ANIYA سے لیا گیا ہے۔ یہ موجودہ فارسی بھی ہے۔ جیسے کردنی (= کرنے کے قابل)، گفتنی (= کہنے کے قابل)، خوردنی (= کھانے کی چیز)، نوشیدنی (= پینے کی چیز)۔ کرنی، کترنی وغیرہ الفاظ کے اصل معنی تھے 'کام جو کیا جائے اور چیز جو کتری یا کاٹی جائے'۔ بعد میں مجاز مرسل کے طور پر کرنی اس آلے کو کہا گیا جس سے عمارتی مسالا پھیلایا جاتا ہے اور کترنی کترنے کا آلہ یعنی قینچی ہوا۔ اب اگرچہ اسم آلہ بنانے کا یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے لیکن شعراء اور انشا پرداز جو ادب و زبان کے خالق ہیں اور نت نئے الفاظ وضع کرتے رہتے ہیں اگر چاہیں تو آج بھی حسب ضرورت نئے آلاتی کلمے ڈھال سکتے ہیں اور زبان کی ترقی میں ایک اہم تخلیقی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ابتدائی سطروں میں اسم مشتق کی تعریف میں نے یہ کی تھی۔ وہ اسم جسے مادے میں لفظی تصرف کے بعد آلے پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ اسم فاعل اور حالیہ کی طرح اسم آلہ بھی مشتق کی ایک قسم ہے۔ اس لئے وہ تمام اسما جو اپنی ذات سے کسی لفظی تصرف و تغیر کے بعد آلہ فعل پر دلالت کرتے ہیں ہم آلہ شمار نہ ہوں گے اور اردو قواعد میں اسم آلہ کے تحت ان کا ذکر نامناسب اور بے محل سمجھا جائے گا۔ جیسے :

ہتھوڑا، چمٹا، چھری، چاقو، رانپی، قلم تراش۔

یہ کلمے یا غیر مشتق یعنی جامد ہیں یا آلے کے لیے وضع نہیں ہوئے۔ عربی زبان کے جدید لغت "المنجد" کے مؤلف نے اسم آلہ کی دو قسمیں کی ہیں، مشتق اور غیر مشتق۔ اسم آلہ مشتق ضابطے کے مطابق آلہ کے لئے وضع کیا جاتا ہے اور اس کے اوزان مقرر و متعین ہیں۔ آلہ غیر مشتق کے بنانے کا کوئی ضابطہ نہیں۔

اما اسم الآلۃ غیر المشتق فلا ضابطۃ لہ و یاتی علی اوزانٍ مُختَلِفَۃٍ نحو قدوم و سکین و فاس (اسم آلہ غیر مشتق کا کوئی ضابطہ نہیں۔ اس کے مختلف اوزان ہیں جیسے قدوم (رانپی)، سکین (چھری)، فاس (ہتھوڑی))

اس اصول کی بنا پر ہتھوڑا، چھری وغیرہ آلاتی الفاظ جو علمائے لغت و اشتقاق کے نزدیک اسم آلہ غیر مشتق سمجھے جائیں گے۔ میں اپنی رائے اوپر لکھ آیا ہوں۔ میرے خیال میں انھیں اسم غیر مشتق سمجھا جائے یا اسم فاعل ترکیبی۔ یعنی ان کی حیثیت کی تعیین میں معنی کی جگہ ان کی بناوٹ کا خیال رکھا جائے۔

ڈاکٹر نبی ہادی

اکبرِ اعظم کا دوسرا ملک الشعراء

شیخ فیضی

(۱)

گویند ہمرہانِ طریقت کہ اے رفیق — آگاہ شو کہ قافلہ ناگاہ می زنند

غافل نیم ز راہ ولے آہ چارہ نیست — زیں رہزناں کہ بردلِ آگاہ می زنند

تقدیر کا فرشتہ بعض اوقات نہایت گمنام لوگوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور ان کو اپنے قوی بازوؤں پر بٹھا کر بقائے دوام کی بلندیوں کی سمت اڑنے لگتا ہے۔ دنیا سمجھتی ہے اور افسوس کرتی ہے کہ وہ تباہی اور دستبرد کا شکار ہو گئے۔ وہی دست بردان کے عروج کی راہ کا نقطۂ آغاز بن جاتی ہے۔

آگرہ شہر میں اکبر بادشاہ کے جلوس کو کم و بیش گیارہ سال ہوئے ہوں گے۔ ایک دن شہر میں عجیب تماشا نظر آیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ خلقت کا ایک مشتعل مجمع سربازار شور مچاتا چلا آ رہا ہے۔ اس ہجوم میں کچھ خود ساختہ علمائے دین اور کچھ شاہی پیادوں کے چہرے نمایاں تھے جن کو ابوالفضل اشارتاً "بدگوہران کوتہ اندیش" کہتا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مہدوی بدعت کے مرکزوں کو جلا کر خاک کر دیا جائے۔ اتفاقاً راستے میں شیخ مبارک ناگوری کا گھر پڑا۔ شیخ بھی مہدوی تحریک کا حامی شمار ہوتا تھا۔ سارا ہجوم یہیں ٹوٹ پڑا۔ شیخ مبارک کو پہلے سے اس فتنے کی خبر تھی۔ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر غائب ہو چکا تھا۔ شیخ کے گھر میں ایک مسجد اور ایک چھوٹا سا مکتب تھا جہاں بہت سے طالب علم درس میں حاضر رہا کرتے تھے۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے گھر میں لوٹ مچانے کے بعد منبر کی طرف رخ کیا۔ یا آخر یہی وہ منبر تھا جس پر سے شیخ کے بدعتی افکار کی تبلیغ ہوتی تھی۔ منبر کے ٹکڑے اڑا دیئے گئے۔[۱]

اس بات کو دن نہ گذرے ہوں گے کہ بادشاہ کے سامنے بھرے دربار میں ایک آواز ملامت اور ملال کے لہجے میں بلند ہوئی جسے سن کر نوجوان بادشاہ منہ سے ایک حرف نہ بول سکا مگر پیشانی پر بڑی سی گہری لکیر قائم ہو گئی۔ بظاہر ان بے ربط جملوں کا مفہوم یہ تھا کہ ایک گوشہ گیر درویش جو شاہی خوانے سے ایک پیسہ مددِ معاش نہیں کھاتا اپنے گھر میں بیٹھنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کا گھر لٹ جائے اور تم دیکھا کرو۔ اس اندھیر کی کوئی حد ہے۔" زہے انعام از شما ندارد۔ رنجانیدن آن فقیر چوں باشد"[۲] یہ بادشاہ کے خاص خانِ اعظم کی آواز تھی۔ مغل سلطنت کے امیر کبیر اور بادشاہ کے ہمسن رفیق کا خشمگیں لہجہ تاریخ کے نئے آثار کا نقیب معلوم ہوتا تھا۔ اس آواز میں فیصلہ کن لمحات کی گونج سنائی دے رہی تھی یعنی ہندوستان قرونِ وسطیٰ کی سرحدیں پار کر چکا تھا اور عہد جدید کی قلمرو میں اس کا یہ پہلا قدم تاریخ کی تقویم میں تحویلِ منزل کا وقت تھا۔

---

۱ اکبرنامہ۔ ابوالفضل ص ۳۰۲ - ۳۰۳ ج ۲ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

۲ منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی ص ۱۹۸ ج ۲ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

یہ مختصر سی ضمنی واردات بعد میں آنے والے بڑے حادثات کا پیش خیمہ بن گئی۔ فیضی کی عمر اس وقت تقریباً بیس اکیس برس کی ہوگی۔ شیخ مبارک کا سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اس مصیبت کا زیادہ حصہ باپ کے بعد اسی کے دل نے جھیلا۔ اس کے قوی مشاہدے کے لئے یہ زندگی کا پہلا خطرناک اور بحرانی سانحہ تھا جس کا عکس اس کے اعمال پر ہمیشہ کے لئے ایک شدید تاثر میں تبدیل ہوگیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زندگی میں پہلا موقعہ آیا جب جگر دوز حوادث کی حرکت سے دل کو ایسا رنج پہنچا۔ بھائی شہادت دیتا ہے: "زمو دند کہ نخستیں چہرۂ خاطر من بمقتضائے نشاۂ بشریت از سخن سازان بد گوہر غبار آلود گشت"[۵۱]۔ انسان کی باطنی شخصیت خارجی واقعات کے تار و پود سے مرتب ہوتی ہے۔ فیضی کے زیرک شعور نے ماحول کے بظاہر فروعی اور زود گذر حوادث کو شدت سے جذب کرنا شروع کیا اور روزمرہ کی سرسری واردات میں طبیعت پر گہرا رنگ جانے لگیں۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل بات نہیں ہے کہ اتفاقاً پیش آنے والے زود گذر حادثات جن کا بظاہر ایک دوسرے کوئی ربط نہیں ہوتا، انسان کی زندگی میں ایک زندہ کردار کا درجہ رکھتے ہیں اور ان ہی کی نقش گری کی بدولت آدمی کے تمام تعصبات، عقاید اور خیالات ترتیب پاتے ہیں۔ فیضی کی طبیعت کے پیچ و خم اور اس کی شخصیت کے کلیدی نکتے ان واقعات کے مطالعہ سے سمجھ میں آتے ہیں جن کا سلسلہ خود اکبر کے گرد شروع ہوا۔ مثلاً "اہل بدعت" کی دار و گیر اور قتل و تشہیر کا معاملہ جس کا مدت سے معمول تھا۔ امور ملکی اور مسائل عرفی میں تنگ نظر لوگوں کی بیجا مداخلت جو روشن فکری اور رواداری کے راستے میں حایل ہوتی تھی۔ علمائے دین کی خشونت اور باہمی رسہ کشی جو بالآخر صدر الصدور اور شیخ الاسلام (مخدوم الملک) کے ذاتی جھگڑے کی شکل میں انتہا کو پہنچ گئی۔ فیضی کے سامنے سب سے پہلا اور روح فرسا مرحلہ یہ تھا جو عموماً زندگی میں ہر ذہین اور فکری میلان رکھنے والے آدمی کے سامنے آتا ہے، کہ معاشرے کے نظام میں اپنی جگہ کہاں متعین کرے۔ ماحول کی روش کے ساتھ مصالحت کہاں تک ممکن ہے اور کس جگہ پہنچ کر بغاوت کا اعلان لازمی ہوگا۔ شیخ مبارک کا گھرانہ ہنگاموں کا مجموعہ بننے والا تھا۔

اکبر کو ابتدائی عمر سے اہل فضل و تقویٰ کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان کی صحبت سے اکتساب برکت اور حصول فیض کی خاطر ایک عمارت عبادت خانہ کے نام سے بنوائی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ رات کو اور بالخصوص جمعہ کی رات کو ہر قسم کے اہل فضل وہاں جمع ہوں۔ بادشاہ بھی موجود رہے اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال اور مذاکرۂ علمی ہوا کرے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عبادت خانے کے ابتدائی جلسوں ہی میں علمائے دین کے درمیان نشستوں کے سلسلے میں اور جگہوں کے مقدم و مؤخر ہونے پر جھگڑے ہونے لگے۔ پھر اکثر یہ ہوا کہ مباحثے کا رنگ علمی سنجیدگی سے گذر کر بقول بدایونی "سخن نامعقول" میں بدل جاتا تھا "و خنکہ بد لفیہا از یں جماعہ ظاہر شد"[۵۲]۔ ایک رات کو نوبت یہاں تک پہنچی کہ عبادت خانہ میدان جنگ بن گیا اور کسی مسئلہ پر علمائے دین کے بیچ ڈنڈے اٹھ گئے۔ "تا شبے رگ گردن علمائے زمان بر آمدہ آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد۔ ایں معنی بر خاطر اشرف گراں آمد"[۵۳]۔ بادشاہ کو اپنے گرد ایک تنہائی سی محسوس ہونے لگی اور ایک نیا حلقہ قائم کرنے کی آرزو بیدار ہوگئی۔

شہنشاہیت کے نظام میں دربار سب سے اہم اور اولین ادارہ ہوتا تھا جس کے قاعدے و ضوابط صدیوں سے معین اور مربوط تھے۔ دربار کے معین قرینے میں خلل ڈالنا یا مقررہ آداب سے انحراف کرنا، جان سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ مگر یہاں آئے دن یہ منظر رہتا تھا کہ نماز کا وقت آیا اور دربار کے امور میں خلل پڑ گیا۔ بادشاہ اصرار کر رہا ہے کہ خدا کے بندو، فرض پڑھ چکے اب نوافل اپنے گھر جا کر پڑھنا اور اس کے جواب میں آوازیں آرہی ہیں کہ "بادشاہم ایں ملک نیست کہ بحکم شما باشد"[۵۴]۔ بادشاہ بے بسی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ کر رہ جاتا تھا، اس کی نظر ایسے لوگوں کو ڈھونڈتی تھی جن کی حمایت تلخ احساسات سے نجات کا وسیلہ بن جائے۔

علمائے دین کا نشتر انتقاد رفتہ رفتہ بادشاہ کے دینی کردار کی سب سے کمزور رگ تک پہنچ گیا۔ وہ تھا، شاہی حرم میں تعداد ازواج کا مسئلہ

---

[۵۱] اکبرنامہ۔ صفحہ ۳۰۳ ج ۲ — [۵۲] منتخب التواریخ ص ۲۰۲ ج ۲ — [۵۳] منتخب التواریخ۔ صفحہ ۲۰۳ ج ۲ — [۵۴] منتخب التواریخ: صفحہ ۲۰۹ ج ۲

اکبر کی سیاسی حکمت عملی میں یہ مسئلہ کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ علمائے دین اس معاملے کے سیاسی پہلو کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ سیاسی مصالح اور جنسی بوالہوسی میں بدیہی فرق کے باوجود اتنا ضرور ہے کہ سیاستمدار کے اندیشوں کی تہہ میں بھی ایک قسم کی ہوس کارفرما ہوتی ہے۔ مگر یہاں خالص اخلاقی بندش اور ذاتی تعلق خاطر کا خار بھی تھا جو بادشاہ کو مجبور کئے تھا۔ کان علمائے دین کی باریک باتیں اور حرام حلال کے نکتے سنتے تھے، آنکھیں اندرون حرم معصوم چہروں کو دیکھتی تھیں۔ یہ کیفیت بادشاہ کی جان کے لئے دوگونہ عذاب کے عالم سے کم نہیں تھی۔ بادشاہ اپنے سادہ اور جناب ضمیر کی تسکین کے لئے پوچھتا تھا کہ اب کیا علاج کروں، تو علمائے دین کی روش یہ تھی کہ "ہر کدام چیزے می گفتند"[1]۔ اگر علمائے دین انسانی فطرت کے عوامل پر غور کر لیتے یا وقعہ کے سیاسی اوضاع پر نظر ڈالتے تو ممکن تھا کہ مسئلہ کسی طرح حل ہو جاتا۔ علامہ ابن جوزی سے بڑا فقیہ اور مسائل کا دقیقہ سنج کون ہوگا۔ خود ابن جوزی کا واقعہ ہے کہ جوانی میں نسیم الصبا نام کی ایک زن جمیلہ سے ازدواج کیا اور بعد میں طلاق دیدی۔ عرصے بعد جب ان کے علمی کمالات کا چرچا پھیلا اور صحنۂ شہرت پر علامہ کی حیثیت سے نمودار ہوئے تو ایک دن بغداد میں ان کا خطبہ سننے کے لئے نسیم الصبا بھی جا پہنچی۔ اس کے ساتھ قبیلہ نعمان کی دو عورتیں اور تھیں۔ ابن جوزی کی نظر اس پر پڑی تو ماضی کی یادوں نے بجلی کا کام کیا اور فوراً ایک شعر منہ سے نکل گیا: (اے قبیلۂ نعمان کے پہاڑو ذرا سرک جاؤ نسیم کی خوشبو مجھ تک آنے دو)[2] جنگ جلولا کے بعد ایران کی فتح کے موقعے پر ایسا ہی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہوا۔ فقہا نے سارے عرب سپاہیوں کی اولاد کو جائز قرار دیدیا۔ فی الجملہ اکبر کو اپنے زمانے میں اس معاملے کا خاطرخواہ جواب نہ مل سکا۔ بدایونی کہتا ہے: "ازیں کار دربار حالتے عجیب روئی داد"[3]۔ بادشاہ کو اپنے گردوپیش کا ماحول بدلنے کے لئے جرأتمند اور بھاری صداؤں کی ضرورت تھی جن کی گونج اعتراضات کے ہنگامے کو خاموش کر دے۔

دینی اقتدار اور مذہبی پیشوائی کا جھنڈا اس وقت دو آدمیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ایک ملا عبداللہ سلطان پوری جو مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کے خطابات سے سرفراز تھے۔ دوسرے شیخ عبدالنبی صدرالصدور۔ ان کی چشم و ابرو کے اشارے پر پورے ملک کے اہل سعادت کی روزی اور مدد معاش منحصر تھی۔ ان کے فتوے پر گردنیں صاف ہو جاتی تھیں۔ تمام اہل منصب اور امرائے دولت ان دونوں کا رعب کھاتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان بزرگوں میں لڑائی ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے پر الزامات برسانا شروع کئے: "یا یکدیگر تیغ زباں کشیدہ در مقام تنافی و تقابل آمدند"۔ سارے ملک کے علمائے دین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ مخدوم الملک کے خلاف "خباثت و مکاری و دنیا داری" کے متعدد سنگین واقعات منظر عام پر آ گئے۔ مثلاً یہ کہ زکوٰۃ سے بچنے کی عجیب ترکیب نکالی ہے: "مجموعۂ خزانہ مابملکو صرفی بخشید"[4] پھر سال تمام ہونے سے پہلے دوبارہ اپنے نام منتقل کرا لیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ خزانہ زمین میں چھپا کر اعلان کیا ہوا ہے کہ یہاں قبریں ہیں۔ بقول شاعر؎

گاڑیں جنازہ مزار بنا دیں شہید کا

بنی اسرائیل کے جیسے اس کے آگے شرمندہ تھے: "صندوق خشت طلا در گورخانہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود"[5]۔ مخدوم الملک کا ایک وصف اور تھا: "خلیے از ملاحدہ و روافض لیعنی را بجائے کہ جہت ایشاں آمادہ ساختہ بودند رفتند"[6] لہٰذا اعتراض اٹھایا گیا کہ یہ شخص قتل کا فتویٰ دینے میں نہایت بے رحم اور بے باک ہے۔ بیشتر مقتولین جو بدعت وکفر کی بنا پر مخدوم الملک کے فتوے کی زد میں آئے، ان میں اکثر کے خلاف ثبوت محکم نہیں تھا۔ اور بہت سے تو خواہ مخواہ ہی مارے گئے۔ مخدوم الملک اپنے حریف سے اس طرح دبنے والے نہ تھے۔ ان کے مریدوں کی جماعت ملک کے گوشہ وکنار میں اچھی طرح ٹکر لینے کے لئے مستعد ہو گئی۔ انھوں نے صدرالصدور کے خلاف زورِ قلم سے کام لیا اور ایک رسالہ تالیف کیا جس میں صدرالصدور

---

[1] منتخب: ص ۲۰۵ ج ۲
[2] منتخب: ص ۲۰۳ ج ۲
[3] زہر الربیع، نعمت اللہ الجزائری۔ مطبوعہ طہران
[4] منتخب: ص ۳۱۱ ج ۲ - اکبرنامہ ص ۲۷ ج ۲
[5] منتخب: ص ۲۰۹ ج ۲
[6] منتخب: ص ۲۰۷ ج ۲

گے کارنامے تفصیل سے واضح کیے گئے[1]۔ پہلا الزامی جواب یہ تھا کہ جہاں تک اہل بدعت کے خلاف فتوے دینے اور لوگوں کی جانیں ضایع کرنے کا تعلق ہے، صدر الصدور کا دامن ہی کدھر سے پاک ہے۔ مگر اصلی زور بیان اس نکتے پر جا کر ختم ہوتا تھا کہ صدر الصدور کے پیچھے نماز پڑھنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بہت سی مضبوط دلیلیں اور شہادتیں جمع کی گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ صدر الصدور کو ان کے باپ نے عاق کر دیا تھا۔ دوسرے ایک ایسی بیماری کا الزام تھا جس میں نجاست کا احتمال ہر وقت اور طہارت کا قائم رہنا مشکل ہوتا ہے۔ غرضکہ اسی قسم کی ذلیل باتیں رسالہ ہذا میں مذکور تھیں۔ اس ہنگامے کی آواز ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی اور اختلافات نے یہاں تک طول کھینچا کہ "کار بحث از سنی و شیعی و حنفی و شافعی و فقیہہ و حکیم گذشتہ ودر اصل اصول غلل انداختند[2]"

فطری نتیجہ ہے کہ یہ معرکے معاصرین کے لئے ایک درس عبرت تھے مخصوصاً وہ نوجوان نسل جو اس وقت ذہنی نشوونما کے مرحلے سے گذر رہی تھی، ان واقعات کے عکس العمل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ تماشے دیکھ کر تعصب کے خلاف نفرت اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت لازمی تقاضا تھی۔ اجتماعی خلفشار اور معاشرے کی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تحریک اور تبدیلی کی قوتیں آتش فشاں بن کر ابل پڑتی ہیں۔ اس دور کو اپنے مسائل کی چارہ گری کے لئے ایسے لوگوں کی تلاش تھی جن کی ذات میں معاشرے کی ساری توقعات اور تمنائیں مجسم نظر آئیں۔ کہتے ہیں کہ ہر نوجوان آدمی کے ذہن میں کچھ خواب سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور جب حادثات کے جھٹکوں سے جاگتے ہیں تو وابستگی کی تلاش اور سہارے کی آرزو میں بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اکبر کے خواب جب جاگے تو فیضی اور ابوالفضل کو سامنے کھڑا پایا۔ ان دونوں کا وسیع دامن بادشاہ کے خوابوں کی پناہ گاہ بن گیا۔ اب وہ امور و مسائل کو ان ہی کی آنکھوں سے دیکھے گا۔ ان ہی کے کانوں سے سنے گا۔ ان ہی کے ہاتھ حکمت عملی کو تشکیل دیں گے۔ پوری نسل بغاوت پر مشتعل ہونے کے لئے آمادہ اور منتظر تھی۔ رہنمائی کا قرعہ فال شیخ مبارک کے بیٹوں کے نام آیا۔ فیضی کہتا ہے: کو کہن را تیشہ دادیم و کار آموختیم

(۳)

فیضی کی زندگی کا قابل توجہ پہلو جس کو اس طالع کا حیرت انگیز اتفاق سمجھنا چاہیئے، دراصل یہ ہے کہ اس کی ذات بہت جلد بڑے بڑے طوفانوں کا مرکز بن گئی اور عہد اکبری کی تاریخ کا شور انگیز دھارا ہمیشہ اس کے دروازے کے آگے سے ہو کر بہتا رہا۔ وہ اپنے زمانے کے لئے ایک اجتماعی اضطراب کا پیغام بر کر نمودار ہوا تھا۔ عقاید و نظریات کی دنیا میں وہ اپنے وقت اور زمانے سے بہت آگے چلتا ہے:

من براہے می روم کانجا قدم نامحرم است   از مقامے حرف می گویم کہ دم نامحرم است

ذہنی بلوغ کے مختلف مرحلے اس نے اپنے باپ شیخ مبارک کی تربیت میں طے کیے۔ وہ ابوالفضل سے عمر میں دو تین سال بڑا تھا۔ شیخ ابوالفضل کے بچپن کی ذرا سی جھلک تاریخ میں محفوظ ہے۔ بدایونی ایک جگہ اپنی اور ابوالفضل کی طالب علمی کے ضمن میں ملا عبداللہ مخدوم الملک کا مقولہ درج کر گیا ہے۔ ملا صاحب ابوالفضل کو دیکھ کر اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "یہ لڑکا بڑا ہو کر دین میں ضرور خلل ڈالے گا اور مجھے نظر آتا ہے کہ بڑے فتنے اٹھائے گا۔" "در اوایل عہد کہ شیخ ابوالفضل را می دید بتلامذۂ خویش می گفت، چہ خلل کہ در دین ازیں نخیزد:

چوں بہ طفلی اش بدیدم مخدوم اہل دین را   کہ شود بلائے جانہا بشما سپردم دین را[3]"

پھر ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ میرے اور ابوالفضل کے درمیان وہی معاملہ ہے جو شبلی اپنے رفیق جنید کے حق میں کہا کرتے تھے: "ما ہردو از یک تخم بر آمدہ ایم[4]" یہ دونوں اکثر ایک ہی مکتب میں پڑھے۔ دونوں ہم درس رہے اور تقریباً ایک ساتھ آ کر دربار میں ملازم ہوئے۔ البتہ فیضی عمر کی

---

[1] منتخب: ص ۲۵۵ ج ۲   [2] منتخب: ص ۲۵۵ ج ۲   [3] منتخب التواریخ: ص ۲۰۲ ج ۳   [4] ایضاً ص ۲۰۶ ج ۲

منزل میں ان دونوں سے چند سال آگے تھا۔ مگر اس کی مقناطیسی شخصیت نے اپنے گرد ارباب نظر کا ایک حلقہ بنا لیا جن کا مقصد طلب و تجسس کی راہوں میں ایک دوسرے کو روشنی دکھانا اور متنوع عقاید کو ایک مشترک نظام کے تحت مربوط کرنا تھا۔ فیضی کے رفیقوں کی جماعت کو مشترک طور سے ایک خاص مکتب کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اکبری دور کی تمام سرگذشتوں کا سلسلہ اسی مکتب سے وابستہ نظر آتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے مغل حکومت کو ایک واضح حکمت عملی دینا، اور صلح کل کے راستے پر لے آنا اسی گروہ کا کارنامہ ہے۔ سعدی کا معروف عقیدہ: "بنی آدم اعضائے یکدیگر اند" اس جماعت کا منشور قرار پایا۔ مشرق میں عظیم انقلابات تلوار کے ذریعہ ہوتے آئے تھے۔ ان لوگوں نے تلوار کے بجائے افکار و عقاید کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

اس انجمن کے افراد کا ذکر خواجہ حسین مروی کے نام سے شروع کرنا چاہیئے جو ایک طرح سے فیضی کا استاد تھا۔ بدایونی کی اطلاع ہے کہ فیضی نے شاعری کی وادی کے مرحلے اسی کی رہنمائی میں طے کئے۔ مغل تاریخ میں خواجہ کے نام کا نقش کئی جگہ نمایاں ہے۔ ایک مرحلہ وہ ہے جب کابل میں میرزا کامران اندھا ہو جانے کے بعد ہمایوں سے اجازت مانگتا ہے کہ اب باقی دن مکہ معظمہ میں جا کر گذاروں گا۔ ہمایوں آخری ملاقات کے لئے چند رفیقوں کو ساتھ لے کر جاتا ہے۔ کامران نے ایک سرد آہ کھینچی اور یہ شعر پڑھا:

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است   گر ناوک بلاست وگر خنجر ستم

ہمایوں رونے لگا۔ کامران نے اپنے ملازم سے پوچھا۔ یہاں اور کون لوگ ہیں: "او حاضران مجلس عالی را نام برد[1] اور اس میں خواجہ حسین کا نام بھی لیا گیا۔" دوسرا موقعہ وہ ہے جب ہمایوں یکایک دہلی میں اپنے کتاب خانے سے گر کر وفات پا جاتا ہے۔ امرائے چغتائی مشورہ کرتے ہیں کہ جب تک اکبر کو کابل سے نہ بلا لیا جائے بادشاہ کی موت کا واقعہ ظاہر نہ ہو۔ سترہ دن کے انتظار اور تشویش کے بعد اکبر کابل سے وارد ہوتا ہے۔ ان مشوروں میں خواجہ حسین مروی بھی شریک ہے۔[2] تیسرے اور آخری مقام پر خواجہ اکبر کے دربار میں جہانگیر کے تولد کی تہنیت میں اپنا شاہکار قصیدہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے:

مصرعہ اول ز دو سال جلوس پادشاہ   از دوم مولود نور دیدہ عالم برآمد[3]

خواجہ کے علمی کمالات کے بارے میں بدایونی کی شہادت ہے: "در وادی سلاست شعر و انشا و صنایع و بدایع و حسن تقریر و فصاحت و بلاغت و ظرافت و لطافت بے نظیر بود۔"[4] ایسی ہستی سے اکتساب اور تلمذ کا ارمان کس کے دل میں نہ ہوگا۔ شیخ مبارک کے علم و فضل کی شہرت فیضی کے لئے خواجہ حسین کی خدمت میں رسائی کا وسیلہ بن گئی۔ خواجہ آخری بار ہندوستان سے جانے لگا تو شاگرد نے "دام ظلہ" سے تاریخ نکالی۔[5] خواجہ کا دیوان گوشہ گمنامی کی نذر ہو گیا۔ تذکروں میں شعر محفوظ ہیں۔[6]

جان من در دم آخر مرو از پیش نظر   نفسے باش کہ مارا بتو کار است ہنوز

ترجیع بند کے کچھ مصرعے ہیں:

ایام فراق زود رم افگند   از گلشن وصلت اے گل اندام
خوش آنکہ بدولت وصالت   یکبار دگر بر غم ایام
بنشینیم و با تو راز گوییم   غمہائے گذشتہ باز گوییم

شیخ تاج الدین دہلوی طبیعت کی زبردست انفرادیت اور جرأت اظہار کی وجہ سے قابل ذکر ہے جو فیضی کے حلقۂ احباب کا ایک

---

[1] اکبرنامہ: ص ۲۳۰ ج ۱   [2] اکبرنامہ: ص ۳۶۴ ج ۱   [3] اکبرنامہ: ص ۳۴۸ ج ۲
[4] منتخب: ص ۱۷۰ ج ۳   [5] ایضاً: ص ۱۷۸ ج ۳   [6] مخزن الغرائب خطی علی گڑھ ص ۲۰۴ ج ۲

خاص رکن تھا[1]۔ یہ شخص ابن العربی کے فلسفے کا نہایت گرم جوش حامی اور فصوص الحکم کا تقریباً حافظ شمار ہوتا تھا۔ محی الدین شیخ الاندلسی ابن العربی کے افکار مسلمانوں میں ہمیشہ اشتباہ کا باعث رہے ہیں۔ شیخ ایک جگہ فرعون کے ایمان کی بابت بحث کرتا ہے۔ روایتی مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلے میں شیخ کی رائے محل نظر ہے۔ شیخ کی حمایت اور صفائی کے طور پر مسئلہ مذکور کا لب لباب انتہائی سادہ لفظوں میں یوں ہو سکتا ہے: قرآن میں کئی جگہ عذاب شدید کے ضمن میں مثالی گنہگار کی حیثیت سے فرعون کے نام کا اعادہ ہوا ہے۔ فرعون بالآخر آدمی تھا۔ آدمی کا عمل محدود اور متناہی ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف رحمت خداوندی لامحدود اور لامتناہی ہے۔ شیخ ابن العربی اس بحث کو آگے بڑھا کر فرعون کے ایمان اور بخشش کی گنجائش نکالتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بعد کے اکثر مفکرین بالخصوص صوفیائے کرام کی توجہ کا مرکز بنتا رہا۔ اکبری دور میں اس موضوع کی حمایت کے لئے شیخ تاج الدین نے خاص شہرت پائی۔ کسی ستم ظریف نے "وکیل فرعون" کی پھبتی چست کی اور اسی لقب سے مشہور ہو گیا۔ یہ مباحثے اکثر فیضی کے گھر میں منعقد ہوتے تھے۔ اسی مکتب فکر کا ایک دوسرا شاعر جو تقریباً معاصر ہے، ساری دنیا کے گنہگاروں کو بخشوا دیتا ہے۔ منظر یہ ہے کہ قیامت میں فرشتے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کوئی گنہگار نہیں ملتا:

در محشر اگر لطف تو خیزد بشفاعت بسیار بگردند و گنہگار نیابند[2]

قاضی نوراللہ شوستری صاحب "مجالس المومنین" بھی ایک موقعے پر فیضی کی محفل میں رونق افروز نظر آتے ہیں۔ یہ بات بغیر کسی اصرار کے واضح ہے کہ "سواطع الالہام" کی تالیف میں ہر مسلک کے علماء سے تبادلۂ خیال کیا گیا۔ فیضی نے اس کام کی خاطر تمام معروف مفسرین کا مطالعہ کیا۔ اختلاف آراء کو ہر جگہ نظر میں رکھا۔ معاصر علماء سے ہر موضوع پر وضاحت اور معاونت طلب کی۔ غرضکہ مدتوں کی جاں فشانی کے بعد یہ کام اختتام کو پہنچا۔ بدایونی ایک ہنگامہ خیز مباحثے کی روئیداد بیان کرتا ہے۔ فیضی کے گھر میں ایک دن بہت سے علماء جمع تھے۔ تفسیر نیشاپوری درمیان میں رکھی ہوئی تھی۔ پیغمبر اسلام کی ہجرت اور غار میں پوشیدہ ہونا اور صحابیٔ صدیق کا گریہ اور آیۃ کا نزول، حاضرین میں گفتگو کا موضوع تھا۔ اس نکتے پر شیعہ اور سنی مفسرین میں نہایت باریک اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جلیل صحابی عشق رسول میں رویا اور وحی کا فرشتہ تسکین کے لئے نازل ہوا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تسکین کے لئے نہیں بلکہ تنبیہ کے لئے نازل ہوا۔ آیۃ کے تیور سخت ہیں اور انتباہ کا نمونہ ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے جہاں موقعے کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ سانس بھی سنبھال کر لیا جائے وہاں رونے کا کیا مطلب۔ آخر چاہتے کیا تھے۔ یہ مزیدار ہنگامہ فیضی کی چھت کے نیچے قاضی نوراللہ شوستری اور ملائے بدایونی وغیرہ کے درمیان دیر تک گرم رہا۔ بالآخر جب گرمیٔ محفل نے بہت طول کھینچا "مباحثہ بسیار شد" تو سب لوگ فیضی کی طرف متوجہ ہو کر بولے کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ فیضی نے شاید میزبانی کے آداب کا حق ادا کیا۔ ملا صاحب فرماتے ہیں: "شیخ فیضی با آنکہ از ہر دو جانب بیگانۂ مطلق بود، بنا بر عداوت زشت خویش جانب قاضی را گرفت"[3]۔

ہندی علوم اور سنسکرت زبان کے شغف کی وجہ سے فیضی کم، رابطہ جن ہندو عالموں سے قائم ہوا، ان میں راجہ بیربل کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ سنسکرت کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا کام دونوں کی کوشش سے عمل میں آیا۔ اکبر کا دارالترجمہ فیضی اور بیربل کی رفاقت کا شاہد ہے۔ سنسکرت کے مسلمان عالموں میں البیرونی اور امیر خسرو کے بعد فیضی کا نام آتا ہے۔ راجہ بیربل عوامی داستانوں میں داخل ہو کر عجیب شخصیت بن گیا ہے مگر وہ اپنی واقعی زندگی میں بھی کچھ کم عجیب و غریب نہ تھا۔ ہندوؤں کے قدیم علوم، فلسفہ، تہذیب اور تعلیمات بیربل کی ذات میں مجسم ہو کر اکبر کے دربار میں وارد ہوئے اور اپنا جائز منصب پایا۔ بیربل کا خطاب بادشاہ کی طرف سے عنایت ہوا۔ راجہ کا اصلی نام برہم داس تھا۔ بدایونی کی روایت پر اعتبار کیا جائے تو دو آدمی ایسے ہیں جن کی راتیں اکثر بادشاہ کے ساتھ ایک ہی لحاف میں گذریں۔ نقیب خاں اور راجہ بیربل۔ ملا محمد یزدی کو بھی یہ شرف ملا مگر بہت تھوڑے دن بعض راتوں

---

[1] منتخب: ص ۲۵۸ ج ۲ [2] ولی دشت بیاضی کا شعر ہے۔ ریاض الشعراء خطی علی گڑھ [3] منتخب: ص ۱۳۸ ج ۳

کا معمول یہ ہوتا تھا کہ راجہ نے کسی علمی موضوع پر اظہارِ خیال شروع کیا۔ بادشاہ کے سوالات نے گفتگو کے دائرے کو وسعت دی اور رات گذرتی گئی

بیربل کے کردار نے ہندوستانی سماج کی تاریخ کو کئی نکتوں پر متاثر کیا، کئی جگہ سے موڑا اور مستقبل میں پیدا ہونے والے کئی رجحانات کی واضح عکاسی اور تعمیں نشان دہی کی۔ جدید ہندوستان مسلسل تین چار صدیوں کے ارتقائی عمل اور طرح طرح کی الٹ پچھاڑ کے بعد بالآخر زندگی کی جن اچھی اقدار پر فخر کرتا ہے وہ قدریں جمی کی توانائی اور درستی پر کسی کو شک نہیں، ان کی تخلیق میں راجہ بیربل کا بہت بڑا نقش ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ اقدار حیات بیربل کے خوابوں کی حقیقت ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی کا مشہور مفکر حکیم سنائی غزنوی ایک نظم میں مختلف رمزیات کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ بعض عقاید و نظریات عوامی مقبولیت کے مرحلے تک صدیوں میں پہنچ پاتے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن[1]

اتفاق ایسا ہوا کہ راجہ کسی کام سے صوبہ سرحد کی طرف گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ بادشاہ نے انتظار کے مارے راتوں کو سونا چھوڑ دیا اور بچوں کی طرح روتا تھا۔ مسخروں نے خبر اڑا دی کہ راجہ جوگی ہو گیا ہے اور شرم کی وجہ سے دربار میں نہیں آتا۔ پہلے سے بات مشہور تھی کہ راجہ بڑا شرمیلا آدمی ہے۔ مغل حکومت کی اتنی بڑی دستگاہ و نربدا کے گھاٹ تک جوگیوں کی چھان بین اور راجہ کی تلاش میں لگ گئی۔ بدایونی نے اس موقعہ پر بادشاہ کی سہل القبول طبیعت اور طفلانہ سادگی کا سخت مذاق اڑایا ہے[2]۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ فریاد کس عالم میں ملک الشعرا کے دل سے نکلی:

اے ہمنفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

وقت آدمی کی شہرت کو دھندلا کر دیتا ہے۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کی شخصیت پر توجہ کئے بغیر عہدِ اکبری کی تاریخ کا مطالعہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ ہارون الرشید اور یحییٰ برمکی کے درمیان جو روابط تھے، وہی تعلق اکبر کی طبیعت پر ابوالفتح گیلانی کو حاصل تھا، کم از کم معاصرین میں یہی مثال مشہور تھی[3]۔ علمائے دین کو سخت شکوہ تھا کہ بادشاہ کو راہِ راست سے گمراہ کرنے میں یہ شخص بھی شامل ہے: "ناگاہ بیربل حرامزادہ و شیخ ابوالفضل و حکیم ابوالفتح قدم بالا تر نہادہ بادشاہ را از دین منحرف ساختند[4]"۔ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ صلح کل کے مسلک کی تشکیل میں حکیم کا ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔ اہم مسائل اور ضروری امور کے طے ہوتے وقت حکیم دارالوزرا میں موجود رہتا تھا[5]۔ پوری نسل کے ذہن پر حکیم کے علمی کمالات اور ندرتِ افکار کا سکہ جما تھا۔ ادبیات اور شاعری کے معاملے میں بھی حکیم کی جداگانہ نظر تھی۔ تقریباً ہر شاعر نے اس کی رائے سے استفادہ کیا ہے۔

ملک الشعرا کے گھر کو ہر شاعر کعبۂ امید سمجھتا تھا۔ جو آدمی بھی سخن سنجی کا تھوڑا بہت دعویٰ رکھتا تھا، اس کی آنکھ اسی گھر کی طرف لگی رہتی تھی۔ نزدیک و دور کا ہر شاعر اظہارِ ہنر کے لئے ملک الشعرا کی محفل میں نغمہ سرائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاہی دربار میں رسائی کا راستہ ملک الشعرا کی چھت کے نیچے سے ہو کر گزرتا تھا۔ ابوالفضل کی شہادت کے مطابق آنے جانے والے تو کس شمار میں "آئندہ و روندہ بسیار اند[6]" اہلِ سخن مستقل دربار سے وابستہ تھے ان کی تعداد سینکڑوں سے کم نہ تھی۔ کچھ دن کے لئے فیضی کو دکن کے حکمرانوں کے پاس سفیر کی حیثیت سے جانا پڑا۔ اس مسافرت میں بھی شاعروں کی ایک فوج ساتھ گئی۔ مثال کے طور پر یہ بتانے کے لئے کہ ملک الشعرا کی توجہ کس طرح شاعروں کے حال میں شریک اور ان کی ترقیوں کی ضامن رہتی تھی، فقط ایک شاعر کا تذکرہ کافی ہوگا۔ میر حیدر معمائی کاشان کا رہنے والا، رفیعی تخلص اور جیسا کہ لقب سے ظاہر ہے، فنِ معما کا ماہر اور معروف شاعر تھا۔ ایران سے آکر فیضی کا مہمان ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سواطع الالہام مکمل ہونے کے قریب تھی

---

[1] دیوان سنائی: ص ۲۸۷ مطبوعہ طہران
[2] منتخب: ص ۳۵۷ ج ۲
[3] ماثر رحیمی۔ جلد باقی نہاوندی، ص ۴۸ ج ۳ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
[4] منتخب: ص ۲۱۱ ج ۲
[5] اکبرنامہ
[6] آئین اکبری: ص ۳۲۱

شاعر نے اتمام تفسیر کی تاریخ نظم کی اور دو ہزار روپیہ انعام وصول کیا[1]۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے غلطی سے دو ہزار کی رقم کو "دہ ہزار" کر دیا ہے[2]۔ ایک دن فیضی نے گفتگو کے دوران میں کہا کہ ہندوستان میں اب معما کا فن مروج نہیں رہا آپ بھی خیر باد کہیں تو کیسا ہے۔ شاعر نے جواب دیا ہ بتقریب معما در ولایت سالہا تعب کشیدم اکنوں کہ دریں وادی پیر شدہ باشم خود را چگونہ ازآں می توانم گذرانید[3]۔ برسوں ہندوستان میں رہنے کے بعد جب رفیعی ایران واپس جا رہا تھا تو ہرمز کے نزدیک کشتی کو ضرر پہنچا اور مسافروں کا اثاثہ ضائع ہو گیا۔ بدایونی بڑی خوشی سے لکھتا ہے کہ جملہ اسباب میں "تفسیر مہمل فیضی" بھی غارت ہوئی۔ جس کی کچھ جلدیں رفیعی کاشی کے ہاتھ ایران کے علما کو تحفے میں بھیجنی مقصود تھیں۔ رفیعی کے چند اشعار جو معاصرین میں بہت مقبول تھے اور جن کو صاحب اکبر نامہ سے لگا کر بعد تک کے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے، شاعر کے رنگِ سخن کی پختگی کا پتہ دیتے ہیں: (۱) اے دوست دل کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ عاشق ہوں مگر مزاج معشوقانہ رکھتا ہوں، کیا علاج کروں (۲) عشق کے جذبے کی فراوانی اور فشار کا اثر ہے کہ ہلاک ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ محبوب سے سوال ہے کہ جب رفیعی کے مرنے کی خبر سنی تو تجھے کچھ غم بھی ہوا۔ (۳) رفیعی کے تابوت کے ہمراہ تجھے اہل عزا کی طرح جاتے ہوئے دیکھا اور بڑا رشک آیا۔

(۱)	نازک دلم اے دوست، علاجم چہ تواں کرد	من عاشقِ معشوق مزاجم چہ تواں کرد
(۲)	چوں شنیدی کز سر کویت رفیعی شد بخاک	ہیچ رفتی گریہ کردی عزائے داشتی
(۳)	من بتابوتِ رفیعی رشک بردم کہ تو	ہمرہش گریاں تر از اہل عزا می آمدی

اہل سخن کے اس ہجوم میں سب سے منفرد شخصیت اور انوکھے تیور کا شاعر جو ملک الشعرا کے گھر میں داخل ہوا صرف ایک ہی تھا۔ جس کی ہستی پوری انجمن کے لئے ایک نئی روشنی اور نیا اجالا لے کر آئی اور جس سے مل کر ابوالفضل نے کہا تھا کہ "شائستگی از ناصیۂ گفتارش می تابد[4]" اگر تاریخ بادشاہوں کی کہانی اور خاندانوں کے اُلٹ پھیر کے بجائے واقعی انسان کی پیشرفت اور عقاید کی تحریکوں کا نام ہے تو ہندوستان کی تاریخ میں عرفی شیرازی کا بھی ایک مقام ہے۔ دنیا کے کسی بھی معاشرے میں کبیر جیسی شخصیت خود بخود اور خواہ مخواہ پیدا نہیں ہو جاتی۔ عقاید کے نئے مظاہر اور ذہنی قوتوں کو وجود میں لانے کے لئے بے شمار مفکرین برسوں تک اپنی راتیں خونِ جگر جلا کر کاٹتے ہیں تب کہیں ان کے خوابوں کی تعبیر حقیقت میں بدلتی ہے:

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن کز پسِ مردن

مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

ہندوستان میں بھگتی کی تحریک پہلے سے موجود تھی مگر اکبری دور کے روشن فکر جن کا یہاں تذکرہ مقصود ہے، بھگتی کی تحریک سے ایک قدم ہٹ کر بالکل نئے راستے پر چلتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ بھگتی والے دینی عناصر کی ترکیب سے اخلاقی اور تہذیبی اقدار کا خمیر تیار کرتے ہیں۔ اکبری حلقے کے مفکرین دین کی بنیادی اہمیت سے قطع نظر اور مذہب سے کنارے طرفی انتیار کر کے تہذیبی اتصال وارتقا کی جستجو اور صلح کل کی تشکیل میں سرگرم ہیں۔ بھگتی کے حامی سراسر دینی تصوف میں بھیگا ہوا فکر پیش کرتے ہیں۔ عرفی اور فیضی وغیرہ کا رجحان اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ خالص دنیاوی اور غیر دینی نظامِ فکر نافذ کرنے کے امکانات پیدا کئے جائیں۔ وہ اپنے تصورات کی بنیاد ایسی مسلمہ اخلاقی اقدار پر قرار دیتے ہیں جن کا منبع الہام دینی عقاید کے اندر نہیں بلکہ عام انسانی تجربے کی گہرائی میں واقع ہے۔ یہ جماعت کافر و مومن کی بحث میں پڑنا اور دینی عقاید کے لزوم پر اصرار کرنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتی ہے۔

---

[1] نتائج الافکار، قدرت اللہ، ص ۳۳، مطبوعہ ناصری بمبئی۔
[2] منتخب: ص ۲۳۲ ج ۳
[3] خزانۂ عامرہ، آزاد بلگرامی ص ۲۳۲
[4] آئین اکبری ص ۳۰۵ مطبع نولکشور

عرفی صاف کہتا ہے کہ میں نے "ردو قبول" کی کشمکش سے اپنا دامن چھڑا لیا۔

من کجا کش مکش ردو قبولش زکجا ۔۔۔ نیک رفتم کہ نہ کافر نہ مسلماں رفتم

پائے کوباں بحرم رفتم و بیہم کردند ۔۔۔ بدر دیر مغاں ناصیہ کوباں رفتم

دوسری جگہ کہتا ہے کہ "ہفتاد و دو ملت" کی جنگ اور فریب بازی نے وہ گرد و غبار اُڑایا ہے کہ ہدایت کا راستہ نظر نہیں آتا اور کتاب سے معرفت لے حصول کی آرزو جاتی رہی:

ہدایتے کہ زتزویر اُمتاں عمناد ۔۔۔ امید معرفت آموزی از کتاب نماند

دینی مسلمات سے بے طرفی کے بعد نئے تہذیبی نظام کو وجود میں لانے کی کوشش خود ایک خطرناک کھیل تھا۔ اس کوشش کے خلاف جو ہنگامہ مچایا گیا اور جس نفرت کا طوفان کھڑا ہوا اس کا ذرا سا اندازہ ان خوشیوں سے لگا لیجئے جو عرفی کے یکایک مرجانے سے منائی گئیں۔ تاریخ وفات ہے "گفت عرفی جوانا مرگ شد" دوسری تاریخ ہے: "دشمنِ خدا"[1] عرفی دنیا سے گیا مگر اس کی بخشی ہوئی فکری اقدار ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص ذہنی سطح تک رسائی شرط ہے۔ اس سے بغیر وہ ایک دیوانہ شاعر بنتا ہے: (۱) کعبے کا طواف کرتے وقت کچھ آوازیں سنائی دیں۔ حرم کے رہنے والے اندر سے پکار کر کہہ رہے تھے کہ اے دیر مغاں کی بستی والو ہمارا اسلام ہم تم پر (۲) آئیے ان کا فتویٰ بھی سن لیجئے وہی لوگ جو شراب کو حرام کہتے تھے آج کیا کہہ رہے ہیں:

بطوفِ کعبہ شنیدم زساکنان حرم ۔۔۔ کہ اہلِ دیر مغان را سلام می گفتند

بیا ببیں کہ چہ فتویٰ دہند در مستی ۔۔۔ ہماں گروہ کہ مئے را حرام می گفتند

مندرجہ ذیل شعر اکثر ابوالکلام کی زبان پر رہتا تھا: دوست کا تصور رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ عشق کی فراوانی کا کرشمہ دیکھتے رہیئے اب ایک دوسرا "انا الحق" کہنے والا دار پر بلند ہوگا:

موبمویم دوست شد ترسم کہ استیلائی عشق ۔۔۔ یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد

(مسلسل)

---

[1] منتخب: ص ۲۷۵، ۲

قاضی عبدالقادر

شعری تجربہ

ایک فلسفیانہ تحلیل

شعر، افسانہ، بت، تصویر، سب ہی انسانی صناعی کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح کپڑا، وہ مشین جس پر کپڑا بنا جائے اور کارخانے، مصنوعات ہیں۔ لیکن ہم اپنے بچوں کو مصنوعات قرار نہیں دیتے۔ نسل انسانی نہ صنعت ہے نہ انسانی کارنامہ۔ گڑیا بنانا صنعت ہے، بچے کی پیدائش نہیں۔

لیکن جو فرق گڑیا اور بچے کی زندگی میں نظر آتا ہے، روایتاً ہمارے نقاد اسی فرق کو شعر اور "اچھے شعر" میں تمیز کرنے میں لاتے ہیں یہی صورت شاعری اور "اچھی شاعری"، نظم اور "اچھی نظم" کے فرق میں بتائی جاتی ہے۔ اچھی غزل یا مسلسل مجموعۂ اشعار میں جو نظم اور ربط نظر آتا ہے یہ نقاد اسے جیتی نظم و تنظیم سے تشبیہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جو تڑپ اور ہم آہنگی ایک جیتے جاگتے عضویہ اور اس کے اعضا میں نظر آتی ہے، وہی اچھی نظم میں موجود ہوتی ہے جبکہ یہ چیز نہ گڑیا میں ہے، نہ مشین اور اس کے کل پرزوں میں ہے اور نہ ہی معمولی کلام میں ــــ یعنی ایک نظم "نظم" ہونے کے باوجود "اچھی نظم" نہیں کہلائے گی تاوقتیکہ مختلف اشعار اور الفاظ کے درمیان وہ داخلی ہم آہنگی، وزن، روانی اور زندگی نہ ہو جو ایک عضویہ میں نظر آتی ہے۔ عام طور پر یہ فرق عبارت آرائی اور متخیلہ کے فرق سے واضح کیا جاتا ہے۔ روایتاً اس کے لئے ہم آورد اور آمد یا شعری تجربے کے سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ شعری صنعت (غزل، نظم، گیت وغیرہ) میں یہ فرق ہم شاعر کے مزاجِ شعری میں تلاش کریں یا شاعر کی نفسیاتی کیفیات کو سامنے لائے بغیر خود شعری صنعت میں اس اختلاف کی وجہ معلوم کریں؟ بالفاظ دیگر اگر ہمیں دو غزلوں (الف اور بے) کے بارے میں یہ حکم لگانا ہے کہ ان میں سے ایک "اچھی" غزل ہے اور دوسری معمولی، تو ہمارے پاس اس حکم کا کیا جواز ہوگا؟ آیا ان غزلوں کی باہمی جمالیاتی قدر کے بارے میں تصدیق غزل کہنے والوں کے اختلافِ مزاج و تجربہ کی بنیاد پر ہونی چاہیئے یا خود زیر بحث غزلوں کی داخلی ہیئت کے پیش نظر ہونی چاہیئے؟ یہ تقریباً اسی قسم کا فرق ہے جو ہمیں فلاطونی علمیات میں نظر آتا ہے جب وہ علم و ادراک میں تمیز کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ دراصل یہ فرق دو مختلف روحانی کیفیات کا فرق ہے جس میں ایک اعلیٰ تو دوسری ادنیٰ ہے اور کیفیاتِ روحانی میں یہ تمیز ان کے معروض کے فرق کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس بات سے کہ فلاطون اچھے دلائل دینے میں اکثر ناکام رہا اور یہ استدلالِ دوری کی مثال ہے نکتے کا مقصد یہ ہے کہ کیا یہی فرق ہمیں

(۱) آمد یا شعری تجربہ اور آورد میں کرنا چاہیئے؛

(۲) کیا اس قسم کا تجربہ ممکن ہے؛

(۳) اگر ایسا تجربہ ہوا ہو تو اسے کیسے بیان کیا جائے؛

(الف) آمد اور آورد کا فرق عام طور پر ایک شاعر کی دو شعری تخلیقات یا دو شعرا کی ایک ہی موضوع پر طبع آزمائی کی تحقیق کے بعد سامنے

لایا جاتا ہے۔"موازنہ انیس و دبیر" اسی قسم کی ایک کوشش ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ شبلی یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ ان دو میں سے ایک کو شعری تجربہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ یہ تقریباً اسی قسم کی تحقیق ہے کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دو میں سے کون اچھا موٹر ڈرائیور ہے ہم یہ معلوم کریں کہ پچھلے پندرہ سالوں میں کون کم حادثات سے دوچار ہوا۔ یہ ایک خالص تجربی تحقیق ہے۔"موازنہ انیس و دبیر" ایسی ہی تحقیق ہے۔ جہاں شعری صنعت کی ساخت اور ہئیت، الفاظ کے زیادہ یا کم استعمال وغیرہ کی جانچ پڑتال کے بعد دو شعرا کو ان کا شاعرانہ مقام دیا جا رہا ہے۔ یہاں خارج کا مشاہدہ کر کے داخل پر تصدیق لگائی جا رہی ہے۔ جیسے یہ جاننے کے لئے کہ ایک شخص اداس ہے،" اس کے ظاہری کردار اور حرکات و سکنات کا مطالعہ کیا جائے۔

لیکن تصویر کا یہ ایک رخ ہے۔ سائنس میں ہم حقائق سے غیر مشہود حقائق کی طرف آتے ہیں۔ سائنسی قوانین، فرضیہ، پیش فرضیہ، تحلیل نفسی کے تصورات اسی قبیل میں آتے ہیں۔ تحت الشعور، لاشعور ایسے تصورات ہیں جن سے غیر معمولی نفسی کردار کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ غیر معمولی نفسی اعمال تحت الشعور اور لاشعور کی توجیہہ نہیں۔ اسی طرح جوہری طبیعیات میں تحت جوہری ذرات کے تصورات پیچیدہ کیمیائی اعمال کی توجیہہ کے لئے قبول کئے جاتے ہیں۔ یا نیوٹنی طبیعیات میں تعلیل اور کوانٹم طبیعیات میں عدم تعلیل تصورات حقائق کی توجیہہ کے لئے استعمال اور قبول کئے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ شعری تجربہ کس قسم کا تصور ہے؟ کیا یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی توجیہہ کے لئے ہمیں حقائق ڈھونڈنے پڑیں گے؟ مثال کے طور پر اس تصور کی تصویب کے لئے کہ گھر میں سے کون کون سی قیمتی اشیا گم ہو گئی ہیں یا شعری تجربہ ایک حقیقت ہے کیونکہ مختلف شعری تخلیقات میں فرق نظر آتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہو گی کہ شعری تجربہ ایسا تصور ہے کہ جس کے بغیر ہم شعری تخلیقات کے بارے میں نہ حکم لگا سکیں گے نہ ان کی تخمین و قدر کا اندازہ کر سکیں گے یا مثال کی طور پر لاشعور ایک ایجابی تصور ہے ورنہ فاسد کردار کے بارے میں گفتگو نہ ہو سکے گی ـــــ میں سوال دہراتا ہوں:۔

شعری تجربے سے کیا مراد لی جائے؟

(۱) اس سے حقائق کی توجیہہ ہوتی ہے؟

یا (ب) اس کی حقائق سے توجیہہ ہوتی ہے؟

بالفاظ دیگر، شعری تجربہ اصول ہے یا واقعہ؟

ہمارے نقاد اسے اصول اور واقعہ، دونوں ہی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شعری تجربہ راست وجدان ہے جس کا اظہار ایک اچھی نظم میں ہوتا ہے۔"اچھا شعر خود کو کہلواتا ہے" یہ اکثر سننے میں آیا ہے۔ شعری تجربہ، یا وجدان خود اپنا معیار ہے۔ اسی انداز سے شعری تجربے کی تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرض کیجیے کہ نقاد اور شاعر دونوں ہی کے یہ بیانات صحیح ہیں اور یہ دریافت نہیں کرتے کہ معیار اور واقعہ کس طرح عین ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ سوال کرتے ہیں ـــ اگر شعری تجربہ واقعہ ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟

(ب) اپنے مخاطب سے یہ سننے پر کہ وہ شعر کہتے وقت سخت اختلاجی اور اعصابی کیفیات سے گذرتے ہیں، "داغ نے کہا تھا" آپ شعر کہتے نہیں جنتے ہیں"ـــــ فرض کیجیے یہ ایسے شخص کی روداد ہے جو آمد یا شعری تجربہ کا قائل ہے۔ اور اس وجہ سے قائل ہے کہ جب اس کے قلب کی دھڑکن تیز ہوتی ہے نبض تیز چلنے لگتی ہے، بھوک ختم ہو جاتی ہے، جسم میں لرزہ ہوتا ہے تو وہ ایک شعر کہہ لیتا ہے۔ اگر یہی کیفیت کچھ دیر اور رہے تو غزل مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جس طرح کہ ایک بچے کے جسم پر سرخ نشان اور آنکھوں میں پانی دیکھ کر کہیں کہ بچے کو خسرہ نکل رہی ہے یا خسرہ نکلنے والی ہے۔

بچے کی کیفیت دیکھ کر یہ کہنا کہ اس کے ساتھ کس قسم کا واقعہ پیش آنے والا ہے، ایک عملی تصدیق ہے۔ اگر یہ واقعات وقوع پذیر نہ ہوں تو ہم کہیں گے

کہ ہم نے غلط علائم پر نظر کی۔ بہرحال اطباء غلط تشخیص کرتے ہی ہیں لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر بچے کے خسرہ نکلے تو ان علائم کا کم و بیش موجود ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اب کیا ضروری ہے کہ شاعر شعر کہنے کے لئے ان اہتزازی کیفیات سے گذرے جن کی طرف داغ کے مخاطب نے اشارہ کیا تھا؟ کیا ہم ایک بند ش الفاظ کو شعر کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے اگر شاعر ان اعصابی تبدیلیوں سے دوچار نہ ہو؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر شعر کہنے کے لئے شعری تجربہ ضروری ہے اور شعری تجربہ عبارت ہے چند شدید اعصابی و اہتزازی کیفیات سے تو کیا ایک شعر شعر قرار دیئے جانے کا مستحق نہیں ہوگا اگر شاعر کو شعر کہتے وقت کسی قسم کی اعصابی تبدیلیوں کا تجربہ نہ ہوا ہو؟ اور یہ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر شعراء اس بات سے انکار کریں گے کہ شعر کہتے وقت وہ اس قسم کی جسمانی مصائب سے دوچار ہوتے ہیں جن کا تذکرہ داغ کے مخاطب نے کیا تھا۔ شعر گوئی اور اعصابی تغیرات کے کسی قریبی اور لازمی تعلق سے انکار ماہرین نفسیات و لسانیات بھی کریں گے۔ وہ یہ کہیں گے کہ شعر گوئی کے لئے اہتزازی کیفیات مکتفی نہیں جس طرح بچے کے جسم پر سرخ نشان اور آنکھوں میں پانی اس کے خسرہ نکلنے کی نہ علامت محض ہے نہ دلیل۔ اس کے لئے چند اور شرائط کا پورا ہونا بھی ضروری ہے —

شعر گوئی اور شعری تجربہ (یعنی عضویاتی تبدیلیوں) کی بھی یہی صورت ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعر گوئی یا شعری تنقید یا شعری تجربے کے لئے اعصابی تبدیلیاں اگر مکتفی نہیں تو کم از کم کل صورت حال کے تعین میں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو سوال کیا جائے گا کہ کیا یہ کیفیات کسی اور تجربے میں موجود نہیں ہوتیں؟ جب میں ملازمت کی غرض سے انٹرویو دیتا ہوں یا بغیر تیاری کے کسی امتحان میں شریک ہوتا ہوں تو کیا اس وقت میں اس قسم کی کیفیات سے دوچار نہیں ہوتا؟ یہ تو بہرحال ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ جب بھی ہم پر خوف و غم یا خوشی و انبساط کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس وقت ہم عضویاتی تبدیلیوں کا تجربہ کرتے ہیں مثلاً قلب کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، نبض کی رفتار میں تبدیلی آجاتی ہے اور یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی ہے جب ہم گھبراہٹ میں ممتحن کے سوالوں کا جواب دینا چاہتے ہیں اور معذور رہتے ہیں — یعنی اگر شعری تجربہ بعض اعصابی اور عضویاتی تبدیلیوں سے عبارت ہوتا ہے تو ہمارے اور بہت سے جذباتی تجربات بھی اسی سے مرقوم ہوتے ہیں اب کیا وجہ ہے کہ ایک صورت میں یہ عضویاتی تبدیلیاں مجھ سے شعر کہلواتی ہیں اور دوسری میں میں بات کرنے سے معذور رہتا ہوں یا امتحان میں جواب کی غرض سے ایک بھی جملہ صحیح نہیں لکھ پاتا۔

گویا جس طرح ان اہتزازی کیفیات کے تجربے کے بعد ایک فرد صحیح جواب نہیں دے سکتا، ایک شاعر ان عضویاتی تبدیلیوں کے تجربے کے بعد بھی شعر کہنے سے معذور رہ سکتا ہے۔ اگر شعر گوئی کے وقت یہ عضویاتی تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں تو دوسری صورتوں میں بھی موجود رہتی ہیں — عضویاتی تبدیلیوں کا ہونا یا نہ ہونا ایک اتفاقی امر ہے اور شعری تجربے کو اس میں محدود کرنا صحیح نہیں۔ غرضیکہ عضویاتی تغیرات اور اہتزازی کیفیات سے شعری تجربہ اگر تعبیر ہو تو یہ اس کے لئے نہ لازمی ہے اور نہ مکتفی۔

(ج) اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعری تجربہ ایک غیر عضویاتی واقعہ ہے جس میں شاعر داخلی طور پر ذہنی تصویروں اور تمثالات کو ترتیب دیتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اکثر شعراء نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے بعض نفسیئین نے بتایا ہے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر سوچ بچار کرتے وقت، ناول یا افسانہ لکھتے وقت، ماضی سے ذہنی تصویریں نکال کر لاتے ہیں اور قاری پڑھتے وقت اسی قسم کے تمثالات کا تجربہ کرتا ہے جس کا اظہار شاعر یا مصنف نے اپنے شعر یا افسانے میں کیا ہے۔ غالباً اس ضمن میں فیض کی نظم کا یہ مصرع مثال کی طور پر پیش کیا جائے گا:

"گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام"

اور کہا جائے گا کہ اس مصرعہ کو ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے اور اس کی شاعرانہ خوبیوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، جس کا تجربہ خود فیض کو ہوا تھا جس نے شفق دیکھی ہو، کیونکہ اس مصرعے میں ایک ایسے ہی تجربے کی تصویری بازیافت کی گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شعری تجربہ ان تمثالات کا ہو بہو اظہار یا بیانِ مکمل ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ایسے عام تجربات (جس میں فرد تمثالات کی بازیافت کرتا ہے) اور شعری تجربہ میں کیا فرق رہ جائے گا؟ یہ تو بہرحال صحیح ہے کہ ہم میں سے سب نہیں تو کم از کم نصف یا ایک چوتھائی اپنے گذرے ہوئے تجربات کی ذہنی بازیافت کرتے ہیں اور وہ ذہنی تصویر کشی کی صورت میں ہوتی ہے. مثال کی طور پر جب عدالت میں گواہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ وہی بیان کرے جو اُس نے دیکھا ہے اور اس کی تاکید کی جاتی ہے کہ صرف وہی کہے جس کا اس نے مشاہدہ کیا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کرکے گذرے ہوئے واقعات کی اس طرح تفصیل بتاتا ہے گویا کہ وہ اس وقت ایک فلم دیکھ رہا ہے اور ساتھ ہی اس کی روداد بھی ہم کو سنا رہا ہے اس شخص سے اگر پوچھا جائے کہ وہ یہ تفصیل کیونکر بتا رہا ہے تو امکان ہے، وہ یہ کہے کہ وہ "اپنی ذہن کی آنکھ" سے گذرے ہوئے واقعات کی ہو بہو تصویر کشی کر رہا ہے اور اسے بیان کرتا جا رہا ہے۔ اگر شعری تجربے میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے تو ایسے تجربات جس کا ذکر اوپر کیا گیا (جس میں فرد تمثالات کی بازیافت کرتا ہے) اور شعری تجربے میں کیا فرق رہ جائے گا —— جہاں تک تصویری بازیافت کا تعلق ہے، یہ کام ایک سچا گواہ بھی کر رہا ہے اور شاعر بھی انجام دے رہا ہے اور بہرحال عدالت میں دی گئی گواہی اور شعر میں فرق ہے الا یہ کہ گواہی بھی منظوم ہو جو عام طور پر نہیں ہوتی۔

شعراء اور ناقدین ہمیں بتاتے ہیں کہ شعری تجربہ "تصویری بازیافت" سے مختلف ہے۔ اس میں تمثالات کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ ان تمثالات کی ترتیب خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور اس سے شاعر یا ناقد غالباً اس قسم کا تجربہ مراد لیتے ہیں جس کا اظہار شاید ظفر اقبال کی اس "غزل" جیسے کلام میں ہوتا ہے ؎

سورج دریا میں گر رہا تھا ۔۔۔ میں دور سے چھپ کے دیکھتا تھا
پیڑوں پہ ہوئی تھی برف باری ۔۔۔ پتھر کا پہاڑ بج رہا تھا
بادل کی سیاہ سرزمیں پر ۔۔۔ بجلی کا درخت سا اُگا تھا
مچھلی باہر گئی ہوئی تھی ۔۔۔ پانی کا مکان بے صدا تھا
دھڑکی تھی رات کی خموشی ۔۔۔ تانگہ دروازے پر رکا تھا

(فنون شمارہ ۳، فروری ۱۹۶۴ء)

ظاہر ہے شاعر یہاں عدالت میں بیان دیتے ہوئے گواہ کی طرح اپنے تجربات کی نہ ہو بہو تصویر کشی کر رہا ہے، نہ ہی یہاں کسی قسم کے تمثالات کا بیانِ محض ہو رہا ہے، بلکہ تمثالات، یا ذہنی تصویروں کو "انوکھے" انداز سے ترتیب دیا جا رہا ہے ورنہ "پتھر کا پہاڑ بج رہا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟

(ا) لیکن کیا شعری تجربہ تمثالات اور ذہنی تصویروں کے ترتیبی عمل کا نام ہے؟

یا (ب) شعری تجربہ اس ترتیبی عمل کا تجربہ ہے؟

اور آخر میں (ج) شعری تجربہ چاہے جن معنی میں مراد ہو، کیا اس کے لئے تمثالات اور ذہنی تصویریں ضروری ہیں؟

اگر ہم نے آخری سوال کا صحیح جواب دے دیا تو دوسرے سوال خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اس امر پر یقیناً شک کیا جا سکتا ہے کہ شعر گوئی یا کسی بھی "ذہنی عمل" کے تمثالات لازمی یا ملتفی ہوں، شعر گوئی یا شعر فہمی کے لئے تمثالات کا ناگزیر قرار دیا جانا انفرادی نفسیاتی زندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ ہم توقع کرتے ہیں کہ سب ہی سوچتے وقت یا ماضی کو یاد کرتے وقت ذہنی تصویروں میں کھیلتے ہیں لیکن یہ واقعہ نہیں کہ فی الواقع ہم سب ذہنی تصویریں بنا سکیں۔ بعض افراد باوجود ہزار کوشش کے کسی قسم کی ذہنی تصویریں بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ گویا یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ ایک آدمی جو غور و فکر کرتا ہو اس کا بھی اہل ہو کہ وہ ذہنی تصویریں بنا سکے، اور اسی سبب سے شعری تجربہ، شعر گوئی

اور شعر فہمی کے لئے یہ کہا جائے گا کہ ان حالات میں بھی تمثالات کا پایا جانا لازمی اور ضروری نہیں — اس کا قطعی امکان ہے کہ ایک شاعر بغیر کسی قسم کی ذہنی تصویر قائم کئے نہایت عمدہ شعر کہے جس طرح اکثر مصور بغیر تمثالات کی مدد کے حسین ترین تصویریں بناتے ہیں۔ اور اگر یہ صورت ہے تو پھر یہ دریافت کرنا کہ شعری تجربہ تمثالات کا ترتیب دینا ہے یا اس ترتیبی عمل کا تجربہ ہے ولیعنی سی بات قرار پاتی ہے۔ غرضیکہ شعری تجربہ مخصوص قسم کی عضویاتی تبدیلیوں کا تجربہ نہیں اور نہ ہی تمثالات کا ترتیب دینا یا اس ترتیب کا ہی تجربہ قرار پاتا ہے۔

(ح) شعری تجربے کے بیان اور تعریف کی آخری کوشش اسے ایک بے ہمہ واقعہ، تجربہ یا انتہائی بسیط وجدان قرار دیتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شعری تجربہ نہ عضویاتی تبدیلیوں سے عبارت ہے نہ تمثالات کی ترتیب کا نام ہے بلکہ یہ ایک نہایت بے ہمہ تجربہ ہے جسے کسی پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک اس قدر فراری ہے کہ ہم اسے ذہنی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ اور اسی سبب سے ہر شخص اس کی فہم و تمیز کا اہل نہیں۔ صرف وہی اس کے بارے میں تصدیق کر سکتے ہیں جنھیں یہ تجربہ ہوا ہو۔ ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہر وجدان اپنے معروض پر دلالت کرتا ہے۔ ہر تجربے کا ایک معروض ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی بے ہمہ شعری حقیقت ہے جو شعری تجربے کی مختلف مثالوں میں مشترک رہتی ہے اور وہ کون سی شعری حقیقت ہے جس کا تجربہ شعری تجربہ کہلاتا ہے؟

فرض کیجئے کہ ہمیں اس کا یہ جواب ملتا ہے کہ شعری تجربہ اور اس کے معروض میں تمیز ممکن نہیں — یا شعری تجربہ خود اپنا معروض ہے۔ اب یہ کہنا کس حد تک صحیح ہوگا کہ ایک شعر یا نظم جس کا مجموعی تاثر اداسی یا خوشگواری لئے ہوئے ہو اداس تجربے یا خوشگوار تجربے کا مظہر ہے؟ ہمیں بہر حال اداسی کا تجربہ ہوتا ہے، خوشگواری کا تجربہ ہوتا ہے لیکن یہ کہنا صریحاً زبان اور منطق کے اصولوں سے دور ہو جانا ہوگا اگر ہم کہیں کہ ایک تجربہ خوشگوار ہے یا اداس ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ شعری تجربے کا معروض شعری تجربہ ہے، لایعنی بات ہے۔

شعری تجربے کے اس بے ہمہ پن کا ذکر کرتے ہوئے، آخر میں جو بات سامنے آتی ہے یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص تجربہ ہے جو خود شاعر کو ہو سکتا ہے لیکن اس تک رسائی آسان نہیں۔ اور اگر مختلف افراد کو یہ تجربہ ہوا بھی ہو تو بھی اس کا بیان ممکن نہیں — اس قسم کی باتوں سے شعری تجربے کو ہم چاہے ایک نہایت ہی پرفسوں حقیقت بنا دیں لیکن اس سے اس کو سمجھنے میں ہمیں مدد نہیں ملتی۔ اگر شعری تجربہ واقعہ ہے۔ تو پھر اس کا بیان ممکن ہونا چاہیئے۔ آپ مکمل بیان نہ بھی دے سکیں تو بھی اگر اسے موضوعِ گفتگو بنائیں تو یہ گفتگو قابلِ فہم ہونی چاہیئے۔

اگر شعری تجربہ واقعہ نہیں بلکہ ایک تصور ہے تو پھر اس کی مناسب صحیح اور منطقی تعریف ہونی چاہیئے اور اگر ہم نہ تعریف کر پائیں اور نہ ہی "شعری تجربہ" کو بیان کر پائیں تو اس کے بارے میں کسی قسم کی معقول یا قابلِ فہم گفتگو بھی نہیں ہو سکے گی۔

ہم نے ان خطوط کی نشاندہی کی کوشش کی ہے جن کی حدود میں "شعری تجربے" کے بارے میں معقول گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایسی ساری کوششیں منطقی مغالطات سے پاک نہیں — غرضیکہ مروج منطقی خاکوں اور لسانی ڈھانچے میں یہ ممکن نہیں کہ "شعری تجربے" کے بارے میں کوئی معقول بات کہی جا سکے، ہمارے سامنے اب صرف دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہم اس لفظ کو اپنی تنقید سے خارج کر دیں اور شعر و ادب کی گفتگو میں اس لفظ کو استعمال نہ کریں یا پھر اس کو بیان کرنے کے لئے نئے وسائل وضع کریں۔ اپنی موجودہ صورت میں شعری تجربہ ایک بے معنی لفظ ہے۔

مسیح الزماں

برِیخت کا ایپک تھیٹر

ادب اور فن کی دنیا میں بت بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں، عقائد، تصورات، خیالات اور نظریات، انسانی ذہن و احساس میں برسات کے گھنیرے بادلوں کی طرح شکلیں بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ ان شکلوں کی مدتِ حیات یکساں نہیں ہوتی۔ اپنے تراشنے والوں کے درکِ حیات کے مطابق ان کی پرستش بھی ہوتی ہے اور فرماں روائی بھی۔ فکرِ انسانی کا کاروان شکست و تعمیر، کلیم و سومناتھ، نیوٹن اور گلیلیو کی روایت پر آگے بڑھتا ہے۔ اس کی راہ میں نہ بے ستون حائل ہوتے ہیں نہ Inquisition کی آگ ان کے قدم روکتی ہے، عقائد مجروح ہوتے ہیں بنے بنائے تصورات بکھر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ زندگی کے بڑھتے ہوئے شعور کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ بیسویں صدی نے بہت سے پرانے بت توڑے اور ان کی جگہ نئے صنم کدے آباد کئے ہیں۔ ان نئے صنم تراشوں میں جرمن ڈراما نگار اور پروڈیوسر برتول بریخت Bertolt Brecht (۱۸۹۸-۱۹۵۶ء) بھی ممتاز شخصیت رکھتا ہے۔

یوں تو ڈرامے کے ڈھائی ہزار سال کی تاریخ میں کتنی ہی تحریکیں ابھریں، مروج ہوئیں اور وقت کے گرد و باد میں دب کر رہ گئیں لیکن ارسطو کے ڈرامائی نظریات کو بریخت کے خیالات نے جو دھچکا پہنچایا اس نے صدیوں کی مسلمہ روایات کی بنیادیں ہلا دیں اور عالمی ڈراما اور اسٹیج میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس انقلاب کی نوعیت سمجھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ کرنے کے لئے ایک پس منظر یا تمہید کی ضرورت ہے۔ لیکن اس تمہید سے پہلے یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ بریخت پر اپنے پہلے کی کئی قسم کی ڈرامائی روایتوں اور طرزِ فکر کا اثر تھا جسے اس نے ہمیشہ تسلیم کیا۔ ڈرامے اور اسٹیج کی ان روایتوں کو اپنے تجربہ اور فکر کی آنچ میں گلا کر بریخت نے ایک تخلیقی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی آواز میں ایک مبلغ کے جوش کے ساتھ ساتھ اعتماد اور خلوصِ نیت کی جھنکار ہے جس کی بنا پر لوگ اس کے نظریات کو نیا اور انقلابی سمجھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں واقعیت پسند اسٹیج نے عروج حاصل کیا۔ اس کے پہلے روشنی کے جدید کرشموں اور اسٹیج کی سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہدایت کار کا یہ مقصد نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسٹیج پر فریبِ حقیقت (Illusion of Reality) پیش کرے، یعنی جو مناظر ڈرامے میں دکھائے انھیں دیکھ کر ناظرین کو یہ دھوکا ہو کہ یہ واقعات سچ مچ پیش آ رہے ہیں۔ واقعیت پسند اسٹیج نے بجلی کے کرشموں اور اسٹیجی مشینوں کی مدد سے ڈراموں میں فریبِ حقیقت کی وہ طرح ڈالی جس میں اداکار ناظرین سے بالکل غافل زندگی کے کچھ پہلو پیش کرتے تھے اور ناظرین گویا کمرے کی چوتھی دیوار ہٹا کر ان کی زندگی میں جھانکتے رہتے تھے۔ یہ واقعیت پسند اسٹیج ایسا عالمگیر انداز سے مروج و مسلم ہو گیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں استانسلاوسکی (Stanislavski) وغیرہ کے ہاتھوں اس نے وہ بلندیاں حاصل کیں کہ یہ سمجھا گیا کہ اس کے پہلے کی صدیوں پرانی روایتیں تھیٹر سے رخصت ہو گئیں۔

بریخت نے جب آنکھیں کھولیں تو اسے جرمنی میں ایسی فضا نظر آئی جو سرمایہ داری اور فسطائیت کے جلوے دکھا رہی تھی۔ تنگ نظر قوم پرستی، دولت کو زندگی کی سب سے بڑی قدر سمجھنا، طاقت کا غرور وہ چیزیں تھیں جن کی وجہ سے بالآخر جرمنی کو پہلی جنگ عظیم میں چھلانگ لگا دینا پڑی۔ جنگ کے بعد اس کے نتائج اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ نے بریخت کو اس نظام سے بددل کر دیا اور اس نے سامراج شاہی کے خلاف ایک ڈرامہ لکھا جس میں ایک نیک مزاج، صلح پسند آدمی، سامراجی فوج میں بھرتی ہو کر جنگجو اور خونخوار ہو جاتا ہے۔ انقلاب روس نے سرمایہ داری اور فسطائیت کی نئی لہر یورپ میں دوڑا دی تھی۔ چنانچہ بریخت نے بھی اشتراکی تحریک سے ہم نوا ہو کر سماجی اصلاح کو فن کی بنیاد بنایا اور رفتہ رفتہ اصلاح کا تصور انقلاب سے مل گیا۔

واقعیت پسند اسٹیج (سرابی اسٹیج) میں حقیقی زندگی کی مماثلت اور جدید اسٹیجی مشینوں کے استعمال سے ایک ایسی فضا پیدا کر دی جاتی ہے جس پر ناظرین دنگ رہ جاتے ہیں۔ کردار زندگی کے جن مرحلوں سے دوچار ہوتے ہیں جن تجربات سے گزرتے ہیں دیکھنے والے بھی ان سے جذباتی ہم آہنگی پیدا کر کے کم و بیش وہی جذبات اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ ہیروئن کی بے چینی اور تڑپ خود انھیں بھی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہے اور ہیرو کی کامرانی سے ان کے چہرے بھی مسکرانے لگتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے ہیں، جو المیہ میں ہیرو یا ہیروئن کو مرتا دیکھ کر خود بھی آنسو بہانے لگتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا ناظر ہو جو ایک کامیاب المیہ کی پیش کش دیکھ کر ہال سے غم زدہ اور متاثر نہ نکلے۔ ڈرامے کے اسی پہلو کو ارسطو نے تزکیۂ نفس (Katharsis) قرار دیا تھا۔ یعنی اسٹیج پر گزرنے والے واقعات کو دیکھ کر ناظر پر جو غم والم کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اس کے ذاتی جذباتی تناؤ یعنی زندگی کے مسائل سے ذہن پر چھائی ہوئی الجھنوں کی بھڑاس نکال دیتی ہے اور وہ اس تناؤ کے ختم یا کم ہو جانے کے بعد زندگی کے معمولات میں حصہ لینے کے لئے ایک طرح سے تازہ دم اور سماج کے لیئے بے ضرر ہو جاتا ہے۔ قدیم یونان کے کھلے ہوئے نیم دائرے کے تھیٹر سے لے کر اسٹانسلافسکی کے واقعیت پسند چوکھٹے بکس سیٹ تک اسٹیج اور تھیٹر نے بہت سی شکلیں بدلیں اور پیش کش، اداکاری، سجاوٹ کے نئے نئے نظریے سامنے آئے لیکن ڈرامے کے اس بنیادی مقصد سے کسی نے انکار نہیں کیا، بلکہ سب اسی مقصد کو حاصل کرنے، ناظرین کو اسٹیج پر پیش ہونے والے واقعات کی اصلیت کا زیادہ سے زیادہ یقین دلانے اور انھیں ڈرامائی کرداروں کے جذبات سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنے اپنے نظریے پیش کرتے رہے۔ گویا تزکیۂ نفس کا خیال دو ہزار سال سے زیادہ تھیٹر کی دنیا میں ایک مسلمہ حقیقت کی طرح مانا جاتا رہا۔ بریخت نے اس مسلمہ اصول پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی بنیادیں لرز گئیں اور ڈرامے میں فطرت پسندی یا واقعیت کے بجائے اشتراکی حقیقت نگاری کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ڈرامے کے کرداروں کے ساتھ ناظرین کی جذباتی ہم آہنگی بریخت کے نزدیک فن کی بلندی نہیں بلکہ پستی ہے۔ سرابی اسٹیج حقیقی زندگی کا فریب دے کر دیکھنے والوں کو ڈرامے کے عمل میں شریک کر لیتا ہے اور اس طرح ان کی اپنی انفرادیت زائل کر دیتا ہے۔ ایسا ڈرامہ دیکھ کر تھیٹر ہال سے باہر نکلنے والا رنجیدہ یا مسرور نکل سکتا ہے لیکن ذہنی بالیدگی یا وسعتِ نظر لے کر نہیں نکل سکتا۔ ایسا ڈرامہ ایک اچھی دعوت کی طرح ہے جس سے آدمی مسرور و مطمئن واپس آتا ہے لیکن فن کے مطالبات ایسی تسکین سے بڑھ کر کچھ اور چاہتے ہیں۔

بریخت کا خیال ہے کہ جب آدمی کے جذبات ابھار دیئے جاتے ہیں تو اس کی غور و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں، وہ جذبات کی رو میں بہہ کر صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور ڈرامے کی سماجی اہمیت اور ڈراموں پر سنجیدہ تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے ڈرامے کی افادیت برقرار رکھنے کے لیئے ضروری ہے کہ ناظرین کے جذبات کو برانگیختہ ہونے سے روکا جائے اور انھیں ان مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا جائے جو ڈرامہ کا موضوع ہیں۔ اس کے لیئے سب سے پہلے فریب حقیقت پیدا کر دینے کے جذبے ہی کو ختم کر دینا ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ناظرین کو برابر اس کا احساس دلایا جاتا رہے کہ وہ اسٹیج پر اسی لمحہ ہونے والی زندگی کے کچھ واقعات نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ وہ ایک تھیٹر میں بیٹھے ہیں، اور ایسے واقعات کی نقل

دیکھ رہے ہیں جو ماضی میں پیش آ چکے ہیں۔ ڈرامہ نگار یا پروڈیوسر کو یہ مدنظر رکھنا چاہئیے کہ ناظر ڈرامے کے کرداروں میں کسی ایک کے ساتھ جذباتی ہم آہنگی پیدا کر کے اپنی تجزیاتی صلاحیت۔ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے، بلکہ اسے ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیے کہ دیکھنے والا ڈرامے کے واقعات اور کرداروں سے اپنے کو الگ اور بے تعلق رکھے۔ بریخت کا یہ نظریہ بے تعلقی (Alienation) کا نظریہ کہلاتا ہے اور اس کی بنیاد پر اس نے ڈراموں کی جو طرح ڈالی اسے ایپک تھیٹر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس غیر ارسطوی تھیٹر کے اصول بریخت نے ۱۹۳۱ء میں اس طرح گنائے تھے جنھیں ہم مسلمہ ڈرامائی اصول کے ساتھ ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ دونوں کا فرق واضح ہو جائے:

ارسطوی تھیٹر کے اصول	ایپک تھیٹر کے اصول
۱۔ عملی	۱۔ بیانیہ
۲۔ ناظر کو اسٹیج کے عمل میں شریک کر لیتا ہے اور	۲۔ ناظر کو تماشائی کی حیثیت سے رکھتا ہے لیکن
۳۔ اس کی قوت عمل اور جذبۂ عمل صرف کر دیتا ہے	۳۔ اس کے جذبۂ عمل کو بیدار کر دیتا ہے
۴۔ ناظر کے احساسات کو متحرک کرتا ہے اور اسے جذباتی تجربے سے دوچار کرتا ہے۔	۴۔ ناظر کی قوت فیصلہ کو ابھارتا ہے اور اسے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیتا ہے
۵۔ ناظر کرداروں کے ساتھ مسائل میں کھو جاتا ہے	۵۔ ناظر کے سامنے مسائل حیات سوال بن کر آتے ہیں۔
۶۔ ڈراما مسائل کے کسی مخصوص حل کی طرف اشارہ کرتا ہے	۶۔ ڈراما مسائل کے حل کی دلیلیں پیش کرتا ہے۔
۷۔ تشویش قصہ کے انجام تک رہتی ہے اور ایک منظر دوسرے منظر سے مربوط اور اس پر منحصر ہوتا ہے پلاٹ کی ترقی سلسلہ وار واقعات سے ہوتی ہے۔	۷۔ تشویش انجام پر نہیں بلکہ سلسلہ پیش کش میں ہوتی ہے اور ہر منظر بجائے خود اپنی حیثیت رکھتا ہے پلاٹ کے لیے مون تاژ Montage کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے
۸۔ خیال سماجی روح کی تشکیل کرتا ہے	۸۔ سماجی روح خیال کی تشکیل کرتی ہے۔
۹۔ جذبہ یا احساس ڈرامے کی روح رواں ہے	۹۔ دلیل یا عقلیت ڈرامے کی روح رواں ہے۔
۱۰۔ تقدیر پرستی یا آدمی حالات کا اسیر	۱۰۔ آدمی قادر و مختار

بریخت نے ڈرامے میں جذبات کی جو مخالفت کی اس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ ڈرامے کو جذبات سے یکسر خالی رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ بعد کو اس نے اس کی وضاحت کی کہ جذبات تو انسانی زندگی کا لازمی جز ہیں اور زندگی کی پیش کش میں ان کا ظاہر ہونا ضروری ہے لیکن وہ ایسے ڈرامے یا ایسی پیش کش کا مخالف ہے جو ناظرین کو جذبات کی رو میں بہا کر ان کی ذہنی انفرادیت، ان کی سوچنے سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم کر دے۔ اور وہ مسائل حیات پر خود رائے قائم کرنے کے بجائے ڈراما نگار کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگیں۔

بریخت کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ طریقے بتا دیئے جائیں جن پر عمل کر کے ایپک تھیٹر مندرجہ بالا مقاصد حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ بریخت نے خود بھی لکھا ہے، ایپک تھیٹر ارسطوی تھیٹر کی ضد نہیں بلکہ ان کا اختلاف بڑی حد تک نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ ایک میں ڈرامے کے جن پہلوؤں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے دوسرے میں ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دوسرے پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ ناظرین کو ڈرامے سے بے تعلق کرنے کے لئے بریخت اسٹیج پر بہت تیز روشنیاں رکھتا تھا اور ان کا مخرج ناظرین سے پوشیدہ نہیں رکھتا تھا۔ اندھیرے یا رات کے مناظر پیش کرنے میں بھی

روشنیاں تیز رہتی تھیں تاکہ ناظر کم روشنی کی وجہ سے اونگھ کر جذباتیت کی دنیا میں نہ چلا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ جب کشتی کے مقابلے میں ناظرین روشنی کے مخرج کو پوشیدہ نہیں دیکھنا چاہتے تو اسٹیج پر روشنی چھپے ہوئے ذریعوں سے کیوں آئے۔ اسی طرح پس منظر کی موسیقی کے لئے جو گراموفون استعمال کیا جاتا تھا وہ بھی ناظرین سے پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔ اداکاروں کے نام اور تصویریں پیچھے کے پردوں پر منعکس کر دی جاتی تھیں تاکہ لوگ اداکاروں کو اصلی شکل میں بھی دیکھ لیں اور ڈرامے کے دوران میں یہ محسوس کر سکیں کہ یہ اداکار اسٹیج پر اپنا پارٹ کر رہا ہے اور اس کی اصل شخصیت اس سے الگ ہے جو اس وقت پیش کی جا رہی ہے۔

ایک تھیٹر میں گاہے گاہے ایک کردار جسے منتظم یا پیش کار کہا جا سکتا ہے۔ اسٹیج پر آکر ناظرین سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے اور ڈرامے کے بارے میں کچھ کہتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں کورس کے گانے بھی رکھے جاتے ہیں جو اسٹیج کے ایک کنارے گا گا کر مختلف مناظر کے بارے میں کچھ کہتے رہتے ہیں کبھی کبھی بعض کردار بھی اپنے پارٹ سے الگ ہو کر ناظرین سے کچھ کہنے لگتے ہیں۔ بریخت کی رائج کی ہوئی اداکاری کا بھی بنیادی اصول یہ ہے کہ فقیر کا پارٹ کرنے والے کو خود اپنے کو فقیر محسوس نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بات مدنظر رکھنا چاہئے کہ وہ صرف فقیر کا پارٹ کر رہا ہے یعنی کسی دوسرے شخص کے ان افعال و حرکات کو پیش کر رہا ہے جو پہلے کبھی واقع ہو چکے ہیں۔ اداکار کو ناظرین کی طرح اپنے کردار سے ایک طرح کی دوری اور بے تعلقی قائم رکھنی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب ایک اداکار سہراب کا پارٹ کر رہا ہو تو اس میں وہ ولولہ نہیں ہونا چاہیئے جو اس کردار کا تقاضا ہے۔ اداکار کا فرض ہے کہ جس کردار کا پارٹ کرے اسے پوری طرح دکھائے لیکن اس کردار کے پیش کرنے میں اس کو ان محسوسات اور جذباتی تجربات سے نہیں گزرنا چاہیئے جن سے اصل کردار گزرا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی اداکاری ایسی ہونا چاہیئے کہ دیکھنے والے کہیں کہ فلاں نے سہراب یا گردآفرید یا اوتھیلو کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا مگر یہ نہ کہیں کہ وہ سچ مچ سہراب یا گردآفرید یا اوتھیلو معلوم ہوتا تھا یعنی اداکار کا مقصد ایک دوسرے آدمی کے حرکات اور جذبات کو پیش کرنا ہے۔ اس طرز اداکاری کو پیش کرنے کے لئے بریخت نے بہت سے طریقے استعمال کئے۔ مثلاً ریہرسل کے دوران میں اداکاروں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مکالمے کو صیغۂ واحد متکلم میں بولنے کے بجائے واحد غائب میں بولیں اور مکالمہ بولنے کے پہلے "اس نے کہا" یا اسی قسم کا کوئی فقرہ لگا لیں یا مکالمے کے ساتھ جو ہدایتیں لکھی رہتی ہیں وہ بھی بولتے رہیں۔ اداکاروں کے چہروں پر چہروں (mask) کا استعمال بھی اس نے اسی مقصد سے کیا۔

ممکن ہے جو لوگ ایپک تھیٹر کے نئے انداز اور اس کے اثرات سے روشناس نہیں ہیں انہیں یہ جدتیں محض ایجاد بندہ نظر آئیں لیکن اپنے ڈراموں خصوصاً "ماں"، "گلیلیو"، "جس نے ہاں کہا"، "جس نے نہیں کہا"، "اور ست ژواں کی نیک عورت" میں بریخت نے ان طریقوں سے کام لے کر جس ڈرامائی قوت کا مظاہرہ کیا اس نے ساری دنیا میں تھیٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ بریخت کی ڈرامائی بے تعلقی کا تصور صرف پیش کش اور اداکاری سے متعلق نہیں بلکہ ڈرامے کی ساخت سے بھی اس کا گہرا رشتہ ہے اور اس کی اصلی بنیاد وہیں پڑتی ہے۔ کبھی ایک ہی منظر دو بار ہوتا ہے اور ان میں بہت معمولی فرق ہوتا ہے کبھی ایک کردار ایک گزشتہ واقعہ کا حوالہ دے کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ واقعہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے ناظرین جذباتی ہم آہنگی سے بچے رہتے ہیں۔

بریخت کے کردار ناظرین کی موجودگی سے بے خبر نہیں ہوتے اس لیے وہ اپنے مکالموں میں خوبصورتی سے ایسے فقرے یا جملے نہیں ادا کرتے جن سے ان کے آپس کے تعلقات ناظرین پر ایسے واضح ہو جائیں جیسے ان کو بتائے نہیں گئے۔ "ماں"، "تھری پنی اوپرا"، "اور ست ژواں کی نیک عورت" میں ڈرامے کے آغاز ہی میں کردار ناظرین سے اپنے مسائل بیان کر کے اپنا تعارف کرا دیتے ہیں۔ "سفید کنڈلی" میں ایک راوی اسٹیج کے کنارے بیٹھا ہوا

تمام ضروری واقعات ناظرین کو بتا دیا جاتا ہے۔ بیشتر ڈرامے ایسے ہیں جن میں بیچ بیچ میں گانوں کے ذریعہ گزرے ہوئے واقعات پر تبصرہ اور آئندہ کے واقعات کا اشارہ کیا جاتا ہے۔ غرض ان تمام طریقوں سے بے تعلقی کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

بے تعلقی کی حالت پیدا کرنے کے لئے بریخت کے نزدیک کسی مخصوص تکنیک کا استعمال کرنا ضروری نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کی ایک عام حالت کا شعور پیدا کرانا ہے۔ یہ شعور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک چیز کو سمجھانے کے لئے اس کی عام، مانوس حالت سے بدل کر ایک غیر معمولی حالت میں پیش کر دیا جائے۔ ایک طرح سے بالکل سامنے کی واضح چیز کو اس لئے مبہم بنا کر دکھایا جائے کہ وہ اور زیادہ واضح ہو جائے۔ روزمرہ زندگی میں سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ آدمی کو اس بات کا احساس کہ اس کی ماں کسی کی بیوی بھی ہے اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کر لیتی ہے۔ یا فرض کرو موٹر کار کے نئے ماڈل کا چلانے والا کسی پرانے فورڈ پر جا بیٹھے اور اس کے انجن کی پھٹ پھٹ اور انداز رفتار کو دیکھ کر موٹر کے ایک عجیب اور مختلف مشین ہونے کا احساس کرے۔

ایپک ڈرامے کی ساخت ڈھیلی ڈھالی سی انداز کی ہوتی ہے جس میں مختلف واقعات ایک سلسلے میں جڑے ضرور ہوتے ہیں لیکن ارسطوئی طرز کے ڈراموں کی طرح ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ نہ مربوط ہوتا ہے نہ اس کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اس میں نہ تو جذبے کو ابھارنے کا مقصد رہتا ہے اور نہ ڈرامے کے ارتقاء کو مختلف واقعات سے اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کا پلاٹ مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم رہتا ہے۔ ڈرامے کا اثر آپس میں ایک دوسرے کے مخالف حالات اور واقعات کو سمونے اور ان کے مونتاج (Montage) سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ارسطوئی ڈراما مکمل حالت ہی میں سمجھا جا سکتا ہے لیکن بریختی ڈراما چھوٹے چھوٹے حصوں (اکائیوں) میں ہونے کی وجہ سے جستہ جستہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اور اثر لیا جا سکتا ہے جیسے ایک لمبی ایپک کے مختلف حصوں سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال چین کے کلاسیکی ڈراموں میں بھی ملتی ہے جس کے لمبے لمبے ناٹک کئی مختصر ناٹکوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یونان کا تین ناٹکی سلسلہ اس سے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ بریختی انداز کا ڈراما اسی لئے اپنے ڈراموں کو ایکٹوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ انھیں الگ الگ حصے قرار دیتا ہے اور عموماً ان کا عنوان بھی الگ رکھتا ہے۔

بریخت نے اپنے نظریات میں اشتراکی حقیقت نگاری کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اس نے ڈرامے کو عوام کی بیداری اور اس نئی قوت کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی جو زندگی کو اشتراکی طرز پر ڈھال سکے، جو فن کو نئے ذرائع اظہار دے کر ایک نئے سماج کی تعمیر و تشکیل میں مدد دے سکے اور اس فرض کو پورا کر سکے جو تاریخ نے اس کے سپرد کیا ہے۔

بریخت کے نزدیک فن اور ادب کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ عوام کو ان کی قوت کا احساس دلائے۔ لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جانا چاہیئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز لازمی نہیں، کوئی چیز ایسی نہیں جو پہلے سے واقعات کا سلسلہ معین کر دے بلکہ واقعات اور حالات آدمی کی قوت عمل کا نتیجہ ہیں۔ اس کی اپنی سکت اور انسانی سماج کے حدود سے باہر کوئی ایسی بالائی قوت نہیں جو حالات کو موڑ دے۔ آج کی سرمایہ دارانہ تہذیب میں مقدر پرستی کی وبا عام ہے۔ اس کے اثرات کو دور کرنے کے لئے ایک اشتراکی حقیقت نگار کو ایسے ادبی اور فنی نمونے پیش کرنا چاہئیں جو لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں سماجی ارتقاء کے فطری اصولوں کو سمجھنے میں مدد دیں۔ اس جدلیاتی کیفیت کو سمجھنے کے بعد ہی ان میں یہ یقین پیدا ہوگا کہ ایک نامناسب سماجی نظام، استحصال اور ظلم کی یہ دنیا ہمارا مقدر نہیں۔ یہ نہ بدل سکنے والی چیز نہیں۔ ان کے دلوں کا یہ یقین ہی مقدر پرستی اور اوہام کو ان کے خیال اور ان کے دل سے دور کر سکتا ہے اور عمل یا انقلاب کا راستہ کھول سکتا ہے۔

برپخت کا ایپک تھیٹر اسی لیے ایک تماشا گاہ نہیں جہاں لوگ تفریح کرنے یا نجی الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں بلکہ تھیٹر اس کے نزدیک ایک تعلیم گاہ ہے جہاں عوام کو ان کی قوت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ارسطوئی تھیٹر میں تماشائی اسٹیج سے الگ، پیش کیے جانے والے واقعات سے الگ جذباتی طور پر ڈرامے کے واقعات اور کرداروں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ایپک تھیٹر میں اس کے برخلاف تماشائی ڈرامے کے واقعات اور کرداروں کے جذبات سے بے تعلق ہو کر بھی پورے تماشے میں شریک رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے سامنے کچھ واقعات کی نقلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ نقلیں پیش کرنے والے اصل کردار نہیں۔ وہ رک رک کر ناظرین سے مخاطب بھی ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح جہاں ڈرامے کے اصلی عمل سے ان کو الگ اور بے تعلق رکھتے ہیں وہاں ان کو پورے تماشے میں برابر کا شریک رکھتے ہیں۔ برپخت نے جب اپنے ڈرامے پیش کیے تو ایک چشم دید بیان کے مطابق جیسے سارا ہال ایک اجتماعی قوت سے جاگ اٹھا اور سسکتی ہوئی عورتوں اور ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے مردوں کے بجائے دو گھنٹے تک سارے تماشائی مسائل حیات کے سمجھنے میں اداکاروں کے شریک رہے اور اجتماعی ڈرامے کی ایک نئی شکل سے متاثر ہو کر یہ سوچتے ہوئے اُٹھے کہ تعصب اور طرفداری، بے ایمانی اور رشوت کے اس سماج کو کیسے بدلا جا سکتا ہے۔

اوپر کی سطروں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ برپخت ایک منفرد فن کار ہونے کے بجائے اشتراکی ڈھنڈورچی ہے۔ برپخت اپنی پوری زندگی میں صرف دو بار چند روز کے لیے روس گیا اور جب ۱۹۳۳ء میں اسے جرمنی سے ملک بدر کیا گیا تو پہلے ڈنمارک میں مقیم ہوا پھر امریکہ چلا گیا جہاں زندگی کے آخری پندرہ سال گزارے۔ عقائد کے اختلاف کے باوجود برپخت شناسی کے جذبے میں آج امریکہ پیش پیش ہے اور یہ اس کے فن کو بہت بڑا خراج ہے۔

محمد اکرام چغتائی

مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ

مائل کے سوانح حیات

بیشتر قدیم اردو شعراء کی طرح مائل کے نام میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے "میاں محمد تقی" لکھا ہے[۱] اور بعض نے شاہ محمد تقی،[۲] لیکن ہمارے خیال کے مطابق "میر مجدی" درست ہے کیونکہ انھوں نے "قطعہ" کے آخر میں اپنا یہی نام لکھا ہے۔

ان کا وطن دہلی تھا۔ سید صحیح النسب تھے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی۔ اُن کے اُستاد کے بارے میں اردو تذکرہ نگاروں میں اختلاف رائے ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ مولوی قدرت اللہ قدرت اکبر آبادی کے شاگرد تھے[۳] اور بعض انھیں قائم کا شاگرد لکھتے ہیں۔[۴] اقتدا حسن صاحب کا خیال ہے کہ قدرت کے دہلی سے چلے جانے کے بعد (۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ) موصوف نے (مائل نے) قائم سے مشورۂ سخن کرنا شروع کر دیا ہوگا[۵] اور یہ خیال کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قائم نے خود اپنے "تذکرۂ مخزن نکات" (۱۱۶۸ھ) میں مائل کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے۔

علی ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں :

"دریں زمان کہ عہد شاہ عالم بادشاہ است در مرشد آباد می گزارند"[۶]

مذکورہ عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مائل گلزار ابراہیم کے سنہ تکمیل (۱۱۹۸ھ) سے قبل مرشد آباد جا چکے تھے۔ عشقی عظیم آبادی رقم طراز ہیں :

"مرشد آباد سے چلے گئے۔ معلوم نہیں اب کہاں ہیں۔"[۷]

تذکرۂ عشقی تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھنا شروع ہوا اور ۱۲۳۳ھ میں مکمل ہوا۔ اس لئے مائل کے مرشد آباد سے واپس چلے آنے کا کوئی سن متعین کرنا دشوار ہے۔

مائل کے سنہ ولادت کی طرح ان کا سنہ وفات بھی معلوم نہیں ہو سکا بہر حال یہ مسلم ہے کہ وہ ۱۲۲۱ھ سے قبل انتقال کر چکے تھے کیونکہ مجموعۂ نغز میں ان کو "مرحوم" لکھا گیا ہے۔[۸] بعد میں اُن کی وفات کا ذکر اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرۂ عمدۂ منتخبہ (۱۲۳۳ھ) میں بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مدتے شد کہ رحلت نمود"۔[۹]

مائل کے تین شاگردوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں : شاہ نصیر دہلوی، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں متخلص بہ آشفتہ[۱۰] خسروی۔

---

[۱] مخزن نکات۔ ص۹۵۔ تذکرۂ ہندی ص۲۲۵

[۲] مجموعۂ نغز۔ ج ۲۔ ص۱۵۱۔ عیار الشعراء قلمی۔ غلام حسین شورش عظیم آبادی نے میاں فخر مائل لکھا ہے۔ (بحوالہ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی۔ گارسین دتاسی۔ ج ۲۔ ص۲۵۰) [۳] گلشن بیخار ۱۲۵۰ھ ص۱۹۲۔ تذکرہ طبقات الشعرائے ہند۔ مولوی کریم الدین۔ ص۳۸۲۔ جواہر سخن۔ ج ۱۔ ص۲۳۴۔ مخزن نکات۔ ص۹۵

[۴] سخن شعراء ص۴۰۹۔ مجموعۂ نغز۔ ج ۲۔ ص۱۵۱۔ عیار الشعراء قلمی

[۵] مقدمہ کلیات قائم۔ ج ۱۔ ص۴۸ [۶] گلزار ابراہیم ص۲۲۵ [۷] بحوالہ اشپرنگر یادگار شعراء ص۱۹۲ [۸] مجموعۂ نغز ج ۲۔ ص۱۵۱

[۹] تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے مجموعۂ نغز ج ۱۔ ص۱۲۲۔ عمدۂ منتخبہ ص۴۸۔ گارسین دتاسی نے ان کا نام بابے علی شاہ آشفتہ لکھا ہے جو غلط ہے (تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی ج ۲۔ ص۲۹۶)

مائل کے عالم و فاضل اور استادِ عصر ہونے کا بہت سے تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ قائم لکھتے ہیں:۔

"با وصافِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ اتصاف دارد۔ و در سخن طرازی طرزے مخصوص است"[۱]

قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:۔

"بزیورِ علم و حیا آراستہ و بحلیۂ مہر و وفا پیراستہ بسیار درویشانہ و آزادانہ ایام بسر می برد"[۲]

اعظم الدولہ سرور رقم طراز ہیں:۔

"با علم و فضل متصف۔ کلامش بسیار مربوط و سخنش نہایت دلچسپ۔ بزعمِ بعضے عزیزاں استادِ عصرِ خود بود"[۳]

خوب چند ذکا لکھتے ہیں:۔

"عالم فاضل و بسیار با ..... و اہلِ مروت و صاحب سلوک و عالی فکر و خوش مزاج وضع درویشانہ داشت۔ اشعارِ بے نظیرِ خود را از نظرِ قیام الدین علی گزرانیدہ بعد چندے خود استادِ وقت گردید باصلاح بیشتر از تازہ گویاں می گماشت و بے وجہ او اکثرے .... فیض رسیدند تلمذے پیدا گردند"[۴]

مصحفی لکھتے ہیں:۔

"میاں محمدی مائل کہ متصل جامع فتحپوری قیام دارد از شعرائے متوسط شاہجہاں آباد است۔ اگرچہ فقیر را بایں بزرگ اتفاقِ ملاقات نیفتادہ اما یک دو شعرش زبانی مائل شاہ روزے کہ برائے شنیدن اشعار ایں ہیچمداں می آمد بسمع می رسید سلیقۂ سخن سنجیش بسیار بدرستی معلوم می شود"[۵]

مبین چریاکوٹی فرماتے ہیں:۔

"غزل گوئی میں ایک خاص انداز کے مالک ہیں"[۶]

مائل نے اپنا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ ترتیبِ دیوان کی تاریخ انھوں نے خود کہی ہے ؎

ہوا دیوان مرا جب صاف اللہ کی عنایت سے ۔۔۔ شگفتہ دل ہوا پڑھ ریختہ ارباب محفل کا

ہیں سر نیہوڑا ہے بیٹھا تھا ...... زانو پر ۔۔۔ کہا تاریخ ہاتف نے کھلا ہے باغ مائل کا

مائل کا تاریخی قطعہ ہمیں ایک قلمی بیاض سے ملا ہے جو کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور کے "ذخیرۂ کیفی دہلوی" میں موجود ہے۔

مائل کے قطعہ کی چند نمایاں خصوصیات:

۱۔ اس قطعہ میں پہلی دفعہ اردو شاعری کی تاریخ بیان کی گئی ہے

۲۔ اس میں پہلی بار لفظ "اردو" بمعنی زبان استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ "اردو" بمعنی زبان کب اور کس نے استعمال کیا؟ اس کے متعلق

---

۱ مخزن نکات۔ ص ۶۵

۲ مجموعۂ نغز ج ۲۔ ص ۱۵۱

۳ عمدہ منتخبہ۔ ص ۶۷

۴ عیار الشعراء۔ قلمی۔ انڈیا آفس

۵ تذکرہ ہندی ص

۶ جواہر سخن۔ جلد اول۔ ص

مختلف نظریات ہیں جو حسب ذیل ہیں:

ا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لفظ "اردو" بمعنی زبان استعمال ہونا شروع ہوا۔

ب۔ میر عطا حسین تحسین نے "نو طرز مرصع" میں سب سے پہلے یہ لفظ استعمال کیا۔[۱]

ج۔ گلکرسٹ اپنی انگریزی تالیف "قواعد زبان ہندوستانی" (ج ۱، ۱۷۹۶ء) میں اردو کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

د۔ بعض محققین اس سلسلہ میں مصحفی کی اولیت کو مانتے ہیں۔ مصحفی کا شعر ہے ؎

خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی | کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ڈاکٹر گراہم بیلی کا قیاس ہے کہ یہ شعر سنہ ۱۷۷۶ء / ۱۱۹۰ھ کے قریب کہا گیا ہے۔[۲]

ہ۔ مراد شاہ لاہوری نے "نامۂ مراد" (سنہ ۱۲۰۳ھ) میں یہ لفظ استعمال کیا۔[۳]

لیکن مائل کے قطعہ سے مذکورہ تمام نظریات کی تردید ہو جاتی ہے۔ مائل نے اس قطعہ میں تین جگہ لفظ "اردو" بمعنی زبان استعمال کیا ہے اور اب اس سلسلہ اولیت کا سہرا مائل کے سر پر ہے کیونکہ جس دیوان میں یہ قطعہ درج ہے، اس کا سنہ کتابت سنہ ۱۱۷۶ھ ہے۔ مائل اس قطعہ میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ لفظ "اردو" کا استعمال شاہجہاں کے دور سے شروع ہوا۔ اس کے متعلق ہم نے تفصیلی بحث اپنے ایک علیحدہ مقالہ بعنوان "لفظ اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق" میں کی ہے۔

۳۔ مائل کے قطعہ میں بعض ایسے شعرا کا کلام بھی موجود ہے جن کا ایک شعر بھی کسی تذکرہ وغیرہ میں درج نہیں ہے۔ مثلاً شاہ گل کی غزل۔ اور بعض شعرا کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے مثلاً ولی کی غزل۔

۴۔ قطعہ کے آغاز میں دہلی کی مختصر سی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔

قطعہ (قبل سنہ ۱۱۷۶ھ)

مائل سے ایک شخص نے پوچھا یہ آن کر | "بتلا کہ شعر ہندی کس عہد سے چلا" ۳۵
سن کر وہ یہ سوال ٹک اک من سوچ ساچ | کہنے لگا بگڑ دن مُلّا اَلا بَلا
موجد تو ریختہ کا خدا جانے کون تھا | لیکن جو میں سنا ہے وہ کہتا ہوں برملا
ہندوستاں کی بولی میں سعدی نے پیشتر | الفاظ فارسی کو کیا تھا خلا بلا
اس فن میں شیخ سعدی ہیں ہم سب کے پیشرو | شیریں کلام ان کا ہے مصری کا سا ڈلا
پھر ان کے بعد خسرو جماعت کے ہیں امام | جن کے کلام میں ہے سبھی طرح کا صلا[۴]

---

[۱] Journal of the Asiatic Society. of Pakistan. Vol III, 1958, p: 43, 44

[۲] Journal of Royal Asiatic Society 1930, p: 393.

[۳] مقالات حافظ محمود شیرانی۔ ج ۱، ص ۳۹ و ص ۴۹ تا ص ۵۳۔ تاریخ جلیلہ: غلام دستگیر نامی، بار دوم، سنہ ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۷۔ اورینٹل کالج میگزین۔ فروری سنہ ۱۹۳۱ء

[۴] نسخہ: حذف کر دیا گیا ہے۔

[۵] ضلع: مراد ضلع جگت

گو اُن سے پہلے اور بھی کہتے تھے ریختہ
شعر اُن کا پر صفائی کے سانچے میں تھا ڈھلا!

مِن بعد اور اور ہوئے صاحبِ سخن
جن کا کلام ڈھونڈے سے کہیں کہیں ٹک اک ملا

گیارہ صدی شروع ہوئی جبکہ جگ منے
باہم ہوئے یہ ہندو مسلماں خلا ملا

دربار اکبری میں وہ.... تھے رات دن
ہر ہر گلی میں تھا اسی خدمت کا پر تلا"

بولا وہ شخص "یہ تو کہانی میں سب سنی
اردو کا تین (؟) بتا دے سلسلہ کھلا کھلا"

میں نے کہا کہ "دار........ ہے یہ مقام
پانڈوں نے بن اجاڑ بنا شہر اور قلا

اندرپرست نام رکھا خوب جانچ کر
دھن نگر میں میکھ کر کہ گنپا تلا (؟)

اندرپت اس کو کہتے رہے مدتوں تلک
جتنے کہ ساکنین یہاں کے تھے لے دلا

پھر راجہ دہلو نے اسے دہلو بتی کیا
دہلی بدل کے دلّی قلب میں پھر ڈھلا

دہلو کے بعد جتنے ہوئے راجہ اس جگہ
اُن سب کی راجدھانی یہی شہر ہے بھلا (؟)"

بولے وہ سُن کے "اردو کا میں پوچھتا تھا حال
تم کھول بیٹھے پترہ اس شہر کا بھلا"

سائل کو اپنے میں یہی ذرا دیا جواب
سُن سے بگوش ہوش تک ادھر کو بھی کان لا (؟)

مشہور خلق اردو کا تھا ہندوی لقب
اگلے سفینوں بیچ یہ لکھ گئے ہیں سب ملا

شاہجہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں
ہندوی تو مٹ گیا اردو لقب چلا

اس وقت کا بیان تو سُن مجھ سے اے عزیز
سر چڑھ کے میرے گھونٹ نہ ناحق تُو نہیں گلا

استاد شعر ریختہ گزرے ہیں مٹ آ دگل
ہر اک کی شاعری کا ملا جن سے سلسلا

گلشن نے اُن سے فیض اٹھایا ہے مدتوں
جن کے چراغ سیتی ولی کا دیا جلا

حاتم ولی کے آگے ہے بیٹھا ادب کے ساتھ
سودا نے جس کسوٹی پہ اپنا کسا طلا

قائم کو اُن نے شعر کے بتلا دیے اصول
شاگرد ایک جس کا ہے قائل بُرا بھلا

ان کا کلام تم کو سنا دیتا ہوں مجھے
تھوڑی سی دیر کو یہی رکھنا ہے مشغلا

سُن لیجیے مجھ سے سعدی شیرازی کی غزل
لکھ گئے بیاض اپنی میں سید آبو العلا

ریختہ شیخ سعدی شیرازی

قفقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یو کہاں دیت ہے
گفتا کہ ڈر جائے باورے اس ملک کی ریت ہے

لہ میں ۔ دکن میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک صورت منیں بھی ہے۔ شمالی ہندوستان کے ابتدائی شعرانے اسے بہت کم استعمال کیا ہے
ےه قلعہ ۔ گه حال ۔ ذکر ۔ گه ادھر کو ۔ شه ریختہ سودا رودائے قدیم حکیم شمس اللہ قادری لکھنؤ بار دوم [illegible]
له یہ لیا (خزینۃ العلوم .... دربار پرشاد ناتمام ۔ لاہور [illegible]) (اردوئے قدیم) ۵ [illegible] (خزینۃ العلوم (اردوئے قدیم) ۵ کی یہ ریت (خزینۃ العلوم ۔ اردوئے قدیم)
له بیاض شعرائے قدیم (مملوکہ سید نجیب اشرف ندوی) میں مندرجہ ذیل مطلع ہے ۔

جانا ہمارا کیا چھپ کرے ہم کو بہت پرسست ہے ۔ دل کی درد جیسر تن من سوا اپنی میت ہے ۔ (معارف ۔ ۲۱۸۱ ۔ اگست [illegible])
مجھ کو ان کی مکت [illegible] ۔ سے مردماں تہم کیسی بری یہ ریت ہے ۔ جب سے بنی پر سدگے پرولیا ماریت ہے ۔ (اردوئے قدیم میں یہ شعر مطلع ثانی ہے)

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں[۱] مہ بگشتم آخر[۲] — نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں[۳] نہ بھیجیں[۴] پتیاں

بحق روز وصال آں مہ کہ داد ما را فریب خسرو
سپیت من کی درائی راکھوں جو جانے پاؤں (پیا کی کھتیاں[۵])

پڑھتا ہوں شاہ گل کو میں ایک ریختہ ورے — دے داد اس سخن کی تو اب سب کی عاقلا

ریختہ حضرت شاہ گل دہلوی

ذرا تو سوچ اے غافل کہ کیا دم کا ٹھکانا ہے — نکل جب یہ گیا تن سو[۶] تو پھر اپنا بگانہ[۷] ہے

مسافر تو ہے اور دنیا سرائے بھول مت غافل — سفر ملک عدم آخر تجھے در پیش آنا ہے

لگاتا ہے عبث دولت پہ کیوں دل کو اب ناحق — نہ جاوے سنگ[۸] کچھ ہرگز یہاں سب چھوڑ[۹] جانا ہے

نہ بھائی بند ہے کوئی نہ یار و آشنا کوئی — ٹک اک غور سے دیکھو تو مطلب کا زمانا ہے

لگا دے یاد میں اس کی نجات اپنی اگر چاہے
عبث دنیا کے دھندے میں ہوا گل کیوں دوانا[۱۰] ہے

تم نے یہ شاہ گل کی غزل سن لی مہرباں — گلشنیؔ کا ریختہ بھی سنا دوں جو ہو صلا

---

[۱] ز مہر آں ما بگشتم آخر (اردو، اکتوبر ۱۹۳۸ء)۔ [۲] چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ۔ (اردو غزل ولی تک، شیر نگر جرنل)
[۳] آپ ہی آوے (شیر نگر جرنل) آوے (اردو اکتوبر ۱۹۳۸ء، اردو غزل ولی تک)۔ [۴] بھیجے (شیر نگر، اردو، اردو غزل ...)

[۵]	۵	بحق آں روز فضل محشر کہ داد ما را فریب خسرو	سمیت من کے دورائے راکھو جھوٹ دیکھو پران پتیاں	(اردو، اکتوبر ۱۹۳۸ء)
	۵	بحق آں مہ کہ روز محشر بداد ما را فریب خسرو	سپیت من کی دورائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی کھتیاں	(اردو غزل ولی تک)
	۵	بحق روز وصال محشر کہ داد ما را فریب خسرو	ورائے راکھوں سمیت ساجن جو کھف پاؤں دو بول بتیاں	(شیر نگر جرنل)

نوٹ:- یہ غزل خسرو کی ہے یا نہیں، اس کے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات شیرانی ج ۲۔ ص ۸۹ تا ص ۹۲

[۶] سے [۷] بیگانہ [۸] ساتھ [۹] چھوڑ [۱۰] دیوانہ

[۱۱] شاہ گل کے فارسی اشعار تذکروں میں ملتے ہیں لیکن ان کا کوئی اردو شعر کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ اس لئے یہ غزل شمالی ہندوستان کی قدیم اردو شاعری میں خاص حیثیت رکھتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ غزل شاہ گل کی ہے بھی یا نہیں، اس کے متعلق ہم نے اپنے ایک مقالہ بعنوان "بعض نئے دریافت شدہ ریختے" میں بحث کی ہے۔

شاہ گل کا نام عبدالاحد تھا اور وحدت تخلص کرتے تھے۔ ویسے میاں گل کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ سعد اللہ گلشن ان کے مرید تھے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"مرید شاہ گل متخلص بہ وحدت بن شیخ محمد سعید بن شیخ احمد مجدد سرہندی بود ...... بایں مناسبت گلشن تخلص می کرد" (سرو آزاد ص ۲۱۳، ۱۹۱۳ء، ص ۱۹۵) بندرابن داس خوشگو لکھتے ہیں: "بلبل کہ بجوار شیخ سعد اللہ گلشن کہ تکمیلت ابیات برنگین رنگ و بوئیافتہ دانند وا من برگلہائے فیضش بر خاستہ" (سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، پٹنہ ۱۹۵۹ء، ص ۹۶)
ایک اور جگہ رقم طراز ہیں: "ایں ہفت طاق، دست ارادت بدامن شیخ الشیوخ جلد حضرت گل محمد وحدت تخلص ...... زدہ بسر حد معنی رسیدہ، بہمیں نسبت تخلص خود بسیار خوش بود" (ایضاً ص ۱۶۵، در ذکر گلشن)

شاہ ولی اللہ اشتیاق (تخمیناً ۱۱۱۱ھ – ۱۱۹۱ھ) شاہ گل کے پوتے تھے (دیکھئے نکات الشعراء ص ۔۔۔ سرو آزاد ص ۲۳۲۔ ریاض حسنی، نتوت دورنگ آبادی، چمنستان شعراء ص ۔۔۔ تذکرہ میر حسن ص ۲۴۔ گلزار ابراہیم ص ۲۳۔ گلشن ہند ص ۳۲) لیکن نساخ نے شاہ گل کو اشتیاق کا والد لکھا ہے (سخن شعراء، ص ۔۔) شاہ گل کی وفات کے متعلق بندرابن داس خوشگو لکھتا ہے: "در عہد بادشاہ شہید محمد فرخ سیر بہ سال ہزار و بست و شش وصال کرد" (سفینۂ خوشگو، ص ۱۶۵)۔ در ستہ و عشرین و مأتہ والف (۱۱۲۶ھ) ازیں عالم رحلت فرمود" (تذکرہ روز روشن، مولوی محمد مظفر حسین صبا، طہران ۱۳۴۳ء، ص ۸۹)

تعریف تجھ بدن کی کہاں تک کروں ولی
چندا چکور ہو کے ترے مکھ پہ رل[۵۶] گئے

حاتم کا ریختہ یہ بڑی محنتوں کے بعد شاداں[۵۷] کے کاغذات میں سے ڈھونڈ کر ملا

ریختہ شیخ ظہور الدین شاہ حاتم دہلوی[۵۸]

کروں قربان جی کو اس گھڑی اس وقت اس پل کے | کہ جس دن جس گھڑی دلدار آوے[۵۹] گھر مرے چل کے
فدا ہونے کو آیا ایک جی کس کس کے کتنے[۶۰] چل کے | لبوں کے، پان کے، مسی کے تل کے کاجل کے[۶۱]
جہان کے خوبصورت دیکھ تجھ کو مورت[۶۲] کو مجلس میں | رہے خاموش حیرت سے گویا پتلے ہیں سب گل کے
نہ آوے مجھ کو کیونکر خواب[۶۳] راحت بستر غم پر | تصور ترے نقش پا کے گل تکیہ[۶۴] ہیں مخمل کے
یہ طور ہم سے تی ہے بہ زیب[۶۵] گل رو رکھتا[۶۶] تم | کہ اک دن شوق سے آ ہار[۶۷] ہو جاویں گے ہم گل کے
ترے عاشق نے لے ... گا وہ بند حیا چل تے تکلی | کبھی سر پھوڑنے پہنچا پہاڑوں سے ہماچل[۶۸] کے

سجن حاتم کا جی ہر آن پر قربان جاتا ہے
تمہاری چال کے ریج کے اکڑنے زلف کے بل کے[۶۹]

سن لو کلام سودا کا جن کو ہے بہت شوق | خوبی سے اپنی جس نے زمانہ کا دل چھلا

ریختہ مرزا رفیع السودا دہلوی

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے[۷۰] میں | تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں
کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں | دیکھوں ہوں تیری زلف کو میں دست[۷۱] شانہ میں
زینت دلیل مفلسی ہے اک کماں کو دیکھ | نقش و نگار جیت نہیں کچھ اس کے خانہ میں

---

۵۶ قربان ہو گئے۔ ۵۷ ولی کی یہ غزل غیر مطبوعہ ہے حتیٰ کہ کلیات ولی مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (۱۹۵۴ء) میں بھی موجود نہیں۔ راقم نے اس غزل کو اپنے ایک علمی مقالہ بہ عنوان "ولی گجراتی کا غیر مطبوعہ کلام" میں درج کیا ہے۔ ۵۸ بیاض نگار نے لکھا ہے کہ شاداں حاتم کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ بات بالکل نئی ہے اور کسی تذکرہ نگار نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ۵۸ دیوان زادہ (مخطوطہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور سنہ ۱۱۸۹ھ) کے مطابق یہ غزل ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔ ۵۹ کہ جس دم نازنیں وہ یار آوے (دیوان زادہ ۱۱۸۹ھ ورق ۸۰ ب)۔ ۶۰ پاس۔ ۶۱ یہ شعر مذکورہ دیوان زادہ کی غزل میں نہیں ہے۔ ۶۲ اس (ایضاً)۔ ۶۳ ہوئے (ایضاً)۔ ۶۴ ہمیں کیونکر نہ آوے (ایضاً)۔ ۶۵ کف پا کا تصور اس کے گل تکیے (ایضاً)۔ ۶۶ یہ طور یں ہم سے اب بدزیب (ایضاً)۔ ۶۷ یاد رکھنا (ایضاً)۔ ۶۸ کسو دن جا نخوح (؟) میں آ ہار (ایضاً)۔ ۶۹ یہ شعر دیوان زادہ کی غزل میں موجود نہیں۔ اس غزل کے شعر ۲ اور ۵ کی بجائے دیوان زادہ (۱۱۸۹ھ) میں مندرجہ ذیل دو شعر درج ہیں

تصدق ہوں میں اپنے دل کے ان اوقات کے اوپر | اس آہ متصل کے اور اس اشک مسلسل کے
تجھ اوپر ساحروں کا سحر کچھ چلتا نہیں پیارے | ترے تعویذ بازو کے سبب اور گل کے ہیکل کے

۷۰ دیوان زادہ (۱۱۸۹ھ) میں مقطع اس طرح ہے

دیکھو حاتم صنم ہر آن پر قربان جاتا ہے | تری ریجھ کے اکڑ کے چال کے اور زلف کے بل کے

چمنستان شعرا (ص ۱۳۰) میں مصرعہ اولیٰ اس طرح ہے | تری ہر آن پر حاتم بھی قربان جاتا ہے

۷۱ زمانے اور دیگر قوافی بھی اسی وزن پر ہیں (کلیات سودا، لکھنؤ ۱۹۳۲ء ج ۱۔ ص ۱۲۱)۔ ۷۲ دست (ایضاً)

اے مرغِ دل سمجھ کے تو چشمِ طمع کو کھول — ورنہ[1] سنائے دام جسے، ہے وہ دانہ میں
چلّے میں[2] کھینچ کھینچ کیا قد کو جوں کماں — تیرِ مراد پر نہ بٹھایا نشانہ میں
پایا ہر ایک بات میں اپنی[3] میں یوں تجھے — معنی کو جس طرح سخن عاشقانہ میں
دست گرہ کشا کو نہ تزئیں کرے فلک — مہندی[4] بندگی نہ دیکھی میں انگشت شانہ میں
ہم سا تجھے[5] ہے ایک نہیں تجھ سے ہیں کئی — جا دیکھ لے[6] تو آپ کو آئینہ خانہ میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

یہ ریختہ تو حضرت قائم کا گوش کر — اُستادی پر اُنھوں تنگ من میں شک لا

ریختہ شیخ قیام الدین قائم چاندپوری[7]

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم — پھر منہ نہ تمہیں[8] دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم — جوگا لیاں[9] نت کی کھائیں گے ہم
ایسا ہی جو جی[10] نہ رہ سکے گا — تک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
جینے ہی سے ہاتھ اٹھائیں گے[11] — پر[؟] باتیں نہ تری اٹھائیں گے ہم

جو چاہیے چاہ کا رشتہ
قائم ...... کر دکھائیں گے ہم[12]

اُستادوں بیچ اپنا بھی پڑھتا ہے ریختہ — مائل کو دیکھ کیسا بہادر ہے منچلا

ریختہ میر محمدی مائل دہلوی

جا کر تری گلی میں پھر آیا نہ جائے گا — پھر منہ کسی کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا
دنیا و دین و دل تو فراموش کر چکے — روٹھا تو اب وہ شوخ منایا نہ جائے گا
نالہ کو ہم نے ضبط کیا نا صحا تو کیا — منہ سیتی رنگ زرد چھپایا نہ جائے گا
اُس سنگ دل سے غیر کی الفت نہ ہو گی دور — یہ نقش کا حجر سے مٹایا نہ جائے گا

مائل جو کوئی دم ہے غنیمت ہے جاگنا
سوئیں گے پھر تو ایسے جگایا نہ جائے گا

---

[1] وقت نے، کلیات سودا، لکھنؤ ۱۹۳۲ء، ج ۱، ص ۱۲۱۔ [2] میں (ایضاً)۔ [3] اپنے (ایضاً)۔ [4] مہندی (ایضاً)۔ [5] تو (ایضاً)۔ [6] دیکھنے (ایضاً)۔ [7] اقتدا حسن کے مرتب کردہ کلیات قائم ج ۱، ص ۱۱۱ میں قائم کی اس غزل کے گیارہ اشعار ہیں۔ مطبوعہ کلیات میں ان اشعار کی ترتیب اس طرح ہے ۱۱-۵-۲-۳-۴-۷-۱۰۔ [8] پھر تجھ کو نہ منہ (کلیات قائم، اقتدا حسن ج ۱، ص ۱۱۳)۔ [9] جب کو لیں (ایضاً)۔ [10] دل (ایضاً)۔ [11] لگ (ایضاً)۔ [12] مطبوعہ کلیات قائم میں مقطع کا اختلاف ہے۔ اس میں یہ شعر مقطع سے پہلے کا شعر ہے جو اس طرح ہے۔

یوں چاہیے چاہ کا رشتہ — جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

جوش ملیح آبادی

دعوت

آؤ کعبے سے اٹھیں سوئے صنم خانہ چلیں
تا بہ فقر و بہ پیمانۂ شاہانہ چلیں

کانپ اٹھے حرم سرِ عفافِ توحید
یوں پئے سجدۂ سنگِ درِ بت خانہ چلیں

مشعلِ حسن کے اطراف میں سناٹا ہے
آؤ سینوں میں لیے آتشِ پروانہ چلیں

آؤ اے زمزمہ سنجانِ سراپردۂ گل
بہوائے نفسِ تازۂ جانانہ چلیں

آہِ شبگیر و مناجاتِ سحرگاہی کو
نعرۂ ہو پہ نچاتے ہوئے ترکانہ چلیں

بت سے مڈبھیڑ اگر ہو تو جھکیں بہرِ سلام
اور خدا راستہ روکے تو حریفانہ چلیں

تا نہ محسوس ہو واماندگیٔ راہِ دراز
زلفِ پرپیچ کا چھیڑے ہوئے افسانہ چلیں

پھینک کر سبحہ و سجادہ و دستار و کلاہ
بہ رباب و دف و طنبورہ و پیمانہ چلیں

بادہ و ساغر و طاؤس و غزل کے ہمراہ
ذرے ذرے پہ لنڈھاتے ہوئے میخانہ چلیں

گرد قدموں سے اڑے سر پہ دھنک بن جائے
آؤ یوں رنگ اڑاتے ہوئے مستانہ چلیں

فرشِ صحرا پہ مچل جائے نسیم و تسنیم
ثبت کرتے ہوئے یوں لغزشِ مستانہ چلیں

رخصت اے بندہ خرامی کہ وہ دور آپہنچا
کہ اب اس سجدہ طلب خاک پہ یزدانہ چلیں

آؤ پھر جوش کے شانے پہ سجا کر آفاق
خدمتِ پیرِ مغاں میں پئے نذرانہ چلیں

سیّد ضمیر جعفری

دو نعمتیں

(بنیادی خیال عربی ادبیات سے ماخوذ)

یہ دستار میری!
مرے سر پہ نم شاخساروں کا سایا
عراق و عجم کی بہاروں کا سایا
حیا کی علامت، وفا کی ضمانت
مروّت، شرافت، نجابت، سیادت
کلاہِ نہاوند زرد اس کے آگے
نگوں ہرقل و یزدگرد اس کے آگے
مودّت، اخوت، رفاقت کا دامن
"زبیر بنو سعد" تا رودِ اُردن —
خجل طرّۂ تاجِ فغفور اِس سے
کہ مخصوص ہے وضعِ جمہور اس سے
اِسی سے عبا ہے زر افشاں زناپی
اسی سے قبا ہے چمکدار میری
یہ دستار میری!

یہ تلوار میری!
خیاباں خیاباں ہیں گلزار اِس سے
سلامت قبیلے کی دیوار اس سے
چٹانوں کی اُونچی چٹانوں سے اُونچی
حصاروں کے برجوں، مناروں سے اُونچی
کھجوروں کے جھرمٹ ہیں آباد اس سے
مرے اُونٹ صحرا میں آزاد اس سے
نگہبان میری، نگہدار میری!
یہ تلوار میری!
مرے دست و بازو کی روشن گواہی
مری تیز بیانی، مری خوش نگاہی
خیام اپنے معمور و شاداب اس سے
چھلکتے ہیں صحرا میں تالاب اس سے
فروزاں جوانانِ ہاشم کے سہرے
درخشاں حلیمہ و سلمیٰ کے چہرے
غلامی کی دشمن، غریبوں کی حامی
اکھاڑوں میں نامی، وغا میں گرامی
جلالِ قدیمی، شبابِ دوامی
ضعیفوں کی اور ناتوانوں کی یاور
بنامِ خداوندِ قیوم و داور
ہمیشہ معزز، ہمیشہ مظفرّ
رفیق و انیس و مددگار میری
یہ تلوار میری!

مختار صدیق

حجابات

مرحلے شوق کے — عمروں کی کڑی صدیوں میں
طے ہوں — کہ نہ ہوں:

اور اگر طے ہوں —
تو ہر لحظہ، نئی زیست کے سورج نکلیں
ہر گھڑی ایک نئی موت کے گرداب پڑیں!!
شوق کی راہوں پہ ان مرحلوں،
ان منزلوں کی، سرخیاں بنتا ہے
رگِ جاں کا لہو!!
بوند بوند اس کی کبھی سوکھ چلے فرقت سے
بوند بوند اس کی لرز اُٹھے کبھی قربت سے!

کبھی ہر بوند میں سرشاری کی بے پایاں شفق پڑے
کبھی ہر بوند میں چنگاریاں اُمڈیں، نئی ترغیبوں سے
کبھی ہر بوند میں محرومی کے برفاب سمندر بن جائیں!!

(۲)

اور ہر قرب میں بھی فاصلے ہوتے ہیں
کئی دوریاں رکھ لیتے ہیں — رکھنے والے
کئی جذبوں کے کھنچے تار، کھنچے رہتے ہیں
ان کو کبھی سہلاتا نہیں ہے کوئی

آرزومندی کے نغمے ہی سُنے جاتے ہیں اُن سے
نہ دکھن کے نالے
کئی جذبوں کی نہیں، تشنہ پڑی سُوکھتی رہتی ہیں
بھرے پیار کے امرت کے لیے

قرب میں پیار کے بعد، ایسا بھی ہوتا ہے
کہ دل کوئی ترستا ہے
نئے لمس کی شفقت کے لیے!
(اور اس پیاس کو ٹھکرا بھی دیا جاتا ہے!)
پیار کے بعد بھی ——— دیکھا ہے کہ دل کوئی
تھکے چہرے کے دھندلائے ہوئے آئینے میں
جی کے بھر جانے کا اکتایا ہوا عکس بنا کرتا ہے!

پیار کے بعد بھی دیکھا ہے
کہ اک لہجے میں سرشاری کا رس گھُلتا ہے
اور دوسرے لہجے میں
وہ بیزاری کی جھنجھلائی ہوئی کاٹ بھی آجاتی ہے

(۳)

"دیکھو ——— ہم دونوں
جو ہجراں کے کڑے فاصلے سہتے ہیں
انھیں دور بھی کر لیتے ہیں
یہ فاصلے
یہ دوریاں
کیوں دُور نہیں کر پاتے؟؟"

مختار صدیقی

وداع کے دن

تتلیوں کی طرح لہرائے
ٹھمکتے ہوئے اٹھلاتے ہوئے آئے — یہ دن
کیسی امنگوں کے طلسمات — یہ دن
رنگ اور نور رچائے
تو کبھی آس کبھی پیاس
کبھی سوز کبھی یاس سے بھرپور — یہ دن

کبھی جذبوں کے وفور اور سرور
اور ہر اک آن لگاوٹ کی نئی برق
نئے طور — یہ دن!!

کبھی اندیشوں سے بے حال
کبھی درد کا ہر ماضی ہر اک حال
کبھی کل کی کسی فکر سے پامال — یہ دن
ہجر کے خوف کو پرچائے
ہر اک رنج سے منہ موڑے
فقط راحتِ قربت کے سخن سنج — یہ دن!
سالہا سال کے ہر دن کے ملالوں کے
ہر اک شب کے خیالوں کے
ہر اک حسرت و ارماں کے ولارے — یہ دن!
تیرے اور میرے نئے پیار کے پیارے — یہ دن!

یہ ہر اک دُوری ہر اک قرب کے تارے — یہ دن!
باتوں اور لمس کے سائے
یہ مرے دن
یہ ترے دن
جو ہر اک دن بھی ہیں دن
شام بھی دن
رات بھی دن!!
تتلیوں کی طرح لہرائے —
تو ارمانوں کے سپنوں کو یہاں لائے
چھلاوے کی طرح آج گئے
کل نہ رہیں گے یہ دن!!

یوں گزر بھی گئے — یہ دن
یہ مرے دن
یہ ترے دن
کہ جُدا برق سے
اور روشنی سورج سے جدا ہوتی نہیں!!
اس قدر جلد کبھی نیند بھی آنکھوں سے خفا ہوتی نہیں!!
اس قدر جلد کبھی باس بھی کلیوں سے ہوا ہوتی نہیں!!
جسم سے جان بھی یا ہوتی نہیں!!

ادا جعفری

ماں

یہ دھواں ہے کہ مرے دل کی لگی ہے؟ کیا ہے؟
میری آنکھیں ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے؟ کیا ہے؟
وہ اندھیرا ہے کہ دم میرا گھٹا جاتا ہے
آگے کچھ دیکھنا چاہوں بھی تو وہم آتا ہے
میں کہ تقدیسِ وفا، عفّت و ناموسِ حیات
میرے انفاس سے روشن ہوا فانوسِ حیات
حرفِ آغاز بھی ہیں، نقطۂ انجام بھی ہیں
کل کی امّید بھی ہیں، آج کا پیغام بھی ہیں
میں کسی خوابِ دلآویز کی تشکیل نہ تھی
جذبۂ لذّتِ تخلیق کی تکمیل نہ تھی
میں تو خود خالق و کوزہ گر و صناع بنی
شہر بانو بھی مرا نام رہا، مریم بھی
دشتِ ظلمات میں آوارہ و سرگشتہ رہی
بے ستوں کے لیے میں تیشۂ فرہاد بھی تھی

رہنمائی کو مرے دل کی لگن کافی تھی
آبلہ پائی کو سینے کی چبھن کافی تھی
قلبِ سودا طلب و عزمِ جواں ساتھ میں تھا
ہاتھ تقدیر کا ہر آن مرے ہاتھ میں تھا
کوئی کونپل نئی پھوٹی تو یہ جانا میں نے
دے دیا دہر کو جینے کا سندیسہ میں نے
غنچہ چٹکا تو مری روح میں نغمے جاگے
شاید اب مجھ کو مرے خواب کی تعبیر ملے
پھول کھلتا تو بہاروں کا سلام آتا تھا
مہر و مہ کا مجھے کرنوں سے پیام آتا تھا
میرا مذہب کہ محبت بھی ہے، اُمید بھی ہے
پھر یہ کیسی مرے انداز میں محرومی ہے
گرد صدیوں کے سفر کی مرے بالوں میں اٹی
پاؤں چھلنی ہیں، نگہ زخمی ہے، دل ہے خالی

جانے کس موڑ پہ کیا چُوک ہوئی ہے مجھ سے
آرزو لاکے کہاں رُوٹھ گئی ہے مجھ سے
میں نے جو نقش اُبھارا تھا وہ ایسا تو نہ تھا
میں نے شہ کار جو ڈھالا تھا وہ ایسا تو نہ تھا
آج اُس سانس سے بارود کی بُو آتی ہے
میں نے جس سانس کو سمجھا تھا، دمِ عیسیٰ ہے
کہیں پتھرائی ہوئی آنکھ مجھے تکتی ہے
خون آلود کہیں ہاتھ نظر آتا ہے
کہیں کچلے ہوئے سر ہیں، کہیں بے روح بدن
ہے اِدھر بھوک، اُدھر ہے فقط آسائشِ تن
میرا ارماں، مرا محبوب کہاں آ پہنچا
میرا طالب، مرا مطلوب کہاں آ پہنچا

میں وہ گوتم تھی کہ جو راہ دکھانے نکلا
اور رستے میں خود اپنا ہی پتہ بھول گیا
ایک دو کرنیں تو پھوٹی ہیں اُجالے کی، مگر
ان کو خورشیدِ درخشاں تو نہیں کہہ سکتے
چند کلیوں کو بہاراں تو نہیں کہہ سکتے
آج یہ سوچ کے حیران ہوں، آزردہ ہوں -
اپنی تخلیق پہ نازاں ہوں کہ شرمندہ ہوں؟
آگے کچھ دیکھنا چاہوں بھی تو وہم آتا ہے
دم اندھیرے میں گھٹا جاتا ہے
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں
کٹ ہی جائے گا شبِ تار کا اک روز فسوں
دیکھو نادان ہے، نادان سے مایوس نہ ہو
آخر انسان ہے، انسان سے مایوس نہ ہو

فارغ بخاری

سورج کا دیوتا

یہ رات کا آخری پہر ہے
قریب ہی منزلِ سفر ہے
فلک سے ظلمت کے آخری قافلے زمیں پر اُتر چکے ہیں
سیاہیوں کے غبار سے سارے کونے کھدروں کو بھر چکے ہیں
ستارے شب کے حریف راہی
سب ایک اک کر کے تیرگی کے سمندروں میں اُتر رہے ہیں
ہوا کی لہروں سے رفتہ رفتہ یہ سائے بن کر گزر رہے ہیں

حیات کے بے ستوں پرانے افق کا میں بھی ہوں اک ستارا
لٹا کے اپنی حرارتوں کو
بکھیر کر اپنی روشنی کو
میں سرد و تاریک اجڑا اجڑا سا بن رہا ہوں
گماں ہے اُجلی سحر کی کرنوں کے آتے آتے
میں اک نئی انجمن بسا لوں
اتھاہ غاروں میں ڈوب جاؤں

یہ حادثہ تو ہے، حادثے کا مگر مجھے کوئی غم نہیں ہے
ستم ہے لیکن میرے لیے ہی کوئی انوکھا ستم نہیں ہے
انا کی تسکین کے واسطے میرا یہ یقیں کوئی کم نہیں ہے
کہ میں حصولِ سحر کی خاطر
تمام شب ظلمتوں کے عفریت سے لڑا ہوں
لٹا کے اپنی ضیا بھی سورج کے دیوتا سے کہیں بڑا ہوں

احمد فراز

روزنا جرمن نژاد

روزنا جرمن نژاد
اس کے ہونٹوں میں حرارت،
جسم میں طوفاں،
برہنہ پنڈلیوں میں آگ،
نیت میں فساد
رنگ ونسل وقامت وقد
سرزمین ودین کے سب تفرقوں سے بے نیاز
ہر کسی سے بے تکلف، ایک حد تک دلنواز
وہ سبھی کی ہم پیالہ، ہم نفس
عمر شائد بیس سے اوپر برس یا دو برس

روزنا جرمن نژاد
اور چاہنے والوں میں سب
اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب
پیکر تسلیم و سرتاپا طلب
ان میں ہر اک کی متاع کل بہائے نیم شب

روزنا جرمن نژاد
اور اس کا دل زخموں سے چُور
اپنے ہمدردوں سے، ہمسایوں سے دُور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتش کدے کا رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خوں، ہر چاند سے چہرے کا نُور
خلوتیں خاموش ویراں

اور ہر دہلیز پر
اک مضطرب مرمر کا بُت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور — بیقرار
کون اپنوں میں ہے باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستک خواب — شاید خواب کی تعبیر بھی
بول اٹھتی ہے کبھی تصویر بھی
چند لمحوں کی رفاقت بھی بہت ہے حسرتِ تعمیر بھی
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا — امید بھی زنجیر بھی
الوداعی شام، آنسو، عہد و پیماں
مضطرب صیاد بھی نخچیر بھی
کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا
نو مید چاہت کا غرور
روز تا۔ اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی چہرے پر اداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سو تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روز تا مرمر کا بت
اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت
سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا
ایک سی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ، ہمنفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس
اس کی آنکھوں میں تجسس اور بس

پنجابی

منیر نیازی

نوری سالاں دے آثار

اِکّو واج اے چار چپھیرے
فیصلیاں دی گھڑی اے نیڑے

جسماں، مکھاں، نظراں اندروں
پکیاں، پکھیاں نگراں اندروں
دور دراز دیاں خبراں اندروں
بن، کہساراں، ابراں اندروں
اگاں، لوہاں، قبراں اندروں

فصلاں، پانیاں، ثمراں اندروں
ارض، فلک، دیاں صبراں اندروں
حرفاں، زیراں، زبراں اندروں

سخر دوپہریں شام سویرے
اِکّو واج اے چار چپھیرے

جمیل ملک

جاوداں

یہ میرا وطن اور اس کی یہ سرسبز و شاداب مٹی
یہ زرتاب مٹی
میں روزِ ازل سے اِسے جانتا ہوں
اسی کی کھنکتی ہوئی کوکھ سے میں نے سرگوشیاں کیں
یہیں سے مجھے زندگی کی حرارت ملی
میں عدم کے سمندر سے اک جست کے ساتھ ہستی کے ساحل پہ آیا
مِرے سامنے تا بہ حدِ نظر ایک مٹیالی چادر کی جادوگری تھی

یہ ارضِ وطن، میرے خوابوں کی دنیا
مرا ہاتھ تھامے
مجھے سالہا سال تک
وادیوں، کوہساروں میں پنہاں دفینے دکھاتی رہی
میری نظروں میں مٹی کی عظمت بڑھاتی رہی
آسماں اپنے دامن سے موتی لٹاتا رہا
رات کو چاند اور دن کو سورج مجھے پاس اپنے بلاتا رہا
میں ــــ مگر اپنی دھرتی کے خوابوں میں کھویا رہا
دن کو دشت و دمن، کوہ و صحرا میں بادل کی مانند اُڑتا پھرا
رات آئی تو دھرتی کے سینے پہ سر رکھ کے سویا رہا

ایک شب
مجھ کو خوابِ عدم سے جگاتی، بڑھی
میری دنیا میں طوفاں اٹھاتی، بڑھی
ہر طرف سائے ہی سائے تھے

رات کی اوٹ میں
میرے دشمن مرے گھر کے آنگن میں در آئے تھے
ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے
مرا ہاتھ مشکل کشا بن گیا ہو
خدا خود زمیں پر اُتر کر مرا رہنما بن گیا ہو!

اگر آج میں
اپنی دھرتی کی آغوش میں سو گیا ہوں
تو کیا تم سمجھتے ہو، میں زندگی سے جُدا ہو گیا ہوں۔؟
مرا ایک اِک قطرۂ خوں وہ دانہ ہے جو اپنی دھرتی سے پھوٹا
کھِلا، لہلہایا
ہوائے مخالف سے اُلجھا
زمیں پر گرا
اپنی مٹی کا جوہر بنا اور امر ہو گیا
آج میں مادرِ ارض کی کوکھ میں اس طرح جذب ہوں
جیسے رمزِ وجود و عدم ایک ہو
رات دن،
ابتدا، انتہا
موت اور زندگی
جیسے اس بیکراں وقت ہی کے بدلتے ہوئے رنگ ہوں
اور ہر رنگ یہ کہہ رہا ہو
"تم بھی میری طرح جاوداں ہو
تم بھی میری طرح جاوداں ہو"

احمد ظفر

آئینہ

پھولوں سے چہرے
پتھر سے دل
انگاروں پر لوٹ رہے ہیں
سرد جہنم جلتے جلتے
نگری نگری پھیل رہا ہے

سایۂ ابرِ رواں نے مجھ سے
برسوں اک سرگوشی کی ہے
کالے پتھر میں بھی دل ہے
کالی مٹی میں بھی کتنے پھول چھپے ہیں
ساز کسی بھی ہاتھ میں آئے
گیت سنائے
مشرق میں بہتی ہے ندی
گیت وہی ہے
مغرب جس کو سنتے سنتے جاگ رہا ہے

مغرب ایک سمندر — پانی
پھر بھی اس کی لہر لہر سے
آگ ہی آگ بکھر جاتی ہے

احمد ظفر

ایک آواز

یہ نیلا پیلا کالا دن
کیوں مجھ کو یاد دلاتا ہے
پہلے بھی یہاں میں آیا تھا
اک پھول کی صورت مہکا تھا
اک شعلہ بن کر دہکا تھا
ان آنکھوں میں، اس ماتھے پر
زخموں کے نشاں سے باقی ہیں
میں دار و رسن کے سائے میں
گردن کو جھکائے بیٹھا تھا

جلاد وہی شمشیر بکف
اک ابر کی صورت ابھرا ہے
گلشن میں لہو ہے میرا لہو
جو زینۂ جسم سے اُترا ہے
ہر شاخ نے لی ہے انگڑائی
ہر پھول کا چہرہ نکھرا ہے
یہ پھیلتی بڑھتی کرنیں سی
شاید میرے وہ بازو ہیں
جلاد نے جن کو کاٹ دیا

منظور عارف

ڈروں اکیلی

روشنی پہلی بار ہی بحر پہ اُتری ہے
ایسا بحر کہ جس کا ساحل کوئی نہیں
میں اِک ذات کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہوں
جیسے ہر سُو، سارے بحر پہ پھیل گئی ہوں

سُورج چور ہے، بحر کا پانی لے اُڑتا ہے
بحر کا پانی،
ٹکراؤ سے،
ٹھہراؤ میں
جھاگ بنا ہے
صدیوں سے یہ کھیل تماشہ دیکھ رہی ہوں
اب کہیں جا کر
اُٹھتا، رُکتا جھاگ جما ہے
ڈروں اکیلی
کیوں نہ میں اپنے آپ کو پارہ پارہ کر کے
جگہ جگہ
گِرے، جمتے جھاگ کی گود میں سو جاؤں
جہاں کہیں بھی آنکھ کھلے
اپنی ذات سے آپ لڑوں
اپنے آپ سے پیار کروں

امین راحت چغتائی

سرِ شام

سرِ شام پھر باغ میں آ گیا ہوں
اُسی مخزنِ رنگ و بُو کی لگن میں
کہ جس نے کبھی روح کو تازگی، کیف و مستی کی دولت عطا کی
فضا کو دلآویزی کا جادو داں دی
نگاہوں کو حسنِ طلب کے نئے زاویے، دل کو تہذیبِ جذبات دے کر
روایات سے پیار کرنا سکھایا

یہاں کاسنی، اودے اودے، گلابی، شہابی
سبھی پھول ہیں
سبزہ زاروں میں جائیں تو بیلے کی خوشبو فراواں فراواں،
کہیں موتیے اور چنبیلی کی مہکار راحت بداماں
گلابوں کے تختوں میں ہر دیدہ و دل کی تسکیں کا ساماں،
یہاں ڈھاک ہے
جس کے پھولوں سے مغلوں نے اپنی تصاویر کے رنگ اُبھارے
اِسی ڈھاک کے رنگ کی دلکشی سے

بسا دن نے، دسونت نے مغلِ اعظم کے دربار میں داد پائی
یہاں ایک بوڑھا شجر بھی ہے
جو زیست کے خارزاروں سے تنگ آ کے گوتم بنا
گیان میں محو ہے
—— اور یہ سب روایاتِ ماضی ہیں
ان کا بھلا عہدِ حاضر سے رشتہ ہی کیسا!
یہاں تو ہری گھاس پر ٹکڑیوں میں بٹے لوگ بیٹھے
سبک گام بادِ معطّر کے جھونکوں سے فرحاں و شاداں
ہجومِ گُل و رنگ پر تبصرے کر رہے ہیں
میں کب سے کھڑا ہوں،
سماعت کی اس تشنگی کو بجھاؤں تو کیسے،
میں وہ قہقہے ڈھونڈتا ہوں
جو گونجیں تو ایسا گماں ہو
کہ جیسے سرِ شام دلّی کے باغوں میں بجتے کٹورے

الیاس عشقی

کانٹریکٹ برج[1]

پارٹنر[2] کال[3] تو دو، سوچتے کیا ہو بھائی
میں نے ٹو ہارٹس[4] کہا، فور کلب[5] تم بولے
دھیان کس سمت ہے، کچھ بات سمجھ میں آئی
اچھا نو بڈ[6] ہے، سنبھل جاؤ تو بازی ہو لے
فائیو نو ٹرمپس[7]! بہت خوب، تو پھر یوں ہی سہی
اب بھی نو بڈ ہے، چلو خوش رہو کیا بات کہی

اتنے نروس[8] نہ ہو، اچھا چلو پتے تو دکھاؤ
پتے ایسے ہیں کہ تم کال بھی دے سکتے تھے
اپنا یہ کھیل ہے، اسپیڈ[9] کو رف[10] کرتے جاؤ
پہلی بازی میں بھی تم منہ تو یونہی تکتے تھے
ڈائمنڈ[11] ایس[12] کوئن[13] جیک[14] کوئی بات نہ تھی
تم اگر ٹرمپس سے چلتے تو کبھی مات نہ تھی

اب بھی سنبھلے نہ اگر، سلام[15] کی تیاری ہے
کال کو میری سمجھ کر تمہیں دینا ہے جواب
کیسے تم سے کہوں میں، بازی یہ کیوں ہاری ہے
پتے باؤنس ہی تو ہیں، کون سا مشکل ہے حساب
پارٹنر، کھیل تو تم ویسے سمجھ جاتے ہو
پتے ہوتے ہوئے پھر کس لیے گھبراتے ہو
بازی بدلی ہے، اٹھاؤ چلو اب دوسرا پیک[16]
بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، چلو تم نے دو سلام
کیا تعجب ہے کہ اس بازی میں ہو جائے چیک[17]
ویسے پتے ہیں نرمل، اس میں نہیں کوئی کلام
چال اُس سمت سے گر ٹھیک چلی جائے گی
میرا ذمہ ہے کہ بازی یہ پلٹ جائے گی

کھیل ہے کب تک اس کھیل سے گھبراؤ گے
پارٹنر، زیست بھی کنٹریکٹ برج ہے پیارے
زندگانی میں بھی نو بڈ ہی کہے جاؤ گے
کال جو بھولے وہی لوگ ہیں مت کے مارے
کھیل کی بات الگ، ویسے رہے ہیں غم بھی

1 Contract Bridge 2 Partner 3 call 4 Two Hearts 6 No Bid 7 Five noDumps 8 Nervous 9 Spade 10 Rough 11 Diamond 12 Ace 13 Queen 14 Jaak 15 Slam 16 peek 17 check

زندگانی میں تو نو ٹرمپس رہے ہیں ہم بھی

کال تھی جن کی بلف ان کا تو بنتا ہے سلام

ہم اصولوں کو لیے بیٹھے ہیں بس ایک طرف
ہارٹس سے اپنا چلا کوئی نہ اسپیڈ سے کام
ان کا کلب ہو گیا ڈائمنڈ بہت گیم تھا ٹف
جس نے کانٹریکٹ کیا کھیل وہی جیت گیا
وقت ہم دیکھتے ہی رہ گئے، یوں بیت گیا
شارپر جتنے ہیں اک دوسرے کو جانتے ہیں
یو این او کلب میں بھی کانٹریکٹ برج کھیلتے ہیں
کس کی کیا چال ہے سب چہرے سے پہچانتے ہیں
اونگھتا کوئی جو بل جائے تو سب جھیلتے ہیں
یہ جگہ وہ ہے نہ اپنا ہے جہاں کوئی نہ خویش
سب سمجھتے ہیں برج اصل میں ہوتا ہے فلیش

اور برج بھی کبھی ہو جائے تو جھک جاتے ہیں سر
منہ میں خروشیف کے بلف کرتے ہی آ جاتا ہے کف
آل نو ٹرمپ بھی گھانا کا نہیں آتا نظر

چین کا پتہ جب آ جائے تو ہو جاتا ہے رف
سویپ کر لینے کے اغیار رہیں کب سے دبے
اس کی تقدیر کا پتہ ہی نہیں گرتا ہے

اس کی کیا فکر کریں پوائنٹس ہیں کس کے کتنے
جب نے گنتے گئے اس کا ذرا دھیان رہے
اسی ٹیبل سے اٹھا کرتے ہیں سارے فتنے
دین کی خیر، سلامت ترا ایمان رہے
جانِ من! آج کا لوزر ہی تو ہے کل کا ونر
آج پر سب کی ہے ہنوئی کی ہے کل پہ نظر
کانگو، کوریا، الجیریا کشمیر کیسے
تم نے کنٹریکٹ برج کر کے نہ کٹ تھروٹ کیا
پھر بھی راس آئی ہے اسٹیک کی زنجیر کیسے
شار پر جب کبھی ڈالر سے کوئی مول لیا
اس نے بلف کر کے نہ ہونے دیا برج کو بدنام
تم سے ڈالر لیے اور الٹا دیا گرینڈ سلام

Game Tough Cotract Sharper U.N.O club Bridge
Flash Kruschev Bluff All no Trumps Ghana Rough
Sweep Points Table Loser Winner Hanoi Congo
Korea Algeria cut Throat stake Daller Grand Slam

فہمیدہ ریاض

اپنے دوست کے لیے

یہ زرد موسم کے خشک پتے
ہوا جنھیں لے گئی اُڑا کر
اگر کبھی ان کو دیکھ پاؤ
تو سوچ لینا
کہ ان میں ہر برگ کے نمو میں
زیاں گیا عرق، شاخِ گل کا
کبھی یہ سرسبز کونپلیں تھے
کبھی یہ شاداب بھی رہے ہیں
کھلے ہوئے ہونٹ کی طرح نرم اور شگفتہ
بہت دنوں تک

یہ سبز پتے
ہوا کے ریلوں میں بے لبی سے تڑپ چکے ہیں
مگر یہ اب خشک ہو رہے ہیں
مگر یہ اب خشک ہو چکے ہیں
اگر کبھی اس طرف سے گزرو
تو دیکھ لینا
برہنہ شاخیں ہوا کے دل میں گڑی ہوئی ہیں
یہ اب تمھارے لیے
نہیں ہیں

فہمیدہ ریاض

دل کی بات

اپنے دل کی بات کو ہم نے رات بہت سمجھایا
پہلو بدلے بستر پر اور دل کا درد دبایا
اب حیران کھڑے تکتے ہیں اس کی پیاری صورت
اپنی بات گنوا بیٹھے اور کچھ بھی ہاتھ نہ آیا
جس کے دل میں درد نہیں، ہم اس سے کیا کہہ بیٹھے
کیا چمکیلا موتی تھا، مٹی میں جسے ملایا
ہنگاموں میں اسے بھلایا۔ لیکن جب بھی لوٹے
بوجھل قدم ہوئے اور انجانے میں دل بھر آیا

کمار پاشی

میرا جُرم

دیوتاؤں نے مجھ سے کہا تھا: کہ جب
چندرماؤں کے آئینوں پر گرد جم جائے گی
اور سُورج سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جائیں گے
تب ہر اک رنگ کالک میں تبدیل ہو جائے گا
رستہ رستہ اندھیرے بکھر جائیں گے

اور تم کو ہوا بن کے چپ چاپ
اندھے سفر پر نکلنا پڑے گا
ہزاروں برس
موت کی وادیوں میں بھٹکنا پڑے گا

مرا جُرم یہ ہے: کہ میں ایسے سُورج سے پیدا ہوا
جس کی تقدیر میں ایک پل کا
فقط ایک پل کا اُجالا لکھا ہے
مرا جُرم یہ ہے: کہ میں اس تماشے میں لایا گیا
آخری آدمی ہوں

یہ پاگل اور مُنہ زور ہوا

آؤ۔۔ کہیں چھُپ کر بیٹھ رہیں
کچھ اپنی کہیں، کچھ تُم سے سُنیں
یہ وقت بڑا ہی نازک ہے
یہ پاگل اور مُنہ زور ہوا
معلوم نہیں کیا کر بیٹھے
موسم کے ارادے ٹھیک نہیں
کچھ ٹوٹ رہا ہے دُور کہیں

آؤ۔۔ کہیں چھُپ کر بیٹھ رہیں
طوفان تو جب بھی آتے ہیں
ہر چیز بہا لے جاتے ہیں

ادیب سہیل

میری تخلیق

شعر گوئی ہو کہ کوئی مرحلہ
میں تصنع کا کہیں قائل نہیں

دیکھتا ہوں کھُردرے پن میں حقیقت کی شبیہہ
روح کو ملتا ہے اِس جلوے سے اِک طرفہ سرور

اِس قدر بس رنگ آمیزی روا رکھتا ہوں میں
تاکہ تخلیقات میں پیدا ہو حسنِ امتزاج

یہ مری تخلیق

میرے خوں کا نقش دلنشیں ـــ نظمِ حسیں
صاحبِ ثروت کی بدصورت کوئی دختر نہیں

ڈال دوں جس کو مطلا خول میں
جس کو مقبولِ نگاہِ عام کرنے کے لیے
نت نئی تزئین و آرائش کروں!

خالد شیرازی

ایک نظم

میں اپنے احساسِ کمتری کو چھپاؤں کیسے!
نہ میرے ہمراہ میرا سایا
نہ میری تقدیر میرے حق میں

میں اپنے احساسِ کمتری کو چھپاؤں کیسے
کہ میری آواز اپنے سائے سے ڈر رہی ہے
بکھر رہی ہے
بکھر رہی ہے کہ مر رہی ہے، کوئی بتاؤ!
کوئی بتاؤ: قنوطیت کی یہی سزا ہے؟

[illegible]

پروین سیّد فنا

تضاد

آج کی رات ساتھ لائی ہے
اَن کہے گیت، اَن سُنے نغمے
اَن گنت خواب جو ادھورے ہیں
کتنے گل، کتنے داغ، کتنے خیال
رات کے ساتھ لوٹ آئے ہیں

رات کی تیرگی مری ہمدم
رات کی خامشی رفیق مری
میرے محبوب، تیری یکتائی
میرے ظلمت کدے کی رعنائی
اس اندھیرے کے دم سے لوٹ آئی

دن کی آغوش وا ہوئی تو افق
اک بھڑکتا ہوا الاؤ بنا
دامنِ تیرگی میں آگ لگی
ہر طرف روشنی ۔ کراں بہ کراں
ہر طرف زندگی کا سیل رواں

خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا
مر گئے گیت، جل بجھے نغمے
اُڑ گئے خواب دھجیاں بن کر
روشنی کا یہ ظلم کس سے کہوں
آنکھ اٹھاؤں تو دیکھ بھی نہ سکوں

پھر بھی بہلائے کوئی چیز مجھے
پھر بھی ہے روشنی عزیز مجھے

اعجاز فاروقی

مسافر کا کرب

وہ ہے برگد
اس کی ریش
اس کی گھنی پُرپیچ شاخیں
اس کے تن کو
تند صرصر سے بچاتی تھیں
اور اس کے گھرے سائے میں تھکے ہارے مسافر
آکے سستاتے رہے ہے
سامنے جو ایک ہوٹل ہے
کبھی اک ریت کا ٹیلہ تھا
اب سارے تھکے ہارے مسافر
اس میں رُکتے ہیں
شکستگیوں کی حدّت کو مٹانے کے لیے
یہ بھی سُنتے ہیں کہ ہوٹل میں بھی کوئی سُکھ نہیں ملتا
وہاں شورِ قیامت ہے، دھواں ہے اور گرمی ہے
کوئی کہتا ہے برگد کے خنک سائے میں جو سُکھ تھا
وہ ہوٹل میں نہیں
اور برگد
سُوکھ کر کانٹا ہوا ہے
اس کے پتے جھڑ چکے ہیں
ٹہنیاں ننگی کھڑی ہیں
آگ برساتی ہوئی سورج کی کرنیں
اس کے تن کو جھلس رہی ہیں

ا-ح- نورِ ازل

بے چارہ

میں ہوں اِک طائرکِ رشتہ بہ پا
چل کے کچھ دُور ہی گِر جاتا ہوں
زخموں سے رِستے ہوئے پاؤں میں زنجیرِ حیات
دامِ ماحول کے کستے ہوئے بند
مُڑنا چاہوں تو اُلجھ کر رہ جاؤں

چشمِ بینا بھی ہے اور گوش بھی ہے سمع نواز
رگِ ارماں میں لہو بھی ہے رواں
جذبے طوفان اٹھانے والے
فکر ہر لمحہ پَرافشاں سرِ راہِ تحقیق

کیا کروں زخموں کو زنجیروں کو
کیسے ماحول کے تابوت سے باہر نکلوں
کیسے پرواز کروں
اُف یہ زنجیر، یہ تابوت، یہ ناسُور، یہ ساعت کی لکیر!

عرفانہ عزیز

نوحہ

کون آتا ہے دبے پاؤں اُجالوں کی طرف
صاحبِ جاہ و شرف!
آتشِ تر سے سلگتے ہُوئے لب
جام بکف!

حُسن افسردہ خموش و دلگیر
خامشی کربِ دروں کی تفسیر
مضمحل جسم تذبذب کا شکار
سرد ہاتھوں میں لرزتا آنچل
سعیٔ بے سود حقیقت سے فرار

دل کی نوخیز اُمیدوں کا لہو
چشمۂ رنگِ حنا۔ چاہِ ذقن
اجنبی لمس سے مجروح بدن

گوشۂ چشم میں سمٹی ہوئی لے
اشک گلگوں سے عیاں
رنگِ پیراہنِ دل
ہچکیاں بلب — نوحہ کناں!

تنہائی

کُنجِ گلشن میں خواب آلودہ
نرگستوں کے چھلک رہے ہیں سبو
کیف زا تازگی شگوفوں کی
بھینی بھینی گلاب کی خوشبُو!
نرم جھونکوں کی سرسراہٹ سے
چونک اُٹھتا ہے سازِ تنہائی!
اور گلشن میں نیم خوابیدہ
غنچۂ یاسمن کی رعنائی
زیرِ لب گنگنانے لگتی ہے
جیسے بجتی ہو دُور شہنائی!

پھول تازہ ہیں تیری یادوں کے
چاند پونم کا مسکراتا ہے
اور پلکوں تلے محبت کا
اک اُجالا سا پھیل جاتا ہے

فہیم جوزی

سنگت

تیری میری سنگت اک ان جانی کہانی
جیسے دو ننھے بالک اک پیڑ پہ بیٹھے
ایک ہی پھول کو بے سدھ، جانے کتنے سمے سے
دیکھ رہے ہوں!

پھول کبھی دھرتی کے من کی دُکھتی خوشبو
پھول کبھی سب کی آنکھوں کے سکھ کا سپنا
اپنے دھیان میں گم سُم ایک ہی بھید بتائے
کیا دکھ... کیا سکھ!

آؤ ہم بھی آنے والے دنوں کی بھول میں جھولیں
تیرے میرے سارے دُکھ سکھ
اُڑتی ہوا کی ہر سلوٹ میں گم ہو جائیں
آخر اک دن
ہم بھی دھرتی کے سینے پر اک کیاری میں
پھول بنے... لہرائیں!

گم شدگی

ایک برس کے کٹھور دنوں کا تپتا مقدر
میری آنکھ میں وحشت بن کر جاگ رہا ہے

تُو نے میری ذات کو ریزہ ریزہ کر کے رقص کیا
لیکن میں خاموش رہا
تو نے بھی دیکھا
اور اچانک مجھ سے گریزاں
لمحوں کی بے پایاں کہر میں اک دن مجھ سے بچھڑ گیا

ایک برس کے بعد......
میں اپنی ذات کی دھن میں
تیرے پاس کھڑا ہوں.... تجھ سے پُوچھ رہا ہوں:
"میرا نام بتاؤ مجھ کو؟"
تو بھی مجھ سے پوچھ رہا ہے.... جانے کیوں؟
"میرا نام بتاؤ مجھ کو؟"

ساقی فاروقی

جین مائکلسن

Better Books کتابوں کی ایک دکان ہے جہاں ہر دوسرے ہفتے غصیلے ادیبوں کا مجمع لگا کرتا ہے۔ نظمیں، ڈرامے اور کہانیاں پڑھی جاتی ہیں اور پھر لے دے ہوتی ہے۔ رات کے بارہ بجے تک یہ سلسلہ چلتا ہے اور پھر لوگ اپنے اپنے گھروں اور اپنی اپنی بارکوں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک اجتماع میں جین سے ملاقات ہوئی اور واپسی میں ہم ساتھ ہی آئے اس لئے کہ یہ بھی Golders Green ہی میں رہتی ہیں۔ میرے ساتھ میرا یار فرنندہ اور سہیل بھی تھے۔ ہم لوگ رات کے دو تین بجے تک ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے رہے۔ پھر میں نے جین سے کہا کسی دن آکر میرے ٹیپ ریکارڈر پر اپنی کچھ نظمیں ریکارڈ کر جائیں اور کچھ نظمیں دے جائیں۔ اس لئے کہ تمام غصہ ور ادیبوں میں شاید یہ واحد خاتون ہیں جنھیں سب سے کم غصہ آتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ دو تین مہینے بعد پھر ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اسپین گئی ہوئی تھیں چھٹیوں میں اور اب خالی ہیں چنانچہ اتوار کو آئیں گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں اپنے کچھ دوستوں کو بلاؤں گا۔ نظمیں ہوں گی اور باتیں ہوں گی۔

اتوار کو وہ آئیں اور پچاس نظموں سمیت، میرا تو دم ہی نکل گیا۔ میری اور خاتون دوست تھیں Gunhild Shröder انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی۔ پھر میں نے کہا ایسا کریں گے کہ دو نظمیں تم پڑھو اور دو میں اور ہر چند کہ میں M.A. (English) میں فیل ہو چکا ہوں تاہم کوشش کروں گا کہ اپنی نظموں کا ترجمہ کروں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جاتے وقت وہ اپنی نظمیں چھوڑ گئیں کہ جو پسند آئیں میں فنون کے لئے ترجمہ کر دوں اور چونکہ میں نے ٹیلیفون پر تصویر کی فرمائش بھی کی تھی۔ تصویریں بھی دے گئیں اور میری کتاب کے لئے دو سرورق بھی بنا کر دے گئیں۔ جو مجھے پسند نہیں آئے۔ میں نے تین نظموں کے ترجمے کئے جو مجھے پسند آئیں اور حاضر ہیں — دو چار چھوٹی چھوٹی باتیں اور — آرٹسٹ بھی ہیں یہ خاتون اور اداکارہ بھی۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے معاش کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے پڑھاتی رہیں۔ باتوں میں کاٹ ہے اور جم کر بولتی ہیں۔ شادی نہیں ہوئی اور نہ اس کا ارادہ ہے۔ عشق کیا تھا سخت ناکام ہوئیں اس لئے کہ Surrender کرنا نہیں آتا۔ جاپان اور ہندوستان اور پاکستان سے اندر ہی اندر ایک تعلق محسوس کرتی ہیں۔ شعر و شاعری زندگی ہے اور e. e. cummings روحانی پیشوا۔ cummings خوش قسمت شاعر ہے جسے ایسے ایسے پرستار ملے۔ مجھے تو سارے نئے لکھنے والے اس کے قائل نظر آئے۔

جین مائکلسن
ترجمہ: ساقی فاروقی

نیا جنم

میں اپنے بدن کی کھال اتار دوں گی
یہ مجھ پر بھاری ہے
میں اسے روح تک چھیل دوں گی
اور دنیا میں غیر مرئی بن کر داخل ہوں گی
تمام نئی دریافتیں دیکھوں گی
سب نئی تصویریں اور صنم
جو بچوں نے ابھی ابھی بنائے ہوں گے
اور دُنیا کی ترقیوں اور مصیبتوں میں حصہ بٹاؤں گی
اور یوتو شینگو کے ہاتھ پکڑ کر کہوں گی
اس کے سبب میں آدمی بنی
کسی کا ہاتھ تھام لینے کے علاوہ دُنیا کیا ہے
تمہارے اور میرے ہاتھ
ان کے ہاتھ جنھیں ہم جانتے ہیں
ان کے ہاتھ جو اجنبی ہیں
تو آؤ ہم سب ایک دُوسرے کا ہاتھ تھام کر
رُوح کی آگ پھیلائیں

جین مائکاسن

ترجمہ : ساقی فاروقی

لالچ

مجھے اپنا بستر دے دو —— تمھارے لیے بچھا دوں
مجھے اپنا سیب دے دو —— تمھارے لیے تراش دوں
مجھے اپنے کپڑے دے دو —— تمھارے لیے دھو دوں اور رفو کر دوں
مجھے اپنے پیسے دے دو —— تمھارے لیے بچا دوں اور خرچ کر دوں
مجھے اپنا دل دے دو —— تمھارے لیے توڑ دوں

رات کا خیال

اگر دن اسے میرے پاس لائے گا
تو جی میں ہے کہ دن کا سمندر
اسی لمحے میرے کمرے سے گزر جائے
لہراتا موجیں مارتا

ایوب صابر

کتاب

یہ کہہ کے ہم نے کباڑی کو سونپ دی ہے کتاب
ہے اس کی جلد پُرانی مگر نئی ہے کتاب

لکھی جو میرے حریفوں نے صرف ایک غزل
تو میں نے تاؤ میں آ کر گھسیٹ دی ہے کتاب

کہاں ہے وقت کہ جائیں ضخیم جلدوں کو
ذرا سا وقت ملا ہے تو سُونگھ لی ہے کتاب

ہزار لفظ مجھے کاٹنے کو آتے ہیں
چڑیل کی طرح دل میں بسی ہوئی ہے کتاب

کسی کو گنج ملا اور کسی کو رنج ملا!
زہے نصیب مجھے راہ میں ملی ہے کتاب

مصنفین گھسے ہیں کتاب خانوں میں
مصنفین کی صف میں گھسی ہوئی ہے کتاب

مرے دماغ کی ہر چُول کتنی ڈھیلی ہے
جو پڑھ چکا تو یہ جانا، پڑھی ہوئی ہے کتاب

ہر ایک سمت اندھیرا ہے، وہ بھی کتنا گھنا!
اگرچہ طاق پہ صدیوں سے جل رہی ہے کتاب

چمن میں اس طرح بارش ہوئی خیالوں کی
جہاں بھی دیکھو وہیں پر اُگی ہوئی ہے کتاب

یہ اپنا اپنا مقدر ہے، اپنا اپنا نصیب
کسی نے بیچی، کسی نے خرید لی ہے کتاب

لہو لگا کے شہیدوں میں نام کر لیں گے
کہ آج کل میں ہماری بھی چھپ رہی ہے کتاب

چلم کے کش نہ لگائیے، کتاب پڑھ ڈالی
کہ اور کچھ بھی نہیں ہے، چلم کشی ہے کتاب

منصور قیصر

موت کا طربیہ

میں جس دن فوت ہوا اُس دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

مجھے بارش ہمیشہ پسند رہی ہے۔ بچپن میں وہ مجھے اس لئے اچھی لگتی تھی کہ بیمار ہونے پر جب میری ماں مجھے بستر سے اُٹھنے نہیں دیتی تھی تو مجھے اس خیال سے اطمینان ہو جایا کرتا تھا کہ محلے کے باقی بچے بھی بارش کی وجہ سے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں، اور بارش انہیں بھی کھیلنے نہیں دے رہی۔ "ٹین ایج" میں بارش اس لئے اچھی لگتی تھی کہ بارش میں نہاتے ہوئے بجلی کے کھمبے سے بھی رومانٹک ہونے کو جی چاہا کرتا تھا اور فوت ہونے کے بعد بارش اس لئے رحمت معلوم ہو رہی تھی کہ ان اقربا اور عزیزوں کی باتیں سننے کا موقع ملا جنہیں میں زندگی میں بے حد چاہا کرتا تھا۔

مرنے کے بعد میں بارش سے جس قدر تازگی، بالیدگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا اُسی قدر تمام حاضرینِ ماتم کدہ بیزار نظر آ رہے تھے۔ خاص طور پر عورتیں روتے روتے جب سانس کو ناک کے ذریعے پھیپھڑوں کے علاوہ دماغ کی طرف چڑھاتیں اور "خُر خُر" کرتے ہوئے آسمان کج رفتار کی طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں ایسی اکتاہٹ جھلکتی جیسے کہہ رہی ہوں "مولا اب تو میت پر رحم کر"

میرے سسر اپنے گنجے سر پر پڑی ہوئی بوندوں کو تولیے سے پونچھتے ہوئے بار بار زنان خانے میں آتے اور رشتے میں میری ایک خالہ سے کہتے۔

"ہیں جی! اب تو ملکہ ہی کھل گیا ہے"

اور خالہ سنی اَن سنی کر کے یہی کہتیں "ابھی تک نان نہیں آئے۔ سبز چائے کا تو کاڑھا بن گیا ہے۔ مہمانوں کو کیا کھلانا ہے؟"

میرے سسر نان کلچوں کا سن کر بیٹھک میں چلے جاتے اور میں عورتوں کی باتیں اور بین سننے لگتا۔

میری ماتم گساری کے لئے کافی تعداد میں خواتین و حضرات آئے تھے۔ ایسے لوگ بھی جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ گہرے دوست تھے اور ایسے بھی تھے جن سے رسماً ملاقات رہی تھی۔ خواہش یہی تھی کہ آخری وقت ان کی قربت میں گذارا جائے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مرد جو اپنے آپ کو مرد، آدمی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، مرنے کو اپنے قریب رکھنے کی بجائے عورتوں میں کیوں دھکیل دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ عورتیں مردہ گرفت ہو کر رو رو کر ہلکان ہو جاتی ہیں اور مرد حقہ بدست کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔

میری ایک ہمسائی بالکل میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ عالمِ زندگانی میں اسے اکثر و بیشتر پیسے قرض کے طور پر دیا کرتا تھا۔ قرض دینے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے گھر میں کام کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی شلوار کو پنڈلیوں تک چڑھا کر رکھتی۔ شاید اسے اس کا احساس ہی نہ ہو مگر میرا فرض تو نکھرتا تھا اور میں اسے پورا کرتا رہا۔ اسی ہمسائی نے جب روتے ہوئے کہا "ہائے میرے ویرا" مجھے ذرا سی شرمندگی ہوئی مگر فوراً مر گیا کہ ماحول ہی موت کا تھا۔

عورتیں جب رو رو کر تھک جاتیں تو چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھا جاتی۔ لگتا ہے کہ گا ہے گا ہے کسی شیر خوار کا رونا خاموشی کی اس ندی

میں لہریں سی پیدا کر دیتا۔ پھر کچھ لمبی لمبی آہیں سنائی دیتیں۔ اس کے بعد کچھ کانا پھوسی ہوتی جس کا لب لباب یہی ہوتا کہ یہ طویل بوریت کب ختم ہوگی۔ اسی دوران میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی سنیں۔

میری ایک رشتہ دار اپنی نند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور رشتہ دار سے کہنے لگیں "شرم نہیں آتی اسے ساٹھ جن بھکی ہے اور آنکھوں اُٹھائے پھرتی ہے۔"

دوسری نے جواب دیا "دیکھو تو یوں لگتی ہے جیسے تنور کو سر لگ گیا ہو۔"

اور تنور پر رکھا جو امر میری چھوٹی بہن سے پوچھ رہا تھا "یہ ٹاپس تو بڑے اچھے ہیں۔ میں بھی ایسے ہی بنواؤں گی بے بی کے ابا سے کہہ کر۔"

ابھی یہ جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بے بی کے ابا ہونٹوں کو یوں ہلاتے ہوئے اندر داخل ہوئے جیسے مونچھوں پر سے مکھی اڑا رہا ہو۔ بے بی کے ابا میرے ماموں حکم دین ہیں جنھیں عرف عام میں بھا حقہ کہا جاتا ہے۔ ماموں حکم دین سائیکلیں مرمت کرتے ہیں اور جس دن کوئی سائیکل پنکچر لگوانے کے لیے نہ آئے تو غصے میں اتنے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ اس کی تفصیل ممانی ہی بتا سکتی ہیں۔

بھا حقہ زنان خانے میں داخل ہوتے ہی تنور پہ رکھے ہوئے سر سے کہنے لگے "بیتو ڈھیری ٹائٹ ہو گئی ہے۔"

ممانی نے بڑے مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں نے کہا مولوی صاحب کو تو بلا لاؤ میت تو بغیر غسل کے ہی پڑی ہے۔"

بھا حقہ نے چڑ کر جواب دیا "مولوی صاحب تو پتہ نہیں کہیں غسل کر رہے ہیں یا کیا باعث ہے ملتے ہی نہیں، کچھ خود ہی ہاتھ پیر ہلاؤ نا۔"

"ہائے ہائے ہم مردے کو کیسے نہلائیں۔" ممانی نے اپنے گال پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔"

عورتیں سینہ کوبی اور اشک باری سے تھک کر ابھی تازہ دم ہی ہو رہی تھیں کہ سیڑھیوں میں سے ایک عورت کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ باقی عورتیں جو ہانپ ہانپ کر مگرمچھوں کی طرح منہ کھولے سانس لے رہی تھیں اس کا ساتھ دینے لگیں۔ ایک بار پھر وہ سینہ کوبی اور وہ اشک باری ہوئی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میرا خود بھی جی چاہنے لگا کہ اس کمرے سے جلد سے جلد دفع ہو جاؤں لیکن میں تو مر چکا تھا اور اب اپنے رشتہ داروں کے رحم و کرم پر تھا جو بارش کے رحم و کرم پر بیسیوں تمباکو پھونک چکے تھے اور بیٹھک میں پڑے ہوئے اخبار کے طاقتور گولیوں تک کے اشتہار پڑھ چکے تھے۔

نووارد خاتون جب اپنے جی کو ہلکان کر چکی تو پوچھنے لگی "کیا ہوا تھا اسے پرسوں تو اچھا بھلا تھا۔ ہائے اللہ! میرے گھر آیا تو کہنے لگا۔ بھابی میں تو چنے کی دال اور چاولوں کے لیے ترس گیا ہوں ہائے کرموں جلی میں نے تو اسے ٹال ہی دیا تھا — ہائے رے آخری بار دال چاول تو کھلا لینے تھے۔"

"کیا کھاتا بے چارہ۔" میری خالہ نے ناک کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا "کیا بتاؤں، بس بیٹھے بیٹھے ہی کچھ ہو گیا ہے۔ رب کی تو رب ہی جانے۔"

پھر میرے خالو کرم الٰہی کی آواز گونجی۔ آپ ٹوکو ورکشاپ میں فورمین رہے ہیں اور میرے وفات پانے تک سیکنڈ ہینڈ موٹروں کا کام کیا کرتے تھے انھیں بارش پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

ان کی بیٹی شادو آگے بڑھ کر بولی "میاں جی کیا بات ہے؟"

انھوں نے اکتا کر کہا "گولی مار میاں جی کو، بارش ہی نہیں تھمتی، سب لوگ جماہیاں لے لے کر ڈاؤن ہو گئے ہیں۔"

"کوئی غسل وغیرہ کا تو بندوبست کرنا تھا،" شادو نے کہا۔

ابھی خالو جواب دینے ہی والے تھے کہ ماموں حکم دین دور سے بولے "جانے یہ مولوی کہاں چلا گیا۔"

خالو نے شادو سے اپنے بیٹے رفیق کے بارے میں پوچھا۔

"یہ نیقا جہاں جاتا ہے ادھر ہی کا ہو جاتا ہے۔ آنے دو، اس کا بھی آج پلنگ کھینچ دوں گا۔"

رفیق کا نام سن کر ماموں جان بھی تنک کر بولے "میں بھی اسے دو گھنٹے سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ دوکان پر سائیکل پڑا ہوا ہے خال جاجب کا۔ انھیں شام تک ضرور پہنچانا ہے۔"

دہلیز پر دو مردوں کو باتیں کرتے دیکھ کر عورتیں خاموش ہو چکی تھیں اور مرغیوں کی طرح گردنیں موڑ موڑ کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ رفیق کا نام سن کر خالہ نے میری بیوی کے کان میں کچھ کہا اور خود خالو کے پاس آ کر کہنے لگیں "نیقا نان لینے گیا تھا، ابھی تک لوٹا نہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔"

اتنے میں میری بیوی اسٹور کو تالا لگا کر لوٹ آئی سٹور میں اس کے ریشمی کپڑوں کے دو صندوق پڑے تھے اور ہماری ایک ہمسائی سٹور کے دو چکر لگا چکی تھی۔

خالہ زاد بھائی رفیق نان کلچوں کا ایک ڈھیر سر پر اٹھائے بارش میں شرابور تھوڑی دیر بعد ہانپتا کانپتا پہنچ گیا۔ بارش کا پانی اس کے کپڑوں میں سے کم اور نان کلچوں میں سے زیادہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے گٹھڑی سر سے اتار کر ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن آواز گلے میں پھنس گئی۔ خالو کرم الٰہی نے طنز میں کہا "کیا ہوا ہے تیرے گلے کو سائی لنسر کیوں لگ گیا ہے؟"

"کچھ نہیں میاں جی" رفیق نے اس انداز میں جواب دیا جیسے گلے میں سے آواز کو گھسیٹ کر ہونٹوں پر رکھ رہا ہو۔ خالہ نے بڑھ کر گٹھڑی کھولی۔ نان اس قدر بارش زدہ ہو چکے تھے کہ ایک کو اٹھایا جاتا تو چار ایک ساتھ اٹھ آتے اور جب ایک کو الگ کرتے تو اس کے ٹکڑے دل کی طرح بزار ہو جاتے اور کوئی یہاں گرتا، کوئی وہاں ـــــ یہ حالت دیکھ کر خالو جان کی بیزاری میں اور شدت پیدا ہو گئی اور کہنے لگے "یہ نان لایا ہے کہ ماں کا سر لایا ہے۔"

رفیق نے جواب میں جب بارش کا عذر پیش کیا تو خالو جان نے اسی لہجے میں کہا "چھتری لے گیا ہوتا۔ تیرے دماغ کو بھی بریک آئیل دینا پڑے گا۔"

رفیق نے اپنا معرکہ خاک میں ملتے دیکھ کر کہا "میاں جی چھتری تو بھائی جان لطیف لے گئے ہیں۔"

لطیف کا نام سنتے ہی خالو جان کا پارہ اور چڑھ گیا اور بولے "اس کی شادی کیا کر دی ہے، اس کا خانہ خراب ہی ہو گیا ہے۔"

خالہ بولیں "لطیفا تو قبرستان گیا ہوا تھا، شاید دن کیوڑہ کے لئے بازار چلا گیا ہو۔"

خالو نے خالہ کو گھورتے ہوئے کہا "قبر کے لئے گیا ہے کہ مردوں کو کھیر کھلانے گیا ہے؟ اسے گھر کی ہوش ہی نہیں۔ اتنا تو پتہ ہونا چاہیے کہ گھر میں میت خراب ہو رہی ہے۔"

بھائی لطیف دیور میں گیئر لگا کر آ گیا۔ اس کی حالت بالکل اس بکرے کی سی ہو رہی تھی جیسے کسی کنوئیں میں سے زندہ نکال لیا گیا ہو۔ بھائی لطیف ہمارے خاندان میں پہلا میٹرک پاس نوجوان ہے اس لئے وہ باتوں میں کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ ضرور استعمال کرتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی خالو نے تحکمانہ لہجے میں پکارا "لطیفے"

"جی میاں جی" لطیفے نے گھبرا کر جواب دیا۔

خالو نے گرج کر کہا "میں کے پتر تیرا گیئر کہاں پھنس گیا تھا؟"

"کہیں نہیں میاں جی! میں کانو گورکن کو ڈھونڈ رہا تھا۔"

ماموں حکم دین، جو کچھ دیر سے چپ کھڑے مونچھوں کو بٹیروں کی طرح اچھال رہے تھے۔ بولے "اس لطیفے نے تو ہم سب کو کھرل کر دیا ہے"
خالو نے لطیفے سے پوچھا "قبر کا بندوبست ہو گیا ہے کہ نہیں؟"
لطیفے نے چوروں کی طرح منہ لٹکا کر جواب دیا "نہیں جی آج قبرستان میں ہالی ڈے ہے"
"اوئے کیا بک رہا ہے" خالو جز بز کر بولے۔
"سچ کہتا ہوں میاں جی۔ کالو کا باپ کہہ رہا تھا کہ جس دن بارش ہو اس دن ہم کام نہیں کرتے۔ آخر ہمیں بھی تو دنیا داری کے کام کرنے ہوتے ہیں۔"
"سن لیا حکم دین، یہ ہمارے خاندانی گورکنوں کا حال ہے۔ کس قدر سر چڑھ گئے ہیں، حرام کی کھا کھا کر" پھر لطیفے سے کہنے لگے "جا ذرا کالو کو بلا کر لا۔ میں آج اسے دفن کر دوں گا"

"میاں جی۔ وہ تو قبرستان میں نہیں ہے"
"کہاں گیا ہوا ہے" ماموں نے لقمہ دیا۔
بھائی لطیف نے ایک منٹ کے توقف کے بعد کہا
"وہ فلم دیکھنے گیا ہوا ہے جی"

فلم کا نام سنتے ہی ماموں جان اور خالو جان بادل کی طرح گرجنے لگے اور بادل شیروں کی طرح گرجنے لگے۔ مجھے پہلی بار بارش سے نفرت سی ہونے لگی اور میں نے سوچا سب دوستوں کو نصیحت کر دینی چاہیئے کہ مرنے سے پہلے آئندہ چوبیس گھنٹے کے موسم کے بارے میں محکمہ موسمیات سے پوچھ لیا کرو۔

عزیزہ بیگم

اصُول النغمات الآصفیہ

موسیقی کی تقریباً تمام کتابوں کے بارے میں ایک دلچسپ غلط فہمی ہر زمانے میں چلی آئی ہے۔ کرناٹک سنگیت کے علما ان کو اپنی کتابیں خیال کرتے ہیں۔ شمالی ہند کے علما ان کتابوں کو اپنی موسیقی سے متعلق ہونے کا دعویٰ پیش کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں سنگیت مکرند، سنگیت رتناکر، راگ ترنگنی راگ وبودھ، سنگیت پاریجات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ دونوں روایات کے علمبردار اپنے اپنے دعووں کے جواز میں دلیلیں لاتے ہیں۔ اس گرما گرم بحث کے پس منظر میں ہمیں ایک کتاب ایسی ضرور نظر آتی ہے جو صرف پاکستان اور شمالی ہند کی موجودہ کلاسیکی موسیقی سے متعلق ہے اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ یہ ہے محترم محمد رضا خاں کی مشہور و معروف کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" جس پر ہماری موجودہ موسیقی کے نظریات اور گائیکی کا دار و مدار ہے۔

بدقسمتی سے محمد رضا خاں کی زندگی کے بارے میں کوئی تسلی بخش تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ پٹنہ کے قوالوں یا رزمیوں میں سے تھے اور علم موسیقی میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے دربار سے متعلق تھے۔ انھی کی سرپرستی میں یہ کتاب لکھی گئی اور انھی کے نام سے معنون ہوئی۔ اس کتاب کا سنِ اشاعت ۱۸۱۳ء خیال جاتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج اس کتاب کا ایک نسخہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس کتاب کا ایک نسخہ کاشی یعنی بنارس کے مہاراجہ کی لائبریری اور دوسرا کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود تھے۔ دکن والا نسخہ اب لاپتہ ہے۔ موسیقی پر دوسری کتابوں میں جستہ جستہ اس کے حوالے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ہماری قوم کے ذوقِ سلیم پر ایک دلچسپ طنز ہے۔ البتہ ہندوستان میں چند لوگ اس کو دوبارہ شائع کرنے کی کوشش میں ہیں۔

موسیقی پر اکثر کتابیں دیوی دیوتاؤں کے مجہول قصہ کہانیوں سے شروع ہوتی ہیں اور ان کے مصنف موضوع کو کھینچ تان کر دیومالائی فرسودہ روایات میں الجھا دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ موسیقی کی ابتدا نارد منی سے ہوئی جو عالم بالا سے یہ علم سیکھ کر آئے یا یہ کہ مہادیو کے پانچ مونہوں سے ایک ایک راگ پیدا ہوا اور چھٹے راگ کی پیدائش پاربتی کے ذریعے ہوئی۔ یا یہ کہ مختلف جانوروں کی آوازوں کو اکٹھا کر کے موسیقی کی تشکیل ہوئی۔ مثلاً مور کی آواز (شرج)، بیل کی آواز (رکھب)، بکری کی آواز (گاندھار) وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ققنس پرندے کی چونچ میں سات سوراخ ہیں اور ہر سوراخ سے موسیقی کی ایک ایک سُر برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح کی اور بھی عجیب و غریب کہانیاں اور دیوی دیوتاؤں کے قصے موسیقی کی کتابوں میں ہمیں ملتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے علوم میں موسیقی کوئی اعلیٰ درجہ اب تک نہ پا سکی۔

حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ محمد رضا خاں پہلے مجتہد تھے جنھوں نے ان روایات سے اجتناب کیا اور موسیقی کو باقی علوم عقلی و نظری

کی طرح ایک علم قرار دیا۔ موسیقی کی بحث میں یہ ایک نیا اسلوب تھا جس نے اس کو باقی علوم کے ہم پلہ بنا دیا اور موسیقی کی تاریخ میں پہلی دفعہ منطقی طرز پر اس علم میں استدلال کو رائج کیا اور اسی انداز سے موسیقی کے مسائل پر غور کیا۔

تقریباً ایک ہزار سال سے علمائے موسیقی میں یہ بحث چلی آتی ہے کہ ہمارا بنیادی اسکیل یعنی شدھ سبتک کیا ہے۔ کوئی کافی راگ کو بنیادی مانتا تھا تو کوئی بھیرویں کو۔ مختلف مصنفین کے مختلف نظریات تھے۔ محمد رضا خاں نے پہلی دفعہ استدلال کے ذریعے ثابت کیا کہ ہمارا شدھ سبتک بلاول راگ کا اسکیل ہے اور باقی اسکیلوں کی بنیاد اسی پر ہے۔ یہی وہ اسکیل ہے جس کو ہم آج بنیاد مقرر کر کے اپنی گائیکی کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔

ہر زمانے میں راگوں کو مختلف گروہوں میں بانٹنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ مختلف زمانوں میں راگوں کی تقسیم مختلف اصولوں کے پیش کی گئی۔ کبھی تو ان کو جاتیوں کے اعتبار سے بانٹا گیا اور کبھی وادی سروں کے اعتبار سے۔ "سنگیت مکرند" کے مصنف نے (تقریباً ساتویں سے دسویں صدی عیسوی) پہلی دفعہ راگوں کو رسوں کے اعتبار سے مذکر مونث اور مخلوط وغیرہ قرار دیا گیا۔ نارد نے راگوں میں اس تذکیر و تانیث کے نظریے کو راگوں کے بنیادی جذبوں یعنی "رسوں" پر استوار کیا۔ "رس" ہندوستان کی جمالیات میں ایک اہم موضوع ہے۔ اس سے مراد مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ لفظ "رس" کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن موسیقی سے وابستگی پر "رس" کا مطلب راگ کا بنیادی جذبہ ہے۔ "رس" تعداد میں نو ہیں۔ شرنگار رس (محبت)، رودر رس (غصہ) ہاسیہ (مزاح)، بھیانک (تضحیک) ویر رس (بہادری)، کرونا رس (رحم)، جگوپسا (نفرت)، وسمایا رس (حیرانی)، شانت رس (امن)۔ اختلاف تو رسوں میں پایا جاتا ہے لیکن سردست یہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔

موسیقی میں یہ اصول بہت پہلے تسلیم کیا جا چکا ہے کہ مختلف آوازوں سے یا آوازوں کے مجموعوں سے انسانی ذہن کی مختلف کیفیات وابستہ ہیں۔ اس وجہ سے ہماری بائیس (۲۲) شروتیوں میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی ذہنی حالت سے یعنی "رس" سے متعلق کیا گیا اور ہر راگ ایک ایک بنیادی جذبے کا حامل قرار دیا۔

چونکہ مہادیو کے پانچ منہ تھے اس لئے پانچ راگوں کو بنیادی راگ تصور کیا گیا۔ پاربتی جی (جو قوت کا مظہر ہیں) کے نام سے بھی ایک راگ منسوب کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ کل ملا کے چھ راگ قرار دیئے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ چھ چھ راگنیوں کی شادی کی گئی۔ چنانچہ کل ملا کے چھ راگ اور چھتیس راگنیاں ہوئیں۔ اس خاندان کا سلسلہ اور بھی لمبا ہوا، ہر راگ کے کچھ بیٹے ہوئے اور پھر ان کی شادیاں ہوئیں۔

چھ راگ اور چھتیس راگنیوں کی تعداد کے اختلاف کی بنا پر مختلف متیں رائج ہوئیں۔ ویسے تو بہت سی متیں ہیں لیکن چار بہت مشہور ہیں۔ یعنی بھرت مت، شو مت، کالی ناتھ مت اور ہنومنت مت۔ ان متوں کے اختلافات صرف دو باتوں پر مبنی ہیں یعنی کون سا راگ ان چھ بنیادی راگوں میں آتا ہے اور دوسرا کونسے راگ کی کونسی راگنی ہے اور ان کے کون کون سے باہمی رشتہ دار ہیں۔

ہمارے ہاں کے گزشتہ کا راس وقت ایسی ہی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے جب محمد رضا خان نے اپنی "اصول النغمات الآصفیہ" لکھ کر تمام شمالی ہند میں تہلکہ برپا کر دیا۔ انھوں نے راگ راگنیوں اور متوں کی تقسیموں اور گروہ بندیوں کو خرافات قرار دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ اگر راگوں کی تقسیم کرنی ہی ہے تو انھیں سروں کی مناسبت سے تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے جن چھ راگ اور چھتیس راگنیوں کی گروہ بندی کی ہے

ل مزید ملاحظہ ہو معارف النغمات مطبوعہ بزم سدا رنگ۔ جس کے تعارف سے اس مضمون میں کافی حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔

ان میں یہ تعلق رس کی بنا پر نہیں بلکہ سروں اور سکیل کی مماثلت پر رکھا۔ ان کے راگ ، راگنیوں کی تقسیم مندرجہ ہے :۔

راگ	راگنیاں
۱۔ بھیروں	بھیرویں۔ رام کلی۔ گوجری۔ کھٹ۔ گندھاری۔ اساوری
۲۔ مالکونس	باگیشری۔ ٹوڈی۔ دیسی۔ سوہا۔ سگرائی۔ ملتانی
۳۔ ہنڈول	پوریا۔ بسنت۔ للت۔ پنجم۔ دھناسری۔ مارووا
۴۔ سری	گوری۔ پوربی۔ گورا۔ ترون۔ مالسری۔ جیت سری
۵۔ میگھ	مدھ مادھ۔ گوڑ۔ شدھ سارنگ۔ ہنڑ جنس۔ ساونت۔ سورٹھ
۶۔ نٹ	چھایانٹ۔ ہمیر۔ کلیان۔ کیدارا۔ بھاگڑا۔ ایمن

سروں کی مناسبت سے راگ راگنیوں کی تقسیم ایک انقلابی نظریہ تھا۔ جس نے اس موضوع پر پچھلے ایک ہزار سال کی کاوشوں کو کالعدم قرار دیا اور موسیقی میں نئی راہیں پیدا کیں۔ یہ درست ہے کہ وہ خود بھی چھ راگ اور چھتیس راگنیوں کے چکر سے یکسر تو نہ نکل سکے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان راہوں پر چل کر جن کی نشان دہی اُنھوں نے کی تھی، ہماری موسیقی موجودہ سانچوں میں ڈھلی کیونکہ ٹھاٹھ کے نظریے کی بنیاد بھی یہی سروں کی مناسبت ہے۔

اس معیار پر پرکھنے سے ہمیں محمد رضا خاں کا پایہ روایتی نائیکوں سے کچھ اونچا ہی نظر آتا ہے۔

(زیر ترتیب کتاب "ہمارے نامور موسیقار" کا ایک باب)

الیاس عشقی

سندھی روایتی شاعری

برصغیر پاک و ہند کی کلاسیکل موسیقی کا موجودہ کردار مسلمان ماہرین موسیقی کا رہین منت ہے۔ امیر خسروؒ سے پہلے دھرپد کا جو رنگ تھا۔ وہ اس سے بہت مختلف تھا جو ان کی اختراعات کے بعد ترقی کرتے کرتے میاں تان سین تک پہنچا۔ میاں تان سین اور سلطان حسین شرقی کی جدتوں نے کلاسیکی موسیقی کی کایا ہی پلٹ دی۔ گانے کے مختلف اسلوب جو اب ہماری کلاسیکی موسیقی کی خصوصیت ہیں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ موسیقی اپنی ہیئت، اسلوب اور فنی اقدار کے اعتبار سے تکمیل کی تقریباً انتہا تک پہنچ چکی ہے۔ تاثر کے اعتبار سے موسیقی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور اس کا تجزیہ آسان نہیں ہے البتہ وقت اور موسم کو اس کی اثر انگیزی میں بڑا دخل ہے۔ ہندوؤں کی قدیم موسیقی میں بعض موضوعات بھی شامل تھے۔ جن میں عبادت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی مسلمان موسیقاروں کے زیر اثر رفتہ رفتہ موضوعات کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ اور وقت و موسم اہمیت اختیار کرتے چلے گئے۔ علاقائی موسیقی اور لوک دھنوں کے اثر سے کلاسیکی موسیقی میں نیم کلاسیکی موسیقی کے لئے راہیں کھل گئیں لیکن محض مخصوص علاقوں کی دھنیں اور لوک گیت ہی نیم کلاسیکی موسیقی میں بار پا سکے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں کسی حد تک کلاسیکی موسیقی کے آئین کے مطابق ڈھال دیا گیا۔ ٹھمری، دادرا، ماہیا، کجری اور مانڈ وغیرہ کا شمار اسی قسم کی موسیقی میں ہوتا ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی اپنی مخصوص موسیقی ہے جو مقامی خصوصیات اور روایات کی حامل ہے۔ اس موسیقی نے حسن اور اثر زندگی سے براہ راست اخذ کیا ہے۔ اس سبب سے عوام کی امنگوں، آرزوؤں، امیدوں اور نا امیدیوں کی ترجمانی براہ راست ہوتی ہے۔ یہ موسیقی عوامی گانوں اور لوک دھنوں پر مشتمل ہے۔

سندھ کے علاقے کی موسیقی اپنی خصوصیات کی بنا پر ارباب ذوق کی ہی نہیں بلکہ ارباب فکر کی دلچسپی کا باعث بھی ہو سکتی ہے پاکستان کے مختلف علاقوں میں سابق صوبہ سندھ ہی کے علاقے کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی عوامی موسیقی دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک تو وہ لوک گیت جو پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی رائج ہیں مثلاً "لیالو" "ہمرچو" "جالو" اور "تورو" وغیرہ جو اپنے موضوع اور دھنوں کے اعتبار سے پچاس سے زیادہ اقسام پر مشتمل ہیں اور دوسرے ایسے گانے ہیں جو کافی کے انداز میں گائے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی گائیکی کا انداز ایک مخصوص انداز ہے بلکہ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مختلف سُروں میں گائے جاتے ہیں۔ یہ سُر اس علاقے کی موسیقی میں راگوں کی سی اہمیت رکھتے ہیں اور انھیں آسانی سے ایک قسم کی نیم کلاسیکی کے دائرے میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سُر اس علاقے کی سرزمین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور متعارف نیم کلاسیکی موسیقی اپنے اسلوب اور نوعیت کی بنا پر کسی حد تک مختلف ہیں اور سینکڑوں برس سے ان علاقوں میں رائج اور مقبول ہیں اس لئے روایتی موسیقی ہی کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان سُروں سے مماثلت رکھنے والی موسیقی پاکستان و ہند کے کسی دوسرے علاقے

میں رائج نہیں ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موسیقی کا مختصر تعارف کرا دیا جائے کیونکہ عام طور سے لوگ اس علاقے کی روایاتِ موسیقی سے واقف نہیں ہیں یہاں چند مخصوص سندھی راگوں (سروں) کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سر کوہیاری

کھماج ٹھاٹ کے ضمن میں آتا ہے لیکن "بلاول" سے بھی کسی قدر مشابہت رکھتا ہے" اور وہی" کے اختتام پر یہ آسا کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔ اس کی "آروہی" ساگاما پادھانی سا، اور "امروہی" سانی دھاپا ماگارے سا ہے، اس میں دونوں نکھادوں کا استعمال ہوتا ہے۔

سر رانو

کافی ٹھاٹ کا راگ ہے۔ اس کی "امروہی" میں گندھار "وکر" لگتی ہے۔ دیسی ٹوڈی اور سندھوی سے مشابہت رکھتا ہے اور چال میں نائکی اور کانی کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کی "آروہی" سارے ما پادھا سا' اور امروہی' سانی دھاپا ما رے گا رے سا ہے۔

سر بانجھ

استادی موسیقی کے اصول کے مطابق یہ سر درست نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی آروہی کھماج کی ہے اور امروہی کیدارے سے مشابہ ہے۔ اس میں دونوں مدھموں کا استعمال ہوتا ہے۔ قاعدے کے مطابق "اروہی" میں کومل مدھم" کا برتاؤ اساتذہ فن کے نزدیک غلط ہے۔ اگر اس کی آروہی میں تیور مدھم لگائی جائے تو بھاگ، کیدارے اور آنندی سے مشابہت دکھاتا ہے۔ آروہی ساگاما پادھانی سا اور امروہی سانی دھاپا ما گارے سا ہے، جس میں پہلا ٹکڑا یعنی سانی دھاپا ما (تیور) ہمیر کلیان، دوسرا ٹکڑا دھاما (کومل) کیدارے، تیسرا ٹکڑا گارے سا گا آنندی اور چوتھا ٹکڑا دھاپا ما گارے سا بلاول کی شکل بناتے ہیں اور اس سُر کی یہ ترکیب کسی راگ کا صحیح نقشہ قائم نہیں ہونے دیتی' اور نہ راگ مالاہی کی ترکیب شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ سُر راجستھان اور جیپور کے مشہور اور مقبول گانے مانڈ سے بھی بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

سندھی بھیرویں

کلاسیکی بھیرویں سے کسی قدر مختلف اور عام طور پر متعارف سر ہے۔ جو اساوری ٹھاٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں تیور رکھب اور کبھی کبھی تیور نکھاد بھی لگائی جاتی ہے۔

سر لوڑاؤ

پہاڑی سے مشابہت رکھتا ہے۔ مدھم اس کا وادی سر ہے، آروہی میں درگا اور امروہی میں کانی سے ملتا ہے۔ اس کی آروہی سارے ما پادھا سا۔ اور امروہی سانی دھاپا ما گا رے سا ہے۔ یہ راگ اکثر اسے ٹیپ کی سا تک ہی قائم رہتا ہے۔

سر جوگ

بھیروں ٹھاٹ سے تعلق رکھتا ہے اور کلاسیکی راگ جوگیا کا نقشہ بناتا ہے۔ اس کی آروہی سارے ما پادھا سا اور امروہی سانی دھاپا گا رے سا ہے،

سر سورٹھ

کلاسیکی موسیقی کا متعارف راگ ہے ــــ دیس سے مشابہت رکھتا ہے اور دیس کی امروہی میں گندھار ورج کرکے اس کی شکل بنائی جاتی ہے، آروہی سارے ما پانی سا اور امروہی سانی دھاپا ما رے سا ہے لیکن عام طور پر گانے والے اس علاقے میں دیس گاتے ہیں اور اسی کو سورٹھ کہتے

ہیں۔ ممکن ہے شاہ صاحب کے زمانے میں یہ سر اسی صورت میں رائج رہا ہو۔

سر پربھاتی

بلاول ٹھاٹ کا راگ ہے۔ اس کی آنند بھیروں سے ملتی ہے کہ فرق یہ ہے کہ اس میں رکھب تیور لگتی ہے۔

سر معذوری یا معذوری

سری راگ سے مشابہ ہے۔ اس میں سے پنچم کم کر کے معذوری کی شکل بناتے ہیں اور مدھم کو جھلاتے ہیں۔ سری راگ کی آروہی میں گندھار اور دھیوت شامل کرتے ہیں تو اس کی شکل ابھرتی ہے۔ اس کی اوروہی میں تین مرتبہ مدھم لگتی ہے، اس کی آروہی سا رے گا ما دھا نی سا اور امروہی سے نی دھا ما ما گا رے سا ہے۔ یہ راگ بہت کم سننے میں آتا ہے۔ یہ تصدیق طلب ہے اور اسے بلا تامل سندھی موسیقی یا شاہ کے سروں میں شامل کرنے کا فی الحال کوئی جواز نظر نہیں آتا ہے۔ یہ سر لسبیلے میں سننے میں آتا ہے اور معذور کے نام سے پہچانا جاتا ہے مگر بہت کم لوگ اسے گاتے ہیں۔

یہ سب سر مخصوص علاقائی اسلوب میں گائے جاتے ہیں جسے درویشانہ اور فقیرانہ انگ کہہ سکتے ہیں۔ طرز موسیقی کے اعتبار سے اسے ہم صرف امروہی کی موسیقی کہیں گے کیونکہ اس انداز کی گائیکی میں اکثر آروہی ظاہر نہیں ہوتی۔ بعض استادوں کے گھرانے جو اس علاقے میں تقریباً سو برس سے آباد ہیں ان سروں کو قاعدے کے مطابق بھی گائے جاتے ہیں اور آروہی کو بالقصد ظاہر کرتے ہیں، مگر یہ انداز عوامی انداز نہیں ہے۔ اس وجہ سے عوام میں مقبول نہیں ہو سکا ہے۔

سندھی موسیقی کی ایک بڑی خصوصیت اس کا موضوعاتی کردار ہے۔ مذکورہ سروں میں سے اکثر سروں میں خاص خاص موضوع کی کافیاں گائی جاتی ہیں اور روایت کے مطابق ہر گانے والا اس موضوع کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ سر کے بدلنے سے موضوع کا تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ یوں تو غالباً سندھی موسیقی کا یہ کردار زمانہ قدیم ہی سے مقرر ہے لیکن اس علاقے کے مشہور روحانی پیشوا، درویش، اور صوفی شاعر شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی نے ایسے راگوں میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ جو موضوعات کے اعتبار سے مخصوص کہانیوں سے متعلق ہو گئے ہیں۔ جو سر شاہ لطیفؒ سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں کوہیاری، رانو، سوہنی، آسا، کلیان، سارنگ، بروو وغیرہ ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے رسالے کی ترتیب بھی سروں ہی کے اعتبار سے قائم کی ہے جو ابواب کے قائم مقام ہیں۔ یہ دو قسموں پر مشتمل ہے۔ کچھ راگوں کے نام پر ہیں مثلاً کلیان، کھمبات یا کھماچ، سری راگ، سوہنی سارنگ، دیسی، کیدارو، رام کلی، بلاول پربھاتی، آسا اور کاموود وغیرہ۔ اور کچھ کہانیوں اور موضوعات کے اعتبار سے مقرر کئے گئے ہیں۔ مثلاً سامونڈی اور گھاتو جن میں سمندر، سمندری جہازوں اور مونیوں کی تجارت اور گہرے سمندر میں مچھلی کے شکار اور خوفناک مچھلیوں سے مقابلے وغیرہ کا ذکر ہے۔ کاپائیتی چرخا کاتنے کے موضوع پر ہے۔ چرخا کاتنے کو انسانی اعمال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رام کلی اور پورب میں جوگیوں کے سفر اور فراق کے مضامین باندھے ہیں۔ کبھی کبھی عشق مجازی کے اعتبار سے ہجر و فراق کے جذبات کا مرکز کوّے کو قرار دیا گیا ہے جو قدیم ہندی شاعری کا محبوب اور مقبول موضوع ہے۔ سر رانو میں مومل رانو کی داستان عشق کا بیان ہے اور اس کی دھن علیحدہ ہے۔ کاموود اور ماروی میں نوری تماچی اور عمر ماروی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے ان داستانوں کے جو سر مقرر کئے تھے، ان کی نشان دہی اب آسانی سے ممکن نہیں ہے، سوائے ان سروں کے جن کا بیان پہلے کیا جا چکا ہے یا جو کلاسیکی راگوں کے نام پر ہیں، ہر چند کہ بعض حالات میں ان میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ان میں عام دیہاتی رنگ کا ہے۔

موسیقی کے دوسرے سروں کو شاہ صاحبؒ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا کہنے کے لئے تاریخ سے کوئی شہادت نہیں ملتی اور نہ ہر سر کے متعلق یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں اس کی کیا صورت رائج تھی، محض قیاس کی بنا پر اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کافی موسیقی کی ایک ایسی صنف ہے جس میں سروں کا موضوعاتی کردار ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً کوہیاری میں سسی پنوں کی داستانِ عشق سے متعلق کافیاں گائی جاتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کوئی داستان مکمل بیان نہیں کی ہے بلکہ مختلف داستانوں میں سے جو اس علاقے میں مشہور ہیں، خاص خاص مقامات منتخب کر کے بیت اور کافیاں کہی ہیں، اس لئے وہی مقامات سُر کوہیاری اور دوسرے سروں کے موضوع قرار پا گئے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے کئی سروں میں سسی پنوں کی رومانی داستان کو موضوعِ شاعری بنایا ہے۔ اور سسی کی غفلت، اس کے عشق کی شدت اور تلاشِ محبوب میں بیاباں نوردی کو اپنی شاعری میں زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کی داستان تمثیلاتی یعنی Allegorical انداز لئے ہوئے ہے۔ اس لئے سُر کوہیاری جو اس داستان کے لئے مخصوص ہے، اپنے تاثر اور موضوع کے اعتبار سے غفلت، تلاشِ محبوب اور شدتِ عشق کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ اسی طرح سُر رانو جس میں مومل رانو کی رومانی داستان سے متعلق کافیاں اور بیت گاتے ہیں، بدگمانی، شکایت، انتظار اور فراق کے مضامین کے لئے موزوں سمجھا گیا ہے۔ کلیان اور ایمن کلیان، عشقِ حقیقی کی مشکلات، سرفروشی، جاں بازی اور قربانی کے مضامین کے لئے وقف ہیں۔ سوہنی جس میں سوہنی میہار کے عشق کو موضوع بنایا گیا ہے، محبوب کے حصول کی راہ میں دشواریوں کے بیان پر مشتمل ہے طوفانی دریا اور کچا گھڑا، راہِ عشق کی دشواریوں اور کمزور سہاروں پر اعتماد کرنے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی علامتیں ہیں جو اس علاقائی راگ کے مزاج میں داخل ہو گئی ہیں۔ عمر ماروی کی داستان جن مختلف سروں میں گائی جاتی ہے وہ اب حبِ وطن اور اپنے قبیلے کی محبت کے لئے مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ سندھی، بھیرویں، لوڑاؤ، جوگ آسا، پربھاتی اور رامکلی عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کی مختلف کیفیات کے ترجمان ہیں۔ سُر سورٹھ، سخاوت، قول کے پاس اور فن کی قدردانی کے سلسلے میں قربانی کے مضامین کا ترجمان ہے اور قربانی کا یہ جذبہ بڑی شدت سے اس راگ کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ سورٹھ اور رائے ڈیاچ کی داستان میں رائے ڈیاچ ایک گویّے کو اس کے مظاہرۂ فن سے خوش ہو کر اس کے طلب کرنے پر اپنا سر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ سُر سارنگ میں برسات کا بیان ہے لیکن یہ بھی تمثیلی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس میں برسات کے چھائے ہوئے بادلوں کو کعبے کی سمت سے اٹھتے ہوئے ابرِ رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے یہ سُر برسات کی منظر نگاری اور نعتِ رسولؐ کے لئے مخصوص سمجھا گیا ہے۔ اس طرح سندھی موسیقی کا یہ علاقائی اور موضوعاتی کردار اسے نہ صرف پاکستان کے علاقوں کی موسیقی بلکہ برصغیر کے مختلف علاقوں کی موسیقی کے مقابلے میں بھی ایک نمایاں حیثیت دیتا ہے۔ اس کے اس کردار سے ہمارے ماہرینِ موسیقی بڑا کام لے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ موسیقی ایک طرف کہانیوں، مظاہرِ قدرت، موسموں، پرندوں، چوپایوں، دریا اور سمندر سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے تو دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ ان میں سے ہر چیز ایک مخصوص موضوع سے بھی تعلق رکھتی ہے اس لئے سندھ کے علاقے کی یہ پر اثر، سادہ، خوبصورت اور بامعنی موسیقی ان کی ذرا سی توجہ سے ایک ایسے انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور ایسی جدید اور عظیم قومی موسیقی کو جنم دے سکتی ہے جو کلاسیکی موسیقی کی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے پاکستان کے مختلف علاقوں کی عوامی موسیقی کے امتزاج سے پروان چڑھے گی اور اپنے کردار و خصوصیات میں خالص پاکستانی موسیقی ہونے کے باوجود ایسی شاندار روایات کو جنم دینے کے قابل ہو گی جو معنی اور بیلے کی کمی کو پورا کر کے ہمیں مغربی موسیقی کی بیجا خوشہ چینی اور تقلید سے بچائے گی۔

محمد ایوب اولیاء

اُستاد عاشق علی خاںؒ

پنجاب میں دو زبردست گویئے کرنیل، جرنیل ہو گزرے ہیں۔ نام تو ان کا فتح علی خاں، علی بخش خاں تھا، لیکن چونکہ دونوں اکٹھا گاتے تھے، اس لئے علیا، فتو کے نام سے پنجاب میں معروف تھے۔ موسیقی میں اعلیٰ خدمات کی وجہ سے کرنیل، جرنیل انھیں خطاب ملا تھا۔ اگرچہ آپس میں ان کا کوئی خاندانی رشتہ نہیں تھا تاہم وہ ساری عمر سگے بھائیوں کی طرح رہے اور اکٹھا ہی ہمیشہ گائے۔ یہ دونوں اُستاد بھائی، مشہور بہادر شاہی گویئے تان رس خاں کے شاگرد تھے۔

"تان رس خاں صاحب نے میاں اچپل خاں کی شاگردی اختیار کر کے اپنے خاندان میں خیال انگ گائیکی کی بنیاد رکھی۔ ورنہ ان سے پہلے ان کے خاندان والے دھرپد گاتے تھے ـــــ تان رس خاں (استاد سردار خاں مرحوم کے دادا تھے) ـــــ کہتے ہیں جس وقت یہ جوڑی تان رس خاں صاحب کی شاگردی اختیار کرنے گئی اس وقت بھی خاصی تیار تھی۔ خاں صاحب نے انھیں کچھ سنانے کو کہا۔ اس وقت تان رس خاں بوٹی پئے ہوئے تھے۔ ان کا گانا سن کر ان کا نشہ اُتر گیا۔ اُٹھے اور پھر بوٹی پی کر آئے، محفل میں پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی بوٹی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس طرح متواتر تین بار یہ واقعہ پیش آیا۔ خوش ہو کر تان رس خاں نے ان دونوں بچوں کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ انھیں دونوں کی وجہ سے پنجاب میں کلاسیکی موسیقی کا عظیم اور مہتم بالشان پٹیالا گھرانہ" وجود میں آیا جس سے تمام پنجاب نے کسب فیض کیا اور اسی موسیقی کے دریائے پنجاب کی دوسری ندیاں نکلیں جن سے آج بھی دوں کے کنول لہلہا رہے ہیں ـــــ ورنہ اس سے پہلے پنجاب والے بقول استاد اختر حسین "ٹکیر کھاتے تھے، بیر سنتے تھے۔"

خاں صاحب فتح علی خاں (کرنیل صاحب) الاپ، بلپت اور راگ کے پھیلاؤ بڑھت میں بڑے ماہر تھے اور راگ کا تانا بانا بننے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس کے برعکس خاں صاحب علی بخش خاں (جرنیل صاحب) تانوں میں منفرد تھے مشکل اور ادق تانیں لینا ان کا خاص فن تھا۔ اس لئے جب یہ دو جھمکیے گمیئے گانے بیٹھ جاتے تھے تو دوسرے گویئے ٹک نہیں سکتے تھے۔ علم اور تیاری دونوں ہی ان کی لونڈیاں تھیں۔

خاں صاحب فتح علی خاں کے والد ماجد کا اسم گرامی خاں صاحب خیراتی اور چچا کا نام ولایتی خاں صاحب تھا۔ خاں صاحب فتح علی خاں نے پہلے اپنے باپ خیراتی خاں سے تعلیم کا کافی حصہ حاصل کیا۔ اس کے بعد تانی گگا ہی گوئیں کو سنا اور چھوٹی عمر میں ہی گا بجا کر ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں گوکھی بائی کی شاگردی اختیار کی اور ان کے پاس رہے۔ یہ اپنے زمانے کی نامک خاتون گزری ہیں۔ اس کے بعد جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے تان رس خاں صاحب کی خدمت میں پہنچے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد حیدر آباد دکن میں مقیم تھے۔ جرنیل صاحب بھی فتح علی خاں کے ساتھ تھے۔

عاشق علی خاں، فتح علی خاں صاحب کی واحد بڑھاپے کی اولاد تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں ایک بزرگ کی دعاؤں سے ان کی ولادت ہوئی۔ انھی نے عاشق علی نام رکھا اور کہا کہ یہ بچہ علی کا عاشق ہوگا اور طبیعت درویشانہ ہوگی۔ عاشق علی خاں ابھی بچہ ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ فتح علی خاں صاحب

کی شاگرد وسرداربائی نے ان کا ہاتھ پکڑا، باپ کے شاگردوں نے حتی القدور اپنے خلیفے کو جتایا۔ استاد اللہ دیا مہربان خاں صاحب مرحوم نے سب سے زیادہ اپنے مرشدزادے کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ وہ موسیقار کے علاوہ شاعر بھی تھے اور مہربان تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے استادوں کی شان میں متعدد خیال بھی باندھے ہیں، مثلاً

(۱) خیال دلیکار

استائی: آؤ جی موہے نگریا
واروں تم پہ جوبن کرم نثارا
انترا: مہربان، سلطان، فتح علی خان جرنیل، بھاگ جو۔ کرم کما۔

(۲) خیال درباری

استائی: کاہے بے کری۔ صاحب سانچو جگ کے مہربان
ہمرے کاج سنوار دو
انترا: فتح علی خان جو تھے گن ونتا
ہم نردھن پہ گن تیرو۔ کرو سوکھی بیل ہری بھری
کاہے بے کری ....

عاشق علی خاں کے گائے ہوئے راگ پوریا دھناسری کے بول بھی مہربان خاں صاحب کے لکھے ہوئے ہیں (استائی: خوش رہے صنم میرا...... الخ)

مہربان خاں صاحب اور دیگر شاگرد اپنی تمامتر مساعی کے باوجود باقاعدہ اور مکمل علم موسیقی عاشق علی خاں تک نہ پہنچا سکے۔ اس میں عاشق علی خاں کی فقیری اور استغنا کا بھی بہت دخل تھا۔ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے، اس لئے انھوں نے اپنی کمی اس طرح پورا کیا کہ جتنا علم بھی حاصل ہو سکا، اس کو کندن بنا کر پیش کیا تان، پلٹا اور تیاری میں شاید ہی کوئی گویا ان کی برابری کر سکے۔ ان کے گانے کا آغاز ہی یہ بتاتا ہے کہ گویا مشینوں سے آواز نکل رہی ہے۔ انسانی حلق اور بشری آواز سے وہ یکسر بعید اور ماورا چیز تھی جو عاشق خاں گایا کرتے تھے۔

مشہور گائیک پران ناتھ اپنے مضمون "موسیقار کی ڈائری کا ایک ورق" (مطبوعہ "آجکل" بابت اپریل ۶۲) میں لکھتے ہیں:

"میں نے استاد عاشق علی خاں کے ڈھنگ کو بھی اپنانے کی بھی کوشش کی۔ عاشق علی خاں صاحب اتنے خوش گلو نہ تھے مگر ان کو اپنے مخصوص انداز میں فن پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ایسی روکھی سوکھی آواز اور اس پر ایسا پر تاثیر گانا اس کی مثال ملنا مشکل ہی ہے۔"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بعض اوقات وہ بے سرے ہو جاتے تھے۔ میں کہتا ہوں یہی تو ان کا کمال و خاصہ تھا کہ بے پناہ تیاری اور تیزی میں گا کر کبھی ایک آدھ جگہ صرف احساس ہوتا تھا کہ وہ بے سرے ہو گئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اچھے سے اچھا سننے والا بھی جب ان کی رفتار اور طراری کا ساتھ نہیں دے سکتا تو اس کو خفیف سا دھکا محسوس ہوتا تھا اور وہ خود اپنی خفت مٹانے کی خاطر خاں صاحب کو بے سرا کہہ دیتا تھا۔ یہ اصل میں اپنی شکست کو بے سرے پن کا نام دینا ہے۔ عاشق علی خاں کے گانے کی رفتار کے ساتھ چلنا بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔ وہ ابھی یہاں، ابھی وہاں، یہ جا۔ وہ جا

وہ تو عجیب و غریب اور حیران کن گویے تھے۔ ان کا اپنا سٹائل اس قدر مشکل اور نرالا ہے کہ آج تک گویے نقل کر رہے ہیں اور وہ چیز حاصل نہیں کر پائے جو عاشق علی خاں کا طرۂ امتیاز تھی۔ اہل موسیقی کو یہ ماننا پڑے گا کہ پنجاب میں موسیقی کا جو انداز اور طریق مروج ہے وہ تمام تر خان صاحب کا ہی رہین منت ہے۔ وہ اس قدر طناز اور اہل گھیئے تھے کہ کلاسیکی موسیقی کا سٹائل ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہ اپنے سوا سب کو گونگا سمجھتے تھے۔ اگر کسی موسیقار کی نظریں بدلی ہوئی دیکھتے تو فوراً

برسرِ محفل کہہ دیتے تھے کہ آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں اور یہ چیلنج اس کے لئے پیغام ہوتا تھا۔

خاں صاحب عاشق علی خاں ایسے زبردست گویے تھے کہ آج تک ان کی گائیکی کو جداگانہ گائیکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا انداز اتنا اچھوتا اور پیچیدہ ہوتا تھا کہ بڑے سے بڑا گویا ان کے آگے پانی بھرتا تھا جب وہ موج میں آتے تو اکثر بزرگ سنگیت کاروں سے بھی ٹکر لے لیتے ــــــ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ خاصے نشے میں تھے۔ اپنے شاگردوں سے کہا کہ کبھی ساز وغیرہ وہ نہ گائیں۔ مرحوم خاں صاحب عبدالعزیز خاں (بینکار) بھی موجود تھے۔ وہ ان دنوں سارنگی بجاتے تھے۔ بین کی طرح وہ سارنگی میں بھی لاجواب تھے اور عاشق علی خاں سے خاصے معمر تھے۔ اس روز وہ خاں صاحب کے ساتھ سارنگی پر سنگت کرنا چاہتے تھے مگر عاشق علی خاں نے منع کیا کہ آج آپ میرے ساتھ سارنگی نہ بجائیں لیکن وہ باز نہ آئے اور سارنگی لے کر پنڈال میں آ موجود ہوئے۔ عاشق علی خاں نے ان کو اس اقدام سے پھر روکا اور کہا کہ اب بھی آپ میرے ساتھ نہ بیٹھیں، گو آپ سارنگی بھی ساتھ لے آئے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس وقت میرے ساتھ سارنگی بجائیں۔ میں نشے میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو جائے ــــــ یہ مجھے کہیں کا نہ رکھے گی ــــــ لیکن عبدالعزیز خاں صاحب نہ مانے۔ جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو خاں صاحب کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ بات چیت کا اثر ان پر کافی ہو چکا تھا (عاشق علی خاں چرس کو بات چیت کہا کرتے تھے) جلال میں آ کر کہنے لگے کہ میں آپ کے ساتھ ایک شرط پر گاؤں گا۔ اگر آپ میری صحیح سنگت کر سکے پھر تو آپ ساری عمر سارنگی بجا سکتے ہیں۔ ورنہ آپ کو میرے سامنے اپنی سارنگی اس بھرے پنڈال میں توڑنا ہو گی اور آئندہ کبھی سارنگی کو ہاتھ نہ لگانا ہو گا۔ عبدالعزیز خاں صاحب نے مسکراتے ہوئے یہ شرط مان لی۔ اس روز عاشق علی خاں کچھ اتنی مہارت سے گائے کہ بینکار صاحب کے لئے سنگت کرنا مشکل ہو گیا اور آخر کار اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے از روئے شرط بھری محفل میں اپنی سارنگی توڑ دی۔ یہ واقعہ خود عبدالعزیز خاں صاحب سے منقول ہے اس واقعہ کے بعد انھوں نے وچتر وینا (گوٹ وینا) اختراع کی اور اس میں اپنی نفاست طبع اور خداداد قابلیت سے وہ گل بوٹے پیدا کئے کہ آج بھی دنیا ان کی بین کو یاد کرتی ہے، مگر پھر سارنگی کو عمر بھر انھوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور یوں اپنے وعدے کو پورا کیا۔

ایک عجیب منقول واقعہ بھی عاشق علی خاں کی طرف منسوب ہے۔ پٹیالہ کے قیام کے دوران وہ بے پناہ ریاض کر رہے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ شام کے وقت ایک تانگے پر سوار ہو کر دریا کی طرف نکل جاتے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر بھیروں گانے کی مشق کرتے۔ ابتدائی ایام میں کوچوان سخت بور ہوا کرتا مگر آہستہ آہستہ اس کے کان سرگم سے مانوس ہو گئے اور وہ بھی خاں صاحب کے سامنے ریاض کے دوران بیٹھا رہتا۔ خاں صاحب خاص نشست جما لیتے پھر ہر چیز سے بے نیاز ہو کر موسیقی کی دنیا میں گم ہو جاتے اور اس قدر ریاض کرتے کہ الاماں والحفیظ! تانوں، پلٹوں، زمزموں، مرکیوں اور سرگموں کا ایک بحرِ ناپیداکنار ٹھاٹھیں مارتا۔ اس طرح عاشق علی خاں نے اپنی بدآہنگ آواز کو ایک نیا اسلوب دیا جو آج بھی تمام گویوں کے نزدیک مستحسن و پسندیدہ ہے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ بھیروں راگ گاتے وقت، خود تانی بھیروں، مجسم صورت میں دریا سے نکل کر آ موجود ہوئی اور خاں صاحب سے بمنت کہنے لگی۔ عاشق علی خاں! تم روز کیوں مجھے تنگ کرتے ہو، جاؤ تم موسیقار بن گئے ہو ــــ یہ واقعہ خود کوچوان نے لوگوں کو سنایا۔ عاشق علی خاں نے بہتیرا اس کو منع کیا لیکن وہ اس واقعہ کو فشا کرنے سے باز نہ آیا۔ یہ واقعہ کوچوان کے منہ سے نکلتے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور لوگ اس کو لے اڑے ــــــ بھیروں کی قلمی تصویر سنگیت کی کتابوں میں یوں بیان کی جاتی ہے:

> "گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، گول منہ، مونچھیں چڑھی ہوئیں۔ بالوں کا جوڑا بندھا ہوا، اس پر ایک سانپ لپٹا ہوا۔ دوسرا سانپ کمر میں لپٹا ہوا بیل پر سوار، گلے میں زنار، سرخ ریشمی دھوتی پہنے ہوئے، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، ہاتھ میں موتیوں کی سمرن، عمر بارہ ہزار دو سو برس، ایک دھارا پانی والی گنگا کی جٹا کے منہ سے نکل کر مہادیو کے دونوں شانوں پر گرتی ہے بھیروں کی شکل مہادیو سے مشابہ ہے۔"

یوں بھیروں کا حاضر ہونا، عاشق علی خاں کا معجزہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط، اس سے بحث نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مشہور کیوں ہو گیا ؟ اس کی شہرت اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ عاشق علی خاں اپنے عہد کے بہت بڑے اور صاحب طرز گویا تھے جن کی نسبت لوگوں نے نہایت حیرت افزا واقعات منسوب کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

"نقوش" کے لاہور نمبر میں سراج نظامی لکھتے ہیں :

"مرحوم سارنگی نواز بابا علی بخش عمر کے آخری ایام میں موچی دروازے کے اندر لگنے کی ایک محفل میں تشریف لائے جس میں اُستاد عاشق علی خاں گا رہے تھے سسکنے لگے۔ برسوں کے بعد گا سن رہا ہوں۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ دیکھوں فتح علی خاں کا لڑکا کتنے پانی میں ہے۔ واقعی عاشق علی فن کے لحاظ سے اپنے بزرگوں کا صحیح جانشین ہے ــــ"

عاشق علی خاں کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ تھی کہ وہ جیسا خود گانا جانتے تھے، ویسا ہی وہ بتانا اور تعلیم دینا جانتے تھے۔ خود گانا نسبتاً آسان ہے لیکن دوسروں کو بھی اپنے جیسا گانا سکھانا بڑا مشکل ہے۔ بے کاری میں بھی ان کو جواب نہیں اور بے بدلنے میں جو مہارت ان کو نصیب ہوئی وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ ... سراج نظامی اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں :-

"ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک میوزک کانفرنس میں اُستاد احمد جان تھرکوا ان کے ساتھ طبلہ بجانے بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ کونسا تال بجاؤں۔ آپ نے کہا جو جی آپ کو جی چاہے۔ پھر جو تانیں اڑائی اور گرہ بندی شروع کیا تو سامعین کا یہ حال تھا کہ تالیاں بجاتے اور کرسیوں سے اُچھلتے تھے۔"

عاشق علی خاں اتنے بڑے گویّے ہوتے ہوئے بھی انتہائی درویش صفت انسان تھے۔ فقیر منشی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہزاروں روپے کمائے مگر ہمیشہ داد و دہش میں خرچ کر دیئے۔ جو کسی نے مانگا دے دیا۔ اگر اپنے پاس نقدی کچھ نہیں بچی اور کسی نے سوال کر دیا تو تن کے کپڑے تک اتار دیئے۔ ایک روایت ان کے متعلق مشہور ہے کہ خاں صاحب کوٹ اور برجس میں ملبوس تھے سارے کمائے ہوئے روپے گھر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ہی صرف کر آئے۔ دروازے پر پہنچے تو کسی سائل نے کہا بابا عاشق علی! ہمیں بھی کچھ دیتے جاؤ۔ آج کل تو سخت سردی پڑ رہی ہے تن ڈھانپنے کو کپڑا تک نہیں ملتا۔ اسی دفعہ کوٹ اور برجس اس کو پہنائی۔ خود صافہ باندھے ننگ دھڑنگ سڑک پر کھڑے سوں سوں کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک ہندو رئیس آ گیا ــــ اس نے پوچھا "خاں صاحب! یہ کیسا حال بنا رکھا ہے"۔ بولے "سیٹھ! فقیر کو کبھی مل گیا تو پہن لیا ورنہ یوں ہی گزارا کر لیا"۔ رئیس نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور گھر پہنچ کر نیا سوٹ پہنایا۔ اگلے دن اس کا حشر بھی یہی ہوا کہ وہ کسی اور کے جسم پر نظر آیا!!! ۔ اب ایسی درویشی کہاں نظر آتی ہے ــــ دراصل خدا ترسی کا یہ جامہ ان پر خوب سجتا تھا۔

موجودہ دور کے تقریباً سبھی گویوں نے عاشق علی خاں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر لیا ہے۔ اُستاد بڑے غلام علی خاں اور استاد امید علی خاں تو مدت تک ان کی معیت میں گاتے رہے ہیں ــــ جو ان کے باقاعدہ شاگرد ہو کر فیضیاب ہوئے، ان کے نام یہ ہیں ــــ سندھ میں نواب اور گوگی۔ پنجاب میں استاد اللہ رکھا (طبلہ نواز)، مختار بیگم، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج، اور غلام ستار منور رتا۔

خاں صاحب نے ساری عمر شادی نہیں کی اور تجرد کی زندگی گزار دی۔ ان کے لاابالی پن نے کبھی یہ برداشت نہ کیا کہ وہ پابند زندگی بسر کریں۔ عمر بھر انہوں نے فقیری میں بادشاہی کی۔ کوئی مادی لالچ اور لوبھ ان کو صحیح بات کہنے سے نہ روک سکا بیچ تر نے ان کے دل و دماغ کی تمام کدورتوں اور آلائشوں کو دھو دیا تھا۔ ان کا ضمیر روشن تھا اور دماغ بیدار ــــ ان کی حس ذکاوت تیز تھی اور روح بے داغ!

آخر ۱۹۴۸ء کو یہ گوہر یکتا وہ فقیر، شہنشاہ موسیقی، خدا ترس انسان اور شفیق اُستاد لاہور میں انتقال کر گیا۔ تکیہ مراثیاں جمبر لین روڈ میں ان کی تدفین ہوئی۔

پروفیسر حمید احمد خاں ——— ڈاکٹر سید عبداللہ ——— احمد ندیم قاسمی

تجریدی مُصوّری

[گزشتہ مارچ سے میں روزنامہ "امروز" میں "تہذیب و فن" کے مستقل عنوان کے تحت ایک ہفتہ وار کالم لکھ رہا ہوں۔ میں نے ۱۷ جون ۱۹۶۵ء کے اس کالم میں تجریدی مصوری پر اظہار خیال کیا اور اس کے بعد لاہور کے چند معروف اہل علم و ادب اور بعض نامور مصوروں سے درخواست کی کہ وہ میری معروضات کے حوالے سے تجریدی مصوری پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ فرمائیں۔ مقصد یہ تھا کہ "فنون" میں اس موضوع پر ایک مذاکرے کا آغاز کیا جائے اور خود تجریدی مصوروں سے بھی عرض کیا جائے کہ وہ اس مذاکرے میں حصہ لے کر پڑھے لکھے طبقے کو اس فن کی خاص نوعیت کو سمجھنے میں مدد دیں۔ اب تک محترم پروفیسر حمید احمد خاں، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی اور محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریریں موصول ہوئی ہیں جنھیں میں اپنے مضمون کے ساتھ درج کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مصوروں، شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے علاوہ "فنون" کے قارئین بھی اس مذاکرے میں بھرپور حصہ لیں گے اور ایک نزاعی فنی مسئلے کی کوئی سمت متعین کرنے کی کوشش کریں گے ——— (ندیم)]

احمد ندیم قاسمی

پچھلے دنوں محترم جسٹس ایس۔ اے رحمان نے ایک نیم تجریدی/نیم کلاسیکی پاکستانی مصور کولن ڈیوڈ کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ وہ تجریدی مصوری کے دشمن نہیں ہیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ مصوری جو نہ تو جمالیاتی حظ بخش سکے اور نہ ذہنی آسودگی دے سکے، تجریدی مصوری ہی کے نام سے پکاری جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ فن پارے جن کا اس معاشرے اور اس ماحول سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا جس میں وہ تخلیق پاتے ہیں، قوتِ جاذبیت سے بھی عاری ہوتے ہیں اور لوگ بھی ان سے کوئی وابستگی محسوس نہیں کر سکتے۔

مگر یہ لوگوں کی وابستگی تو ایک ایسا مسئلہ ہے جسے تجریدی مصور کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ اگر لوگ کسی تجریدی فن پارے کے ساتھ وابستگی محسوس کرنے لگیں تو اس کے خالق کو یہ فکر دامنگیر ہو جاتی ہے کہ اس کا معیار پست ہونے لگا ہے۔ کیونکہ عام لوگ اسے سمجھنے لگے ہیں۔ "لوگ" تجریدی مصوری کے دائرے میں سے قطعی طور پر خارج کیے جا چکے ہیں کیونکہ مصور کے ذہن سے عوام کے اخراج ہی سے تجرید پیدا ہوتی ہے۔ جو تجریدی مصور آج بھی فن کی پاپولر اپیل کی اہمیت کے قائل ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس صورت میں وہ تجریدی نہیں رہتے۔ زیادہ سے زیادہ انھیں نیم تجریدی کہا جا سکتا ہے اور نیم تجریدی مصوروں کا "سچے صوفیوں" کے ہاں وہی مرتبہ ہے جو معاشرے میں متوسط طبقے کے افراد کو حاصل ہے کہ اونچا طبقہ انھیں اس لئے رد کرتا ہے کہ وہ اس کی طرح امیر نہیں ہیں اور وہ خود غریب طبقے سے اس لئے منسلک ہونا پسند نہیں کرتے کہ وہ اس طبقے سے کہیں زیادہ امیر ہیں۔ یوں نیم تجریدی مصور ہمیشہ برزخ کے عالم میں رہتا ہے اور اس لئے اگر وہ عوامی پسند کو

اہمیت دیتا ہے تو اس کی رائے میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ وہ صدفی صد تجریدی نہیں ہے۔ اگر تجریدی مصوروں کو "پاپولر اپیل" کا کوئی لحاظ ہوتا تو وہ تجریدی ہی نہ ہوتے۔ وجہ یہ ہے کہ عوام الناس تو بلا کے حقیقت پسند ہیں۔ وہ حقیقت کو آراستہ ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بعض حقیقتوں کے ملاپ سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہ حقیقت کو انفرادی زاویے سے دیکھنے کے بھی مخالف نہیں ہیں مگر وہ حقیقت کو سر کے بل کھڑا نہیں دیکھ سکتے۔ ایک بڑے درخت کی تصویر اگر دس مختلف مصور بنائیں تو درخت یقیناً ایک ہی ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت دس انفرادیتوں میں بٹ جائے گی اور یہ دس کے دس درخت جمالیاتی حظ کے حامل ہوں گے۔ لیکن اگر ان مصوروں میں سے کوئی ایک مصور ضد کرے کہ وہ اس درخت کے کھوکھلے تنے میں گھس کر بیٹھے گا اور وہاں سے اسے جو کچھ دکھائی دے گا اسے اپنے تاثر کی چھلنی میں سے نکال کر کاغذ پر منتقل کرے گا اور اس تصویر کا نام "درخت" ہی رکھے گا تو یہ وہی سر کے بل کھڑے ہونے والی بات ہوئی۔ لوگ ایک نٹ کو تو یقیناً یہ اجازت دے سکتے ہیں مگر ایک ایسے شخص کو نہیں جسے فن کاری کا دعویٰ ہو اور جو معاشرے کے ذہین ترین طبقے میں شمار ہونا چاہتا ہو اور جو اظہار کے اسی "میڈیم" کو اختیار کر رہا ہو جو "مونا لیزا" کے خالق نے کیا تھا سو تجریدی مصوری اور "پاپولر اپیل" کا آپس میں کوئی دور دراز کا رشتہ بھی نہیں اور حق بات یہ ہے کہ پانی یہیں مر رہا ہے۔

مصوروں سے کوئی باشعور آدمی مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ حقیقت سے سر مو انحراف نہ کریں۔ حقیقت کی اتنی شدید پیروی فن کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے۔ جب تک فن کار خارجی حقیقت میں اپنے خوابوں، اپنی سوچوں اور اپنی منفرد شخصیت کا اضافہ نہ کرے، وہ تخلیقی فن کار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت اور فنی حقیقت میں نہایت نازک مگر خاصا بڑا فرق ہوتا ہے۔ حقیقت کو فنی حقیقت میں بدلنے کے لئے فن کار کو جس مرحلے میں سے گزرنا پڑتا ہے، اسی کا دوسرا نام تجرید ہے اور تجرید کس فن میں نہیں ہے؟ مصوری اور شاعری کے علاوہ موسیقی، رقص اور سنگتراشی بھی تجرید ہی کی وجہ سے فنون میں شامل ہیں۔ اقبال جب شام کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

سورج نے جاتے جاتے، شام سیہ قبا کو   طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

تو یہ دل آویز امیجری تجرید نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح جب چغتائی کی تصویر میں لڑکی کی آنکھیں اس کی کنپٹیوں تک کھنچی چلی جاتی ہیں تو یہاں بھی تجرید ہی کارفرما ہوتی ہے۔ مگر یہ تجرید حسن کار ہے، انتشار آفریں نہیں ہے۔ حقیقت میں اس مبالغے سے حقیقت کے خطوط چمک اٹھتے ہیں اور یہی تخلیق جمال ہے۔ تجرید ہم لوگوں کے لئے قطعی اجنبی نہیں ہے۔ ہم صدیوں تک غزل کی شاعری کے عادی رہے ہیں اور دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی صنف شعر میں تجرید سے اتنا کام نہیں لیا گیا جتنا اردو غزل میں لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ولی، میر، سودا، غالب، مومن اور اقبال کی غزلوں میں سے "محبوب" کی خصوصیات جمع کر کے کسی نہایت حقیقت پسند مصور سے کہا جائے کہ وہ ان سب خصوصیات کو ایک تصویر میں منتقل کرے تو اس انتہا درجہ کی تجریدی تصویر تیار ہوگی کہ پکاسو کے موضوعات بھی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔ اس کے باوجود آپ ان شاعروں کو پڑھتے تو یہی تجرید ان کے کلام میں وہ لطافت اور جاذبیت پیدا کرتی ہے جس سے ہر پڑھا لکھا انسان (بشرطیکہ وہ پتھر نہ ہو) حظ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تجرید کو برتنے کا فرق ہے اور سارا اختلاف یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک کلاسیکیت پسند مصور کو انسانی جسم میں سے آنکھ بہت پسند ہے تو وہ حقیقت سے بہت دور گئے بغیر چہرے میں آنکھوں کو یوں آراستہ کرے گا کہ وہ حقیقت سے بعید بھی معلوم نہ ہوں اور دیکھنے والا بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ اگر چہرے پر صرف آنکھیں ہی اچھی ہوں تو پورے چہرے پر کس طرح حسن برس سکتا ہے۔ اس کے برعکس اسی ذہن کا تجریدی مصور اگر اپنے موضوع کے ماتھے پر بھی آنکھ بنا دے اور گردن پر بھی اور ناف پر بھی اور ہتھیلی پر بھی تو غرض یہ ہے کہ یہ جذبے کا بھونڈا اظہار ہے اور کچھ نہیں۔ زیادہ مہذب الفاظ میں اسے عجزِ اظہار کہا جا سکتا ہے اور بس۔

میں پکاسو کو صرف اس کی امن کی فاختہ کے حوالے سے جانتا ہوں مگر حیران ہوتا ہوں کہ یہ فاختہ محض اس لئے مشہور ہوئی کہ اسے پکاسو نے

بنایا تھا جس کی ایک ایک تصویر کئی کئی لاکھ ڈالر میں فروخت ہوتی ہے۔ ایک حقیقت پسند مصور اگر یہی فاختہ بناتا تو اس میں زیادہ معصومیت، زیادہ نرمی اور زیادہ حسن ہوتا۔ مجھے جہالت کا طعنہ سننا منظور ہے مگر میں یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ پکاسو بڑا مصور ہے۔ اس کی "گرنیکا" میں کوئی جاذبیت نہیں۔ وہ تھپیلے جیسے انسان مجھے کبھی بھلے نہیں لگ سکتے جن کے نہ خطوط میں کوئی جذبہ ہے اور نہ رنگوں میں کوئی تخیل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ پکاسو ایک بیئتریے باز مصور ہے۔ اس کے بیئتریے نے جدت کے بھوکے مغرب کو ورغلایا تو اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ وہ بڑا مصور ہے۔ دراصل وہ بہت معمولی مصور ہے اور اس نے مکعبیت اور تجرید وغیرہ کو صرف اس لئے اختیار کیا کہ وہ بڑے بڑے کلاسیکل اساتذہ کا سا ایک دھڑکتا ہوا خط بھی نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اس کے عجزِ اظہار نے اسے تجریدی اور بھونڈا اور فنِ مصوری سے نفرت پیدا کرنے والا مصور بنا دیا اور یہی ان سب تجریدی مصوروں کا المیہ ہے جو اپنے آپ کو عام لوگوں سے اونچا قرار دے کر اپنے عجز کو عظمت میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان سے ان کے فن کی وضاحت کے بارے میں کہا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ ہمارے فن سے لطف اندوز ہونے سے پہلے فن کے رموز پر حاوی ہونا ضروری ہے، تجرید کی بنیادوں کو سمجھنا ضروری ہے، ان تقاضوں کا عرفان ضروری ہے جنھوں نے ہمیں کلاسیکل حقیقت پسندی سے بغاوت پر مجبور کیا۔ مقصد یہ کہ تجریدی مصوری سے لذت یاب ہونے کے لئے تجریدی ہونا ضروری ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی نقطۂ نظر ہے جیسے کوئی منطق کو نہ سمجھ سکے تو اسے سمجھایا جائے کہ جب تم مسلمان ہو تو منطق کو کیسے سمجھ سکتے ہو۔ اس کے لئے تو تمہیں عیسائی ہونا پڑے گا۔ تجرید کی اسی "ناقابلِ رسا" نوعیت نے اسے بچوں کا کھیل بنا ڈالا ہے۔ خود تجریدی آج یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اب تو ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اور جسے دنیا میں کرنے کو اور کوئی کام نہ ملے وہ برش لے کر چند آڑی سیدھی لکیریں کھینچتا ہے اور تجریدی مصور بن جاتا ہے۔ بصورت حال اگر واقعی یہی ہے تو تجرید کے اساتذہ یہ بھی تو سمجھائیں کہ ان کی تصویروں اور "لاالموضوع" کی تصویروں میں حدِ امتیاز کیا ہے اور ایک نوجوان نے محض آڑے سیدھے خطوط کھینچ کر تجرید پر حملہ کیا ہے تو خود آپ کے آڑے سیدھے خطوط کیا کہہ رہے ہیں اور اگر کچھ کہہ رہے ہیں تو چاؤ کی سے کیوں کہتے ہیں خوشصورتی سے کیوں نہیں کہتے؟

تجریدی مصوری کا طرۂ امتیاز ابہام ہے اور ابہام بھی اس انتہا کا کہ اگر اس میں "ابلاغ" کی ایک ننھی سی جھری بھی پیدا ہو جائے تو فن کے نقاد فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ یہ شخص بامعنی ہو گیا ہے، اس لئے تجریدی نہیں رہا۔ معنی بمفہوم سے اس دشمنی کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ تجریدی مصوری، مصور کے لاشعور کی پیداوار ہوتی ہے اور لاشعور کو سمجھنے کے لئے صرف شعور کافی نہیں۔ اس کے لئے تو دیکھنے والا اپنے لاشعور کو مصور کے لاشعور کی سطح پر لے آئے تو جب جا کر کام بنتا ہے۔ یہ تو بالکل چڑیا کا دودھ دوہنے والی بات ہوئی! سوال یہ ہے کہ اگر تجریدی مصوری محض لاشعور کی — مصور کے سخت نجی تاثرات کی — اس کے سراسر ذاتی ردِعمل کی پیداوار ہے تو یہ مصور اپنی تصویروں کی نمائشیں کیوں منعقد کرتے ہیں؟ ابلاغ ان کا مسئلہ ہی نہیں۔ پھر کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ اپنے لاشعور کو مصور کے لاشعور کی سطح پر لانے کا چلّہ کاٹے۔ اس صورت میں نمائشیں منعقد کرنے کا صرف یہ جواز باقی رہ جاتا ہے کہ مصور اپنی تصویریں فروخت کرنا چاہتے ہیں مگر کیا اس مقصد کے لئے تصویروں کی ایک دوکان کھول لینا مناسب نہیں ہے؟ آخر یہ ریاکاری کب تک چلے گی کہ مصور کو اپنی تصویروں کے بارے میں عوامی ردِعمل کی پروا بھی نہیں ہے اور وہ عوام کے لئے نمائش بھی لگائے بیٹھا ہے؟ تجریدی مصور یہ بھی کہتے ہیں کہ پوری کائنات بے ترتیب ہے۔ ستارے بے ترتیب ہیں۔ زمین کی سطح بے ترتیب ہے۔ خود انسانیت بے ترتیب ہے۔ اس لئے ہماری مصوری بھی بے ترتیب ہے اور یوں یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہے مگر عرض یہ ہے کہ کائنات کی بے ترتیبی میں بھی تو ایک ترتیب ہے۔ یہ سب بے ترتیبی کم سے کم ایک نظم کے تحت تو ہے جسے شاعرانہ زبان میں "حسنِ ربط" کہہ لیجئے۔ مگر تجریدی مصوری کی بے ترتیبی میں یہ ترتیب، یہ نظم، یہ ربط کہاں ہے؟ سارا جھگڑا اسی ربط ہی کا تو ہے۔ تجریدی مصوری میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو اس مصوری کا بول بالا۔ کیونکہ اس طرح وہ کلاسیکی حقیقت پسندی سے مل جائے گی اور

سمجھ میں آنے لگے گی۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ بے معنی بے ترتیبی ہی پر تجریدی مصوروں کو فخر ہے۔ وہ فن کے ادھورے پن ہی کو فن کی تکمیل کا نام دیتے ہیں اور انھوں نے ابہام کو گہرائی کا خطاب دے رکھا ہے۔ اس صورت میں ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے ملک اپنی قوم، اپنے معاشرے اور اپنے ماحول کی زبان بنیں گے، بیکار ہے، کیونکہ تجرید تو مصور کی ذات کو ان سب وابستگیوں سے "آزادی" دلانے کا نام ہے۔ اس صورت میں کیا ہماری آرٹ کونسلوں نے کبھی سوچا ہے کہ وہ اس اندھا دھند بے معنی، بے مقصد اور بھونڈی تجرید کی ترویج سے فن کا کون سا مقصد پورا کر رہی ہیں؟

پروفیسر حمید احمد خاں

عنایت نامہ مرقومہ ۲۹ ارجون ملا ہیں شکر گزار ہوں کہ آپ نے تجریدی فن پر اپنے بصیرت افروز مقالے کی طرف مجھے متوجہ کیا۔ میں آپ کے ساتھ قطعاً متفق ہوں کہ تجریدی فن کار زغالباً افلاس تخیل کی وجہ سے، فن کو حقیقت سے اس قدر دور لے جاتے ہیں کہ ذوق سلیم اس طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ آپ نے تجریدی مصوری کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ وہی ذرا سے رد و بدل کے ساتھ تجریدی موسیقی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی فن کی تکنیک کا بھونڈا، بے معنی، اور بے مقصد مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی موسیقی رگوں میں خون کو حرکت میں نہیں لاتی، کیونکہ جذبے سے عاری اور محض فنی چابک دستی پر مبنی ہوتی ہے۔ باقی رہ گئیں آرٹ کونسلیں، وہ موسیقی اور مصوری کے خلاف تجربات پر مجبور ہیں۔ اس دور میں جب فن کار کسی نئی ہیئت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، کچھ معلوم نہیں کون سا تجرید کار فن کے لئے واقعی کوئی نئی راہ تلاش کر لے۔

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ڈاکٹر سید عبداللہ

میں نے احمد ندیم قاسمی صاحب کا مضمون (تجریدی مصوری فن کا المیہ ہے) جو امروز مورخہ ۲ ارجون میں شائع ہوا ہے، پڑھا۔ میرے خیال میں قاسمی صاحب نے ایک اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے اور اس لحاظ سے فن کی خدمت کی ہے کہ فنی اور مطالعۂ فن کے ایک اہم اصول کی طرف متوجہ کیا ہے اس قسم کے مسئلوں کی توضاحت کرنا اس لئے بھی لازمی ہے کہ ان وضاحتوں کے بغیر فن کی قدر و قیمت بھی متعین نہیں ہو سکتی اور فن شناسی کا مسلک یا اسلوب مبہم اور پیچیدہ ہو کر فن کے متعلق غلط فہمیوں کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

تجریدی فن دراصل، دو انتہا پسندانہ تحریکوں کا رد عمل ہے۔ پچھلی صدی میں یورپ کے اکثر ممالک میں فطرت پرستی مذہب کا درجہ رکھتی تھی۔ فطرت کی نقل پر اتنا اصرار ہوا کہ نقل کا مطلب اس صورت کی نقل قرار پایا جو بادی النظر میں آنکھ کے سامنے نمودار ہوتی ہے۔ یہ اسلوب، ایک تحریک بن کر "تاثریت" کے نام سے موسوم ہوا۔

عجیب بات یہ ہے کہ فطرت کی نقالی کے نام سے یہ لوگ فطرت کو مسخ کرتے تھے مگر پھر بھی فطرت پرست کہلاتے تھے۔ وہ اصل صورت کو جیسی کہ وہ ہے، پیش کرنے کے بجائے، جیسی کہ وہ نظر آ رہی ہے، کے اصول پر مسخ کر کے پیش کرتے تھے۔ ان کی تصویریں دھبوں اور داغوں کا مجموعہ ہوتی تھیں اور بسا اوقات یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ مصور کس شے کی باز آفرینی کر رہا ہے۔

پھر اس تحریک کے رد عمل کے طور پر ایک اور مسلک سامنے آیا اس کا نام "اظہاریت" ہے۔ اس کے سلسلے میں بھی یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ نام کے بالکل برعکس، یہ اظہار سے زیادہ اخفا کا وسیلہ ثابت ہوا۔ یہ مسلک تاثریت کے برعکس، داخلی تاثر یا تصور کے اظہار کا مدعی تھا۔ اصل شے نہیں بلکہ

اصل شے کا وہ تصور جو مصور کے ذہن میں ہوتا ہے۔ کروچے (اطالوی ماہر جمالیات) کا یہ عقیدہ تھا کہ فن اس حقیقت یا تاثر کا نام ہے جو ذہن میں موجود ہوتا ہے، اس کے لیے خارجی جزئیات نگاری ضروری نہیں۔ اظہاریت کے پیرو ایک حد تک اس فلسفے سے بھی متاثر ہوئے۔

یہ ایک دوسری انتہا تھی۔ یہ سب تحریکیں کچھ تو جدت پسندی کا نتیجہ تھیں یا سابقہ تحریکوں کی انتہا پسندی کے خلاف مخلصانہ ردِعمل۔ تجریدی مصوری بھی ایک ایسا ہی ردِعمل ہے۔ انیسویں صدی کی انتہا پسندانہ فطرت پرستی نے اکثر لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر مصوری کے لئے اصل شے کی باریک جزئیات کی حد تک پیروی لازمی ہے تو فوٹوگرافی شاید مصوری سے بہتر وسیلۂ اظہار ہے۔ فن نقالی ہے مگر محض نقالی نہیں۔ اس میں بازآفرینی (representation) لازمی ہے۔ مصور کا اپنا تخیل یا تصور بھی اس میں حصہ لیتا ہے۔ اسی سے فن پارے میں شخصی یا انفرادی عنصر داخل ہوتا ہے مگر فطرت پرستوں کی مصوری نے اتنا غلو برتا کہ شخصی زاویہ نظر یا تاثر کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی —— اور بعد میں تو جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہوا ہے، فطرت پرستی خود اپنے مقصد کی نفی کرتی رہی اور مسخ و تحریف کا آلۂ کار بن گئی۔ اس کے خلاف ردِعمل قدرتی تھا۔

تجریدی مصوروں کا کہنا ہے کہ تخلیقِ صورت یا تخلیقِ حسن کے لیے کسی شے (موجود فی الخارج) کی نقل یا بازآفرینی کی ضرورت نہیں۔ صورت یا حسن، کو ان اشکال میں محدود نہیں سمجھا جا سکتا جو موجود فی الخارج ہیں بلکہ ؎

صد سال می تواں سخن از زلفِ یار گفت
در بند آں مباش کہ مضموں نماندہ است

حسن تخیل کی کارفرمائی کے ذریعے ترتیب کے نئے انداز بھی دکھا سکتا ہے۔ اس کی وہ صورتیں بھی ہیں جو نیچر میں موجود ہیں اور وہ بھی ہیں جو ذہن انسانی میں موجود ہیں اور ظہور و نمود کے لیے بے تاب ہیں۔

دراصل تجرید پرستوں کا یہ عقیدہ قدرے متصوفانہ ہے۔ کسی دوسری انتہا پسندی کے خلاف برہمی اور شے ہے مگر مصوری میں یا فن میں اصل سے بالکل منقطع ہو جانا دوسری چیز ہے۔ تجرید پرستوں کو یہ اختیار تو حاصل ہے کہ وہ ترتیب و ترکیب کے نئے تجربے کرتے رہیں مگر ان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ فطرت کے تعینات کو بدل دیں۔ اگر وہ زندگی اور نیچر کی بازآفرینی نہیں کرنا چاہتے تو نہ کریں مگر انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسم اور مسمّٰی میں ایسی تفریق پیدا کریں کہ دیکھنے والا شے کو پہچان ہی نہ سکے۔

ہندسی اشکال (مکعبیت) پر بھی عام حالات میں کوئی اعتراض نہیں مگر اسم اور مسمّٰی کا جھگڑا یہاں بھی ہے۔ ایک عام ناظر جس شے کو درخت کہتا ہے، اگر کوئی مصور درخت کی تصویر کے بجائے چند ڈبوں کی تصویر بنا کر یہ کہہ دے کہ یہ درخت ہے تو اس پر ہر ناظر کو متعجب بلکہ برہم ہونے کا حق حاصل ہوگا۔ تجرید پرستوں کا ایک گروہ اس صدی کی غالی حقیقت پسندی (realism) سے بھی چڑ گیا ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعض اوقات فن (اور ادب) میں حقیقت نگاری، روکھی پھیکی روداد نگاری بن جاتی رہی ہے۔ خصوصاً مصوری میں پہنچ کر یہ حقیقت نگاری بڑی سطحی سی کوشش معلوم ہونے لگتی ہے۔ سیزان (۱۸۳۹-۱۹۰۶) نے پچھلی صدی ہی میں اس کے خلاف اپنے محاکمانہ تاثر کا اظہار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تمام اشیائے فطرت کو، مکعب اور مربع ہندسی شکلوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر پکاسو نے واقعی یہ کر دکھایا کہ فطرت کے اکثر اجسام کو عجائب المخلوقات بنا کر ان کو مسمّٰی سے اتنا دور پہنچا دیا کہ ان کو پہچاننا ناممکن ہو گیا۔ اور اس کا نام تجرید یا خالص صورت رکھا حالانکہ یہ صورت، بے صورتی کا دوسرا نام ہے۔

میں حقیقت نگاری کے مسلک کی کمزوریوں سے آگاہ ہوں مگر مجھے یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسلک سے ناراض ہو کر کوئی شخص یا گروہ انسان کو

اس طرح پیش کرے کہ وہ چھپکلی معلوم ہو یا صابن کی ٹکیا نظر آئے۔ یہ فن نہیں مضحکہ خیز حرکت ہے۔ یہ کاوش "تزئین" بھی نہیں، بدوضعی بھی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سائنسی دور ہے، اس لئے اس میں مشین نما اشکال اور صورتوں کا فروغ قدرتی امر ہے۔ مگر یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ مشین نما اشکال و صور کا مستی ہرگز ہرگز بدل نہیں سکتا۔ سائنسی زمانے میں بے عقلی کی یہ روش ہرگز پسندیدہ یا جائز نہیں سمجھی جا سکتی۔ بعض اوقات مسلمانوں کے فنِ اشکال و صور کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے مگر یہ مغالطہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنی عمارتوں میں اور کتاب اور دوسری چیزوں کی آرائش کے لیے خطوط، اور دائروں اور قوسوں کا استعمال کیا ہے مگر ان کا مقصد واضح ہے اور ان کے مستی کے بارے میں بھی کسی کو کوئی مغالطہ نہیں ہوتا۔

اصل مسئلے دو ہیں، اول یہ کہ فن کا انسان کی زندگی سے کیا رشتہ ہے۔ دوسرا یہ کہ فن کا مقصد کیا ہے؟ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ فن زندگی سے انقطاع کا نام نہیں۔ اس کا اصل منصب ہی یہ ہے کہ زندگی کو پیش بھی کرے اور انسانی زندگی کے خلاؤں کو پر بھی کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مصور یا ادیب انسانی زندگی کے متعارفات سے آگاہ ہو یعنی اسے یہ معلوم ہو کہ میرا موضوع انسانوں کے لیے اجنبی نہ ہوگا۔ یہ تو بے بنیاد دلیل ہے کہ مصور محض اپنے لیے تصویر بناتا ہے۔ یہ ویسی ہی دلیل ہے جیسی علامت نگاروں کا انتہا پسند طبقہ کبھی کبھی پیش کیا کرتا ہے۔ فن بہر حال میں تخاطب کا طلب گار ہے۔ اس تخاطب کے بغیر فن محض شغل بیکاری اور عمل لایعنی ہے۔ تجرید پرستوں کے خلوص پر شبہ کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس مغالطے میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ ہوا میں معلق ہو کر اپنے خیال میں یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ ہم معجزہ دکھا رہے ہیں حالانکہ اس میں بڑا معجزہ یہی ہے کہ وہ انسانوں کی توجہ اور تخاطب سے محروم رہتے ہیں اور خود بھی گردن کے بل گرتے ہیں۔

عجوبہ پسندی کی اور بات ہے۔ اگرچہ اس میں بھی ایک انداز تخاطب ہے مگر تجرید محض عجوبہ ہے، فن نہیں۔ فن میں انسانوں کے متعارفات کا استعمال لازمی ہے۔

میں سائنسی زمانے والی دلیل کو پھر زیر بحث لاتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ اس سائنسی زمانے میں، ذہن و نظر کو، سائنسی معلومات کی زیادہ ضرورت ہے۔ سائنسی زمانے میں یہ کس طرح جائز سمجھ لیا جائے کہ اب انسان، حیوانات اور شجر حجر سب "مشین نما" ہو گئے ہیں۔ استعارے کی حد تک تو درست ہو سکتا ہے مگر فطرت کے تعینات ابھی تک قائم ہیں اور کوئی فن کار، ان تعینات کو محض اپنی عجوبہ کاری کی خاطر بدل نہیں سکتا۔

فن تجرید و حقیقت اور حقیقت و تصور کے خوشگوار امتزاج کا نام ہے۔ یہ نقالی بھی ہے اور باز آفرینی بھی ہے۔ یہ ذہن مصور کا عمل بھی ہے اور اس کے موئے قلم کا خارجی اعجاز بھی! وہ جب تک مصور کے ذہن میں ہے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن جب خارج میں ظاہر ہو جاتا ہے تو انسانوں کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے پردے میں اپنے آپ کو ڈھونڈھیں اور اپنے متعارف ماحول کی جستجو کریں ـــــ خواب ہو یا خیال، ماضی ہو یا مستقبل، انسان ان سب آئینوں میں اپنی تصویر ـــــ اپنے ماحول (فطرت) کی تصویر ضرور دیکھنا چاہتا ہے ؎

بہ آب جو نگرم خویش را نظارہ کنم
بایں بہانہ مگر روئے محرمے بینم

سید علی عباس جلالپوری — محمد خالد اختر — فتح محمد ملک
آغا سہیل — جمیل ملک — سیف زلفی

تبصرے

بجنگ آمد

تصنیف: کرنل محمد خاں ناشر: مکتبۂ جدید، لاہور قیمت: ۷/۵۰

ادب کا مقصد ہمیں زندگی کے تنوع، اس کی رنگارنگی، اس کی شادمانی اور اس کے اندوہ سے دوچار کرنا ہے، اس کا مقصد ہمیں ہنسانا اور رلانا اور ہمیں یہ احساس دلانا کہ کوئی شخص اپنے آپ میں ایک جزیرہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ اپنے احساسات و جذبات میں ہم سب ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔ ادب کا مقصد یقیناً ہمیں کسی خاص مسلک یا عقیدے کو اپنانے کی تبلیغ کرنا نہیں۔

میں آغاز ہی میں اس بحث کو اس لئے لے بیٹھا ہوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج بھی ادب اور غیر ادب میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ بے شمار لوگوں کے لئے وہ سب کچھ جو ڈائجسٹوں میں چھپتا ہے "ادب" ہے اور نسیم حجازی کے ناول ادب عالیہ۔ اس کے برعکس جب ایک ادبی مجلّے میں عباس رضوی کی کہانی "نے پیوں گا" شائع ہوتی ہے تو کوئی اس کا نوٹس تک نہیں لیتا۔ یہ ننھی سی شاہکار کہانی اُردو کے سب سے ضخیم اسلامی تاریخی ناولوں پر جواب تک لکھے گئے ہیں بھاری ہے، اور اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ کوئی تنقید نگار اُردو افسانے پر تنقید کرتے وقت اسے درخور اعتنا نہیں سمجھے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک میں کوئی ادب کی دو کوڑی جتنی پروا بھی نہیں کرتا۔ کسی کو پڑھنے سے دلچسپی ہے نہ لکھنے سے، اور لکھنے والوں کو کس قدر عجیب خبطی قبیل کی مخلوق سمجھا جاتا ہے جو صرف اپنا وقت ضائع کرنا جانتے ہیں۔ اچھی کتابیں، برسوں میں بھی نہیں بک سکتیں، کیونکہ تعلیم یافتہ لوگ کالج یا یونیورسٹی سے باہر آنے کے بعد روزانہ اخبار اور ڈائجسٹوں کے علاوہ کچھ اور پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ خلاصوں اور فرہنگوں کی مدد سے پڑھی ہوئی چند ادبی کتابیں ان کا کل ذہنی سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہ فرضی تعلیم ان کے تخیل کو جِلا دینے اور صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی بجائے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لئے کند کر دیتی ہے۔ کالج کے کلاس روم میں ادب سے تھوڑی بہت شناسائی ان کے لئے کافی ہوتی ہے اور تحصیل علم کے بعد وہ ایک ادبی کتاب کی شکل ہی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہی وہ تعلیم ہے جس پر تعلیم داں اتنا زور دیتے ہیں اور جس کو سیاسی بے شعوری سے لے کر خلائی بے راہ روی کا تریاق گردانا جاتا ہے؟ کیا یہ تعلیم ٹھیک نہیں جس کے بغیر ہم موجودہ حالت سے ہم ہزار درجہ بہتر ہوں گے؟

کرنل محمد خاں کی کتاب "بجنگ آمد" کو شکرانے اور انتہائی مسرت کے ساتھ پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آتا رہا کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں سے کتنے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوں گے، کتنوں کو اس اچھی و نادر کتاب کی خوبیوں کا احساس ہوگا۔ ایسی کتابیں اول تو ہمارے ادب میں تقریباً نایید ہیں۔ کوئی انھیں نہیں لکھتا اور اس سبب سے ہوتے، شگفتہ منجھے اسلوب میں تو مطلق نہیں لکھتا۔ فوجی کے طرز بیان میں ایک ایسی قدرتی کیفیت ہے جس پر ہمارے بہترین

لکھنے والے رشک کر سکتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر دل و دماغ کو مسخر کر لیتی ہے۔ "بجنگ آمد" ایک نیم لفٹین کی فوجی زندگی کی داستان ہے۔ سوانح اور سفری تاثرات اور کھلنڈرے پن کا اتنا کھلتا ہوا امتزاج کہ اسے شروع کر کے بیچ میں چھوڑنا آسان بات نہیں۔ اور جب آدمی اس کے اختتام پر پہنچتا ہے (اور اس آخری کلپانے والے فقرے پر یہاں سے ایک اور داستان کا آغاز ہوتا ہے) تو وہ اتنے اچھے اور پُر مذاق ساتھی سے اتنی جلدی جدا ہو جانے پر رنج محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اول تا آخر ایک نشست میں پڑھا اور اس سارے عرصے میں اکتاہٹ یا کوفت کا ایک لمحہ بھی نہ آیا۔ ختم کر چکنے کے بعد میں نے چاہا کہ کاش یہ کتاب اس سے دوگنی لمبی ہوتی جتنی کہ یہ اب ہے، اور میرے دل میں اس دوسری داستان کو پڑھنے کے لئے جس کی مصنف نے خوشخبری دی تھی، ایک بیتابی کا احساس پیدا ہوا۔ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں کم ہی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں، اور جنھوں نے میری "اور کے لئے ہوس" کو اس قدر تیز کیا ہو۔ یہ ایک "ٹور ڈی فورس" ہے۔ بجد چمکیلا، دلچسپ، پُر ظرافت اور بے دم کر دینے والا تماشا۔

کیا میں اس کتاب کو بہت چڑھا رہا ہوں؟ میرے خیال میں بالکل نہیں۔ اردو میں اول تو اس نوع کی کتابیں ہیں ہی کتنی؟ تم ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ میرے ذہن میں دو تین ہی اس وقت آتی ہیں۔ ایک "داستانِ غدر" تھی جو دلّی کے ایک مغل شاہزادے کی خود نوشت آپ بیتی ہے۔ اور جسے لاہور اکادمی نے چھاپا تھا۔ دوسری جو مجھے یاد ہے تھانیسر کے ایک سیاسی قیدی کی انڈیمان میں اسیری کی کہانی تھی۔ ان دونوں کتابوں نے مجھے مسحور کیا۔ لیکن ان میں قدیم رنگ اور متانت تھی اور وہ اس زمانے میں عجائبات کے ضمن میں جگہ پاتی ہیں۔ "بجنگ آمد" دوسری جنگ عظیم کے ایک لفٹینٹ کی ذاتی، چندھیا دینے والی کہانی ہے۔ ایک لفٹینٹ، جو صحت مند، نارمل اور خوش ذوق ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اول درجے کا پُر فن داستان گو بھی۔ ہم اُردو ادب کی دولتمندی اور زرخیزی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ تاہم کبھی کبھی ہمیں اپنے دامن کی تنگی کا احساس ہوتا ہے اور ہم پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ اردو ادب کہاں ہے۔ اُردو میں دو تین اچھے ناول ہیں اور بلاشبہ چند ایک اعلیٰ پایہ کے مختصر افسانے جنھیں یورپی ادب کے فنکاروں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر ہمارا ادبی چمن کتنا ترسا ہوا، کتنا خشک ہے۔ ہمارے سارے ادب میں ایک بھی سوانح یا سفر و سیاحت، یا جیل لیٹرز کی فسٹ ریٹ کتاب نہیں جو ایک ماڈرن سلجھے ہوئے پڑھنے والے کو مطمئن کر سکے۔ ہم ایک بھی ڈاؤٹی، فریا سٹارک، تھیسیجر (THESIGER) پیدا نہیں کر پائے۔ سٹیونسن کی "ٹریولز وِد اے ڈانکی" سی ایک بھی کتاب ہماری زبان میں ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی (محمد حسین آزاد ایسی کتاب شاید لکھ سکتے، اگر ان پر آخری عمر میں جنون حملہ آور نہ ہوتا) وہ لوگ جو یہاں ان اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، بالعموم ان کی اعلیٰ توانا روایات سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لئے غیر دلچسپ، بے جان چیزیں لکھتے ہیں جنھیں کوئی ضعیف العقل ہی پڑھ سکتا ہے۔ ایک شخص سوانح لکھنے بیٹھتا ہے، اور اپنے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ ایک سفرنامہ لکھنے کا نیک ارادہ باندھتا ہے اور اس کی بجائے ایک تیسرے درجے کی گائیڈ بک لکھ ڈالتا ہے جس میں قابل دید مقامات کے تذکرے سیدھے سفری بروشر میں سے ترجمہ کر دیئے جاتے ہیں۔ جدید ادب میں ہماری ذہنی پونجی لے دے کے تنقیدوں اور مقالوں پر صرف ہو رہی ہے۔ جیسا کہ شفیق الرحمٰن نے ایک دفعہ مجھ سے ہنستے ہوئے کہا "اردو میں ادب اتنا نہیں جتنا اس پر مقالے لکھے جاتے ہیں۔"

جس صنف اور طرز میں "بجنگ آمد" لکھی گئی ہے، اس میں وہ ہمارے جدید ادب میں منفرد ہے۔ انگریزی میں اس مقبول صنف میں بہت سی کتابیں ہیں اور ان میں سے چند ایک ماڈرن کلاسک کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ میجر ییٹس براؤن کی "بنگال لانسر" ان میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب جب چھپی تو فوراً ایک بیسٹ سیلر بن گئی۔ پھر اس پر طویل فراموشی کا دور آیا اور اب میں سنتا ہوں کہ یہ پیپر بیک میں آئی ہے۔ ناولسٹ جان ماسٹرز کی "بیوگلز اینڈ اے ٹائیگر" بھی جو کرنل محمد خان کی کتاب کی طرح دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک ذاتی آپ بیتی ہے، ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ ونسٹن چرچل کی "سٹوری آف مالاکنڈ فیلڈ فورس" اور "ریور وار" بھی اسی طرح کی سوانحی تاریخیں ہیں مگر امپیریلسٹ چرچل کی پُر شکوہ فصیح نثر مزاح کے عنصر سے عاری ہے اور صرف اس کے خاص پرستار ہی اس کی کتابوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ ورنہ دونوں کتابوں

کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان اس خاص صنف میں بے حد مالا مال ہے۔ "بنگال لانسر" کو میں نے چودہ پندرہ سال پہلے پڑھا تھا میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ "بجنگ آمد" ہر لحاظ سے ییٹس براؤن کی کتاب سے بہتر کتاب ہے۔

کرنل محمد خاں اپنی کہانی بڑی خوش طبعی، بے تکلفی اور شگفتگی سے بیان کرتا ہے۔ ایک ایسے منجھے ہوئے طرز بیان میں جس کی ایک فوجی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کی نثر سورج کی چمک اور صاف ستھری ہوا کی طرح ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس میں خوف کا ذائقہ بھی آجاتا ہے: اوڑ کھائی کے کنارے پر اٹکتی ہوئی زندگی کی خوفناک خوبصورتی کا بیان بھی (کیونکہ ہمارا ہیرو لفٹیننٹ شمالی افریقہ کے محاذ جنگ میں رومیل سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھیجا گیا اور دو تین دفعہ موت سے اس کی بڑی قریبی علیک سلیک ہوئی)۔ سدی رزیغ سے صولوم کی طرف پسپائی کے دوران وہ بال بال بارود سے اڑتے ہوئے بچا اور جب ہم اس کے سارے بریگیڈ کی تباہی کا حال پڑھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ہمیں کرنل محمد خاں کے بچ کر آنے پر خدا کا شکر بجا لانا چاہیئے۔ اگر وہ مارا جاتا تو ہمارے لئے اتنی پر مسرت کتاب کون لکھ سکتا۔

"بجنگ آمد" میں دوسری جنگ عظیم کی فوجی بیرک لائف کی روشن، ذہن میں رہ جانے والی جھلکیاں ہیں۔ ساتھی افسروں کے تیکھے اُستادی سے کھینچے ہوئے مرقعے جن میں محبت اور مزاح کی رنگ آمیزی ہے، ہمیشہ مسرت دیتے ہیں۔ درشت مگر درے کرنل "بلمپ" ان صفحوں میں کبھی کبھی آن نکلتے ہیں۔ مگر محمد خاں ہمیں ان پر خوب خوب ہنساتا ہے کس قدر HUMAN لکھنے والا وہ ہے! اس کی کتاب خود اس کی اپنی داستان نہیں۔ یہ ان ہزاروں نیم لفٹیننٹوں کی ذاتی اندرونی کہانی ہے جو پچھلی جنگ عظیم میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے، ان کے وسوسوں، ان کے جذبات، اُن کی امنگوں اور ان کی ذہنی اٹھانوں کی کہانی، بناوٹ کے شائبے کے بغیر لکھی ہوئی اور کافی تندرست مزاح کے ساتھ۔

یہ محض ایک فوجی کے جنگ کے سالوں کے "میموائر" ہی نہیں، یہ ایک اول درجے کی مزاحیہ تخلیق بھی ہے۔ یہ مزاح استادی اور روایتی مزاح کی طرح عبارت آرائی کا محتاج نہیں۔ یہ ایک قدرتی چشمے کی طرح اُبلنے والا مزاح ہے۔ "بجنگ آمد" کو شروع کرنے سے چند دن پہلے میں نے "ایولین واہ" کا جنگی ناول MEN AT ARMS پڑھا تھا۔ واہ ایک بڑا قدرتی مزاح نگار ہے اور کرنل محمد خاں کا مزاح بھی کچھ کچھ واہ کی طرح کا ہے۔ میری رائے میں MEN AT ARMS اور "بجنگ آمد" ایک ہی ذائقے اور ایک ہی قسم کے ذہنی انداز کی کتابیں ہیں۔ اگرچہ ایک ناول ہے اور دوسری کہنے کو ایک میموائر مگر ان دو کتابوں کی صداقت، ان کی قدرتی بے لاگ مزاحی کیفیت، ان کی گہری، غیر محسوس اچھائی، سانجھی ہیں (اور مجھے جس طرح کچھ کچھ شک ہے کہ MEN AT ARMS کا "بیز کروشنک" خود ایولین واہ ہے۔ اسی طرح یہ ناول بھی تھوڑا بہت بس میں ایک میموائر ہے)

مصنف سنہ ۱۹۴۰ء میں فوج میں بھرتی ہوا۔ بقول اُس کے اُسے نہ تو ہٹلر کی دلآزاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ دونوں سے اس کے مراسم دوستانہ تھے۔ صرف لفٹیننٹ بننے کا شوق تھا۔ ایک ہلکے پھلکے مزاح انٹرویو کے بعد وہ کمیشن کے لئے منتخب ہوا اور ۸ اگست کو اسے او ٹی ایس مہو میں ٹریننگ کے لئے حاضری کا تار ملا۔ لفٹیننٹی کی شان کو ذہن میں لئے جب وہ فسٹ کلاس کے ڈبے سے مہو کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو ایک کھردرے تین پٹیوں والے گورے سارجنٹ نے اسے اور چند دوسرے ہم جنس حضرات کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور ایک دو تین بولنے کا حکم دیا۔ نوجوان محمد خاں اور اس کے ساتھیوں کو اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ انہیں کچھ اس قسم کا خیال تھا کہ فوجی بینڈ سے ان کا استقبال ہوگا۔ نو مہینے کی سخت ٹریننگ کے بعد ایک دن لفٹیننٹی کا حکم آ ہی گیا اور کندھے پر پھول جگمگانے لگے۔ اس کی پوسٹنگ پشاور ڈسٹرکٹ سگنلز میں ہوئی جہاں پہلے ہی روز ریڈیو پر اردو گانے سننے اور ایڈجوٹنٹ سے ایک قدرے معصوم سوال کرنے پر وہاں کے "بلمپ" اس سے کشیدہ خاطر ہوگئے۔ ان بلمپوں نے دس پندرہ دن کے بعد ہی اسے بنوں کی طرف فقیر ایپی کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ لفٹیننٹ ٹام کے بغیر جو فقیر ایپی کی سرکوبی کرنے والے ڈپٹی کا علم بن تھا، ان بلمپوں کی

برج کی چوکڑی پوری نہ ہوتی تھی۔ اور وہ ٹام کو کسی طرح واپس بلانا چاہتے تھے۔ اپنے بیرے نیر باز کے ساتھ جب وہ میران شاہ" پہنچا تو لال اور لمبی مونچھوں والا ٹام پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ ٹام اسے دیکھتے ہی بولا" قصور تمہارا ہے تمہیں برج آنی چاہیئے تھی"۔ ٹام، برج کی چوکڑی پوری کرنے پشاور چلا گیا اور محمد خاں بریگیڈ کے ہمراہ فقیر ایپی کا قرب حاصل کرنے کے لئے دتا خیل روانہ ہوگیا۔ کچھ دن کی سرحدی قبائلی جنگ کے بعد سے وائرلیس پیغام پہنچا کہ" پشاور پہنچو۔ تمہاری جگہ ٹام آ رہا ہے" جب وہ پشاور پہنچا تو بلیسون نے اسے سمندر پار جانے کا حکم سنایا۔ اس کے دوست جان راجانت نے اسے کہا" یہ ان سارجنٹوں کی سازش ہے، سمندر پار دراصل ٹام کو جانا چاہیئے تھا۔ وزیرستان کی لڑائی اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لئے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آ جائے گا اور پھر مزے سے برج کھیلیں گے"۔

محمد خاں پشاور سے ممبئی پہنچا جہاں وہ کچھ دن ٹرانزٹ کیمپ میں رکھے جانے کے بعد ایک جہاز میں سوار کر دیا گیا۔ جہاز کی منزل مقصود "ٹاپ سیکرٹ" تھی لیکن ہر ایک کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ وہ بصرہ جا رہے ہیں۔ ایک صبح وہ جاگا تو جہاز بصرے کی بندرگاہ میں لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ بصرے نے نوجوان لفٹیننٹ کو کافی مایوس کیا۔ الف لیلیٰ کی رومان انگیز سرزمین پر اس کی نظر ایک نوٹس بورڈ پر پڑی "سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے خبردار رہیں"...... مگر یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بصرے سے شعائبہ کیمپ اور پھر حبانیہ کیمپ۔ وہاں سے صحرائے کیاوہ۔ ہمارا نیم لفٹیننٹ کچھ دن بغداد کی رنگینیوں سے بھی بہرہ ور ہوا۔ موصل سے اس کا بریگیڈ طبرق کی سمت روانہ ہوا۔ جہاں جنرل رومیل ان کی مزاج پرسی کے لئے انتظار کر رہا تھا......

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ ایک جنگ کی کتاب (وار بک) نہیں ہے یہ نیم لفٹیننٹ محمد خاں کی اپنی پرکشش داستان ہے اور توپوں کی باڑ اور ٹینکوں کی گرج میں بھی اس کی باچھیں کھلی رہتی ہیں۔ میری نظر سے کبھی کوئی ایسی "وار بک" نہیں گزری جس میں اتنے ناقابل فراموش HUMAN واقعاتی ٹکڑے ہوں اور اتنا خوش طبعانہ مزاح۔ یہ ٹکڑے اس کتاب میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ کیڈٹ ارجن سنگھ اور اس کا کرنل شراب میں دھت اور ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں حمائل کئے ناچتے ہوئے۔ کپتان راجندر سنگھ جنالیہ کبھی اپنی آرمڈ کار اور کبھی ٹینک میں شعائبہ کیمپ سے بصرے کیبرے دیکھنے کے لئے جاتا ہوا اس نے فرد جرم لگنے پر اپنی صفائی میں کورٹ کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ ٹریننگ پر جا رہا تھا اور کیبرے پر غلطی سے جا پہنچا کیونکہ اس کے قطب نما میں خرابی تھی، سکھ سپاہی دم لنڈھانے کے بعد ڈھولک اور چمٹے کی تال پر تیری ڈونگ وا پیالشکارا تے بالیاں نے رل ونگ لئے" گاتے ہوئے صوم وم کی طرف پسپائی کے دوران، چند من چلے پنجابی مزے سے چائے کی کیتلی رکھے ماہیا الاپتے ہوئے جیسے کوئی جنگ نہ ہو اور وہ اپنے گراں کی چوپال میں بیٹھے ہوں۔ ایسی FUNNY اور دیومن اور پرسوز کہانیاں اس کتاب میں بہت سی ہیں۔ آدمی کس کا ذکر کرے اور کس کو چھوڑے۔

"بجنگ آمد" ایک سرخ اور نیلے دیدہ زیب گرد پوش میں آئی ہے اور ایک الٹی رکھی ہوئی آہنی فوجی ٹوپی کی تصویر کے ساتھ جس میں سے سپاہی کی محبوبہ کی تصویر جھانک رہی ہے۔ یہ وِنڈانک پر نہایت خوبصورت چھپی ہے۔ یہ جنگ کی کہانی ہے۔ مگر زندگی کی باتیں کرتی ہے۔

اور اب لفٹیننٹ محمد خاں! تمہاری اگلی داستان ہمیں کب پہنچے گی؟ خدا کے لئے لکھتے رہو، لکھتے رہو۔ ہماری بھوک کبھی نہیں مٹے گی۔

محمد خالد اختر

باز آؤ اور زندہ رہو

تصنیف: حنیف رامے　　　ناشر: مکتبہ جدید، لاہور　　　قیمت: تین روپے

یہ تحریریں کہنے کو تو اداریے ہیں مگر ان کا ان رسمی، بے جان اور رفا لتو قسم کی تحریروں سے کوئی علاقہ نہیں جنھیں ہمارے مدیران جرائد و رسائل کے

آغاز میں ٹانک دیتے ہیں اور پڑھنے والے جنھیں اداریہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تازگیٔ اظہار، نزاکتِ احساس اور ندرتِ خیال ان تحریروں کی جان ہے اور مصنف نے انھیں بجا طور پر انفرادی، معاشرتی اور ملی مسائل پر مضامینِ نو کا ایک "انبار" قرار دیا ہے۔

کتاب "چاندنی کی سیج" اور "دھوپ کا سائبان" نام کے دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلے حصے کے مضامین ایک ماہانہ رسالہ کی صحافتی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے بھی ایک رچی ہوئی ادبی تخلیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ بے شک یہ مضامین اردو نثر کی کسی مروجہ صنف کی ذیل میں نہیں آتے مگر ان میں مختلف اصنافِ نثر شیر و شکر ہیں اور کسی نئی صنفِ نثر کے ظہور کے امکانات موجود ہیں۔ یہ امکانات حنیف رامے کا رشتہ ان لکھنے والوں سے جوڑتے ہیں جو نئی راہوں کی تلاش سے اردو نثر کا جمود توڑنے میں کوشاں ہیں۔

سن پچپن کے لگ بھگ اردو ادب میں جو نئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان کے زیرِ اثر ہماری تخلیقی نثر افسانہ نگاری تک محدود ہو کر رہ گئی اور ایک طویل مدت تک اردو نثر کی اقلیم میں افسانہ نگاروں کا علم بلند رہا۔ جوں جوں افسانہ ترقی کے مراحل طے کرتا گیا، اردو نثر کی زرخیزی اور شادابی میں اضافہ ہوتا رہا۔ مگر افسانے میں جمود اور زوال کی کیفیتیں نمودار ہوئیں تو اردو نثر کا رنگ روپ بھی اجڑنے لگا۔ ایسے میں محمد حسن عسکری اور ان کے حلقۂ اثر کی تنقیدوں اور وزیر آغا اور دوسرے انشائیہ نگاروں کی کاوشوں سے اردو نثر میں تازگی کی نئی کیفیت نمودار ہوئی۔ لیکن ان ادیبوں سے کہیں زیادہ اُن لکھنے والوں نے اردو نثر کو توانائی اور بانکپن دیا جو مانے جانے ہوئے ادیب نہ تھے بلکہ جنھیں سرے سے اپنے ادیب ہونے کا زعم ہی نہ تھا۔ ان لوگوں کو اپنے تجربات و مشاہدات نے کچھ یوں بے چین کیا کہ یہ انھیں قلمبند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں میرا اشارہ محمود نظامی کے "نظر نامہ"، صفیہ اختر کی "زیرِ لب" اور کرنل محمد خان اور بیگم اختر ریاض کے سفرناموں کی جانب ہے۔ ان لکھنے والوں نے سامنے کی زندگی کے دیکھے بھالے مناظر اور جانی بوجھی حقیقتوں کو ایسے مقامِ نظر سے دیکھا اور دکھایا اور اس سلسلے میں ریڈیو اور فلم کی جدید ترین تکنیکوں کو اس ہنرمندی سے برتا کہ بظاہر بے جان حقائق اور بے رنگ کوائف افسانے سے زیادہ دلچسپ اور داستان کے سے پُراسرار نظر آنے لگے۔ "چاندنی کی سیج" کے تحت دیئے گئے اداریے حنیف رامے کو ان لکھنے والوں سے ہم رشتہ کرتے ہیں۔

حنیف رامے نے اقتصادیات میں ایم اے کرنے کے بعد مصوری کو اپنا کام سمجھا، مگر ان کی ہستی مصوروں کے مقابلے میں لکھنے لکھانے والوں سے رہی اور وہ افسانہ نگار بننے کے خواب دیکھتے رہے۔ ان خوابوں کی تعبیر "نصرت" کے زیرِ نظر اداریوں کی صورت میں سامنے آئی۔ انفرادی اور معاشرتی زندگی کے مسائل و مشکلات ان تحریروں کا موضوع ہیں مگر اندازِ بیان، سیدھا سپاٹ اور بیانیہ ہونے کی بجائے تمثیلی ہے کہیں ڈرامائیت کا سہارا لیا گیا ہے تو کہیں رمز و ایما کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر اداریے مختصر افسانے ہیں یا انشائیے۔ مثلاً "بنتا بنتا ہوا تو" کئی اعتبار سے مختصر افسانہ ہے۔ "کسی کی پہچان" میں انشائیہ کے بیشتر لوازم موجود ہیں۔ "اور زمان کی دعا" میں پرانی حکایت اور نئے افسانے کے فن سے بیک وقت استفادہ کیا گیا ہے۔ اس طریق کار نے پٹے پٹائے موضوعات میں دلچسپی اور اثر انگیزی کی انوکھی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ محبت کے موضوع پر لکھے گئے گیارہ اداریے اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اداریہ ذاتی تاثر بھی ہے اور معاشرتی مرقع بھی۔ اور سب مل جل کر ایک ایسے سلسلۂ مضامین کا روپ دھارتے ہیں جس میں ہماری معاشرت میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک محبت کی بہت سی شکلیں موجود ہیں۔ ان کا انداز سوانحی ہے مگر ان میں جذباتیت یا بے جان رومان زدگی کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہاں محبت کے تجربے کو مابعد الطبیعیاتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے جو نئی اردو نثر میں اپنی مثال آپ ہے۔

"چاندنی کی سیج" سے "دھوپ کے سائبان" تک آتے آتے حنیف رامے کو عجیب حادثات پیش آئے کہ ان کا اندازِ نظر ہی بدل گیا۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے جو قومی تعمیرِ نو کے سلسلے میں ہمیں درپیش ہیں۔ مسئلہ کشمیر سے لے کر جمہوریت کے مستقبل تک اور زراعت کی ترقی سے لے کر

خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین تک کتنے ہی اہم وقتی مسائل اس حصے میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ مگر یہاں حنیف رامے ایک معمولی صحافی سے زیادہ بصیرت کا ثبوت نہیں دیتے۔ حد یہ ہے کہ یہاں ان کی نثر کا وہ رنگ بھی مرجھا گیا ہے، جو کتاب کے پہلے حصے کے لئے باعثِ رعنائی ہے۔ خود حنیف رامے کا کہنا یہ ہے کہ "دوسرے حصے کے مضامین ہیں، جو معاشرتی اور قومی مسائل سے متعلق ہیں، بات کو دلیل کی رفاقت میں پیش کیا گیا ہے۔ دلیل سے میری دلچسپی فن ہی کے وسیلے سے آگے چلی۔ فن پر سوچتے سوچتے کچھ کچھ فلسفے سے رغبت ہوئی اور فلسفے نے دین کی راہ پر ڈال دیا۔" ——— جن حادثات کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا وہ یہ ہیں کہ حنیف رامے نے فن کی دشوار گذار راہ چھوڑ کر فلسفے اور دین کی آسان راہ اختیار کرلی ہے اور اس راہ پر وہ ایک زقند لگا کر پہنچے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ قومی مسائل پر لکھتے وقت وہ ایک برخود غلط فلسفی اور ایک خود ساختہ مجتہدِ عصر کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ مبادا آپ کو اس زمانے میں اس طرح کے بہروپ قرینِ قیاس نہ معلوم ہوں، میں آپ کو حنیف رامے کا وہ تعارف سناتا ہوں جو خود حنیف رامے نے کتاب کے شروع میں کرایا ہے:

"جس طرح نبوت مانگے سے نہیں ملتی، خدا کی دین ہوتی ہے، شاید سوچ کا سیلاب بھی انسان کے گھر غیب سے بھیج دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حنیف رامے کو بھی خیال کے گھرے، اگر نجتے، خون آشام دھنوں میں سرگرداں کر دیا گیا کہ میاں! مزے سے تصویریں بناتے تھے اور آوارگی و عاشقی کے لذت کیش تھے۔ ذرا اونچ دانیگال بھی کھیلو، یہ سیر بھی دیکھو کہ جو کچھ ہے وہ کیا ہے اور ہونا کیا چاہیئے تھا اور ہوتا کیوں نہیں اور ہو کیسے سکتا ہے؟"

مجھے یہ گمان گذرا ہے کہ حنیف رامے کے گھر "سوچ کا یہ سیلاب" غیب سے نہیں، امریکہ سے آیا ہے۔ جس زمانے میں جو کتاب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی ہے اس زمانے میں اسی کتاب کے خیالات کو اپنا لیتے ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ امریکی مصنفین کی کتابیں انھیں زیادہ مرغوب ہیں اور انھیں مصنفین کے خیالات کی تجارت ان کے اداریوں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً "زراعت پر زور" کے عنوان سے جو تحریر شاملِ کتاب ہے وہ یوں شروع ہوتی ہے:

"آج کل اقتصادیات والوں کے یہاں ڈبلیو ڈبلیو روسٹو کی کتاب "اسٹیجز آف اکنامک گروتھ" کا بہت شہرہ ہے۔"

کسی مسئلے پر کسی غیر ملکی دانشور کی دانش کو من و عن پیش کر دینا بھی افادیت سے خالی نہیں مگر خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں حنیف رامے ملکی اور دینی مسائل پر امریکیوں کے انداز میں سوچتے ہیں اور پڑھنے والوں کو "متنبہ" کرتے ہیں کہ اگر وہ باز نہ آئے تو مٹ جائیں گے۔ ایسے مقامات پر ان کا لہجہ ناقابلِ برداشت ہے اور طرزِ فکر حیرت انگیز ——— لہجہ اس حد تک ناقابلِ برداشت ہے کہ کتاب کا نام توراتِ مقدس کی آیت کی بجائے ڈیل کارنیگی کے کسی جملے سے مستعار معلوم دیتا ہے اور طرزِ فکر اس حد تک حیرت انگیز کہ حنیف رامے اس بیسویں صدی میں بھی عام آدمی کے لئے "عامی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ستم یہ کہ اس سلسلے میں قرآن حکیم سے استدلال کرتے ہیں، وہی قرآن حکیم جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہہ رکھا ہے:

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

بیشتر مسائل پر لکھتے ہوئے حنیف رامے نے حکومتِ وقت کے نقطۂ نظر کی وکالت جس ذہانت اور وسعتِ مطالعہ سے کی ہے وہ قابلِ داد ہے مگر اکثر اوقات وہ بہت دور نکل گئے ہیں۔ وہ "قیادت کی تعمیر" میں اطاعت کے اصول پر مبالغہ آمیز حد تک غیر ضروری زور دے رہے ہوں یا قائدِ اعظم کی آئین پسندی کی حمد ثنا کے دوران سیاسی آزادی کی خاطر بغاوت پر ہجرت کو ترجیح دے رہے ہوں اور نہ صرف ترجیح دے رہے ہوں بلکہ سیاسی آزادی کی خاطر بغاوت کو سراسر غیر اسلامی بلکہ غیر انسانی سرگرمی ثابت کر رہے ہوں یا سائیکلیں، موٹر سائیکلیں، رکشے، کاریں اور بسیں درآمد کرنے کی مخالفت میں یہ استدلال پیش کر رہے ہوں:

سب سے پہلے یہ ہو گا کہ سڑکوں پر حادثات کی رفتار بڑھ جائے گی۔ کرسمس اور نئے سال کے تہواروں پر ایک امریکہ

میں تین چار سو آدمی ٹریفک کے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں، حادثات کی روک تھام کے لئے ہمیں سڑکیں چوڑی کرنی پڑیں گی، اس ضمن میں محکمہ تعمیراتِ عامہ کو نئی بھرتی کرنی پڑے گی، ٹریفک پولیس میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ غرض ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا خرچ کا۔"
تو عام پڑھنے والا ان کی نیت پر نہ سہی، ذہانت پر ضرور شبہ کرنے لگتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حنیف رامے کی ذہنی ترقی کا یہ مرحلہ گذشتنی ہے۔ اگر حنیف رامے یہ جان لیں کہ قرآن عزیز اور انجیل مقدس کے جا و بیجا اقتباسات دیتے چلے جانے یا ان کی لفظیات و تراکیب کی بھرمار سے تحریر میں الہامی شان پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ الٹا "جناتی" قسم کی نثر وجود میں آتی ہے۔ اور پسندیدہ مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات کی کثرت سے قاری کا ناک میں دم کر دینے سے تحریر میں فکری دبدبہ اور علمی وقار پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ الٹا سطحیت ٹپکتی ہے، تو یہ مرحلہ بہت جلد گذر جائے گا اور پھر ہم حنیف رامے کی وہی نثر پڑھ سکیں گے جو کتاب کے پہلے حصے میں زندہ ہے۔

فتح محمد ملک

واہگہ کے اُس پار

مصنف: رفیق چوہدری
ناشر: رچناب پبلشرز۔ کچہری روڈ۔ گوجرانوالہ
صفحات: ۱۵۲
قیمت: دو روپے

جنگی ناول کا تعلق حقیقت نگاری کی روایت سے ہے۔ زولا کا "ڈیبیکل" اور لیوطالسطائے کا "وار اینڈ پیس" عظیم ناول ہیں جن میں جرمن فرانسیسی جنگ اور نپولین کے حملۂ روس کے پس منظر میں معاشرے پر جنگ کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ گذشتہ عالمگیر جنگوں سے متعلق مغربی زبانوں میں بلند پایہ ناول لکھے گئے جن میں "فور ہارسمین آف اپوکلپس" اور "آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ" مقبول ہوئے۔ "واہگہ کے اُس پار" اسی سلسلۂ روایت کا ایک حلقہ ہے۔

میں اسے ناول کہنے میں متردد ہوں کہ ڈیڑھ سو صفحات میں نہ ناول جیسی جزئیات نگاری ممکن ہے نہ کرداروں کی ارتقائی تحلیل سرسبز ہو سکتی ہے۔ راقم کے خیال میں کرشن چندر کی "شکست" کی طرح یہ بھی ایک کامیاب طویل مختصر افسانہ ہے جسے ناول کا نام دیا گیا ہے۔ یہ قصہ گذشتہ ستمبر کی جنگ پاک و ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ امجد ایک پاکستانی ہے جو ہندوستان کو ناجائز وسائل سے غلہ برآمد کرنے کا کاروبار کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اوائل ستمبر میں امرتسر جاتا ہے اور اپنی محبوبہ کلدیپ کے یہاں ٹھہرتا ہے۔ آخر شب کو جنگ چھڑ جاتی ہے اور امجد دشمنوں میں گھر جاتا ہے۔ کلدیپ ہر مشکل میں اس کے آڑے آتی ہے۔ اسی کی مدد سے وہ تین مغویہ پاکستانی لڑکیوں کو اوباشوں کے دستِ ہوس سے بچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ آخر کلدیپ کا ایک قدیم چاہنے والا نمودار ہوتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے پریمی کو دو دارو جیت لیتا ہے اور امجد کو پاکستانی علاقے میں پہنچا دیتا ہے۔

"واہگہ کے اُس پار" کا اسلوب بیان رواں دواں ہے چنانچہ کہانی کی دلچسپی میں آخر تک کوئی فرق نہیں آتا۔ اس قصے کی تین خوبیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رفیق چوہدری نے ہندی اور پنجابی کے موزوں الفاظ اور جملوں کے برمحل استعمال سے واہگہ کے اُس پار کی حقیقی فضا پیدا کر دی ہے۔ سکھ، جاٹ، مہاشے، سیٹھ بنئے، بھڑوے، ریلوے کے چوکیدار وغیرہ اپنی اپنی خاص زبان بے ساختہ بولتے ہیں۔

"یار اس سالی کو پتہ نہیں تو نے کیا گھول کر پلا دیا ہے، سالی بارود ہے بارود، بھگ سے بھٹ پڑتی ہے۔"

"اس کا نام مت لے مجھی، بچھاتی پر سانپ لوٹتا ہے، سوگند ہے کالی کی، کلیجہ لوٹتا ہے۔"

"ہے بھگوان ہماری رکھشا کریو۔ نور خان کے بیر دے میں دم ڈالیو، پرنتو اس کے جہاز اس جگہ بم نہیں گرادیں۔"

"کیوں اڑی کرتے ہو سیٹھ؛ پچھتاؤ گے۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ بتائے دیتا ہوں۔ گاڑی بھر کر لے جاؤ گاڑی بھر کے۔ پنجاب کا گورا مال پھر کہاں ملے گا۔"

سیٹھ بولا "تم کرو گر دو ہجار منظور ہو وے تو ہاں بولو۔ جیادتی لفڑا اچھا نہیں ہے۔"

"یہ شاستری کی بدھی کو پتہ نہیں کیا ہوا، جو خواہ مخواہ ان مسلمنوں کو چھیڑ دیا۔"

"سوہن میرے ویر، واہگورو کا واسطہ تو جو کہے گا مانوں گی۔ سوہن میرے ویر مان جا۔"

"جی چاہتا ہے اسے پکڑ کر گھٹ گھٹ جپھیاں ڈالوں اس کے منہ کی ساری لالی پی جاؤں۔"

"سوہنیو کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہی کرو۔"

کتاب کے صفحات پر جابجا دقتِ مشاہدہ اور لطافتِ بیان کے شگفتہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں

"کرنل صاحب کے ہاتھ میں ایک بیتی سی بید ہے جسے وہ کبھی کبھی دونوں ہاتھوں میں دبا کر دوہرا کرتا ہے۔"

سمگلر کہتا ہے "میں وہ سانپ ہوں جو غیروں کی بین پر ناچتا ہے اور اپنوں کو ڈسنے سے ذرہ بھر نہیں چوکتا۔"

"وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی جیسے آم کے پیڑ سے چنبیلی کی بیل اور اس کی خوشبو اور اس کی مستی میرے حواس پر چھا گئی۔"

"بجے بندے ماترم کے نعرے میرے ذہن کے پردوں پر کنکروں کی طرح بجنے لگے۔"

"بھوکی جنتا کے پیٹ کا ناسور جسے چند دن جھوٹی خبروں، جھوٹے دلاسوں اور کھوکھلے وعدوں سے ڈھکا گیا تھا، اب پھر رسنے لگا۔"

"عیار اور مکار قیادت نے بیچاروں کی سب طاقتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور ان کو حالات کے ایسے گورکھ دھندے میں جکڑ رکھا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو ان بھول بھلیوں سے نکال لے جانے کی سکت نہ رکھتے تھے اور وہ بالکل گایوں اور بھیڑوں کے گلوں کی طرح اپنے چرواہوں کے رحم و کرم پر تھے اور وہ چرواہے جن کے اپنے ڈیرے تو نخلستانوں میں ہوں اور ریوڑ صحرا کی ویرانیوں میں بھٹکتے پھرتے ہوں۔"

مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگیں، سنکھ پھونکے گئے اور برہما، شو، وشنو، پاربتی، کرشن، رام اور سیتا کے پجاری اپنے اپنے دیوتاؤں کو گھیرے گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے اپنی سہائتا کی بھیک مانگنے لگے۔ دیو داسیاں سولہ سنگھار کئے، تلک سجائے کنواریوں کی لے پر دیوتاؤں کے سامنے ناچتی گاتی تھرکتی، ورمن موہنی اداؤں سے ان کے من پر چھانے لگیں "پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچی رے" اور پتھر کے کٹھور دیوتا کہانیوں اور حقیقتوں کے روایتی کردار اپنی منجمد آنکھوں کے ساتھ جوں کے توں کھڑے رہے۔ مدھر گیت، چنچل اور البیلی اداؤں سے بھرپور ناچ کے رنگ ان میں کوئی حرکت پیدا نہ کر سکے۔

جنگ کے دوران انسان کی رگِ وحشت پھڑک اٹھتی ہے۔ تہذیب کا جامہ تار تار ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں غار کے انسان کی خشمناک چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ عقلِ سلیم اور ہمدردیِ انسانی پر سلب و نہب کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ دشمن کی خوبیوں سے قطع نظر کی جاتی ہے اور وہ شیطان مجسم دکھائی دیتا ہے۔ ان کٹھن احوال میں بھی رفیق چوہدری نے انسان دوستی کا پالن کیا ہے۔ امجد اپنے دشمن سوہن سنگھ کو جان پر کھیل کر بچاتا ہے اور اس طرح اس کا دل موہ لیتا ہے۔ اس سے پاکستانی مسلمان اور ہندی سکھ پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور دو انسانوں کی محبت بھری شبیہ آنکھوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔ امجد ہندو لڑکیوں کو بچاتا ہے تو وہ جذبہ ممنونیت سے بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ جاتی ہیں۔ اور امجد کہتا ہے:

"یہ پیار، یہ خلوص یہ ان جذبات کا ریلا جس میں ہم کتنی ہی دیر ڈوبے رہے۔ ذیابیطس گنگ تھیں پر سینکڑوں باتیں ہو چکی تھیں اور میں دل ہی دل میں ان حالات کا نمونہ بھی سوچ رہا تھا کہ جن میں گھر گرہستی سے نبرد آزما ہو کر بعد میں ایسے ایسے سحر کن لمحات بھی آتے ہیں جب آدمی اپنے سامنے پردوں کو ہٹا کر اپنے مصنوعی خول کو توڑ کر انسان اور صرف انسان رہ جاتا ہے۔"

انسان دوستی کا یہی سبق اس طویل مختصر افسانے کی جان ہے اور اسے وہ قدر و منزلت عطا کرتا ہے جو فنی تحریر کو عام تحریر سے ممتاز کرتی ہے۔

سید علی عباس جلالپوری

اقبال اور جمالیات

موضوع: فلسفہ | مصنف: نصیر احمد ناصر | ناشر: اقبال اکادمی، پاکستان کراچی

ضخامت: ۴۹۹ صفحات | قیمت: سترہ روپے پچاس پیسے

دو سال قبل مذکورہ بالا کتاب تبصرہ کے لئے میرے پاس پہنچی۔ میں نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا اور میں نہایت عجز و انکسار سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے اکثر مقامات میری سمجھ میں نہیں آئے کہ حقیقتاً وہ میری فہم سے بالاتر تھے۔ چنانچہ میں اس کتاب کے مصنف سے خود ملا اور تعارف کے بعد مدعا اصلی زبان پر لایا۔ موصوف نے نہایت شفقت سے مجھے وہ مقامات سمجھائے۔ میں نے تبصرہ لکھا، حوالہ ڈاک کر دیا لیکن اتفاقیہ ڈاک میں کہیں گم ہو گیا۔ دوبارہ میں نے پھر لکھنا چاہا لیکن قلم رکھ دینا پڑا اور اپنی عاجزی پر صبر کیا۔ کئی بار میں نے اس کتاب کو پڑھا اور کیا اس کی علمیت اور کیا اس کا سحر کن انداز تحریر، دونوں نے مجھے مرعوب کر لیا۔ لاکھ معرب اور مفرس طرز نگارش سہی، لیکن اس کی جزالت کی داد نہ دینا، اس کی شگفتگی کا اعتراف نہ کرنا، لفظوں کے آہنگ میں جو غنائیت اور موسیقیت کا نظام از اول تا آخر اس کتاب میں ملتا ہے اس سے متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں۔

مذکورہ بالا کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام ہے "حسن" اور دوسرے کا عنوان ہے "فن"۔ پھر دونوں کے ابواب میں عالمانہ مباحث ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش ہر شخص کے لئے موجود ہے، البتہ موضوع اس قدر اچھوتا ہے کہ مصنف کی ہر کوشش مستحسن نظر آتی ہے۔ دیباچے میں مصنف نے خود ہی لکھا ہے کہ:

> "اس میں شک نہیں کہ انہوں نے (اقبال نے) جمالیاتی مسائل پر جو کچھ لکھا ہے عموماً نظم ہی میں لکھا ہے، اور نظم میں چونکہ فلسفہ و منطق کے قواعد و ضوابط کی پابندی نہ تو لازم اور نہ ممکن، اس لئے ان کے تصورات نظریات کی صورت میں یکجا نہیں ملتے بلکہ مختلف مقامات پر بکھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ یہ امر علامہ اقبال کے جمالیاتی نظام کے سمجھنے میں ایک زبردست رکاوٹ اور اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کا بنیادی سبب ہے۔"

اس اعتراف کے ساتھ نصیر احمد ناصر صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

> "اس کتاب میں علامہ اقبال کے بے ترتیب جمالیاتی تصورات و افکار کو منطقی سلسلے میں منضبط کر کے نظریات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے نظام جمالیات کے تمام خد و خال اپنی اپنی جگہ پر واضح طور پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ نیز ہر نظریے کا تاریخی پس منظر بھی دے دیا گیا ہے جس سے نہ صرف علامہ اقبال کے نظریات کو کامل طور پر سمجھنے، بلکہ ان کی حقیقی قدروں کی تشخیص و تعیین میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس کتاب کی بنیاد ہی "استنباط" پر رکھی گئی ہے جس میں قطعیت ناممکن ہے لہٰذا مصنف موصوف کو بڑی حد تک اعتراضات کے جواب سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ وہ خود ان لفظوں اعتراف کر چکے ہوں:

"علم و فن کے لامحدود امکانات کے پیش نظر ہم چونکہ کسی کوشش کو حرف آخر نہیں کہہ سکتے لہٰذا میں اپنی اس ناچیز کوشش کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میری یہ تصنیف میرے شوقِ فراواں، تفکرِ مسلسل اور سالہا سال کے مطالعے کا ماحصل ہے جسے میں بڑے خلوص کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔"

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے مذکورہ بالا کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور دونوں کے تطابق سے علمی اور منطقی مباحث کے ابواب وا ہوئے ہیں۔ وہ ابواب بھی جن پر مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے اور وہ بھی جن کے بین السطور ابھی بہت کچھ غور کرنے کی گنجائش ہے۔ مصنف نے نہ صرف قدیم فلسفہ جمالیات کو کھنگالا ہے اور یونان کے جدید حکیموں سے رجوع کیا ہے بلکہ ان کے آرا سے اتفاق یا اختلاف بھی نہایت فراخ دلی سے کیا ہے۔ جدید فلسفیانہ نظریات جو جمالیات کے ذیل میں آتے ہیں ان سے بھی اپنے موضوع کو رجوع کیا ہے اور قرآن حکیم کے ارشادات میں بھی جمال بین کا جو پرتو دیکھا ہے اسے اقبال کے احساسِ جمال کی بنیاد اور اساس قرار دیا ہے۔

میں نے بعض مقامات کو سمجھنے کے لئے مصنف موصوف کی تاریخ جمالیات کے بعض مقامات سے بھی استفادہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مصنف کے نظریات سے اختلاف کا یہ وقت مناسب نہیں ہے کیونکہ ابھی اردو میں ایسے موضوعات پر اور کتنی کتابیں ہی کتنی لکھی گئی ہیں۔ ابھی تو اردو کو ظفر حسین خاں[1] مرحوم (ابوالاثر بہزاد) جیسے علما پیدا کرنا ہیں لہٰذا نصیر احمد ناصر صاحب کی اس کتاب سے طالبانِ علم کو خصوصی طور پر استفادہ کرنا چاہیے اور ان کی دل آویز تحریر سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔

آغا سہیل

غبارِ خاطر

مصنف: ابوالکلام آزاد	مرتب شذرات: الف المراث	ناشر: میری لائبریری۔ لاہور
صفحات: ۳۴۴	قیمت: مجلد: آٹھ روپے	غیر مجلد: چار روپے پچاس پیسے

"غبارِ خاطر کوئی پہلی بار نہیں چھپی ہے کہ اس کے تعارف کی ضرورت پیش آئے۔ اردو ادب میں تو بچے بچے کی زبان پر ابوالکلام آزاد کی اس شہرۂ آفاق کتاب کا نام رہتا ہے جو خطوط مولانا نے زمانۂ اسیری میں تحریر کئے ان کے علاوہ بھی بعض خطوط اس میں شامل ہیں۔ ۱۹۴۶ء سے اب تک کئی بار اسے چھاپا گیا اور اس کی مقبولیت کا یہی عالم رہا کہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ ظاہر ہے کہ ادارہ میری لائبریری اس اعتبار سے خسارے میں نہیں رہا کہ اس نے ایک بار پھر غبار خاطر کو چھاپا ہے۔ اس مرتبہ الف المراث نے اس کتاب کے شذرات لکھے ہیں۔ موصوف عرصۂ دراز سے لفظوں کی چھان بین میں لگے ہوئے ہیں اور اس شغف میں انھوں نے دین و دنیا تج دیئے ہیں۔ خود میں اس بات کا عینی گواہ ہوں کہ موصوف سات سات اور آٹھ آٹھ گھنٹے ٹکٹکی لگا تار اردو انگریزی، ہندی کے بعض عسیر الحصول لغات میں سر کھپایا کرتے ہیں اور بزعم خویش اردو زبان و ادب کی اصلاح فرمایا کرتے ہیں۔ ان شذرات میں معلومات جو فراہم کی گئی ہیں بعض ان میں مستحسن ہو سکتی ہیں کہ غبار خاطر کے بعض مقامات بعض جماعتوں کے نصاب میں داخل ہیں اور طلبہ ہمارے ملک کے سہل انگار ہوتے ہیں، لیکن بعض توجیہ

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اخبار الہلال میں ظفر حسین خاں ابوالاثر کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ ظفر حسین خاں اور ظفر علی خاں دو مختلف شخصیتیں ہوئی ہیں۔ اول الذکر پر راقم الحروف کا ایک مضمون ستمبر ۱۹۶۸ء قومی آواز لکھنؤ میں طبع ہو چکا ہے۔ ظفر حسین خاں مرحوم فلسفی، ادیب، مفکر، ماہر لسانیات اور صحافی تھے۔

طلب بھی ہیں اور محلِ نظر بھی۔

مثلاً الف اطہرات صاحب مولانا کے دیباچے کے سلسلے میں 'غبارِ خاطر' کے نام کی وضاحت طلب کرتے ہیں :

"زبانِ کتاب و مضمونِ کتاب بتایا جائے نیز نثر یا شاعری ہے ؟"

حالانکہ بالکل ابتدائی سطور میں مولانا نے وضاحت کر دی ہے۔

املے میں مرتب کی طرف سے جو تحریف عمل میں آئی ہے، اُسے نہ تو مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ جائز، البتہ اس سے مغایرت اور اجنبیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً:

بلگامی کو بل گرامی　　　　ہمدانی کو ہم دانی　　　　وغیرہ

ایک جگہ نواب صدر یار جنگ کا مکتوب مولانا کی رہائی کے بعد ان سطور سے شروع ہوتا ہے :

صدیقِ حبیب !

جس دن بمبئی کا ٹل گیسں سے نکلا تھا، دل نے محسوس کیا تھا کہ تو عظمت جہاں تاب ہو گو، ہوا اور کس شان سے ہوا، ۲۰ رجوں کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا، اس میں ایک ہیکلِ محبوب بھی تھی تینچی (مجمع اغیار سے اُسے جدا کیا، دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی :

روشن ماہ بہر تو رویت نظر سے نیست کہ نیست　　　　منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست"

اس شاعرانہ عبارت آرائی کا تقاضا یہ تھا کہ مذکورہ شعر کے حسن کو باقی رکھا جاتے اور لفظ شیراز کی آگے چل کر وضاحت "حافظ" کا نام لکھ کر نہ کی جاتے کہ یہ بات ذوقِ سلیم پر بار ہوتی ہے لیکن الف اطہرات صاحب نے نہ صرف یہ ستم کیا ہے بلکہ بار بار اس کا اعادہ بھی کیا ہے۔ ان کو اگر طلبہ کی رہنمائی منظور تھی تو ایک علیحدہ کتاب لکھ دیتے اور اس کتاب کے حسن کو مجروح نہ کرتے۔

جو بات اوپر میں نے لکھی ہے وہ در اصل تمہید ہے اس بات کی کہ 'غبارِ خاطر' تو نثر میں شاعری ہے اور شاعری سے الف اطہرات صاحب کو وہی شغف ہے جو ٹائپ رائیٹر کو موسیقی سے۔ موصوف کو عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ معلوم کرنے کا جو شوق ہے، بجائے خود کچھ بُرا نہیں لیکن ہر جگہ اس کا انطباق مناسب نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں موصوف کو نہ صرف اردو لسانیات کے مبادیات کا علم نہیں بلکہ علم لسانیات سے عدم واقفیت کی بنا پر وہ لفظوں کے آہنگ، اصوات اور اکثر مزاج سے بھی نابلد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لفظوں کے مترادفات تو ڈھونڈے لیکن ان کے متعلقات و مضمرات پر مطلق غور نہیں فرمایا۔ غالباً اس ضمن میں وہ بڑی مہلک خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ صاحبانِ ذوق پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ شاعری میں ایمائیت اور اشاریت اگر بلیغ درجہ رکھتی ہو تو شاعری کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ 'غبارِ خاطر' میں شاعری کا یہی وصف کارفرما ہے جسے سمجھنے کے لئے ذوقِ سلیم اور شئے لطیف دونوں کی ضرورت ہے۔

شذرات کی ضرورت سے میں منکر نہیں، مجھے مرتب کے طریقۂ کار سے اختلاف ہے۔ ممکن ہے مجھ سے بعض لوگ متفق نہ ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرتب نے ان شذرات کے لئے بڑی کدوکاوش کی ہوگی۔ بعض اسما گمنامی کے گوشے میں پڑے تھے ان کو نکالا اور حتی الامکان ان کے باب میں صحیح صحیح مختصر باتیں لکھ دیں۔ بعض عربی اور فارسی اشعار جو ہیں تو وک زباں لیکن ان کی نسبت یہ معلوم نہیں کہ کس کے ہیں، مرتب نے تحقیق کی اور ان کی نسبت شاعر کا نام اور اس کے حالات مختصراً لکھ دیئے۔ بعض انگریزی فقرات جن کو مرتب نے توضیح طلب سمجھا، لغات کے سہارے ان کی توضیح کر دی (یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر محلِ نظر ہیں)

میرا خیال ہے کہ الف الخرات ہیں تو اردو ادب کے لئے ایک سرمایہ، لیکن ان کو غلط شاہراہ ملی ہے۔ دراصل ان کا کام فرہنگ الفاظ تیار کرنا ہے۔ اگر شیدایانِ اردو نے اس کنزِ الفاظ سے کام نہ لیا اور اردو لغت پر ان کے خدمات کو حاصل نہ کیا تو یہ یقیناً ہماری زبان کی بدبختی ہوگی۔ آغا سہیل

اخوان الصفا

مصنف: مولوی شیخ اکرام علی　　　مرتبہ: ڈاکٹر احراز الحسن نقوی

ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور　　　صفحات: ۲۲۴　　　قیمت: ساڑھے چار روپے

فورٹ ولیم کالج کے خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ مولوی شیخ اکرام علی کی معروف ترین کتاب "اخوان الصفا" کی مقبولیت اگرچہ میر امن کی "باغ و بہار" کے مقابلے میں کم ہے لیکن افادیت کے معاملے میں "اخوان الصفا" کا رتبہ باغ و بہار سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۱۰ء سے اب تک اس کے متعدد نسخے مختلف مطبعوں سے مدون ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بکے۔ ڈاکٹر احراز نقوی کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ ان کا مرتب کردہ نسخہ سب سے زیادہ مفید اور اغلاط سے بڑی حد تک مبرا ہے لیکن میرے خیال میں "اخوان الصفا" کے مذکورہ نسخے کی ترتیب و تدوین میں مرتب اور ناشر دونوں کا حصہ برابر ہے۔ دونوں کی مساعی جمیلہ و کاوش ہائے بلیغہ نے مذکورہ نسخے کی افادیت کو بڑھایا ہے۔ کلاسیکی ادب کے تحفظ میں مجلس ترقی ادب کا کردار اس لئے اور بھی زیادہ مستحسن ہے کہ زمانہ ماضی میں جو بعض گراں قدر تصانیف محض مرتبین اور ناشرین کی کم سوادی کا شکار ہو کر بے وقعت ہو گئی تھیں، اُن کو مانجھ پونچھ کر صاف ستھرا کر کے، اس ادارے نے ان کو وہی رتبہ دیدیا جس کی فی الحقیقت وہ مستحق ہیں۔ ہماری ثقافت کے احیاء میں بہرحال کلاسیکی ادب کا مقام رفیع ہے اور مجلس کے پیش نظر انہیں اقدار کا تحفظ ہے۔

ڈاکٹر احراز کے مشمولہ مقدمے نے "اخوان الصفا" کے مذکورہ نسخے کی حیثیت بلند کی ہے۔ اگر ڈاکٹر موصوف کے بعض نظریات اور خیالات سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تحقیق کا حق موصوف نے ادا کر دیا ہے اور دو باتوں کو خصوصیت سے واضح کیا ہے کہ ایک کے سبب سے شیخ اکرام علی کی شخصیت ابھر آئی ہے اور دوسری کے باعث "اخوان الصفا" کے مذکورہ نسخے کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہی دو باتیں خصوصیت سے اس مقدمے کے لئے اہم تھیں۔

جہاں تک مقدمۂ مذکورہ کی زبان اور اس کے لب و لہجے کا سوال ہے، مجھے اس سلسلے میں مختصراً دو باتیں کہنا ہیں۔ اول تو یہ کہ ڈاکٹر موصوف کو تحقیق کے زعم اور نشے میں دوسرے ادبا کی عزتِ نفس کا بھی خیال بھی رکھنا چاہیئے۔ دوم ان کے لہجے میں جو تمرد ہے وہ سخت ناپسندیدہ ہے، اس سے اجتناب برتنا چاہیئے۔

رہا مقدمے کی زبان کی صحت کا سوال: اس میں بھی اغلاط ہیں۔ کیا انشا کیا املا، اور کیا املا ہر شے کے اغلاط موجود ہیں۔ اس سلسلے میں ذرا اور احتیاط برتی جاتی تو اچھا ہوتا۔ ایک آدھ جگہ انگریزی کی عبارت بھی غلط چھپی ہے لیکن معلوم نہیں مرتب اس سلسلے میں کس حد تک قصوروار ہے اور کمپوزیٹر کس حد تک۔ دراصل کتابوں میں عبارت کی صحت کا معاملہ ابھی تک ہمارے ملک میں وہ اہمیت نہیں حاصل کر سکا جس کا وہ مستحق ہے۔

آخر میں، میں یہی عرض کروں گا کہ ڈاکٹر احراز نقوی اور سید امتیاز علی تاج دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے "اخوان الصفا" کو قالب جدید بخشا اور اس قدر کم قیمت میں ایک گراں بہا نسخہ صحت و صفائی کے ساتھ ملک و قوم کے لئے فراہم کیا۔ اگر "اخوان الصفا" کے جملہ نسخے میں نے پڑھے ہوتے تو میں مفصل طور پر موازنہ کرتا، لیکن قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لندن والے نسخے کو چھوڑ کر تمام پاک و ہند کے نسخوں میں یہی نسخہ سب سے اچھا اور مستند ہے۔ اگر ڈاکٹر احراز کی بات تسلیم کر لیجئے (اور نہ تسلیم کرنے کی بظاہر وجہ بھی کوئی نہیں ہے) تو یہی نسخہ تمام نسخوں پر تفوق رکھتا ہے۔ آغا سہیل

۱۹۶۵ء کے منتخب افسانے

مرتبہ: ڈاکٹر اعجاز نقوی　　　　ناشر: میری لائبریری، لاہور

صفحات: ۳۲۴　　　　قیمت مجلد: سات روپے　　　　غیر مجلد: تین روپے پچاس پیسے

ڈاکٹر اعجاز نقوی اور میری لائبریری کا یہ جوگ امسال پھر رنگ لایا۔ گیارہ افسانوں پر مشتمل یہ انتخاب کچھ برا نہیں ہے، جسے میری لائبریری نے شائع کیا ہے۔ افسانے بھی اچھے ہیں اور مقدمے میں بھی چند باتیں معقول نظر آتی ہیں جن کی ڈاکٹر صاحب سے بہرحال توقع کی جا سکتی ہے۔ اعجاز صاحب کا خیال ہے کہ اگر افسانہ نگار خود ہی اچھے افسانے نہ لکھیں تو وہ منتخب کہاں سے کریں، جن لوگوں کے افسانے اس میں شامل ہیں، کچھ ان میں جانے پہچانے ہیں اور کچھ نئے۔ میرا خیال ہے کہ پرانوں سے زیادہ نئے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے۔ اور یہی ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ مجھے "بے ستون" کے علاوہ تمام افسانے پسند آئے اگر اس افسانے کو اس انتخاب سے علیحدہ کر دیا جائے تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس انتخاب میں کرشن چندر کا "پیاسا"، حجاب امتیاز علی کا "چٹان"، کوثر چاندپوری کا "دیدہ بینا"، اشفاق احمد کا "قاتل"، احسن فاروقی کا "بڑا تعجب"، آغا اشرف کا "بے ستون"، مسعود مفتی کا "داستی نامہ"، واجدہ تبسم کا "شادی کی رات"، غلام الثقلین نقوی کا "راکھ"، شرون کمار کا "دل دریا"، اور رشید امجد کا "کھمن کا پال" شامل ہیں۔

اس قسم کے انتخابات کے سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے فن کاروں کو اس میں سے بطور معاوضہ کچھ نہیں ملتا اور آیا یہ کہ یہ بات جائز بھی ہے کہ نہیں؟ اور اگر بفرض محال فن کاروں کی اس حق تلفی کو جائز تسلیم بھی کر لیا جائے تو آخر اس بدعت کا جواز کیا ہے؟

آغا سہیل

غزالہ (ناول)

مصنف: لطیف کاشمیری　　　　پبلشرز: سنگ میل پبلیکیشنز۔ لاہور　　　　قیمت: پانچ روپے

لطیف کاشمیری ایک ہونہار اور جانا پہچانا افسانہ نگار ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ ناول نویسی کے فن میں بھی طبع آزمائی کر رہا ہے۔ اس وقت لطیف کاشمیری کا پہلا ناول "غزالہ" میرے پیش نظر ہے۔ یہ ناول پڑھ کر پہلا تاثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ مرتب نے ابھی ابھی افسانہ نگاری کے کوچے سے نکل کر ناول کے کھلے میدان میں قدم رکھا ہے اور ناول کی وسیع و عریض دنیا میں اتر کر بھی اپنے افسانوں کی مختصر، داخلی اور رومانی فضا کو نہیں بھولا۔ اسی لئے میں غزالہ کو ناول سے زیادہ ایک طویل مختصر افسانے یا ناولٹ کا نام دینا ہی پسند کروں گا۔

لطیف بنیادی طور پر ایک رومانی فن کار ہے، موضوعی لحاظ سے بھی اور اسلوب کے اعتبار سے بھی۔ میں رومانیت کو عیب نہیں سمجھتا کیونکہ رومانی طریق اظہار سے فن پارے میں حسن و جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر کوئی فن کار زیادہ دیر تک اسی رومانی فضا میں کھویا رہے تو یہی رومانیت اس کے پاؤں کی زنجیر بھی بن جاتی ہے اور اس کا فنی ارتقا رک جاتا ہے۔ جذبے کے خلوص، زندگی کے تنوع اور تجربات کی توانائی کو زاد راہ بنا کر ہی ایک فن کار کڑی کڑی آزمائشوں سے سلامت گزر سکتا ہے اور غزالہ میں لطیف کاشمیری ان تمام آزمائشوں سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بسا اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لطیف نے خود اپنا امتحان لینے کے لئے اس سخت سرزمین میں قدم رکھا ہے۔ بلاشبہ ناول نگار کا یہ جذبہ خطر پسندی لائق تحسین ہے، مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ

ناول کے دور دور تک پھیلے ہوئے میدان میں جو دو چار بڑے صبر آزما مقام آتے ہیں، مصنف وہاں سے دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا سکا ہے یا نہیں۔

ناول کا موضوع یک جان دو قالب سہیلیوں عالیہ اور غزالہ کے رومانی المیہ پر مبنی ہے۔ یہ دونوں حسن پرست اور رومان پسند سہیلیاں اپنے اپنے خوابوں کے شہزادوں کی تلاش میں اتنی دور نکل جاتی ہیں جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آسکا۔ ان دونوں کو اپنا آدرش ملتا بھی ہے تو اس وقت، جب عالیہ کو ایک ہوس پرست مل مالک اور غزالہ کو ایک محنت کش کے پلّے باندھ دیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں کو اپنا آدرش مل تو جاتا ہے مگر وہی سماج کی دیوار چاہنے والوں کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک تو موضوع کے اعتبار سے ناولٹ میں بظاہر کوئی ندرت محسوس نہیں ہوتی مگر جب اچانک ڈرامائی طور پر عالیہ اور غزالہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے عمران کی صورت میں ایک ہی آئیڈیل ایک ہی خوابوں کے شہزادے کو مرکز حیات بنائے ہوئے ہیں تو نہ صرف پلاٹ ایک حیرت انگیز موڑ کاٹتا ہے بلکہ مرکزی کرداروں کے مابین داخلی تصادم کی فضا بڑے قدرتی انداز سے ابھر آتی ہے جو قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے اور ناول کو نقطۂ عروج کی طرف بڑھانے میں بڑی مفید اور موثر ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ ناول میں خاصی دیر تک جمالی کا کردار ایک روایتی ویلین کا روپ دھار کر عمران اور غزالہ کی شیریں محبت میں زہر بھرتا رہتا ہے لیکن جب اپنی محبت کے تقدس کو برقرار رکھنے اور عمران کی زندگی کو جمالی کی سازش اور اپنے خاوند حنیف کے تیز دھار والے چاقو سے بچانے کے لئے غزالہ اپنے آپ کو جمالی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور غیر متوقع طور پر عمران کی بجائے جمالی کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی غزالہ بالآخر اپنے شوہر حنیف کے ہاتھوں محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہے تو ناولٹ میں ایک انوکھا اور زوردار نقطۂ عروج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر افلاطونی محبت کی اس کہانی میں حیرت، کشمکش اور ٹریجیڈی کے عناصر یکجا ہو کر اسے موثر اور جاندار بنانے میں بڑی مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناولٹ کا سارا انداز پیش کش فن افسانہ نگاری کی خصوصیات میں سے مستعار لیا گیا ہے۔ پلاٹ کا تانا بانا اس طرح بنا گیا ہے کہ غزالہ، عالیہ اور عمران، جمالی اور فیاز علی کے کرداروں کی آویزش میں صرف غزالہ کا مرکزی کردار ہی آغاز، وسط اور انجام کے مراحل طے کرتا ہوا تکمیل پذیر ہو سکا ہے۔

'غزالہ' میں نہ تو ناول کے پلاٹ کی سی گمبھیرتا ہے، نہ اس میں پھیلتی، بڑھتی اور ہمکتی ہوئی زندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے اور نہ ہی اس میں چھوٹے بڑے کرداروں کی ریل پیل ہے جو ناول کی جزئیات سے جنم لیا کرتی ہے اور تفصیلات کی آغوش میں پروان چڑھتی ہے۔ 'غزالہ' تو بنیادی طور پر ایک ہی کردار کی کہانی ہے جس کی چوٹ سارے ناولٹ پر پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے میں نے 'غزالہ' کو ایک طویل مختصر افسانے یا ناولٹ کا نام دیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو مصنف کی یہ پہلی کوشش خاصی کامیاب بھی ہے اور دل آویز بھی۔

آخر میں ایک بات نظیف کاشمیری کے طرز نگارش کے بارے میں عرض کروں گا۔ نظیف کا اسلوب اوراک حیات اور جمالی فطرت کے دو خوبصورت اور گہرے رنگوں سے مزین ہے لیکن بعض اوقات ہمارا یہ فن کار اپنے آئیڈیل کی تلاش میں دو متوازی خطوط پر بھی چل نکلتا ہے۔ کبھی اس کی رومانیت حقیقت نگاری سے دامن بچا کر افلاطونیت کے دھندلکوں میں کھو جاتی ہے اور کبھی اس کی حقیقت نگاری رومانیت سے گریز کر کے داخلیت پر اتر آتی ہے۔ اس انداز تحریر سے جہاں اس کے رومانی کرداروں پر ماورائیت کی دھند چھا جاتی ہے وہاں اس کے نمو پذیر کردار بھی مثالیت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ ایک نظیف کاشمیری ہی پر کیا موقوف ہے، ایسے بیشتر فن کار جنہیں فن سے بھی لگاؤ ہے اور جو زندگی کو بھی عزیز رکھتے ہیں، اس دورنگی کے تار و پود میں الجھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ رومان پسندی اور حقیقت نگاری کے درمیانی فاصلوں کو ختم کر کے ان دونوں کو ایک سطح پر لانے اور ان میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد ہی کوئی فن کار فکر و فن کی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے، اور یہ منزل کائنات کو اپنی ذات میں اتارنے اور اپنی ہمہ گیر شخصیت کو پیکر فن میں ابھارنے کے بعد ہی سر کی جا سکتی ہے۔ مصنف کی پُر خلوص شخصیت کا مشاہدہ اور 'غزالہ' کا مطالعہ

کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ لطیف کاشمیری کے دل میں اس ریاضت کا جذبہ بھی ہے اور حوصلہ بھی اور یہی کسی فن کار کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ ہے۔

جمیل ملک

اسم اعظم

مصنف: شہریار — ناشر: انڈین بک ہاؤس۔ محمد علی روڈ، علی گڑھ (بھارت)

ضخامت: ۱۱۲ صفحات — قیمت: تین روپے

اسم اعظم، شہریار کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ شہریار ایک ذہین نوجوان ہیں، جن کی شاعری اردو ادب کے مختلف رسائل کے وسیلے سے ہم تک پہنچتی رہی ہے۔ ان کا قلم مختصر نظموں میں رنگ آمیزی کرتا ہے وہ ایک خاص ڈھنگ کی غزل بھی کہتے ہیں جس میں سوچ کی ایک رَو اور احساس کا نکھار پایا جاتا ہے ——— آل احمد سرور فرماتے ہیں

"شہریار کی نظموں اور غزلوں میں پہلی بات مجھے جو خوبی نظر آئی وہ یہ ہے کہ یہ طول کلامی کے عیب سے پاک ہیں۔ ان میں جدید نسل کے اُس مجروح ذہن کے نقوش ہیں جو خوابوں اور حقیقتوں کے تصادم میں پس کر رہ گیا ہے۔ ان نظموں میں جو احساس کی تتلی کے پیچھے دوڑنے کی کوشش ہے وہ انہیں معنویت عطا کرتی ہے۔ ان کا سلوک ایک انفرادیت دکھاتا ہے جو قابل توجہ ہے۔ غزلوں میں ایک نئے تغزل کی لے فوراً ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ غزلوں میں جو مدھم آنچ ہے، وہ گہرے جذبہ کی تہذیب سے آئی ہے اسی لئے گہرا اثر چھوڑتی ہے۔"

سرور صاحب نے اپنے مخصوص انداز نگارش میں شہریار کی نظموں اور غزلوں کا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن مجھے پروفیسر صاحب کی اس رائے سے خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے ادب میں قربت کی حرمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کی حوصلہ افزا تنقید یا ستائش ایک ایسے فن کار کو جس کے ذہن کے دریچے ابھی پوری طرح نہ کھلے ہوں، غلط فہمیوں کی گمراہ کن پگڈنڈیوں پر گامزن کر سکتی ہے۔ اس گمراہی کی ساری ذمہ داری دیباچہ نگار یا نقاد پر عائد ہوتی ہے اور فن کار اس مقدمے سے صاف بری ہو جاتا ہے۔ دوسرا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ایسے بیان سے تنقید نگار کی خود اپنی ساکھ کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے اور قاری کے ذہن میں اُس کا اعتماد اس وقت بطور خاص ڈگمگانے لگتا ہے جب تخلیق اور نقاد کے بیان میں تضاد موجود ہو۔ اس مجموعے میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ سرور صاحب ہمارے بزرگ تنقید نگار ہیں لیکن کیا وہ یہ بتا سکیں گے کہ انھوں نے اس مجموعے کا بنظر عمیق مطالعہ کیا ہے؟

نظم کا اختصار اپنی جگہ برمحل، اُس کا بھرپور تاثر معنویت اور اُس کی وسعتوں کو ایک کوزے میں بند کرنا، بڑے مجاہدے اور عرق ریزی کا کام ہے مگر شہریار ابھی اس منزل سے کچھ دور نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے کی بیشتر نظمیں عنوان اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے ایک اُبھرتی ہوئی آواز محسوس ہوتی ہیں مگر یہ آواز چند ہی لحوں میں کسی صحرا میں کھو جاتی ہے اور پھر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی آواز اُبھری بھی تھی کہ نہیں مجموعے کی ایک نظم "موت" لے لیجئے۔ یہ صرف چھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔

ابھی نہیں، ابھی زنجیر خواب برہم ہے
ابھی نہیں، ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں، ابھی در باز ہے امیدوں کا

ابھی نہیں، ابھی سینہ کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی کمبخت دل دھڑکتا ہے

لیجئے نظم مکمل ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کچھ کہتے کہتے بھول گیا ہے اور قاری کی پیاس بدستور باقی ہے۔ سرورؔ صاحب سے پوچھیے کہ یہ طول کلامی کے عیب سے پاک ہے یا اس مختصر کلامی کی خوبی پائی جاتی ہے؟ "موت" ایک ہمہ گیر حقیقت ہے۔ اس موضوع پر بیشتر شعرا نے قلم اٹھایا ہے۔ میں یہاں شہریار کے ایک پیشرو شاعر اخترالایمان کی نظم "موت" کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس کا آخری بند پیش خدمت ہے:

کون، آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم
کون آیا ہے، ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو
زلزلہ، اُف یہ دھماکہ، یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

اس نظم میں آغاز سے اختتام تک موت کا رعب، اس کی دہشت کا کرب، اس کرب کا شدید احساس، اس احساس کی پختگی کچھ اس انداز سے جذبے کی ہم آہنگی کے ساتھ سموئی گئی ہے کہ ایک باشعور قاری پر موت کا دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شہریار کی نظم (بقول سرورؔ صاحب) صرف طول کلامی کے عیب سے پاک ہے۔

ایک اور نظم (جو اس عنوان سے نزدیک ہے) "قبرستان" دیکھیے:

"جہاں ہے ازل سے ابد ہی کا پہرا
طلسمی چراغوں میں لپٹی ہوئی، عود و عنبر کی خوشبو
جہاں خیمہ زن ہے
زمانوں کی صدیوں کی، لمحوں کی غمخواریاں جس نے کی ہیں
جہاں ساری تہذیبیں، شرمائی سی،
سربرہنہ کھڑی ہیں"

یہ نظم اپنے تاثر کا کچھ بھرم تو دکھ لیتی ہے مگر اس کا نفس مضمون احمد فرازؔ کی نظم "کھنڈر" کے نفس مضمون سے کچھ جدا نہیں۔ احمد فرازؔ کی نظم "کھنڈر" ایک پیر و تاثر اور فن کی عظمتوں کو چھوتی ہوئی نظم ہے۔ قبرستان کے موضوع پر گرےؔ کی مشہور نظم (اور اس کا اردو ترجمہ جو طباطبائی نے کیا ہے۔ اس موضوع پر حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔ گرےؔ اس نظم اور طباطبائی صرف اس ترجمے کی وجہ سے شاعر مانے جاتے ہیں) اور احمد فرازؔ کی "کھنڈر" اس کی شاعری کے جواز میں بڑے فخر کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے مگر شہریار کی "قبرستان" کو صرف ایک مختصر نظم ہی کہہ سکتے ہیں اور بس۔

شہریار کی نظمیں صرف مختصر ہی نہیں ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں جو پانچ چھ مصرعوں کی حد سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ ان نظموں کا شمار بھی عام نظموں میں ہوتا ہے جن خلوص کی رو میں بہہ کر ان پر انفرادیت کی چھاپ لگانے سے قاصر ہوں۔ میں اس سلسلے کے ضمن میں وحید اختر صاحب سے معذرت خواہ ہوں۔

مختصر ترین نظموں نے ایک بڑا گھپلا یہ کر دیا ہے کہ لوگ قطعہ اور رباعی سے دست کش ہو کر ان نظموں پر پل پڑے ہیں۔ قطعہ اور رباعی کے چوتھے مصرعے اور ایک واضح مضمون سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے آزاد نظم ایک اچھا فرار ہے اور اسی لئے شاعری آسان نظر آنے لگی ہے۔ مختصر نظم "ثلاثی" کی حد تک حمایت علی شاعر نے بھی لکھی ہے۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ اس کو قطعہ کا نام دینا کون سا جرم ہو گا۔ ہر چند کہ حمایت کا تیسرا مصرعہ اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ قاری چوتھے مصرعہ کی توقع نہیں کرتا۔

اس کے باوجود قاری کو شہریار کا خلوص، سوچ کا انداز، بات کہنے کا اسلوب سب کچھ سچا معلوم ہوتا ہے۔ سو ان سے توقعات ضرور وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

غزل کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ان کی غزلیں روایت سے بھرپور تعلق رکھتی ہیں، ان میں ہجر و وصال، ذاتی غم، اردگرد کی بے چینیاں، ماحول کا دکھ درد، آس پاس کی بے راہ روی، قید و بند کی الجھنیں، جبر کے خلاف بغاوت، سبھی کچھ پایا جاتا ہے لیکن غزلوں میں "ایک نئے تغزل کی لے" ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی، غزل کو شہریار آگے نہیں بڑھا سکے جبکہ ان کے بعض ہمعصر ان سے آگے نظر آتے ہیں۔ شہریار کو غزل میں ابھی تک اپنا کوئی لہجہ نہیں مل سکا ہے۔ البتہ وہ ایک مانوس انداز میں بات کہنے پر قادر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سینے میں جلن، آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے　　اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

وصل کی شب کے ہونے میں پہلے کچھ دیر ابھی　　داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھائی جائے

تجھ سے ملنے کی بجھ کر پانے کی　　کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہیں

شرمندہ دوست ہی سے نہیں شہریار ہم　　دشمن سے بھی تو آج پشیمان ہیں بہت

ہیں ختم اہلِ درد پہ یہ وضعداریاں　　جس موڑ پر ملے تھے اسی پر جدا ہوئے

مجموعی طور پر یہ کتاب عام ہمعصر شاعری کا ایک مجموعہ ہے۔ ہم اسے فن میں کوئی گراں قدر اضافہ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جذبے کا نکھار، سوچ کا انداز اور فن کی سچائی اس کے مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔

کتاب کا سرورق موجد کی تخلیق ہے۔ یہ بے حد بامعنی سرورق ہے اور صرف حروف کی ترتیب اور رنگوں کی آمیزش نے اسے بے حد بلیغ بنا دیا ہے۔

سیف زلفی

چکیدہ (مجموعہ کلام)

معنف: یٰسین۔ سلام | ناشر: قلات پبلشرز۔ مستونگ (قلات ڈویژن)
ضخامت: ۱۵۰ صفحات | قیمت: پانچ روپے

چکیدہ یٰسین سلام کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، کتاب کی فہرست میں نظموں کے عنوان درج کئے گئے ہیں لیکن نظم کے آغاز پر ایک ستارہ بنانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ دائرہ غزل کا سمبل تو ہے لیکن ستارہ ابھی تک نظم کا سمبل نہیں بن سکا ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے بار بار فہرست سے رجوع کرنے کی مصیبت سے اگر سلام صاحب ہمیں بچا لیتے تو ہم اُن کے بہت ممنون ہوتے۔ یہ ایک جدت بھی مگر ایک ایسی جدت ہے جیسے کسی مشاعرے کے پوسٹر میں شعرا کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے اور اسٹیج پر بغیر تعارف کے وہ اپنا کلام سناتے چلے جائیں۔

یٰسین سلام کو فن شعر پر پوری گرفت حاصل ہے۔ وہ جذبے کا نفسیاتی منطقی اور شاعرانہ استعمال خوب جانتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں اُن کے اسلوبِ نگارش میں "فارسیت" کو زیادہ دخل ہے۔ مثلاً

شکست
نغمۂ حسیں
جو حرف آشنا نہیں
گدازِ خوابِ رائیگاں
سکوتِ رنجِ بے کراں
شعورِ کائنات ہے
حیاتِ ممکنات ہے

سلام کی نظمیں ایک نقطۂ عروج پر اختتام پذیر ہوتی ہیں جن سے ان کے شعور کی پختگی اور فن کی ریاضت ٹپکتی ہے۔

سلامؔ بات کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اُس میں ہمہ گیری کا انداز پایا جاتا ہے۔

زندگی کی گرم بازاری میں
ہم سب ہیں خسارے کی متاعِ نفع اندوز
احتیاطِ خود فریبی سے دُکانوں کو سجائے
مطمئن خوش فہمیوں کے کرب سے
گھات میں بیٹھے ہیں گاہک کی، مگر گاہک کہاں

اس مجموعہ کی تمام نظمیں خصوصاً "رسم کی قید" "محرومی کا نقصان" "پہاڑوں کے سنگین اسرار" "اپنی ہی آواز" "سمندر چاند اور دل" "تیرے دروازے تک" آزاد نظم کے عام ڈھرے سے ہٹ کر بہت منفرد اور رنگ اور معنی خیز محسوس ہوتی ہیں لیکن اس مجموعے کی تمام نظموں کا المیہ یہ ہے (دیگر شعرا کی اس قبیل کی نظموں کا بھی یہی المیہ ہے) کہ یہ سب کی سب آزاد ہیں سو ہیں، ان کا قاری سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہیں شاعر کو فن کے پیچ و خم میں اُلجھا دیتی ہیں اور بسا اوقات ایک لاحاصل سی کوشش بن کے رہ جاتی ہیں۔ اگر سلام صاحب ان نظموں کے اظہار کے لئے کوئی واضح راستہ اختیار کرتے تو اُن کی آواز قاری تک ضرور پہنچتی

واضح راستے کا مطلب میں اُن نظموں کی وساطت سے آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں جن کی آواز ادب کے قاری تک ایک گونج بن کر پہنچی ہے اور دل و دماغ پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی "پتھر" اور "انسان عظیم ہے خدایا"۔ مجید امجد کی "طلوعِ فرض"۔ ساحر کی "تاج محل"۔ فیض کی "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز"۔ "انسان عظیم ہے خدایا" میں شاعر براہِ راست خدائے لم یزل سے ہمکلام ہوتا ہے اور وہ اس کو بتاتا چلا جاتا ہے کہ وہ کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ نظم نقطۂ عروج پر پہنچ کر اس بند کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے:

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا، سوا ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

اس نظم میں الفاظ کا تانا بانا، اظہار کا انداز، بات کہنے کا سلیقہ کچھ اتنا مسحور کن ہے کہ قاری فن کار کی عظمت اور ادب کی افادیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجید امجد کی "طلوعِ فرض" میں صبح ہوتی ہے تو ہر شخص رواں دواں نظر آتا ہے لیکن اس کے اس عمل کے پیچھے کوئی امنگ یا مجبوری کا۔ فرماتے ہیں۔ مجید امجد نے ایک اچھی مثال کا سہارا لے کر اس بات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ نظم میں چار چاند لگ گئے ہیں:

گلی کے موڑ پر نالی میں پانی
تڑپتا، تلملاتا جا رہا ہے
زد جاروب کھاتا جا رہا ہے

"تاج محل" میں ساحر نے یہ کہہ کر:

مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

نظم کو خود تاج محل کا سا حسن بخش دیا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی نظمیں غزل سے پیچھے نہیں رہ سکتیں اور یہ سارا کرشمہ فن کار کے اظہار کا ہے۔ میں سلام کی نظموں میں اظہار کچھ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سنگِ مرمر کا تراشا ہوا محل دھوئیں کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا گم ہو رہا ہو۔ اگر سلام صاحب اظہار کا کوئی واضح راستہ تلاش کرتے تو مجھے یقین ہے کہ اُن کی آواز اردو ادب میں ضرور واضح طور پر سنائی دیتی

سلام کی غزلوں پر بھی نظموں کی سوچ کا انداز چھایا ہوا ہے۔ ان غزلوں میں رواج اور جذبہ دونوں رنگوں کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ سوچ کا

ایک قابلِ قدر انداز اُن کے پاس ہے جس کا وہ بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔

مجموعے کی پہلی غزل ——— بنائے رنج تھی وجہ التفات تمہیں

میں شاعر نے قافیے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "راق" اور سنگِ حاق جیسے بھاری بھرکم لفظ استعمال کئے ہیں جو غزل کے سبک مزاج کو یقیناً مجروح کرتے ہیں لیکن دوسری غزلیں اس بارے جا سے پاک ہیں۔ مجھے غزل میں کسی لفظ کے استعمال پر اعتراض نہیں۔ آج کی غزل ——— کبوتر۔ جھینگر، ککڑی، جالا، انگنی، اخبار، دفتر، بک شیلف، نوالہ وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ جہاں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں شاعر نے انھیں اس حسن سے شعر میں سمویا ہے کہ ذرا بھی ناگوار نہیں ہوتے مگر راق اور سنگِ حاق کے لئے غیاث کی ورق گردانی بہت کھلتی ہے۔ غزلوں میں جابجا چراغ سے چراغ جلانے کی بھی مثالیں واضح طور پر ملتی ہیں مگر حاشا میں سلام پر سرقے کا الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ میری نظر میں یہ ایک اچھی کوشش ہے بشرطیکہ مضمون کی یکسانیت کے باوجود مفہوم کا کوئی نیا پہلو سامنے آئے۔

آخر میں مجموعے کے دو اچھے شعر سنیئے:

آپ کو دیکھ کر یہ سوچتا ہوں ——— آسماں سے بھی لوگ اُترتے ہیں

سلام ہنستی ہوئی بجلیوں کا کوڑا ہے ——— کہ آشیاں میں رہو فکرِ آشیاں سے بلند

سیف زلفی

دشمن (افسانے)

مصنف: ابو ضیا اقبال ——— مکتبۂ عالیہ۔ ایبک روڈ۔ لاہور

ضخامت: ۲۰۸ صفحات ——— قیمت: تین روپے

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے سترہ روزہ جنگ میں بھارت کے خلاف جو ادبی محاذ قائم کیا تھا۔ یہ کتاب اُسی محاذ کا ایک مورچہ ہے۔ اس مجموعے کے دس کے دس افسانے گذشتہ جنگ کے ماحول سے بھرپور ہیں۔ ابو ضیا اقبال مجھے پہلے نوجوان افسانہ نگار نظر آئے ہیں جنھوں نے جنگ پر اس شد و مد سے افسانے تخلیق کئے۔ مصنف نے اپنے افسانوں کے پلاٹ کچھ ایسے تلاش کئے ہیں جن سے ان کی ذہنی اُپج اور تخلیقی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ جنگ کے موضوع پر جو افسانوی ادب تخلیق ہوا ہے اس میں ان افسانوں کو نمایاں جگہ ملے گی۔

سیف زلفی

ہماری تازہ ترین کتابیں

طنزیات و مضحکات
رشید احمد صدیقی

طنز و مزاح کا عنصر دنیا کے ہر ادب میں پایا جاتا ہے۔ اردو کا دامن بھی اس سے خالی نہیں۔ اردو میں اس قسم کے شگفتہ انشا، و ادب کا جو سرمایہ ملتا ہے۔ اس کا جائزہ سب سے پہلے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لیا تھا مگر ان کی کتاب طنزیات و مضحکات ایک ہی جھلک دکھا کر نایاب ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ چھپ کر تیار ہے۔ قیمت: ۵/۵۰ روپے

النبی
خلیل جبران ترجمہ: حبیب اشعر

النبی خلیل جبران کی THE PROPHET کا اردو ترجمہ ہے جس میں جبران نے اپنے شاعرانہ افکار کو فلسفیانہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب جبران کے فن کا نقطۂ عروج سمجھی جاتی ہے۔

قیمت: تین روپے

دربارِ رسولؐ کے فیصلے
قرطبی۔ ترجمہ ابو العرفان حکیم عبدالرشید

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فیصلے مندرج ہیں جو حضورؐ نے خود طے فرمائے یا جن میں فیصلہ دئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔

قیمت: سات روپے پچاس پیسے

اقبال کے صنائع بدائع
پروفیسر نذیر احمد

اقبال کے فکر و فن پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اقبال کے کلام میں صنائع بدائع کی صحیح معنوں میں نشاندہی کی موثر کوشش کسی نے نہیں کی۔ یہ کتاب بڑی حد تک ندرت و جدت کی حامل ہے۔

قیمت: ۳ روپے ۷۵ پیسے

تصوراتِ اقبال
مولانا صلاح الدین احمد

تصوراتِ اقبال میں وہ تمام دل کش مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جو مولانا صلاح الدین احمد نے وقتاً فوقتاً اقبال کی شاعری اور ان کے فکری سرمایہ کے بارے میں تحریر کئے تھے۔ عمدہ اسلوب بیان اور لطفِ دلبری سے مزین۔

قیمت: ۷ روپے ۵۰ پیسے

مفصل فہرست طلب کریں۔

ہماری دیگر کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
شمع	اے۔ آر خاتون	۹/۰۰
تصویر	〃 〃	۷/۵۰
افشاں	〃 〃	۹/۰۰
چشمہ (دو حصے)	〃 〃	۱۵/۰۰
ہالہ	〃 〃	۱۰/۰۰
زمانہ	〃 〃	۶/۵۰
نور العین (بچوں کے لئے)	〃	۲/۵۰
سات کھیلائیں (〃)	〃 〃	۱/۵۰
شہزادی ماہ رخ (〃)	〃 〃	۲/۰۰
ساڑھے تین یار (〃)	〃 〃	۴/۷۵
بھائی بہن (〃)	〃 〃	۲/۰۰
سلیقہ بیگم (〃)	〃 〃	۲/۰۰
سہیلیں (〃)	〃 〃	۲/۰۰
نادرہ	زبیدہ خاتون	۶/۰۰
عروسہ	〃	۷/۵۰
کرن	〃	۷/۵۰
ہما	〃	۷/۵۰
ترنم	〃	۸/۰۰
زیور (دو حصے)	〃	۱۳/۵۰
شہفیلا	بدر انجم خاتون	۷/۵۰
زبیدہ	〃	۷/۰۰
دیارِ غیر	نور جہاں	۶/۰۰
شہنانہ	نجمہ فرخ	۳/۵۰
عاصمہ	تنویر زبیدہ بخاری	۱۰/۰۰
عنبریں	قدرہ جبیں	۸/۰۰

ایک تحقیقی و نفسیاتی جائزہ

چھ ستمبر
عشرت رحمانی

پاک بھارت جنگ کے مستند اور مکمل حالات و وقائع، حوادث اسباب و عوامل اور عواقب و نتائج۔ قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی لاہور
فون نمبر: ۶۷۵۰۴

کتاب نما کی مطبوعات

کیا آپ کو

روس کی معاشرتی زندگی سے،

عالمی احوال و کوائف سے،

نئی سائنسی دریافتوں اور ٹیکنیکل ایجادات سے

طب اور جدید ادبیات سے

بچوں کی تعلیم و تربیت اور کھیلوں کی عالمی خبروں سے

دلچسپی ہے؟

یقیناً ہوگی ——— تو آپ

روس سے شائع ہونے والے اردو ماہنامے

سوویٹ یونین

کا مطالعہ کریں

یہ ماہنامہ بڑے سائز میں دبیز آرٹ پیپر پر متعدد سادہ اور رنگین تصاویر اور دیدہ زیب گٹ اپ کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

سالانہ چندہ ——— ۶/۵۰

دو سال کے لئے ——— ۱۰/-

تین سال کے لئے ——— ۱۳/۵۰

آپ اپنا چندہ ہمیں بھیج دیں۔ چندہ موصول ہونے کے دو ماہ بعد رسالہ آپ کو براہ راست ماسکو سے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ملنا شروع ہو جائے گا

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق فارسی مثنوی

مجنوں لیلیٰ

کا مستند ترین نسخہ جسے علمی اکیڈیمی آذربائیجان نے ترتیب دے کر ماسکو سے شائع کیا ہے

بڑا سائز، مضبوط کپڑے کی جلد، خوبصورت جلی ٹائپ

قیمت بہت ارزاں: ۷/۵۰

ماسکو سے شائع شدہ

اردو کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
۱- دار و رسن کی آزمائش		۲/۵
۲- داستان خواجہ بخارا کی		۱/۲۵
۳- بھوکے بہار کے	از ترگنیف	۳/-
۴- ایوان بیلکن کی کہانیاں	از پشکن	۲/-
۵- گورکی کے ڈرامے		۳/-
۶- اطالوی کہانیاں	از گورکی	۲/-
۷- سوویٹ سوشلسٹ جمہوریت	از لینن	۱/۵۰

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

۲۶- مال روڈ۔ لاہور

فون: ۴۵۱۲

تارۃ القرطاس

فنون لاہور

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کی مطبوعات

۱- برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری		۱۰/-

(نیشنل بنک آف پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں اس کتاب پر پہلا انعام دیا)

۲- قانونی لغت	شیخ تنزیل الرحمٰن		۱۲/-
۳- قاموس الاصطلاحات	شیخ منہاج الدین	سفید کاغذ	۳۰/
		اعلیٰ کاغذ	۴۰/
۴- اڑن طشتری			۳/-

(صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، کمشنر بہاولپور ڈویژن اور محکمہ قومی تعمیر قلاہمید نے اس کتاب پر انعامات دیئے)

۵- مصنوعی سیارے

(صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس کتاب پر انعام دیا)

۶- ایٹم اور ایٹمی توانائی			۲/۵۰

(صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس کتاب پر انعام دیا)

۷- ایکس ریز			۱/۵
۸- حیاتین			۱/-
۹- مبادی نباتیات	پروفیسر اکرام بٹ	(ایف۔ ایس سی کے لئے)	۳/-
۱۰- حیوانات	پروفیسر محمد رمضان مرزا	(بی ایس سی کے لئے)	۴/۵۰
۱۱- نفسیات	پروفیسر چوہدری عبدالقادر	سفید کاغذ	۱۱/-
	(بی۔ اے۔ بی۔ اے آنرز کے لئے)	اخباری کاغذ	۸/۵۰
۱۲- ہمارے جانور	از رشید طاہر		۳/۵۰
۱۳- آدار	از ڈاکٹر عبدالبصیر پال		۶/۷۵

ملنے کا پتہ :-

مکتبۂ ادب جدید، پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ - لاہور

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۲- انار کلی - لاہور سے شائع کیا
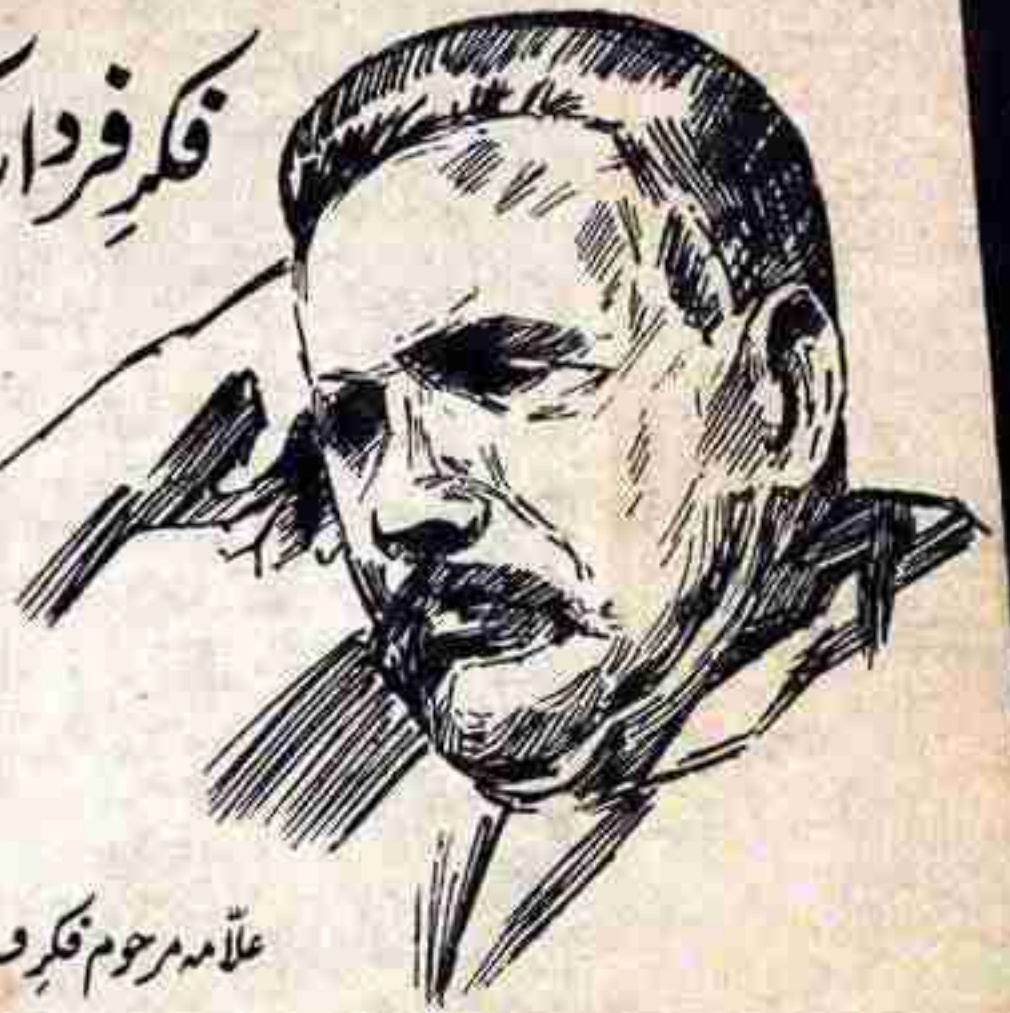
علامہ مرحوم فکرِ فردا کو بے حد اہمیت دیتے تھے ـــــ!

انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں فکرِ فردا کی جو قندیل روشن کی، ۱۶ برس کی قلیل مدت میں آفتاب عالم تاب بن کر افقِ عالم سے ابھری اور پاکستان کو عدم سے وجود میں لائی، جو انشاء اللہ تعالیٰ ابد الآباد تک زندہ و پائندہ رہے گا ـــــ

اسی "فکرِ فردا" کی صدائے بازگشت ۱۹۳۴ء میں پھر گونجی، جب علامہ مرحوم نے مسلم انشورنس کمپنی کی تشکیل کی، جو گذشتہ ۳۲ برس سے "فکرِ فردا" کی عملی تعبیر بن کر قومی خدمت میں سرگرم عمل ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ رہے گی۔

فکرِ فردا کی بہترین صورت بیمۂ زندگی ہے، اور بیمۂ زندگی کے لئے بہترین ادارہ ہے۔

مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ

بانی علامہ اقبالؒ

MIC. 113.66

صرف سرورق کی چھپائی فنون پریس لاہور میں ہوئی